قَدْ بُصِّرْتُمْ إِنْ أَبْصَرْتُمْ وَقَدْ هُدِيتُمْ إِنِ اهْتَدَيْتُمْ وَأُسْمِعْتُمْ إِنِ اسْتَمَعْتُمْ (علیؑ)

تم کو چشم بصیرت دی گئی ہے اگر آنکھ کھول کر دیکھو۔ تم کو صراط مستقیم بتا دی گئی ہے اگر اس پر چلو۔ تم کو قوت سماعت دی گئی ہے اگر سنو (علیؑ)

اَلْعَقْلُ مَا عُبِدَ بِهِ الرَّحْمٰنُ وَاكْتُسِبَ بِهِ الْجِنَانُ

فلسفۂ اسلام

حصۂ اوّل

در مبحث شرائع مختلفہ

تصنیف

آغا محمد سلطان مرزا دہلوی، ایم اے، ال ال بی

مصنف

البلاغ المبین، کتاب التفریق والتحریف فی الاسلام، سیرۃ فاطمۃ الزہراؑ، نور المشرقین من حیاۃ الصادقین وغیرہ

در ایجوکیشنل پریس، پاکستانی چوک، کراچی طبع شد

دسمبر ۱۹۵۶ء

قیمت:- مجلد آٹھ روپیہ بارہ آنہ
غیر مجلد آٹھ روپیہ

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَإِنَّمَا تُوَفَّوْنَ أُجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ... وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ ۱۸۵۔۳

ہر جان موت کا مزا چکھے گی اور تم لوگ قیامت کے دن (اپنے کئے کا) پورا پورا بدلہ پاؤ گے
دنیا کی زندگی تو ایک دھوکہ ہے۔

فلسفۂ اسلام

حصّہ اوّل

جس میں

(۱) ادیانِ عالم، فلسفہ یونان و ایران و ہندوستان و مصر اور حالات و معاشرہ و تہذیب اقوام ماضی مثلاً اہل بابل، آشوریا، فینیقیا، مصر و جزیرہ قریطہ، چین وغیرہم کو وضاحت سے بیان کر کے ان کا مقابلہ فقہ و فلسفۂ اسلام سے کیا گیا ہے جس سے احقیت و افضلیت اسلام عیاں ہے (۲) ارشاداتِ قرآن و تعلیمات ائمہ علیہم السلام کو موزوں مقامات پر شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے (۳) دہریت کے نظریات و معتقدات کی تردید باحسن دلائل کی گئی ہے (۴) آیاتِ فطرت سے فاطر ارض و سماوات کی طرف دلالت کی گئی ہے۔ اور اس ضمن میں علم اجرام فلکی، علم طبیعیات و تخلیق کائنات و ابتداء حیات و گردشِ ثوابت و سیارگان و اخر شعاع عالمی و تقلیب معدنیات و اختلاف خلقت کو دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے اور سائنس کی لاعلمی کو ہر مناسب موقعہ پر عیاں کیا گیا ہے۔

تالیف

آغا محمد سلطان مرزا

ایم اے ال ال بی۔ ڈسٹرکٹ و سشن جج ریٹائرڈ جسٹس آف پیس کراچی و نوٹری پبلک، کراچی سابق انڈر سیکرٹری پراونشیل سول سروس جوڈیشل برانچ پنجاب سابق ممبر کورٹ آف دہلی یونیورسٹی۔ مؤلف البلاغ المبین، نور المشرقین من حیاۃ الصادقین، کتاب التفریق والتحریف فی الاسلام، کتاب سیرۃ فاطمۃ الزہرا ؑ
وغیرہ وغیرہ

بیادگار

و

برائے ایصال ثواب

بارواح

والدین و مادر و پدر والدین مصنف

نوشته شد

رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مُناجات بدرگاہِ قاضی الحاجات

اے وہ ذاتِ ہست جو فہم و شعورِ انسانی سے بالاتر ہے، جس کی مشیّت کو سمجھنا ذہنِ انسانی کا کام نہیں - اور جس کی قضا و قدر میں چوں وچرا کرنا عقلِ انسانی کی بے عقلی ہے - میں نے اپنی حالت اور حاجت کو عرصہ تک تیری درگاہ میں فریاد و فغاں کے ذریعہ سے پہنچایا - اور اَب خاموشی کو اپنا وکیل کر کے تیرے پاس یہ عرض کرنے کے لئے بھیجتا ہوں کہ ؎

کاہی کمینہ بخششت ملک جہاں
من چہ گویم چوں تو میدانی نہاں

میں ہمیشہ زبان سے یہی کہتا رہوں گا اور دل سے اقرار کرتا رہوں گا اس دُنیا میں بھی اور میدانِ حشر میں میزانِ عدل کے سامنے بھی کہ تو نے ہمیشہ میرے اُوپر اپنے افضال و اکرام ہی ارزانی فرمائے - اور جو دُنیا والی آنکھوں میں مصائب نظر آئے وہ بھی میرے بے شمار گناہوں کے کفّارہ کی صورت میں تیری نعمتیں تھیں - قصور میرے شکر میں ہوا تیرے فضل و کرم میں کبھی کمی نہ ہوئی - باوجود میرے گناہوں کی کثرت اور اُن پر اصرار کے تو نے میری حاجتیں پُوری کیں ع

اے ہمیشہ حاجتِ ما را پناہ

حالانکہ جب میں نے تیری طرف امداد کے لئے ہاتھ پھیلایا تو یہ پہلے کہنا پڑا کہ ع

بارِ دیگر ما غلط کردیم راہ

ایک حاجت میری اتنی شدید ہے کہ باوجود اس یقین کے کہ تو اس کو میرے بغیر میرے کہے جانتا ہے، فقط اپنی تسلّی کے لئے اس کو زبان سے بھی عرض کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں - وہ یہ کہ میں اپنے والدین کی خدمت اپنی تمنّا کے مطابق نہ کر سکا - اور قبل اس کے کہ میں اس کمی کو پُورا کرتا وہ اپنا سفر ختم کر کے تجھ تک جا پہنچے تھے - اب کیا کروں اور کس سے کہوں کہ میرے اس قصور کی تلافی کرے - تجھ سے ہی عرض کرتا ہوں کہ

رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا

عرض پوری ہوئی - قبول پر نظر ہے

نذر

بحضور حضرت حجۃ اللہ القائم امام العصر والزمان

مہدی دوران صلوات اللہ علیہ

کیا ایسے گنہگار کو بارگاہ عالی میں حاضر ہونے کی اجازت مل سکتی ہے جس کے ہاتھ خالی ہیں اور دامن گناہوں سے پُر۔ مجھے یقین کامل ہے کہ آپ میری حالت سے واقف ہیں۔ گناہوں اور غفلتوں کا تو کوئی عذر ہی نہیں ہو سکتا۔ اگر میری حالت پر نظر کر کے سزا میں کمی ہو جائے تو یہ بھی بہت ہے۔

مومنین کی دُعا ہے کہ آپ جلد ظاہر ہوں تاکہ دُنیا جو ظلموں سے بھری ہوئی ہے عدل سے پُر ہو جائے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ حضور والا خداوند تعالےٰ سے دُعا کر کے ہمیں اس قابل کر دیں کہ ہم حضور کو قبول کر سکیں اور حمایتِ حق کر سکیں۔ ابھی تک تو ہماری یہ حالت ہے کہ حمایتِ حق تو بڑی چیز ہے ہمارے صاحبانِ حل وعقد باطل کی کثرت کو دیکھ کر اپنے تئیں اہلِ حق کہتے ہوئے شرماتے ہیں ڈرتے ہیں۔ اور ہم سب اپنے عمل سے ان کے اس ڈر کو تقویت دیتے ہیں۔ ابھی ہم عجل اللہ فرجک کہنے کے قابل نہیں ہیں۔ آپ ہماری مدد فرمائیں کہ اس قابل ہو جائیں اور یہی وجہ ہے کہ یہ دُعا کرتے کرتے عرصہ ہو گیا اور ابھی یہ دُعا قبول نہیں ہوئی۔

یہ سطور میں اس مہینہ میں لکھ رہا ہوں کہ جس مہینہ میں دُنیا کو آپ کی پیدائش سے فیض پہنچا تھا۔ مومنین نے سینکڑوں رقعے حضور کی طرف دریا میں ڈال کر بھیجے اور منکرین نے اعتراض کیا کہ کہیں پانی کے رقعے بھی پہنچے ہیں۔ وہ یہ نہیں جانتے کہ تحریر تو طرز عرض ہے اور رقعہ کو پانی کے حوالہ کرنا اظہار نیت ویقین۔ اور جب اس عرض کو نیت ویقین کے بال وپر لگ جاتے ہیں تو اس کو بہت سے خضرِ راہ مل جاتے ہیں جو اُسے حضور تک پہنچا دیتے ہیں

اگرچہ میں گنہگار ہوں لیکن باوجود گناہوں کے آپ کے فیض و کرم کا اُمیدوار بھی ہوں۔ اگر میری اس اُمید و یقین کی سادگی کو گناہوں کی شدت و کثرت کے مقابلہ میں ترازو میں رکھا جائے تو پھر آپ ہی فیصلہ کرسکیں گے کہ گناہ مستوجب سزا ہے یا یہ سادگی قابلِ آفریں ہوئی۔ جو یہ سادگی ہو جس کے ایک ہاتھ میں آپ کے عفو کا دامن ہے۔ اور دوسرے ہاتھ میں کشکولِ گدائی اور نظر آپ کے چہرے پر ہے کہ کیا حکم صادر ہوتا ہے۔ کیا ایسے گدا کو آپ اپنے دروازے سے محروم واپس کریں گے نہیں، نہیں، ہرگز نہیں واپس کریں گے۔ آپ کے جدامجد کے دروازے سے تو کبھی کوئی سائل محروم نہیں گیا۔ اور بغیر اس کے جرموں کی فہرست پر نظر ڈالے ہوئے اُسے اتنا دیا کہ پھر اُسے کسی اور دروازے پر جانے کی ضرورت نہ رہی۔

اس اُمید کو لے کر آپ کی بارگاہ پر حاضر ہوا ہوں کہ میرے گناہوں کو نظر انداز کر کے میرا یہ حقیر نذرانہ قبول فرمایا جائے گا۔ نذرانہ بھی کیا ہے؟ چند اوراقِ پریشاں جن میں جذبات کے قلم سے آنسوؤں کی سیاہی کے ساتھ اُس نالۂ دل کو قید کرنے کی کوشش کی ہے جو گناہوں کے بوجھ سے پہلے ہی دبا ہوا تھا۔ شاید اُس کو قید میں دیکھ کر کسی کو رحم آجائے۔ طائرِ نالاں قفس میں بند ہو کر زیادہ قابلِ توجہ ہو جاتا ہے۔

روزِ محشر کہ جب کوئی تو اپنے گناہوں سے نادم ہوگا اور کوئی اپنے اعمال پر فخر کرتا ہوا آئے گا۔ میں ہوں گا تو خالی ہاتھ اور گناہوں سے آلودہ لیکن انشاء اللہ اس طرح آؤں گا کہ

من و دست و دامانِ آلِ رسولؐ

ناظرین اس وقت آمین کہدیں تو میرا دل بڑھ جائے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تعارف کتاب ھذا

الحمد للہ الواحد الفرد الوتر الصمد ولم یکن لہ کفواً احد الذی لم یتخذ صاحبۃ ولا ولداً ولم یکن لہ شریک فی الملک ولم یکن ولی من الذل فکبرہ تکبیرا۔ والصلوٰۃ والسلام علی رسولہ الکریم وآلہ الطیبین الطاہرین۔

زمانۂ حال کی کتابوں کی کثرت و فہم کی قلت ہر مصنف کو مجبور کرتی ہے کہ وہ بتائے کہ جو کتاب وہ پیش کر رہا ہے اس کی غرض و غایت کیا ہے اور وہ کس ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ آجکل دُنیا پر مغربی تہذیب نے اپنا مکمل قبضہ کر لیا ہے۔ اور چونکہ اس کی پشت پر سیاسی طاقت بھی ہے اور اس نے مادی ترقی بھی کافی کر لی ہے لہٰذا دُنیا کی اکثریت کو یقین ہوتا جا رہا ہے کہ اس تہذیب میں ضرور حقیقت ہے جب ہی تو یہ ترقی کر رہی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اس میں چند خصائل ایسے ہیں جو واقعی اچھے ہیں مثلاً (۱) کام کرنے میں (۲) ہمت و طاقت (۳) علم کی جستجو (۴) آپس کے معاملات میں (ایمان داری)۔ ان اُمور کو اور ظاہری سیاسی طاقت کو دیکھ کر چند مُسلم محققین خصوصاً مصری عالم علی عبدالرزاق اور طٰہٰ حسین کی رائے یہ ہے کہ بغیر مغربی تہذیب کی مکمل اور خالص پیروی کے ترقی ناممکن ہے اور مسلمانوں کو چاہیئے کہ بغیر دل میں کوئی شک لائے ہوئے مغربی تہذیب کو الف سے ی تک اپنا بنا لیں۔ اس راستہ میں پہلا قدم یہ ہوگا کہ حکومت کو مذہب سے بالکل علیحدہ کر لیں۔ دیکھو علی عبدالرزاق کی کتاب الاسلام والحضارة العربیہ اور طٰہٰ حسین کی کتاب مستقبل الثقافت فی مصر۔ یہ ایک ایسا انقلابی نظریہ ہے کہ جس کی روک تھام ضروری ہے۔

پہلے تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ آیا جس راستہ پر مغربی تہذیب جا رہی ہے وہ ترقی کا راستہ ہے یا اس کے برعکس ہے۔ یہ امر واقعہ بہت بدیہی ہے۔ اس کے لئے کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں کہ مغربی تہذیب دُنیا کو ایک مہیب غار آتشین کے کنارے پر لے آئی ہے جس کے اندر وہ اب گرنے کو ہو رہی ہے۔ مغرب والے سب ہم مذہب ہیں۔ ایک ہی اُن کی تہذیب ہے آپس میں صلح و آشتی سے رہنے کے ہزاروں جتن کر لئے لیکن جو قدم اُٹھتا ہے وہ اُن کو مزید عناد و نفاق و جنگ کی طرف لے جاتا ہے۔ خود یورپ کے محققین کی رائے ہے کہ اگر یہی حالت رہی تو دُنیا کی بربادی یقینی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عقلِ انسانی کے سارے حیلے ختم ہو گئے اور اب بنی نوعِ انسان کے نیست و نابود ہونے کا زمانہ آگیا۔[1]

لہ (1) H.G. Wells : Mind at the end of its Tether.

اس کتاب کے متعلق علماء کی یہ رائے ہے :-

"Mr. Wells had not heard of the atomic bomb

مغربی تہذیب کا مابہ الامتیاز یہ ہے کہ جو کچھ ہے عقلِ انسانی ہے۔ نہ خدا ہے اور نہ عاقبت
یہ کلیہ اُنہوں نے یونان کے فلسفۂ قدیم سے لیا ہے جس کا مقولہ ہے کہ

Man is the measure of all things :

یعنی صرف انسان ہی تمام اشیاء کائنات کی اصلیت اور حقیقت کا معیار ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس کو انسان سچ کہدے وہ سچ اور جس کو انسان غلط کہدے وہ غلط

لیکن اس نظریہ اور اس تہذیب کا نتیجہ بربادی ثابت ہے۔ اور جس کا نتیجہ بُرا ہو وہ نظریہ یا وہ خیال کبھی صحیح نہیں ہو سکتا۔ صریح نتیجہ نکلا کہ مغربی تہذیب غلط ہے اور بربادی پر منتج ہو رہی ہے۔ ایٹم بم یا ہوائی جہاز ترقی کے نشان نہیں ہیں بلکہ بربادی کی علامتیں ہیں۔ مغربی تہذیب کی جو خوبیاں ہم نے اُوپر بتائی ہیں اگر وہ مغربی تہذیب میں اور محض مغرب ہی میں پائی جائیں اور کسی اور ضابطۂ زندگی میں نہ ملیں تو پھر مغربی تہذیب کی تقلید جائز ہو سکتی ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام میں وہ اصول بدرجۂ اتم موجود ہیں تو پھر اس زہریلے درخت کے پاس جانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ اگر کسی ثقافت یا تہذیب یا Culture کی ایک یا چند اُمور کی تقلید کریں اور اُن اُمور کو اس تہذیب یا ثقافت کے اجزا تصور کر کے تقلید کریں تو پھر رفتہ رفتہ ساری ہی تہذیب کی تقلید

بقیہ صفحہ ۶

when he wrote this book. nevertheless, he makes no secret of his conviction that man soon would arm himself with the means of complete self-destruction. These is a prophecy. in this book which recent events have brought alarmingly nearer.

اس ہی مصنف کی مندرجہ ذیل کتاب بھی اس ضمن میں قابل ملاحظہ ہے :۔

The Outlook for Homo Sapiens.

ترجمہ (اس کتاب کے مصنف) مسٹر ویلز کو ایٹم بم کی اطلاع نہیں تھی جب اس نے یہ کتاب لکھی۔ لیکن پھر بھی وہ اپنے اس یقین کو برملا ظاہر کرتا ہے کہ بہت جلد انسان اپنی ہی بربادی کے ہتھیاروں سے اپنے تئیں آراستہ کریگا۔ اس کتاب میں جو پیشین گوئی ہے اس کو زمانۂ حال کے واقعات نہایت خطرناک سرعت کے ساتھ نزدیک تر لے آئے ہیں۔

کرنے لگتے ہیں - لہٰذا ہم کو ان اُمور کا تتبع ان کو مغربی تہذیب کے ارکان سمجھ کر نہ کرنا چاہیئے بلکہ اسلام کے اُمور و ارکان سمجھ کر اُن کی پیروی کرنی چاہیئے ۔ جناب امیر علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جب تم دُنیا کا کام کرو تو اس انہماک سے کرو کہ گویا تم کبھی نہیں مرو گے - اور جب تم عبادت کرو تو اس خیال کے ساتھ کرو کہ گویا آنے والے لمحہ ہی میں تم مر جاؤ گے - اس سے زیادہ زور دار الفاظ میں کام اور جستجو کی ہدایت نہیں ہوسکتی - جناب رسولؐ خدا فرماتے ہیں کہ اطلبوا العلم ولو کان بالصین - آپس کے معاملات کے طریقے اور ان کی دیانت داری جو اسلام نے بتائے ہیں اس سے بہتر کسی فلسفہ یا مذہب میں نہیں ملتے - ان کو تفصیل سے اس کتاب کے دُوسرے حصہ میں ہم انشاءاللہ بیان کریں گے -

اس کتاب کی تحریر کا مقصد اس ہی خطرۂ عظیم کا روکنا ہے اور یہ ظاہر کرنا ہے کہ مغربی تہذیب میں جتنی خوبیاں پائی جاتی ہیں وہ سب فلسفۂ اسلام میں ملیں گی - اور اس کی بُرائیاں جو اس کی اچھائیوں سے کہیں زیادہ ہیں اسلام کی تہذیب میں نہیں پائی جاتیں - غرضکہ فلسفۂ مغربی کا مقابلہ فلسفۂ اسلام سے کر کے اسلام کی خوبیوں کو ظاہر کیا گیا ہے - مغربی تہذیب کے ایسی فلسفہ کے عیوب کو نمایاں کرنا اور اسلام کے دین کی خوبیاں بیان کرنا اس کتاب کا مقصد ہے -

لیکن اس امر واقعہ سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ بہت عرصہ سے مسلمان اخلاقی اور اقتصادی ذلت میں گرفتار ہیں - اگر نتیجہ سے فلسفہ کی صحت کا پتہ چلتا ہے تو مخالفین اعتراض کرسکتے ہیں کہ فلسفۂ اسلام بھی صحیح نہ ہوا - ان کی یہ بحث صحیح ہوتی اگر یہ ثابت ہوجاتا کہ مسلمان صحیح فلسفۂ اسلام پر عمل کر رہے ہیں - ہمارا دعویٰ ہے کہ بہت عرصہ سے مسلمانوں کے ارباب حل و عقد کا مذہب اسلام نہیں رہا - یا یوں کہہ سکتے ہیں کہ انہوں نے اصولِ اسلام پر عمل کرنا ترک کردیا ہے -

مغربی تہذیب کی تقلید کی حماقت اس کے آخری درجہ پر پہنچ چکی ہے - مثلاً عورتوں میں بے پردگی معیار ترقی سمجھا گیا ہے - اور اس میں درجے ہیں - سب سے نیچا درجہ یہ ہے کہ عورت مردوں کے مجمع میں بے حجابانہ داخل ہو اور خاوند سے دُور غیر مردوں کے ساتھ ہنسی مذاق میں حصہ لے - اور خاوند اس کو دیکھ کر دل ہی دل میں دُور بیٹھا ہوا خوش ہوتا رہے - اس سے اونچا درجہ یہ ہے کہ عورت مردوں کو اپنا گانا سُنائے - اور سب سے

زیادہ Advanced وہ ہے جو غیر مردوں کے ساتھ ناچے۔ اسی طرح مردوں کے بھی ترقی کے درجات ہیں۔ سب سے نیچا درجہ تو یہ ہے کہ گلے میں ایک ڈھیچی صلیب کے طرز پر باندھ لی۔ اور وہ ہوا میں اڑتی ہے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ جس طریقے سے انگریزوں کو سگرٹ پیتے دیکھا تھا اور باتیں کرتے سنا تھا اسی طرح سے یہ بھی کریں۔ شراب پینا تیسرا درجہ ہوا۔ مردوں میں بہت زیادہ درجے ہیں اور سب حماقت پر مبنی۔ یہاں تک بھی خیریت ہوتی۔ لیکن وہی اصول کارفرما ہوا کہ اگر چند باتوں میں تقلید کرو گے تو پھر ساری تہذیب ہی کی تقلید کرنے لگو گے۔ مغربی تہذیب کا رکنِ اعظم دھریت ہے اور اب مسلمان اس کو محض فیشن سمجھ کر اختیار کر رہے ہیں۔ لہٰذا ضرورت محسوس ہوئی کہ ان کی توجہ دھریت کی حماقت کی طرف منعطف کرائی جائے۔ اور یہ کتاب زیادہ تر ان ہی لوگوں کے لئے لکھی گئی ہے مومن کے لئے کسی چوں وچرا کی ضرورت نہیں اور اس کے لئے حقائقِ اسلام محتاج ابحاث واثبات نہیں ہیں۔ لیکن یہ ضرور ہے کہ اس کتاب کے مطالعہ سے مومن کا ایمان راسخ تر ہو جائیگا اور اس کو قرآن شریف کے مطالعہ میں خاص لطف آنے لگے گا۔ اس کتاب کا بہت بڑا جزو تعلیم ائمہ علیہم السلام پر مشتمل ہے۔

یہ سوال بھی دلچسپ ہے کہ آیا انسان نے بذریعہ ارتقاء مچھلی یا بندر سے گزرتے ہوئے یہ شکل پائی ہے یا شروع ہی سے اس ہی شکل میں زمین پر ڈالا گیا تھا۔ مذہب پر بھی کیا اصول ارتقاء حاوی ہیں اور دماغ انسانی بتدریج بُت پرستی اور جانور پرستی سے گزر کر توحید پر پہنچا ہے۔ یا اس کو یہ تعلیم شروع ہی سے دی گئی ہے۔ ان سوالات پر بھی اس کتاب میں بحث کی گئی ہے۔

دُنیا میں ہر ایک عصر کی ایک خصوصیت رہی ہے اور عصرِ رواں کی خصوصیت لادینی اور خداوند تعالےٰ سے اعراض ہے۔ لوگوں نے خداوند تعالےٰ کے آوامر ونواہی کو فراموش کر دیا ہے۔ اور اپنے رسولؐ اور ان کے خاندان کے ائمہ علیہم السلام سے روگردانی اختیار کر لی ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ ان بھولے ہوئے سبقوں کو پھر یاد دلایا جائے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ نوائے بے ہنگام ہے۔ وہ وقت نہیں رہا۔ وہ لوگ نہیں رہے کہ جب اس طرف لوگوں کی توجہ تھی۔ اور ان باتوں کو کان لگا کر سنتے تھے۔

وہ گل نہ رہا، وہ گلستان نہ رہا۔ بلبل کے نغمے نہ رہے۔ سننے والے نہ رہے۔

چونکہ گل رفت و گلستاں در گزشت
نشنوی زین پس زبلبل سرگزشت

بہرصورت بے وقت کی راگنی تو ہے لیکن ضروری تھی۔ اپنی طرف سے تو میں نے بڑی کوشش کی ہے اور شاعرانہ مبالغہ کے لہجہ میں کہہ سکتا ہوں کہ ؎

شمع محفل خفتہ بود و شوقِ صحبت رفتہ بود
آتش افگندم بمجلس بال بر مجمرِ زدم

ہم نے اس کتاب میں انگریزی الفاظ اور اصطلاحیں بعض جگہ انگریزی ہی میں لکھ دیئے ہیں۔ کیوں کہ آج کل کے تعلیم یافتہ طبقہ کے لوگ ان الفاظ کے مفہوم کو آسانی سے سمجھ لیتے ہیں۔ اردو میں انگریزی الفاظ کا صحیح تلفظ ادا نہیں ہو سکتا اور وہ الفاظ آجکل کے کانوں کو اجنبی معلوم ہوتے ہیں۔

اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں فلسفہ اور تصوف کی اُن اصطلاحات سے بچنے کی کوشش کی گئی ہے جن کی خاردار جھاڑیوں میں ذہن انسانی اُلجھ کر آگے بڑھنے سے معذور ہو جاتا ہے۔ عام فہم اُردو میں اُن کو سمجھایا گیا ہے۔ یہ کتاب زیادہ تر اُن لوگوں کے لئے بھی لکھی گئی ہے جو اپنے دیگر مشاغل کے باعث فلسفہ اور تصوف کو اپنا خاص مضمون نہیں بنا سکے لیکن اُن کی طبیعت اور ذہن کی فطری رغبت اور رفعت اس امر کی مقتضی ہے کہ وہ اپنے ماحول کو سمجھیں اور غور کریں کہ ہم کیوں پیدا کئے گئے ہیں اور ہمارا آخری انجام کیا ہو گا۔

اگر مختصر الفاظ میں بیان کرنا ہو تو کہہ سکتے ہیں کہ اس کتاب کا مقصد ایک تو دھریت کے اثر کو محو کرنا ہے اور دوسرے تعلیم ائمہ علیہم السلام کی نشر و اشاعت۔

اگر اس کتاب کے مطالعہ سے قوم کے چند افراد میں بھی صحیح غور و فکر کی عادت و اہلیت پیدا ہو گئی تو میں سمجھونگا کہ اس کتاب کا مقصد تحریر پورا ہو گیا۔

وما توفیقی الا باللہ العلی العظیم

آہ! آہ! از غفلتِ مردم آہ

اس غفلت کا کچھ ٹھکانہ ہے۔ انسان اس چیز کو بھولا ہوا ہے جو اس کو خاک میں ملا کر کیڑوں کی خوراک بنا دے گی۔ اور اس کے حصول کے پیچھے اپنی عمرِ عزیز کو کھو رہا ہے جس نے کبھی کسی سے وفا نہ کی۔ اوّل تو اس کا ملنا ہی دشوار ہے۔ اگر مل بھی گئی تو کے دن کے لئے۔ کیا موت بھلا دینے والی شے ہے جس کا آنا یقیناً معلوم ہے۔ لیکن جس کے آنیکا وقت نامعلوم۔ دُنیا کی زینت جو ہر تی پھرتی چھانوں ہے اس قابل نہیں کہ اس کے لئے انسان اپنی عاقبت سے بے خبر ہو جائے۔ کیا یہ کل کی بات نہیں کہ ہمارے والدین جو ہم پر جان چھڑکتے تھے۔ اگر ہمارے بدن پر مکھی بیٹھ جاتی تھی تو بیتاب ہو جاتے تھے۔ آج ہماری آنکھیں اُن کو ڈھونڈھتی ہیں اور وہ چہرے نظر نہیں آتے جن سے محبت ٹپکتی تھی۔ ہیں برچھیاں لگ رہی ہیں اور کوئی ہمارا دردِ دل سُننے والا نہیں۔ ہمارے دوست و اقارب جو کل تک ہم سے باتیں کر رہے تھے آج ہماری نظروں میں پھرتے ہیں لیکن ہماری آنکھوں سے غائب ہیں۔ جو گیا دل میں حسرت ہی لے کر گیا۔ ذرا تاریخ کی ورق گردانی تو کرو۔ کتنے بڑے بڑے عظیم الشان بادشاہ ہوئے ہیں۔ کیا کیا طوفان اُٹھائے ہیں۔ دُنیا کو اُلٹ پلٹ کے رکھ دیا۔ لیکن انجام یہ کہ خاک۔ وہ شان و شوکت کیا ہوئی۔ رعبِ شاہی کہاں گیا۔ اَب تو اُن کی لاشں پر زمین کے کیڑے آپس میں لڑ رہے ہیں۔ ایک کہتا ہے کہ میں پہلے کھاؤں۔ دُوسرا کہتا ہے کہ میں پہلے کھاؤں۔ شاعر نے سچ کہا ہے ؎

نہ گورِ سکندر نہ ہے قبرِ دارا
مِٹے ناموں کے نشاں کیسے کیسے

دُوسرا کہتا ہے ؎

بیک گردشِ چرخِ نیلوفری
نہ نادر بجا ماند نے نادری

ایسے ہی کہنے والے بہت کہہ گئے۔ لیکن شیطان نے کچھ ایسا سحر انسان کے کانوں میں پھونکا ہے کہ یہ سب کچھ دیکھتا ہے اور پھر کچھ نہیں دیکھتا کبھی قبرستان میں جا کر تو دیکھ

سب سے بڑا مدرسۂ عبرت تو وہ ہی ہے۔ اُجڑی ہوئی بستیوں پر نظر ڈالو بابل، نینوا، قرطبہ کارتھیج وغیرہ۔ ان شہروں کی گذشتہ رونق اور موجودہ بربادی پر خیال دوڑاؤ۔ معلوم ہوتا ہے کہ شہر آباد پہلے کوئی آباد ہی نہ تھا۔ کان لم یغنوا فیھا۔ یہ وہ ہی انسان تو ہے جس کو خلیفۂ خدا کہا گیا ہے۔ ایسی غفلت اور ایسی جہالت ایسی عظیم الشان ہستی کے شایان نہیں۔ سوچنا چاہیئے کہ ہمارا مقصدِ حیات کیا ہے۔ وہ مقصدِ حیات اس دُنیا کا عروج تو ہو نہیں سکتا۔ بقول شیخ سعدی ع

آنچہ پایندگی ندارد دل بستگی را نشاید

صحیح مقصدِ حیات نہ تو فلسفہ میں مل سکتا ہے اور نہ دھریت میں۔ کیونکہ وہ دونوں اس دُنیا میں محدود ہیں۔ اور مقصدِ حیاتِ انسانی دُنیا کی آلائش سے بالاتر ہے۔ وہ مقصد تو مذہب ہی میں مل سکتا ہے۔ ہم نے تمام دُنیا کے فلسفے اور تمام دُنیا کے مذاہب آپ کے سامنے پیش کر دیئے ہیں۔ ان میں سے جس کی طرف آپ کی عقلِ سلیم دلالت کرے اودھر چلے جاؤ۔ ہمیں یقین ہے کہ انسان کی عقلِ سلیم سوائے اسلام کے اور کسی طرف دلالت نہیں کر سکتی۔ اسلام میں بھی بہت سے فرقے ہیں اور ہر ایک میں ائمہ اور رہبر بیان کئے گئے جاتے ہیں۔ پھر عقلِ سلیم کو کام میں لاؤ۔ اہلبیت رسولؐ سے بہتر اور حقیقی ائمہ کہیں نہ پاؤ گے۔ ائمہ حق اور ائمہ ناحق کی شناخت بھی قرآن نے بتا دی ہے اور صبر کو معیار قرار دیا ہے۔ اس معیار پر سوائے ائمہ اہلبیت علیہم السلام کے اور کوئی پورا نہ اُترے گا۔ سب سے زیادہ مصائب ان پر پڑے۔ سب سے زیادہ ثابت قدم یہ ہی رہے۔ ان کے سوا کسی اور کی تعلیم راہ ہدایت نہیں دکھا سکتی۔ لیس للانسان الا ما سعی۔ ہدایت تلاش کرنے کی سعی کرو۔ خدا بھی اس کی ہی ہدایت کرتا ہے جو ہدایت کا متلاشی ہوتا ہے۔ جس کو ہدایت کی پرواہ ہی نہیں۔ بلکہ اُس کی مخالفت سے وہ تو صم بکم عمی فھم لا یعقلون کے زمرہ میں آتا ہے۔ اور اس کی ہدایت خدا نہیں کرتا۔ اگر ورثہ میں پاتے ہوئے تخیلات کو نظر انداز کر کے دیکھو گے تو خاندان رسولؐ کے علاوہ اور کہیں ہدایت نہ پاؤ گے۔ ہم نے اس کتاب میں اُن کی تعلیم پر اپنے بیان کو مبنی کیا ہے۔ دیکھو زندگی ہمیشہ نہیں رہتی۔ اگر ہزاروں نعمتیں بھی تم کو حاصل ہیں تو نتیجہ یہ ہی ہوگا کہ ایک دن یا وہ نعمتیں نہیں رہیں گی یا تم نہیں رہو گے دیکھو ایسا نہ ہو کہ بستر مرگ پر پشیمانی ہو۔ وہ پشیمانی بعد از وقت کی کچھ کام نہیں آئے گی۔

نکات برائے غور

شوخیٔ باطل نگر! اندر کمینِ حق نشست
شپرازکورے شبیخونے زند برآفتاب

فلسفہ کا دارومدار خود اپنے غور و فکر پر ہے۔ اور غور و فکر کا دارومدار عقلِ سلیم پر ہے۔ اور عقلِ سلیم ہر انسان کے اندر ہے۔ اگر اس پر خود غرضی و عصبیت کا غلاف نہ چڑھ جائے۔ سقراط کا طریقۂ تعلیم اس ہی اصول پر مبنی تھا۔ متواتر سوال و جواب سے مخاطب کو خود غور و فکر کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ اور پھر آخر کار اس کے منہ سے وہ ہی بات نکلوا لیتا تھا جو وہ تعلیم کرنا چاہتا تھا۔ ہم اپنے ناظرین کے غور و فکر کے لئے مندرجۂ ذیل نکات پیش کرتے ہیں۔ اگر ان پر عقلِ سلیم کے ساتھ غور کیا تو خود بخود راہِ مستقیم نظر آنے لگے گی۔ اس کے بعد اس کتاب کا مطالعہ ان کے لئے مشعلِ راہ کا کام دے گا۔

۱۔ ہستیٔ خداوند تعالےٰ

اپنے چاروں طرف نظر ڈالئے۔ نظامِ عالم پر غور کرنے سے انسان کس نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ اس نظام کا کوئی مدبر ہے یا نہیں؟

جس نظام کا کوئی مدبر نہ ہو وہ کبھی ایک راستہ پر نہیں چلے گا۔ لیکن اس نظام کے متعلق تو یہ ہے کہ لن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔ اگر ایسا نہیں ہے تو اس نظام کی کوئی کل تو بدل کر دکھاؤ۔ سورج مشرق سے نکلتا ہے۔ کبھی اس کو مغرب کی طرف سے بھی نکلتا ہوا دیکھا ہے؟

۲۔ توحید۔

توحید مطلق کے یہ معنی ہیں کہ صفات میں بھی خداوند تعالےٰ کا شریک کسی کو نہ سمجھے۔ انسان کو بھی غصہ آتا ہے۔ خوش ہوتا ہے۔ ناخوش ہوتا ہے۔ محبت کرتا ہے۔ نفرت کرتا ہے۔ عداوت کرتا ہے۔ لوگوں کو اپنا دشمن سمجھتا ہے۔ کسی کو اپنا دوست سمجھتا ہے۔ اس لئے جو اپنی زبان اور اس کے حروف و جملے بنائے ہیں محض اپنی ضروریات

کے لئے۔ جب خداوند تعالیٰ کے لئے خوشی، ناراضی، محبت، عداوت وغیرہ کی شانوں کو بیان کرتا ہے تو اس کو یہی الفاظ استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ انسان کی زبان محدود ہے۔ خداوند تعالیٰ کی شان وصفت لامحدود ہے۔ قرآن شریف انسان کی زبان میں ہے ہم خداوند تعالیٰ کی صفات میں شریک نہیں ہیں۔ لہذا اُس کی صفات ہماری محدود زبان ادا نہیں کرسکتی۔ ہمارے رنج، خوشی نفرت و محبت کا Physical Basis ہے یعنی ان کا ہمارے دماغ سے تعلق ہے جو جسمانی ہے۔ خداوند تعالیٰ کا کوئی جسم نہیں ہے۔ لہذا یہ صفات اُس میں اس طرح کے نہیں ہوسکتے جس طرح ہماری صفات ہیں۔ اس نکتہ کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہر ایک فلاسفر نے جب خدا کا تخیل کیا تو جسم کے ساتھ کیا۔ موجودہ بائبل لکھنے والے بھی اس نکتہ کو نہ پاسکے۔ انہوں نے بھی خدا کا تخیل جسم کے ساتھ کیا اور وہ مسلمان جو کہتے ہیں کہ خدا کے ہاتھ پاؤں جسم ہے قیامت میں خدا نظر آئے گا۔ جہنم کی آگ اس وقت ہی فرو ہوگی جب وہ اپنی ساق اس میں ڈال دے گا۔ وہ بھی اس نکتہ کو نہیں سمجھے اور قرآن شریف میں جو یہ صفات بوجہ محدودیت زبان ان ہی الفاظ سے ظاہر کی گئی ہیں ان کی وجہ سے ان کو یہ دھوکہ ہوگیا۔

۳۔ حیات بعد ممات۔ عاقبت۔

(الف) کیا انسان کی اس دنیا کی زندگی کامل ہے؟ کامل اس وقت کہی جائیگی کہ جب انسان کی ساری قوتیں اور جائز خواہشات اس کی زندگی میں بار آور ہوسکیں۔

(ب) دُنیا میں **موت** اور ظلم کی موجودگی کیا ظاہر کرتی ہے؟ موت اور ظلم سے جو انسان کو رنج پہنچتا ہے کیا اس کا مداوا اور اس کا بدلہ انسان کو اس دُنیا کی زندگی میں مل جاتا ہے؟ یا مل سکتا ہے؟

۴۔ نبوّت۔

اگر خدا ہے اور عاقبت معہ اپنی سزا وجزا، حساب وکتاب کے ہے تو عدل ضرور ہے اور اگر عدل ہے تو دُنیا کے طوفان و تلاطم انگیز امواج کو جن کو جہالت ہوا اُٹھا رہی ہے اور انسان کی کمزوری کو دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس کو خدا ہی کی طرف سے بھیجا ہوا اور علم کا نہ دیا ہوا انسان اس کی ہدایت کے لئے نہ آئے تو پھر حیاۃ بعد ممات اور عاقبت و سزا وجزا و حساب و میزان سب بے معنی اور غیر ضروری ہیں۔ اور اگر ہیں تو

منافیٔ عدل ہیں۔ ایسا شخص جو خدا کا پیغام لے کر آئے گا وہ ہی پیغمبر اور نبی ہے۔ اگر دُنیا میں محض فلسفہ ہوتا اور نبوّت نہ ہوتی تو چاروں طرف فتنہ و فساد ہی ہوتا۔ اوّل تو عوام الناس فلسفی عقل نہیں رکھتے اور جن معدودے چند افراد کے پاس یہ ہے بھی تو آج تک وہ سب کسی ایک نظریہ پر متفق نہیں ہوئے اور محض عقل انسان کے تمام افعال کی محرک نہیں ہوتی۔ ان کی عقل تو یہاں تک پہنچی ہے کہ

Good and Evil are nothing but pleasure and pain, or that which occasions or procures pleasure or pain to us,

Locke : Essay, Book II, Capt. XXVIII. See also

Rashdall The Theory of Good and Evil, Vol. I Chap. ii.

ترجمہ۔ خیر و شر کچھ نہیں سوائے راحت و رنج کے یا اُن اسباب کے جن سے راحت و تکلیف پہنچتے ہیں۔

معاملہ ختم ہوا۔ خود غرضی کو عام اجازت مل گئی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ حکما کی ایک جماعت نے اس نظریہ کی مخالفت کی ہے۔ لیکن اس نظریہ کے رکھنے والے بھی Locke, Hobbes اور Bentham جیسے جلیل القدر حکما ہیں۔ اس اختلاف سے بھی ہمارا مدعا ثابت ہو گیا یہ اختلاف ہی عوام الناس کے فتنہ و فساد کا باعث اور دلیل راہ بن جائے گا۔

۵۔ امامت

جب دُنیا کو ہر پہلو سے اور اس کی ہر تہذیب کے زمانے میں ڈرایا جا چکا تو نبوّت کو ختم کر دیا گیا۔ لیکن ہدایت بذریعۂ عمل کا سبق ان نظریات کے مطابق جو دُنیا قائم کر لی گئی ضروری تھا۔ اندریں صورت امامت کی ضرورت ہے یا نہیں؟

۶۔ ائمۃ الصدق و اولیاء الحق

دُنیا کچھ اس نہج پر بنائی گئی ہے کہ یہاں صدق و کذب ہمیشہ ساتھ ساتھ رہے ہیں۔ آدمؑ کے ساتھ شیطان، ہابیلؑ کے ساتھ قابیل، موسیٰؑ کے ساتھ فرعون، محمدؐ کے ساتھ ابوسفیان اور حسینؑ کے ساتھ یزید۔ انسان کا یہ فرض ہے کہ ان دونوں کو

علیحدہ کر کے رکھے، ایک کی پیروی اور دوسرے سے بیزاری اس کا فرضِ اوّلین ہے۔ ان دونوں کی شناخت کے لئے خداوند تعالےٰ نے انسان کو عقلِ سلیم سے مسلح کر دیا۔ اور پھر فرمایا کہ تواصوا بالحق وتواصوا بالصبر، اور فرمایا استعینوا بالصبر والصلاۃ۔ مندرجہ ذیل آیات میں خداوند تعالےٰ نے ائمہ حق و ائمہ تلبیس کی شناخت تفصیل سے بیان کر دی ہے۔

وَالَّذِينَ صَبَرُوا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَأَنفَقُوا
مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ سِرًّا وَعَلَانِيَةً وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ أُولَٰئِكَ لَهُمْ
عُقْبَى الدَّارِ ۝ جَنَّاتُ عَدْنٍ يَدْخُلُونَهَا وَمَن صَلَحَ مِنْ آبَائِهِمْ وَأَزْوَاجِهِمْ
وَذُرِّيَّاتِهِمْ ۖ وَالْمَلَائِكَةُ يَدْخُلُونَ عَلَيْهِم مِّن كُلِّ بَابٍ ۝ سَلَامٌ عَلَيْكُم بِمَا
صَبَرْتُمْ ۚ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ۝ وَالَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهْدَ اللَّهِ مِن بَعْدِ مِيثَاقِهِ
وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَن يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۙ أُولَٰئِكَ
لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوءُ الدَّارِ ۝ اللَّهُ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَن يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ۚ
وَفَرِحُوا بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا مَتَاعٌ ۝ الرعد ۱۳: ۲۲ تا ۲۶

ترجمہ - اور جن لوگوں نے اپنے پروردگار کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے صبر کیا اور نماز پڑھی اور جو کچھ ہم نے اُن کو دیا تھا اس میں سے چھپا کر اور ظاہر طور پر (راہ خدا میں) خرچ کیا اور بدی کا بدلہ نیکی سے کرتے رہے عاقبت کا گھر ان کے لئے ہے (یعنی) رہنے کے باغات جن میں خود وہ بھی ہمیشہ رہیں گے اور ان کے آباء و اجداد میں سے اور ازواج میں سے اور ان کی اولاد میں سے بھی جو جو اس قابل ہوں گے - اور فرشتے ہر دروازے میں سے ان کے پاس آیا کریں گے (اور یہ کہا کریں گے کہ) یہ عوض ہے تمہارے صبر کرنے کا، تم پر سلامتی ہو دیکھو (تمہارا) انجام کیسا اچھا ہوا - اور جو عہد خدا کو بعد اس کے پختہ ہو جانے کے توڑ ڈالتے ہیں اور جن (تعلقات باہمی) کے قائم رکھنے کا خدا نے حکم دیا ہے انہیں قطع کرتے ہیں اور روئے زمین پر فساد پھیلاتے پھرتے ہیں ایسے ہی لوگ ہیں جن کے لئے لعنت ہے اور ایسے ہی لوگوں کے واسطے برا گھر (جہنم) ہے اور خدا ہی جس کے لئے چاہتا ہے روزی کو بڑھا دیتا ہے اور (جس کے لئے چاہتا ہے) تنگ کرتا ہے اور یہ لوگ دنیا کی (چند روزہ) زندگی پر بہت نہال ہیں حالانکہ دنیاوی زندگی (نعیم) آخرت کے مقابلہ

میں بالکل بے حقیقت چیز ہے۔ (ختم ہوا ترجمہ)

اب ناظرین خود غور و خوض کرکے معلوم کریں گے کہ ہم حق کون ہوسکتے ہیں اور اولیاء الشیطان کون ہیں۔ صبر ہی بہت بڑا معیار حقیقت ہے۔ صبر سختی و بلا میں ہوتا ہے۔ مسندِ حکومت پر بیٹھ کر اپنے دشمنوں کو قتل کرکے خوشی حاصل کرنی اور بات ہے اور تلوار کے نیچے قید خانہ کی تاریکی اور طوق و رسن کی کشاکش میں جانشینِ رسولؐ کے فرائض ادا کرنا اور شے ہے۔ اقبال مرحوم نے ٹھیک کہا ہے ؎

رہ و رسم فرماں روایان شناسم

خراں بر سرِ بام و یوسف بچاہے

جنابِ رسولؐ خدا فرمایا کرتے تھے کہ اشد الناس بلاءً الانبیاء یعنی تمام انسانوں میں سب سے زیادہ شدت و مصائب و آلام سے انبیاء کا امتحان کیا جاتا ہے صحیح بخاری، صحیح مسلم، مسند احمد حنبل، سنن ابن ماجہ، ترمذی، مسند طیالسی، طبقات ابن سعد وغیرہ میں یہ حدیث پائی جاتی ہے۔ نتیجہ صاف ہے۔ انبیاء کے جانشین اوصیاء پر بھی انبیاء کے بعد سب سے زیادہ سختیاں اور مصائب نازل ہوں گے اور وہ صبر کریں گے یہی اُن کی شناخت ہے۔

باب اوّل

مغربی تہذیب۔ اس کے چند تصورات و اثرات

زمانۂ حال کی مغربی تہذیب و تعلیم جو مذہبیت اور روحانیت سے بالکل معرّا ہے تمام دنیا پر چھا گئی ہے اور ایشیا و افریقہ کی تمام کمزور قومیں اس کی محتاج ہیں اور کسی نہ کسی طرز میں مغربی طاقتور اقوام کے سامنے دستِ سوال دراز کئے ہوئے ہیں اور روس و یورپ کی رقابت کی وجہ سے یہ سوال احتیاج کچھ نہ کچھ مقرون باجابت بھی ہو رہا ہے۔ در اصل مغربی تہذیب کی ہمہ گیری کی وجہ اس کے تصورات و نظریات

کی صداقت و حقانیت نہیں ہے۔ بلکہ ایشیا اور افریقہ کی یہ مرعوبیت اور احتیاج
اُس کی تہ میں ہے۔ بظاہر دنیا دو حصّوں میں تقسیم ہوگئی ہے۔ ایک طرف تو روس
اور اُس کی چھوٹی چھوٹی مددگار قومیں اور دوسری طرف مغرب کی چار بڑی قومیں
جن میں سے ایک امریکہ ہے اور ان کے معاونین۔ کہنے کو تو کہا جاتا ہے کہ ہماری
Ideology میں فرق ہے۔ اپنے اصلی مقصد کو چھپانے کے لئے یہ ایک جدید لفظ
تراشا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ ہم آزادی کے شیدا ہیں، اور جو حصّہ دنیا ہمارے قبضہ میں ہے
وہ آزاد دنیا کہے جانے کے قابل ہے اور ہمارے مخالفین استبدادیت پسند ڈکٹیٹر
ہیں۔ یہ سب سیاسی ہتھکنڈے ہیں۔ ورنہ کل کی بات ہے کہ یہ سب شیر وشکر تھے۔
اُس وقت تو محض ہٹلر ڈکٹیٹر تھا اور باقی سب آزاد دنیا تھی۔ اب دوسرا پاسا پلٹ گیا لیکن
درحقیقت یہ دونوں بلاک ماہیت میں ایک ہی ہیں اور ایک بنیاد یعنی اقتصادیت پر قائم ہیں۔
روس کا کمیونزم بھی یورپ ہی کے اقتصادیت کی ایک شاخ ہے اور اُس کی جڑ یورپ
ہی میں ہے دونوں کا مقصد ایک ہی ہے یعنی دنیا پر قبضہ کرنا۔ یورپ نے اس
مقصد کے حاصل کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ عام دنیا کی دولت سمیٹ کر
اپنے گھر میں لے آئے اور پھر ایک طرز حکومت ایجاد کیا جو در اصل امراء کی حکومت
ہے یعنی Aristocracy بغیر لوگوں کے تو حکومت نہیں ہوسکتی لہٰذا لوگوں کو اپنی
طرف کرنے کے لئے انھوں نے اس کا نام جمہوریت یعنی Democracy رکھ لیا۔
اور کہا کہ یہ عوام الناس کی حکومت ہے اور اُصول مساوات پر قائم ہے۔ روس نے
نے بھی ماضی کی تاریخ کے مطالعہ سے یہ نتیجہ نکالا کہ حکومت بغیر عوام الناس کی مرضی
کے محض تلوار سے قائم نہیں رہ سکتی اور عوام الناس کو بغیر مساوات کے جال کے
اور کسی طرح نہیں پکڑا جا سکتا۔ اُن کو یہ جال اقتصادیت میں ملا۔ اُنھوں نے سوچا کہ
یہ مساوات ہم پیٹ کی طرف سے شروع کریں جس کے سب محتاج ہیں۔ مغرب نے
حکومتی مساوات کا جال بچھایا۔ اور کہا کہ حکومت میں سب مساوی ہیں سب کو
حصّہ ملنا چاہیئے۔ حکومت تو ہم ہی چند آدمی کریں گے۔ لیکن تم ہم کو اپنا نمائندہ بنادو
یا تصوّر کرلو۔ بس حکومت تمھاری ہوگئی۔ روس نے یہ نظریہ مشتہر کیا کہ سب لوگ
حصول رزق و راحت میں مساوی ہیں۔ بظاہر یہ طریقہ زیادہ موثر تھا اور ہم یہ کہتے

ہیں کہ مساوات نہ حکومت میں ہوئی اور نہ دولت میں۔ حکومت وہی کریں گے جو کر رہے ہیں اور عیش و راحت وہ ہی کریں گے جن کے پاس دولت ہے، افلاس اور دولت میں ابتدائی عالم سے کش مکش چلی آ رہی ہے۔ لاکھوں تدبیریں سوچیں۔ ہزاروں جتن کئے۔ حکومت و راحت ہمیشہ دولت ہی کے پاس رہی ہے، اور رہے گی۔ عوام الناس کو جس طرح جی چاہے احمق بنالو۔ خیر یہ جملہ معترضہ تھا۔

روس باہر سے دولت نہیں سمیٹ سکتا تھا کیونکہ ان راستوں پر پہلے ہی سے یورپ و امریکہ نے تجارت اور نوآبادیات کے ذریعہ سے قبضہ کر لیا تھا۔ جس وقت یورپ اس طرف مشغول تھا، روس کی شہنشاہیت اپنی وسعت ارض کی وجہ سے اپنے تئیں ان باتوں سے مستغنی سمجھتی تھی۔ لہذا مشرقی اصول کو زیر نظر رکھ کر کہ ۔ حاکم قہر خدا اُس نے اودھر سے چشم پوشی کرنا ہی اپنے لئے آسان اور مفید سمجھا۔ لیکن روس میں چند لوگ ایسے تھے جو دولت و حکومت کی طرف سے چشم پوشی نہیں کر سکتے تھے۔ کھسیانی بلی کھمبا نوچے پہلے تو شہنشاہیت کو نوچ کھسوٹ کے الگ کیا۔ نپولین سبق پڑھا چکا تھا کہ کوئی شے ناممکن نہیں لہذا انھوں نے دولت اپنے ہی اندر سے نکالنی شروع کی۔ اور حکمرانوں کی جماعت علیحدہ کر کے، اُن کی طرف ایک آہنی پردہ ڈال دیا۔ اور اپنی رعایا کو جو زیادہ تر مشرقی تھی اودھر نہ دیکھنے دیا کیونکہ ؎

رموزِ مملکت خویش خسرواں دانند گدائی گوشہ نشینی تو حافظا مخروش

اُن کی آنکھیں اور اُن کا مُنھ اس طرح بند کیا کہ گورنمنٹ کی طرف سے اُن کے لئے Empioyment یعنی کام کی مشغولیت پیدا کر دی۔ اور اپنا دست نگر اتنا بنا لیا کہ بغیر حکومت کے نظام کے وہ اس قسم کی Employments ہی نہیں حاصل کر سکتے جو سب کو مشغول رکھیں۔ یہ ہی بات یورپ و امریکہ نے رعایا کو باہر غیر ممالک میں نوآبادیات قائم کر کے حاصل کی تھی۔ اور اب الیکشن کی تیز روشنی سے اُن کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کر رہے ہیں۔ غرض روس و امریکہ و یورپ گویا تمام دنیا نے مل کر ایک اصول قائم کر لیا کہ اپنی رعایا کو اپنی حکومت پر نکتہ چینی کا موقعہ نہ دیں۔ اور اپنی تہذیب کو اقوام مشرق میں بھی ایسے ہی مساوات کے باغ دکھا کر پھیلایا۔ اتنا پھیلایا کہ شاعر مشرق بھی مغرب کی آواز کو اس لے میں دُھرانے لگا کہ ؎

۵ خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

لیجئے دنیا کو تو اپنے قبضہ میں کیا تھا آسمان پر بھی ایک جمہوریت قائم ہو گئی اور شہنشاہِ کائنات کو اُس کے عرش پر سے اُٹھا کر امریکہ کی مسندِ جمہوریت کا صدر بنا دیا۔ اور وہ ہی رعایا کی ظاہری رضامندی کا اصول قائم رکھا۔ یہ مغربی تہذیب کا اثر نہیں تو کیا ہے۔ حضرت شرف الدین بو علی شاہ قلندر تو کہیں کہ

می نہ گنجد بو علی ہرگز خدا اندر خودی تو ہمی خواہی پری در کعبہ باز اصنام را

لیکن حکیم امت نے خودی کو خدا کے مقابل میں لاکر کھڑا کر دیا۔ یہ صنم الاصنام یعنی خودی مغرب کا بچہ ان کے اسلام کا خدا بن گیا۔ اور بھولے بھالے مسلمان اس کو حکمتِ اسلام سمجھنے لگے۔ مغرب کے غلط فلسفہ کو سامنے رکھ کر حکمت اسلام سے موجودہ تاریکی کو دور کرنا اس کتاب کی وجہ ہست و بود ہے، جس کا نام حضرت اقبال نے خودی رکھا ہے اُس کو فلسفۂ یونان و یورپ نے عقل انسانی کہا ہے۔ دونوں نے انسان کو خدائی کا درجہ دیدیا۔ اور بے جا غرور اس کا باعث ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہماری عقل اتنی بلند ہے کہ ہم سب کچھ معلوم کر سکتے ہیں۔ ہمارے فلسفہ میں خدا کی ضرورت نہیں۔ ہماری خودی اتنی مجموعہ اسرار ہے کہ اس کو Develope کر کے ہم خدا کے مقابلہ میں کھڑے ہو سکتے ہیں۔ اور خدا کی تقدیروں کو اپنے احکام سے مرتب کر سکتے ہیں۔ چونکہ اپنے تئیں مسلمان کھلوانا ضروری تھا۔ لہٰذا خدا کا نام بھی آ گیا۔ ورنہ مطلب اس کا بھی یہ ہی ہے کہ ہمیں خدا کی ضرورت نہیں۔ اور اگر خدا ہے تو ہمارا ماتحت ہے۔ دیکھئے یہ وہ ہی ابلیسی تکبر ہے جس نے عزازیل کو خوار کیا تھا، اور اب وہ ہی ابلیس اپنی پورانی خودی پر اڑا ہوا ہے جس نے کہا تھا کہ قَالَ رَبِّ بِمَا اَغْوَيْتَنِي لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۳۹﴾ اِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۴۰﴾ قَالَ هٰذَا صِرَاطٌ عَلَيَّ مُسْتَقِيْمٌ ﴿۴۱﴾ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطَانٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغَاوِيْنَ ﴿۴۲﴾ ۱۵: ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲۔

ترجمہ:۔ کہا اے میرے پروردگار چونکہ تو نے مجھے راستہ سے الگ کیا میں بھی ان کے لئے دنیا میں سازو سامان کو انکی آنکھوں میں زینت دوں گا اور ان سب کو بہکاؤں گا

مگر اُن میں سے تیرے خالص بندے (کہ وہ میرے بہکانے میں نہیں آئیں گے) خدا نے فرمایا کہ یہی راہ سیدھی ہے کہ مجھ تک (پہنچتی) ہے۔ جو میرے مخلص بندے ہیں ان پر تجھے کسی طرح کی حکومت نہ ہوگی۔ مگر ہاں گمراہوں میں سے جو تیری پیروی کرے (اس پر تیرا زور چل جائے گا)

ان آیات سے یہ امور ظاہر ہوئے۔

(۱) کبر خصلتِ ابلیسی ہے۔

(۲) دنیا کی زینت میں پھنس جانا شیطان کی پیروی کا نتیجہ ہے۔

(۳) ان آیات سے فقہ اسلام کا ایک مسئلہ حل ہوتا ہے۔ شیطان خود اپنی مرضی سے ہر ایک فعل کا مرتکب ہوا۔ سجدۂ آدم نہ کرنا اُس کا اپنا فعل تھا۔ آدم و حوّا کو ورغلا کر جنّت سے نکلنے کا باعث بننا اُس کی آزاد خودی کا عمل تھا۔ لیکن پھر کہتا ہے کہ اے خدا تو نے مجھے صراطِ مستقیم سے علیحدہ کر دیا۔ اپنے فعل کو خدا کے سر تھوپتا ہے۔ اس ہی شیطان کی تاسّی میں ایک فرقہ مسلمانوں کا ایسا ہے جو کہتا ہے کہ انسان مجبورِ محض ہے جو وہ کرتا ہے خدا کے حکم سے ہوتا ہے۔ گویا خدا ہی کرتا ہے۔ جماعتِ جبریہ کا فلسفہ ابلیس کی تقلید میں مرتب ہوا ہے۔

اس کتاب میں اُن ہی خدا کے مخلص بندوں کی تاویلِ قرآن و تشریحِ فقۂ اسلام کا ذکر ہے جو دنیا کی زینتوں کی طرف نہیں گئے اور اس طرح شیطان کے بہکانے میں نہیں آئے۔

جنابِ امیر علیہ السّلام اپنے ایک خطبہ میں فرماتے ہیں:-

اَیُّهَا النَّاسُ اِنَّهٗ مَنِ اسْتَنْصَحَ اللّٰهَ وُفِّقَ، وَمَنِ اتَّخَذَ قَوْلَهٗ دَلِیْلًا هُدِیَ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ فَاِنَّ جَارَ اللّٰهِ آمِنٌ، وَعَدُوَّ اللّٰهِ خَائِفٌ، وَاِنَّهٗ لَا یَنْبَغِیْ لِمَنْ عَرَفَ عَظَمَةَ اللّٰهِ اَنْ یَتَعَظَّمَ فَاِنَّ رِفْعَةَ الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ مَا عَظَمَتُهٗ اَنْ یَتَوَاضَعُوْا لَهٗ، وَسَلَامَةَ الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ مَا قُدْرَتُهٗ اَنْ یَسْتَسْلِمُوْا لَهٗ۔ فَلَا تَنْفِرُوْا مِنَ الْحَقِّ نِفَارَ الصَّحِیْحِ مِنَ الْاَجْرَبِ، وَالْبَارِیْ مِنْ ذِی السَّقَمِ وَاعْلَمُوْا اَنَّكُمْ لَنْ تَعْرِفُوا الرُّشْدَ حَتّٰی تَعْرِفُوا الَّذِیْ تَرَكَهٗ، وَلَنْ تَاْخُذُوْا بِمِیْثَاقِ الْكِتَابِ

حَتّٰی تَعْرِفُوا الَّذِیْ نَقَضَہُ، وَلَنْ تَمَسَّکُوْا بِہٖ حَتّٰی تَعْرِفُوا الَّذِیْ نَبَذَہٗ، فَالْتَمِسُوْا ذَالِکَ مِنْ عِنْدِ اَھْلِہٖ فَاِنَّھُمْ عَیْشُ الْعِلْمِ، وَمَوْتُ الْجَھْلِ: ھُمُ الَّذِیْنَ یُخْبِرُکُمْ حُکْمُھُمْ عَنْ عِلْمِھِمْ، وَصَمْتُھُمْ عَنْ مَنْطِقِھِمْ وَظَاھِرُھُمْ عَنْ بَاطِنِھِمْ: لَایُخَالِفُوْنَ الدِّیْنَ، وَلَا یَخْتَلِفُوْنَ فِیْہِ، فَھُوَ بَیْنَھُمْ شَاھِدٌ صَادِقٌ وَصَامِتٌ نَاطِقٌ۔ (نہج البلاغہ الجزء الثانی ص ۴۲: ۴۳)

ترجمہ:- اے لوگو! جس نے خداوند تعالیٰ سے نصیحت چاہی اسے نصیحت دی گئی جس نے کلام الٰہی کو اپنا رہنما بنایا اس کی استوار ترین راستہ کی طرف ہدایت کی گئی، کیونکہ جو خدا سے آشنا ہو وہ ایمن و آسودہ رہتا ہے اور اس کا دشمن ہراساں اور ترساں رہتا ہے۔ جو خدا کی عظمت کا شناسا ہے اس کے لئے تکبر و پندار زیبا نہیں۔ ان لوگوں کی رفعت جو خدا کی عظمت سے واقف ہیں یہ ہے کہ وہ اس کے آگے خضوع و خشوع کریں۔ اور ان لوگوں کی سلامتی جو خدا کی قدرت سے آشنا ہیں، اس میں ہے کہ اس کی اطاعت کریں۔ پس حق سے راہِ فرار اختیار نہ کرو جس طرح خارش زدہ اونٹنی سے تندرست اور مریض سے مرد صحیح و سالم بھاگتا ہے۔ تم ہدایت سے آشنا نہیں ہو سکتے جب تک اسے نہ پہچان لو جس نے ہدایت کو چھوڑ دیا ہے۔ اور کتاب الٰہی کے عہد پر استوار نہیں رہ سکتے جب تک اسے نہ پہچان لو جس نے اس کو توڑ دیا ہے۔ اور اس (کتاب الٰہی) سے تمسک نہیں کر سکتے۔ جب تک اس کو نہ معلوم کر لو کہ جس نے اس کو چھوڑ دیا ہے۔ تم یہ باتیں ان سے ہی حاصل کر سکتے ہو جن سے علم زندہ ہے اور جو جہل کی موت ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے احکام تم کو ان کے علم و دانش سے آگاہ کرتے ہیں، ان کی خاموشی ان کی نیکوئی گفتار سے اور ان کا ظاہر ان کے باطن سے آگاہ کرتا ہے۔ وہ مخالف دین نہیں ہیں اور ان کے احکام دین میں ایک دوسرے سے اختلاف نہیں ہے، پس دین ان کے درمیان ایک دوسرے کا گواہ اور خاموش گویا ہے۔ (ترجمہ ختم ہوا)

جناب امیر علیہ السلام کے خطبہ کا یہ ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے۔ اس میں جناب امیر نے نہایت اہم مسائل کو بہت عمدگی سے سمجھایا ہے۔ فلسفہ کا یہ نہایت اہم مسئلہ ہے کہ دنیا میں بدی کیوں ہے۔ آپ نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ طبیعت انسانی کی افتاد کے مطابق شر کی موجودگی خیر کی معرفت کے لئے ضروری ہے۔

ہدایت کا دینے والا تو خدا ہے۔ لیکن ہدایت اس کو ملتی ہے جو ہدایت کا متمنی

ہوتا ہے اور اس کے لئے ہر وقت تیار رہتا ہے۔

اس بات کی پہچان کہ کون شخص خداوند تعالیٰ کی عظمت و قدرت کی معرفت رکھتا ہے یہ ہے کہ وہ خدا کے آگے فروتنی اور خضوع وخشوع کرے اور اُس کے احکام کی اطاعت کرے۔

حق سے کبھی گریز نہ کرنا چاہئے۔

تم کو رشد وہدایت اُس وقت ہی اچھی حاصل ہو سکتی ہے جب تم آئمہ تلبیس کو آئمہ حق سے شناخت کر سکو۔ بڑے حکام اور بڑے آئمہ کے تجربہ سے تم کو معلوم ہو جائے گا کہ آئمہ حق کون ہیں۔ آئمہ حق کی صفات بھی بیان فرمائی ہیں۔ اور ارشاد فرمایا ہے کہ علم وہدایت ہمیشہ آئمہ حق سے تلاش کیا کرو۔

آئمہ حق کی خاموشی اور گفتار اور ان کے کردار واحکام ہی سے تم شناخت کر لوگے کہ وہ آئمہ حق ہیں اور صاحبان علم وہدایت ہیں۔

ہم مغربی تہذیب کا ذکر کر رہے تھے۔ اس مغربی تہذیب نے اپنے علٰحدہ خدا مقرر کر لئے ہیں۔ کچھ تو زبان سے اور کچھ اپنے عمل سے جو قول سے زیادہ واضح ہے یہ لوگ اچھی طرح ظاہر کر رہے ہیں کہ اُن کا اعتقاد نہ تو خدا پر ہے اور نہ عاقبت کی زندگی پر۔ نشر وحشر و میزان عدل ان لوگوں کے نزدیک موہوم تخیلات ہیں جو محض دل بہلانے کے لئے اختراع کئے گئے ہیں۔ مغربی تہذیب کا یہ اثر مسلمانوں پر بہت ہے بلکہ آج کل کے مسلمان انکار بالعمل والی جماعت کے نہایت بااثر اور ممتاز ممبر ہیں۔ اسلام کو قومیت کے ڈھانچہ میں ڈھال کر اُس سے وہ ہی کام لے رہے ہیں، جو دوسرے ملک ومذہب والے اپنے تئیں ایک ممیز قوم قرار دے کر قوم کے نام پر اپنی سیاست کو رواں کر رہے ہیں۔ دنیاوی ثروت ووجاہت نے ہمیشہ مسلمانوں کو اپنی طرف راغب ومشغول رکھا ہے۔ اور اب تو مغربی سند بھی حاصل ہو گئی ہے، مذہب سے انکار مغربی تہذیب کا مابہ الامتیاز ہے۔ اور مسلمانوں نے اس کو ترقی کی علامت سمجھ کر اس کو اپنا فیشن بنالیا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ جب سے انسان نے دنیا میں ہوش سنبھالا ہے اُس وقت سے دنیا کی اکثریت پر دولت کی حکومت رہی ہے اور بعض وقت وہ حکومت خدائی کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے۔

ایسے زمانے دنیا پر آتے رہے ہیں۔ اُن سب میں موجودہ زمانہ دولت کی خدائی کا ہے اور بہت سخت ہے۔ کیونکہ ازمنہ ماضیہ کے تجربوں سے دولت کے بندے بھی فائدہ اُٹھاتے رہے ہیں۔ اور اب دنیا کے لوگوں کو بیوقوف بنا کر اپنا کام نکالنے میں بہت زیادہ تجربہ کار ہوگئے ہیں۔

مغربی تہذیب کے پانچ ارکان ہیں۔ اور وہ ہی اپنے اثرات کے ساتھ دنیا پر حکومت کر رہے ہیں۔ مغرب میں یہ ارکان اپنا عمل پندرھویں صدی عیسوی سے کر رہے ہیں۔ اور یہ وہ ہیں جنھوں نے انسان کے اخلاق و عادات کو اتنا گرا دیا ہے۔ کہ جہاں تک اخلاق کا تعلق ہے انسان میں اور جنگل کے وحشی جانور میں کچھ فرق نظر نہیں آتا۔ اگر فرق ہے تو ریاکاری اور کذب کا ہے۔ جانور اپنے عمل میں سادگی کے ساتھ سچے ہوتے ہیں۔ انسان کا بھی عمل وہ ہی ہے لیکن کذب کے ملمع کے نیچے۔ صرف ایک خودغرضی کو لو۔ کیا آج کل کا انسان خودغرضی میں کسی وحشی جانور سے کم ہے۔ خال خال مستثنیات کا ذکر نہیں۔ چونکہ مستثنیات ہی لہذا قاعدہ کلیہ کو اچھی طرح ثابت کرتی ہیں۔ مغربی تہذیب کے وہ ارکان جنھوں نے یہ صورت حالت پیدا کر دی ہے پانچ ہیں۔ (۱) تجارت کی رقابت اور نوآبادیات کے لئے دوڑ دھوپ۔ (۲) قومیت و وطنیت۔ (۳) انڈسٹریلزم۔ (۴) جمہوریت اور (۵) ابتدائی تعلیم جس نے اُن چاروں کے مددگار پیدا کر دئے ہیں۔ اب ہم ہر ایک کا علیٰحدہ علیٰحدہ ذکر کرتے ہیں۔

۱- تجارت:- اگر تجارت صحیح اصول پر کی جائے جس میں کچھ اپنا فائدہ بھی ہو اور خلق خدا کا بھی فائدہ مدنظر ہو تو وہ بڑی اچھی چیز ہے۔ فضل الٰہی ہے۔ انسان کی ضروریات زندگی مہیا ہوتی ہیں۔ تہذیب اور حسن اخلاق کے خیالات اور طریقے تجارت کے قافلوں کے ساتھ چلتے ہیں اور وحشی اقوام کو بلند سطح پر لے جانے میں مدد دیتے ہیں۔ لیکن زمانہ حال کی تجارت جو محض عذاب الٰہی ہے خلق خدا کے لئے۔ معصیت کے راستوں پر چلنے کے ذرائع اور سہولتیں پیدا کرتی ہے۔ جس طرح اچھے زمانوں میں حکمت اور خیر تجارتی قافلوں کے ہمراہ ایک ملک سے دوسرے ملک میں سفر کرتی تھیں اسی

بدیاں پھیلتی ہیں۔ موجودہ زمانے کی تجارت بعینہٖ اُن اصول کے مطابق اور اُن اغراض کے ماتحت ہو رہی ہے، جن طریقوں سے اور جن مقاصد کے لئے دنیا کی تجارت کے بانی اہل فینقیا تجارت کرتے تھے۔ یہ وہ ہی سبق ہے جو زمانۂ حال کے تجار دُھرا رہے ہیں۔ وہ تجارت کیسی تھی ایک یوروپین مورّخ کی زبانی سُنئے۔

Like all early voyagers, and some old languages, they (Phoenicians) made scant distinction between trade and treachery, commerce and robbery, they stole from the weak, cheated the stupid, and were honest with the rest ے۵

ترجمہ:۔ مثل ازمنہ ماضیہ کے دیگر جہاز رانوں (تاجروں) کے اور چند پورانی زبانوں کی لغت کے اہل فینقیا نے تجارت اور دھوکہ دہی اور تجارت اور ڈاکہ زنی میں کوئی فرق نہیں رکھا تھا۔ وہ کمزور سے مال چرا لیتے تھے اور احمق کو دھوکہ دیکر مال لیتے تھے۔ اور باقیوں سے ایماندار تھے۔

یہ زمانۂ حال کا ترقی یافتہ مورخ نہ ہوتا اگر اپنی قوم کے بھی عیوب اسی طرح ظاہر کر دیتا وہ کہہ سکتا تھا اگر چاہتا کہ زمانہ حال کے یوروپین تجارت باز بھی ایسے ہی ہیں۔ اگرچہ اُس نے نہیں کہا لیکن جو شخص زمانہ حال کی تجارت سے ذرا سا بھی واقف ہے وہ آج کل کے تاجروں کو اہل فینقیا کا خلف رشید سمجھے گا۔ بالکل اس ہی نمونہ پر تجارت چل رہی ہے اور اگر ان کی نوآبادیات کے حصول کی تاریخ کو غور سے پڑھا جائے تو یہ اپنے اُن آباو اجداد سے بھی بڑھ گئے ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ یہ اُس کتاب میں تحریر ہے جو یورپ کی مشرقی وراثت کو بیان کر رہی ہے۔ یہ تجارت بھی اُنھوں نے اس ہی ورثہ میں پائی ہے۔ آگے چل کر مورخ کہتا ہے کہ یہ ہی حال اس زمانہ کے ہر قوم کے تاجروں کا تھا۔

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جو پہلے زمانہ میں ہو چکا ہے وہ ہی اب بھی ہو رہا ہے وہ ہی انسان ہے اور وہ ہی اُس کی فطرت اور وہ ہی اُس کے واقعات۔ آج کل

ے۵ Will Durant, Our Oriental Heritage, P. 293.

صرف اون پر ایک ملمع چڑھا دیا گیا ہے پہلے انسانوں ہی کے جذبات، احساسات، خواہشات موجودہ زمانہ کے انسانوں میں جاری و ساری ہیں۔

جب تجارت کے یہ اصول اور اُن کے "ناجائز فوائد عام ہو گئے تو معاشرت اور معیشت کے اصول و قواعد بھی اُس ہی نمونہ پر ڈھال لیئے گئے۔ اور ہر چیز، ہر صفت، ہر خصلت کی قدر و قیمت روپیہ کی صورت میں تبدیل کردی گئی۔ مثال کے طور پر دیکھئے پہلے زمانہ میں جب یہ تجارتی اصول عام نہیں تھے تو وکالت، طبابت اور تعلیم کی فیس نہیں لی جاتی تھی۔ تعلیم کی فیس سب سے پہلے سوفسطائی فلاسفروں نے لینی شروع کی لیکن لوگ اُن کے اس فعل کو بہت بُرا سمجھتے تھے۔ اُس زمانہ میں یہ ہی نہیں کہ تعلیم کی فیس نہیں لیتے تھے بلکہ غریب طلباء کو گر دیا استاد اپنے پاس گھر میں رکھ کر اُس کی خوراک و پوشاک مہیا کرتے تھے لیکن جب بنی نوع انسان نے "ترقی" کی تو اب اس ترقی یافتہ زمانہ میں ان تینوں پیشوں میں بلیک مارکٹ ہو رہی ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہر قسم کے دھوکے اور چالاکی کے ذریعہ سے لوگوں سے روپیہ لیا جاتا ہے ان میں نہ اب اخلاق کا اثر ہے اور نہ مذہب کا۔ صرف تجارتی اصول پر مدرسے اور مطب چلائے جا رہے ہیں اور وکالت کی تو کچھ پوچھو ہی نہیں۔ عدالتیں وکیلوں کے بغیر تو بات نہیں سنتیں اور وکیل اگر فیس ہی زیادہ لے لیں تو غنیمت ہے۔ نہیں۔ موکل سے ہر بہانہ سے روپیہ نوچا جاتا ہے۔ اور پھر اتنا عالمانہ مشورہ دیا جاتا ہے اور قانونی تدابیر بتائی جاتی ہیں کہ جو شخص ایک دفعہ اس قانونی بھنور میں پڑ گیا پھر تو جب تک ساری جائداد اور اساسہ فروخت نہ ہو جائے اُس کا چھٹکارا مشکل ہے۔ تعلیم اتنی مہنگی ہو گئی کہ عام ایمان دار آدمی کے بس کی نہیں رہی لیکن بچّوں کو تعلیم دینا ضروری ہے۔ لہٰذا والدین بھی ہر جائز اور ناجائز طریقہ سے روپیہ گھسیٹنا اپنی زندگی کا جزوِ اعظم سمجھتے ہیں۔

سکولوں کے کتب درسی اور اُن کے نصاب میں جس سرعت کے ساتھ تبدیلی ہوتی ہے اُس کی غرض یہ نہیں ہوتی کہ کوئی نیا اصول تعلیم ایجاد ہو گیا ہے جس کے وجہ سے نصاب اور کتابوں کی تبدیلی کی ضرورت ہوئی بلکہ دیگر اغراض اس میں شامل ہوتی ہیں۔ پبلشرز کو بھی فائدہ پہنچانا ضروری ہے۔ مولفین بھی بے چین ہیں۔ نئے

آدمیوں کو دریائے منافع میں غوطہ لگانے کے لئے موقع بہم پہنچائے جاتے ہیں۔ اور ان سے بہت سے رہنمایان قوم کا فائدہ ہوتا ہے۔ پھر کبھی اگر موڈرن اصول کے مطابق دستور اسلامی مانگنا ضروری سمجھا جاتا ہے تو یہ گروہ استاد ان ہاتھوں میں جھنڈیاں اپنے طلبہ کو پیچھے لئے ہوئے کوچہ و بازار میں یہ کہتے ہوئے گردش کرتے نظر آتے ہیں کہ ہم دستور اسلامی لئے بغیر نہیں مانیں گے۔ ورنہ بھوک ہڑتال کر دیں گے۔ وہ دستور اسلامی کیسا ہوگا جس کے چاہنے والے ایسے ہیں۔ ڈاکٹروں کی حالت تحریر کرنے کے لئے تو اکبر الہ آبادی یا نظیر اکبر آبادی کا قلم چاہیئے۔ غرض قصہ مختصر ہر ایک تحریک تجارت کے بلیک مارکٹ کے اصول پر چل رہی ہے۔ اور انسان کی زندگی کا واحد مقصد روپیہ جمع کرنا ہوگیا ہے۔ دراصل تجارت نے روپیہ کو خدائی مسند پر بٹھا دیا ہے۔

قومیت اور وطینت:- یہ بھی اہل یورپ کا تحفہ ہے اور مغربی تہذیب کا مایہ الامتیاز۔ لیکن خود اُن کے مذہب مسیحیت کے خلاف ہے۔ دنیا کے امن وچین کے منافی ہے۔ اور دنیا کی عالمگیر جنگوں کا باعث ہے۔ یہ یاد رکھیئے کہ دنیا میں جتنی خرابیاں، بدنظمیاں اور ظلم پھیلے ہوئے ہیں اُن کا سبب اوّلین حکومت ہے۔ بلکہ یوں کہو کہ حکومت کی خود غرضی ان کا سبب ہے۔ اور اس میں کچھ مذہب کے رئیس یعنی پوپ کی بھی غلطی ہے۔ اُس نے تمام ممالک یورپ میں اپنے مذہب کی بنا پر اتنا تسلط وغلبہ حاصل کرلیا کہ بادشاہوں کو تخت سے اُتارنا، تخت پر بٹھانا، ان کی رعایا کو اُن کے خلاف کرنا، جس بادشاہ سے ناراض ہو اُس کا ناک میں دم کرنا اُس کے فرائض روزانہ میں داخل ہوگیا۔ فطرتاً بادشاہوں کو برا لگا اونھوں نے وطینت اور قومیت کے جذبات کو جو پہلے ہی موجود تھے اتنا بھڑکایا کہ بجائے ایک عیسائی قوم ہونے کے ملکی حدود سے قومیں بن گئیں اور حُبِّ وطن کا جذبہ حُبِّ مذہب پر غالب آگیا۔ پھر تجارت کی رقابت نے اس جلتی ہوئی ہوئی آگ پر تیل ڈالا۔ اس درمیان ہی میں وہ مذہبی اصلاح شروع ہوگئی جس کا نام Reformation ہے۔ یہ تحریک شروع تو نہایت اچھے جذبہ سے ہوئی تھی۔

عیسائی چرچیں تو بہت عرصہ سے بتوں کی پناہ گاہ بن چکی تھیں اور اُن میں پرستش ہوتی تھی۔ مقابلہ سے برائی بہت جلدی آنکھوں کے سامنے آجاتی ہے۔ صلیبی لڑائیوں میں جب ان عیسائیوں کو اسلام اور اسلام کے اصول سے واقفیت ہوئی تو اپنی بُت پرستی پر بہت شرمائے اور اپنے بے خدائی کے اصولوں سے کترانے لگے۔ یہ تھی اس اصلاح مذہبی کی بنا۔ لیکن بہت جلد اُس نے مسیحی دنیا میں قومیت و وطنیت کے ساتھ مل کر ایک تقسیم و تفریق عظیم پیدا کر دی۔ نپولین نے جب بادشاہوں کو شکستوں پر شکستیں دینی شروع کیں تو پھر ان بادشاہوں کو اس ہی حب وطن و قوم سے مدد لینی پڑی۔ اب یہ حد ہوگئی ہے کہ اگرچہ سب عیسائی ہیں لیکن قومیں آپس میں ایک دوسرے کی جانی دشمن بن گئی ہیں۔ غلام قوموں کو تو آقا کی ہر ایک چیز اچھی معلوم ہوتی ہے اور تمام دنیا آج کل مغربی تہذیب کی غلام ہے۔ لہٰذا اور تو اور مسلمانوں نے بھی اس قومیت کے بُت کو اپنا بنا لیا۔ اور اب اسلام جیسے عالمگیر مذہب کو ایک قوم تصور کر کے اُس پر تمام وہ اصول حاوی کر دیئے جو قوموں میں رائج ہوتے ہیں جس کے نتائج کو حالی مرحوم ان اشعار میں بیان کرتے ہیں۔

جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے — اس دین میں خود تفرقہ اب آکے پڑا ہے
جس دین نے غیروں کے تھے دل آکے ملائے — اس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جدا ہے
جو دین کہ ہمدردِ بنی نوعِ بشر تھا — اب جنگ و جدل چار طرف اس میں بپا ہے

اس کی وجہ کیا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ بجائے اقوام کے تفرقوں کے مٹانے کے دنیاوی وجاہت و ثروت و دولت کے زیر اثر آن کر ان لوگوں نے جو اپنے تئیں کارکنان اسلام کہتے ہیں اسلام کو مذہب کی مسند سے اٹھا کر قومیت کی کرسی پر بٹھا دیا ہے۔

قصہ مختصر یہ کہ مغربی تہذیب میں قومیت اور وطنیت سے مل کر تجارت کا مقصد اور مضبوط ہوگیا۔ وہ مقصد کیا تھا؟ دولت و ثروت پیدا کرنا۔

مغربی تہذیب کا نظامِ اقتصادیات۔ انڈسٹریلزم:۔ لیکن ابھی دولت کو خدائی مسند پر

پہنچنے کے لئے مزید مدد کی ضرورت تھی۔ وہ انڈسٹریلزم اور جمہوریت کی طرف سے ملی۔ سب سے پہلے انڈسٹریلزم انگلستان میں رونما ہوا۔ وہ ملک اُس کی جائے پیدائش ہے۔ وہاں کے شاعر گولڈسمتھ (1774-1728) Goldsmith کے زمانہ میں اس کے بُرے اثرات بہت اچھی طرح ظاہر ہوئے۔ اگرچہ اُس وقت ابتداء تھی۔ چنانچہ اُس شاعر نے اپنی مثنوی قریۂ مصیبت رسیدہ (Deserted Village) میں گانوں اور زراعت کی تباہی اور اخلاقیات کے تنزل کا ذکر نہایت وضاحت سے کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ یہ سب کچھ Industrialism کا نتیجہ ہے جس نے انگلستان کی پُرامن و پُرسکون زندگی کو تلاطم انگیز ہوا و ہوس سے بدلنا شروع کر دیا ہے۔ لیکن براعظم یورپ میں اس کے بُرے اثرات ۱۸۷۵ء سے بہت زیادہ نمایاں ہونے لگے۔ انسانیت اور اخلاقیات کو دولت پر قربان کرنا انڈسٹریلزم کا پہلا گر ہے۔ اس کے نزدیک انسان بھی ایک ایسی ہی مشین ہوگیا جیسی مشینوں سے انڈسٹریلزم نے دولت جمع کرنی شروع کر دی تھی۔ جمہوریت کے ساتھ مل کر انڈسٹریلزم نے وہ غرور پندار سے بھری ہوئی Individualism پیدا کی جس نے اپنے قیاس کے ذریعہ سے جس کو اُس نے مقیاس الحق تصور کر لیا مذہب کو انسانی زندگی سے خارج کر کے دولت و ثروت کو اُس کی جگہ بٹھا دیا۔ اس کو مدد اُس Nationalistic Patriotism سے ملی جس کو مغربی تہذیب میں ایک تقدس کا درجہ حاصل ہوگیا۔ کیونکہ بغیر اس تخیل کے حکمرانوں کو اپنی استبدادیت میں تقویت نہ حاصل ہوتی۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ کمیونزم محض یورپ کے نظام اقتصادیات کا نتیجہ ہے اگرچہ اب روس نے اس کو خاص اپنا بنا لیا ہے۔ کمیونزم آخری منطقی نتیجہ ہے یورپ کی اقتصادیات کے ان ہی نظریات کا جو مغربی تہذیب میں کارفرما ہیں اور یہ ہی وجہ ہے کہ بھارت اور پاکستان میں کمیونزم اتنی سرعت اور طاقت کے ساتھ ترقی کر رہا ہے۔ مغربی تہذیب نے اپنے نظریات کی اشاعت سے ان دونوں ممالک میں، بلکہ جہاں جہاں مغربی تہذیب کی پیروی

ہوئی کمیونزم کے لئے زمین صاف کردی۔ ان کے نظریاتِ جمہوریت نے بیجا انڈسٹریلزم پیدا کیا اور انڈسٹریلزم نے غربا کو امراء کا اس قدر دست نگر بنا دیا کہ امراء کے جذبات خود غرضی و نفسانیت اور پندار بہت نمایاں ہو گئے۔ غرباء کی زندگی ناقابل برداشت ہو گئی۔ اور غربا اور امراء کے درمیان ایک ایسی حد فاصل قائم ہو گئی جس نے دونوں کا باہمی اتحاد ناممکن بنا دیا۔ اس ہی کشمکش کا ردِّ عمل کمیونزم ہے۔ یورپ اور انگلستان کے سیاسی اور اقتصادی ماہرین نے یہ نہ خیال کیا کہ ان کے نظریات کا آخری نتیجہ کمیونزم ہو سکتا ہے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ کمیونزم نے تو اپنے ممالک میں سے مذہب کے خدا کو ہٹا کر خدا کی جگہ خود لے لی ہے اور اپنی پرستش کرانی شروع کر دی ہے۔ اور اپنے پرستاروں کی ایک علیحدہ جماعت بنا کر جس کو آج کل کی سیاسی زبان میں بلاک (BLOC) کہتے ہیں۔ ہمارے اقتدار پر ساری دنیا میں حملہ شروع کر دیا ہے تو گھبرا کر اسے ایک فتنہ کہنے لگے۔ لیکن یہاں ایک عجیب مخمصہ میں پھنس گئے۔ کس کو خدا بنا کر اس کی آڑ میں اس فتنہ کا مقابلہ کریں۔ کیونکہ بغیر ایک خدا مقرر کئے ہوئے جماعت نہیں بن سکتی۔ آج کل کی سیاسی زبان میں اس فقرہ کو یوں ادا کر سکتے ہیں کہ کون سی نئی Ideology قائم کر کے کمیونزم کا مقابلہ کریں۔ قومیت اور وطنیت تو ہمارے اور اہل روس کے مشترک خدا ہیں۔ مذہب کو پہلے ہی سے بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ بلکہ اب تو اپنے تئیں اہلِ مذہب کہتے ہوئے بھی شرم آتی ہے۔ جب کوئی نیا خدا نہ ملا یا نئی Ideology نہیں ملی تو کہنے لگے کہ ہم آزاد ہیں اور اہل روس غلام ہیں۔ اب انھوں نے ایک تخصیص پیدا کر لی دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اپنی دنیا کا نام Free world یعنی آزاد دنیا رکھا اور روس والی دنیا کا نام اس کے برعکس غیر آزاد دنیا رکھا، مطلب یہ ہے کہ چونکہ ہمارے یہاں جمہوریت ہے لہٰذا ہم آزاد ہیں اور روس میں ڈکٹیٹر شپ ہے۔ لہٰذا وہ آزاد نہیں ہے۔ غلام ہے۔ لیکن گھبراہٹ میں یہ یاد رکھنا مناسب نہ سمجھا کہ کل کی بات ہے جب ہٹلر کے ساتھ موت اور زندگی کی لڑائی ہو رہی تھی تو اس روس کو، اس ہی کمیونزم کے ملجا و ماوا کو آزاد ڈیموکریٹک

ملک کہہ رہے تھے اور یہ اُس وقت کی بات ہے کہ جب سٹالن جیسا ڈکٹیٹر اُس مُلک کا حکمراں تھا۔ اور جب اُس کی مدد سے لڑائی فتح ہوگئی تو وہ ہی روس اور وہ ہی سٹالن ڈکٹیٹر شپ کی وجہ سے موجبِ نفرت قرار دیئے جانے لگے۔ اس کا جواب روس و سٹالن کے پاس صاف تھا۔ ہم بھی جمہوریت پسند ہیں۔ اور یہ ہمارا ملک بھی جمہوریت کے اُصول کا پابند ہے۔ صرف قسم یا طرزِ جمہوریت میں فرق ہے۔ اب گویا دونوں دنیاؤں کا خدا ایک ہو گیا۔ یعنی جمہوریت۔ لیکن یہ چھوٹا خدا رہا۔ بڑا خدا تو وہ ہی دولت ہے۔ اب ہم ذرا اس نائبِ خدائی مغرب یعنی جمہوریت پر نظر ڈالتے ہیں۔

جمہوریت :- مغربی تہذیب نے جس کو جمہوریت کا جامہ پہنا کر خدائی کی مسند پر بٹھا رکھا ہے اور ساری دنیا اُس کی پرستش میں مشغول ہے وہ نہ تو اصلی جمہوریت ہے اور نہ ہی اُس کی نقل ہے۔ ایک نمایاں دھوکہ ہے جس کو جمہوریت کا تاج پہنایا گیا ہے۔ عوام الناس کی حکومت عوام الناس کے مفاد کے لیئے اور عوام الناس کے ذریعہ سے اگر ہو تو وہ جمہوریت ہے۔ مورخین اور محققین کا اس پر اتفاق ہے کہ صحیح اور اصلی جمہوریت تو صرف ایتھنز میں نہایت قدیم ایام میں بہت تھوڑے عرصہ کے لیئے ہوئی ہے۔ اور پھر بالکل دنیا سے معدوم ہو گئی۔ اُس کے بعد دنیا میں نہ کبھی جمہوریت ہوئی اور نہ آئندہ کبھی ہوگی۔ وہ حکومتیں جو آج کل جمہوریت کے نام پر چل رہی ہیں وہ یا تو پارٹی حکومت ہیں یا حکومت نمایندگی بذریعہ آرا شماری ہیں۔ یہ جمہوریت نہیں ہے بلکہ ایک دھوکہ بازی ہے جس کے ذریعہ سے چند آدمی حکومت کو سنبھال لیتے ہیں۔ اور جمہور کو تو اُسی طرح Hewers of wood and drawers of water کے درجہ پر رکھتے ہیں دیکھو۔

1. Encyclopadia Britannica, Art. "Democracy.
2. Herbert Spencer : The Man Verus the state Chapt "The Political Superstition.
3. Clark . Democracy in the Dock. P. 10

اُس زمانہ کے ایتھنز کی حکومت مکمل جمہوریت اس وجہ سے تھی کہ اُس شہر کے تمام شہری خود بیٹھ کر قانون بناتے تھے اور قانون بناتے وقت سارا شہر موجود ہوتا تھا۔ حق نمائندگی کسی کو نہ تھا۔ ان تمام موجودہ شہریوں میں سے جو حکومت کے لئے چن لئے جاتے تھے وہ ہر سال تبدیل ہوتے تھے۔ اس طرح ہر شہری کو باری باری سے حکومت کرنے کا موقع ملتا تھا۔ دولت وجائیداد اور ٹیکس کی مالیت کی قید نہ تھی۔ اس حکومت کو کہہ سکتے ہیں کہ یہ جمہوریت لوگوں کی حکومت لوگوں کے مفاد کے لئے تھی اور خود لوگ ہی حکمرانی کرتے تھے اُس میں نہ تو اصول نمائندگی اور نہ غیر منصفانہ بلکہ ظالمانہ پارٹی کی حکومت تھی۔ یہ حالت اُس کے بعد کبھی نہیں ہوئی جس کو زمانۂ حال میں جمہوریت کہا جاتا ہے۔ یہ تو دراصل امراء کی حکومت ہے۔ دیکھو۔

C.E. M. Joad : Guide to the Philosophy of Morals and Politics. p. 90, Ed. 1948.

اُن ممالک میں کہ جہاں یہ جمہوریت دوسری دنیا سے آئی ہے اب تو اس جدید تحفہ کا تجربہ بہت اچھی طرح ہوگیا ہوگا۔ کس طرح انتخاب کی دشمنیاں اولاد در اولاد میں جاکر پشتینی بن جاتی ہیں، کیسے کیسے لوگ منتخب ہوتے ہیں۔ کس طرح ووٹ حاصل کئے جاتے ہیں۔ کتنا روپیہ خرچ ہوتا ہے، کیسی کیسی جماعتیں بنتی ہیں اور اسمبلی میں کیا کیا گل افشانیاں ہوتی ہیں۔ کس کس طرح الیکشن میں خرچ کیا ہوا روپیہ معہ سود کے واپس حاصل کیا جاتا ہے۔ اور اب بھی اگر دنیا کے لوگ موجودہ جمہوریت کی اصلیت وماہیت کو نہ سمجھیں تو پھر اُن پر جناب امیر علیہ السلام کا قول صادق آئے گا کہ حوادث زمانہ بہترین واعظ ہیں اور جس کو حوادث زمانہ نے عاقل نہ بنایا اُسے کوئی وعظ فائدہ نہ دے گا۔

جو قومیت پوپ اور بادشاہوں کی کشمکش اور ریفارمیشن سے یورپ میں پیدا ہوئی وہ ایسی شدید نہ تھی۔ اُس میں ابھی انسانی ہمدردی باقی تھی۔ یہ انسانی ہمدردی نتیجہ تھی مذہب کی حکومت اور خدا کے خوف کی جس نے قومیت کے تخیّل کو منطقی حدود کی آخری حد تک جانے سے روکے رکھا۔ ڈیموکریسی ام الفتن ہے اور انڈسٹریلزم ابوالفتن ہے۔ ان دونوں کے ملنے

سے الحاد پیدا ہوا جو راس الفتن ہے۔ اب جو وطینت اور قومیت کے تخیلات پیدا ہوئے۔ ان میں خالص شیطانی جوش اور زور تھا۔ ان سب نے مِل کر وہ دنیاوی عقل و دانش پیدا کی جس نے جاہ و ثروت کو انسانی زندگی کا مقصدِ واحد قرار دیا اگر یونان کے علم الاصنام کی زبان میں اس حالت کو بیان کریں تو کہیں گے کہ یونان کے خداؤں کے باپ Zeus کی جگہ تو انڈسٹریلزم نے لی۔ اور اس کو بیوی ہیرا (Hera) کی جگہ ڈیموکریسی نے لی اور یونان کی Hierarchy of Deities کی طرح اب اس جوڑے سے ان جیسے ہی خداؤں کی ایک جماعت نکلی۔ اس دوسری نسل کے خداؤں میں سب سے بڑا خدا جب جاہ معال ہے۔ اُس کا جوڑا انفرادی قیاس Individualism سے لگا جو خود ڈیموکریسی کا بچہ ہے۔ اب اس جوڑے میں سے بھی بڑا خدا الحاد پیدا ہوا۔ جو اپنے ماں باپ سے بھی بڑا خدا بن گیا۔ ان سب نے مل کر اپنے مددگار خدائے گان قومیت اور وطینت سے مل کر ساری دنیا پر قبضہ کر لیا۔ یہ ہیں زمانہ حال کے خدا۔

ابتدائی تعلیم ڈیموکریسی نے اپنے اصول کے مطابق کوشش کی کہ ہر فرد بشر کو ابتدائی تعلیم دی جائے۔ یہ پروگرام بس ابتدائی تعلیم پر ختم ہو جاتا ہے۔ بظاہر تو یہ تجویز بڑی خوش نما معلوم ہوتی ہے۔ لیکن ذرا اس کے نتائج پر بھی، تو غور کرو۔

اس ابتدائی تعلیم سے مطلب تو محض ابتدائی درجہ کا لکھنا پڑھنا ہے۔ یہ کیا تعلیم ہوئی۔ ایسی تعلیم کے خطرات بہت ہیں اور فائدہ کچھ بھی نہیں۔ دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ زمینداروں، مزدوروں، اور چھوٹے دوکانداروں کے بچے اتنا لکھ پڑھ کر اپنے تئیں عالم سمجھنے لگتے ہیں اور اپنے والدین کو بے وقوف سمجھتے ہیں۔ آبائی پیشہ سے نفرت کرنے لگتے ہیں۔ اتنی سی تعلیم سے دنیا میں تو کچھ کر نہیں سکتے۔ یہ محض حروف شناسی ہے۔ اصلی تعلیم اس سے کوسوں دور رہتی ہے۔ حروف شناسی سے تعلیم کا مدعا تو پورا نہیں ہوتا۔ روٹی کا سوال اور مشکل ہو جاتا ہے۔ ایسا بچہ نہ خاندان کے کام کا، نہ اپنے کام کا۔ نہ قوم کے کام کا۔ نام ہو گیا کہ پڑھنا آتا ہے۔ یہ بچہ اپنے خاندان کے لئے خطرہ ہوتا ہے۔ ماں باپ ایسی

تعلیم سے پناہ مانگتے ہیں۔ اور بچّوں کو سکول بھیجنے سے گریز کرتے ہیں۔ اور جو سزا اون کو ملتی ہے اس کو اپنی قسمت کا جزو سمجھ کر برداشت کرتے ہیں۔

قوم کے لئے ایسا بچہ بہت خطرناک ہوتا ہے۔ اگر سرکاری ملازم ہوگیا تو چونکہ اصلی تعلیم تو ہوتی نہیں، غور و فکر صحیح کی عادت نہیں۔ دماغ میں غرور و پندار پیدا ہو جاتا ہے اور عوام الناس کی مصیبت کا باعث ہوتا ہے۔ اگر ملازمت نہ ملی اور لیسا اوقات نہیں ملتی تو اس کا یہ کام ہوجاتا ہے کہ ہرایک پارٹی، ہرایک لیڈر اس سے اپنے پروپاگنڈا کا کام لیتا ہے۔ لیڈر بننے کے لئے اس کو ووٹوں کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اور چند روپیوں کی اس کی قیمت ہوجاتی ہے وہ بھی ایک خاص موسم میں۔ یہ روز مرّہ کا ہر جگہ کا مشاہدہ ہے۔ جہاں طلباء نہیں ملتے وہاں اجرت کے بچّوں اور بے کار "تعلیم یافتہ" بالغوں سے یہ کام لیا جاتا ہے۔ اکثر ایسی ضرورت کے موقعوں پر بہت سی ٹولیاں ایسے انسانوں کی بانسوں پر جھنڈے لگائے ہوئے گلی کوچوں میں پھرتے ہوئے نظر آتے ہیں، فلاں زندہ باد، فلاں مُردہ باد، درمیان سے ایک آدمی جو اکثر مسجد کا ملا یا مکتب کا مدرس ہوتا ہے آواز لگاتا ہے" نعرۂ تکبیر" بہت سی آوازیں آتی ہیں۔ اللہ اکبر۔ پھر جس آدمی کی زیادہ زندہ باد ہوئی وہ ہی لیڈری اور آگے کی ترقی کے خواب دیکھتا ہے جو مُردہ باد ہے وہ بھی تو مُردہ نہیں ہو جاتا۔ کسی دوسری لائن یا دوسرے وارڈ میں جاکہ وہ ہی زندہ باد ہوجاتا ہے۔ یہ ہیں جمہوریت کے کرشمے۔ ہمارے علماء کہتے ہیں، سچ ہی کہتے ہوں گے کہ جمہوریت قرآن سے ثابت ہے جس طرح کسی زمانہ میں بادشاہ کا حقِ حکمرانی قرآن سے ثابت ہوتا تھا۔ ہمیں ان علماء کا کوئی قرآن نہیں ملا۔ ورنہ ہم سمجھتے کہ وہ قرآن کہاں، کب، اور کس پر نازل ہوا تھا۔ یہ سب اس تعلیم عام کے کرشمے ہیں۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ کسی خاص ملک کی حالت کا نقشہ ہے۔ روٹی کا سوال تو شروع ہی سے ہے اور ہر جگہ ہے۔ یہ ہی حالت یورپ کے ممالک کی ہے۔ اور یہ ہی حالت روم و یونان کی Vespasian کے زمانہ میں تھی، جب وہاں تعلیم عام ہوگئی

بھی دیکھو۔

Hume: Of National Characters,

Juneval Satires No. XV II, 110-12

مصر کی یونیورسٹی کے طلباء گورنمنٹ کے لئے دردِ سر بن جاتے ہیں۔ اور پھر طلباء میں بھی پارٹیاں ہو جاتی ہیں۔ مثلاً کمیونسٹ، وفدسٹ، مسلم برادرز وغیرہ وغیرہ۔

جس پارٹی نے جس جماعت طلباء سے اپنا کام لیا وہ جماعت طلبہ اُس کے ساتھ منسوب ہوگئی۔ دیکھو انگریزی کا پرچہ ڈان مورخہ ۱۳ اکتوبر ۱۹۵۴ء

اس تعلیم نما جہالت سے اشاعت کذب بھی بہت ہوتی ہے۔ جو پروپاغنڈہ بذریعہ پریس ہوتا ہے وہ اس کا ہی نتیجہ ہے۔ یہ پروپاغنڈا کیا ہوتا ہے؟ کذبِ محض پھر اس کا جواب بھی پریس ہی کے ذریعہ سے دیا جاتا ہے۔ وہ بھی کذب محض۔ یہ دونوں مل کر کذب مرکب بن گئے۔ لطف یہ ہے کہ ایک ہی اخبار میں دونوں نکلتے ہیں اور وہ اخبار فخر کرتا ہے کہ ہمارے صفحات سب کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔ یہ جمہوریت کا زمانہ ہے جو چاہے لکھوا دے۔ دونوں ہی جھوٹے ہوتے ہیں۔ ورنہ ایک تو ضرور ہی جھوٹا ہوتا ہے۔ جمہوریت کی آڑ میں اشاعتِ کذب پر فخر کیا جا رہا ہے کہنے والے کہتے ہیں کہ دونوں طرف سے کچھ نذرانہ مل گیا ہوگا۔ راست و دروغ بر گردن راوی۔ اگر نذرانہ بھی لے لیا تو کیا ہوا۔ ویسے آج کل کی تجارت میں ہر طرح سے ایک مقدس شے ہے۔ جس طرح بھی جمع ہو سکے۔ ایسے پروپاغنڈا کی خرابیاں جنگ عالم اوّل اور جنگ عالم ثانی کے واقعات سے اچھی طرح عیاں ہیں۔ انڈسٹریلزم نے تو سرمایہ دار پیدا ہی کئے تھے۔ ڈیموکریسی نے بھی پریس لکھ پتی پیدا کر دیئے، جن کا مفاد اس میں تھا کہ لڑائی خوب پھیلے، پارٹیاں بنیں، پارٹی بازی ہو۔ اُن کا پروپاغنڈا ہو اور ہم روپیہ کمائیں، دیکھئے تجارت کی بلیک مارکٹ کہاں تک پہنچی، مالکان اخبارات کے جو فتنے ان دونوں بڑی لڑائیوں

کے زمانہ میں ہوئے وہ سب پر عیاں ہیں۔ اور سیاسی مظاہروں کے جو برے نتائج ہو رہے ہیں وہ کراچی کے انگریزی ڈان کے ۱۲ اکتوبر ۱۹۵۵ء کے پرچہ میں ملاحظہ ہوں۔

ان امور کا زیادہ تر باعث وہ ہی ابتدائی عام تعلیم ہے۔ اگر ابتدائی تعلیم عام نہ ہوتی تو اخباروں سے اثر لینے والے خواندہ جاہل نہ ہوتے اتنے مظاہرے نہ ہوتے۔ ہر ایک شخص اپنے تئیں خواندہ سمجھ کر ان میں حصہ نہ لیتا۔ وہ اعلیٰ تعلیم جس سے قوم و ملک کو فائدہ ہو نہ پہلے عام تھی۔ نہ اب عام ہے۔ اور نہ آئندہ عام ہو سکتی ہے۔ جب اعلیٰ اصلی تعلیم عام نہیں ہو سکتی تو پھر اس ابتدائی تعلیم کو عام اور جبری کرنے سے کیا فائدہ۔ اس ابتدائی تعلیم کو عام کرنے سے ہم عجیب خطرناک انسان پیدا کر رہے ہیں۔ ایک بچہ پڑھنے کے شوق میں ہر قسم کا لٹریچر پڑھتا ہے لیکن غور کرتا نہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کا دماغ چوں چوں کا مربہ بن جاتا ہے۔ اور آخر کار ہر ایک پرو پیگنڈا کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور ہر ایک پارٹی یا جماعت کے لئے بہت عمدہ آلہ کار بن جاتا ہے بغیر سوچے سمجھے ان کے مقصدوں کو مدد دینے کی کوشش کرتا ہے۔ کسی مقصد کی غلطی یا صحت پر سوچنے کا نہ تو اس کو موقع ملتا ہے۔ اور نہ اتنی لیاقت کہ حق و باطل میں تمیز کر سکے۔ جو زیادہ قیمت دے کر اُسے خریدنا چاہے خرید لیتا ہے۔

اس میں ایک اور بھی نقص ہے۔ اخباران میں تو ہر قسم کی خبریں ہوتی ہیں کوئی کسی کی لڑکی کو بھگا لے گیا۔ کسی نے کسی کی عورت پر ہاتھ ڈالا۔ قتل کیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ جاہل اس کو پڑھتے ہیں اور ان کے دل میں ایسے ہی خیالات نشوونما پاتے ہیں۔ برائی کے رواج کی خبر بھی تو برائی ہوتی ہے۔

غرضکہ عصر رواں کے ارباب ثلاثہ یہ ہیں (۱) جمہوریت ناقص، یعنی Democracy (۲) یورپ کا نظام اقتصادیات جس کو زمانۂ حال کی زبان میں Industrialism کہتے ہیں اور (۳) حب مال وجاہ اس حد تک

جس نے انسان کے دل سے مذہب اور اخلاقیات کو نکال دیا ہے۔ یہ تیسرا عنصر پہلے ہی دو عناصر کا نتیجہ ہے۔ ان سے جو خصائل پیدا ہوئے وہ مختصر الفاظ میں یہ ہیں۔

(۱) یورپ کی تقلید میں خداوند تعالےٰ کو اپنے معاملات میں سے نکال دینا۔ (۲) ظلم (۳) خود غرضی (۴) دولت و ثروت کے حصول میں انہماک (۵) تصورِ اطاعت کا معدوم ہونا (۶) خود اپنے تئیں حق کا معیار تصور کرنا (۷) محبّت، ہمدردی، ایثارِ نفس اور صبر کا درمیان سے اُٹھ جانا (۸) دنیا کی اس ہی زندگی کو معراجِ حقیقت سمجھ کر بالکل اس میں محو ہوجانا (۹) حشر و نشر و قیامت، سزا، جزا کے اعتقادات کا معدوم ہونا (۱۰) روحانیت سے مکمل انقطاع بلکہ اُس کا انکار۔

یہ ہیں روحِ عصرِ رواں کے بڑے بڑے خصائل جو آج کل کی جملہ سیاسی و معاشرتی اور معیشتی خرابیوں اور پریشانیوں کے ذمہ دار ہیں۔ اور اگر ان سب کو مزید اختصار کے ساتھ بیان کیا جائے تو کہہ سکتے ہیں کہ خدا کی ہستی سے انکار، اُس کے احکام سے اعراض اور اُس کی سزا و جزا کی تضحیک۔ قصہ مختصر یہ کہ انسان نے خدا کو ہٹا کر خود اس کی جگہ لے لی ہے۔ سوفسطائی حکماء کا یہ نظریہ کہ Man is the Measure of all things (انسان ہی حق و ناحق کا معیار ہے) اب تک اُس جماعت کے باہر تشنۂ عمل تھا Democracy اور Individualism نے مل کر ایسی صورتِ حالت پیدا کر دی ہے کہ محض یہ ہی نظریہ تمام دنیا کا محرکِ عمل بن گیا ہے۔

یہ تو وہ بڑے بڑے امور ہیں جن کے عیوب و نقائص ایسے عیاں ہو گئے ہیں کہ اہلِ مغرب بھی اُن سے واقف ہو گئے ہیں اور اپنی کتابوں میں ان کا اعتراف کرتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور ایسی باتیں ہیں جو براہِ راست اسلامی تمدن سے تصادم کرتی ہیں۔ اور اسلامی معاشرہ پر بری طرح اثر انداز ہو رہی ہیں۔ مثلاً عورتوں کی بے پردگی اور ان کی تعلیم جس سے مطلب ابتدائی تعلیم ہی ہو سکتا ہے۔ معیارِ رہائش کی بلندی، اور رقص و سرود۔ ان

امور پر تفصیل سے تو ہم اس کتاب کے حصہ دوم میں بحث کریں گے۔ یہاں چلتے چلتے عقل سلیم سے اپیل کرتے ہیں۔

عورتوں کی ابتدائی تعلیم۔ ابتدائی تعلیم کی خرابیاں ہم بیان کر چکے ہیں عورتوں پر وہ بدرجہ اولیٰ حاوی ہیں۔ عورتوں کے لئے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے بہت کم مواقع ہیں۔ وہ تو بسا اوقات اس ابتدائی تعلیم ہی میں محصور رہیں گی۔ جس کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ وہ عورتیں اپنے تئیں تعلیم یافتہ خیال کر کے بچوں کی پرورش اور گھر کے انتظام سے تو اعلیٰ و ارفع ہو گئیں۔ وہ خواہ خاوند خود کرے یا نوکر سے کرالے۔ اُن کا کام تو ناول خوانی رہ گیا، کیوں کہ اس سے زیادہ لیاقت ہی نہیں۔ اس کی خرابیاں خصوصاً عورتوں میں ظاہر ہیں۔

رقص و سرود۔ اسلامی ممالک میں بھی جہاں اسلامی دستور کی دھوم دھام ہے۔ رقص و سرود مدرسہ اور کالج کے نصاب میں داخل ہونے لگا ہے۔ کم سے کم گورنمنٹ کی طرف سے اس کی ہمت افزائی تو مسلم ہے۔ مغربی تہذیب میں ان کو Fine arts تو ضرور کہا گیا ہے۔ لیکن ابھی تک ہم کو ان کی خوبیوں سے لاعلمی ہے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کا مل کر ایک کالج میں پڑھنا اور وہاں رقص و سرود کی فضا میں جذبات کا مشتعل ہونا ایک قیامت خیز نمونہ پیدا کر دیتا ہے۔ چونکہ مغربی تہذیب کا یہ ایک عنصر ہے لہذا ترقی کے لئے ناگزیر ہوا۔ عقل سلیم انگشت بدندان ہے کہ ؏

انچہ من بینم بہ بیداریست یارب یا بخواب

قناعت۔ اب تک تو کتب مذہب اور اخلاقیات میں قناعت کو ایک قابل تعریف خصلت سمجھا جاتا تھا۔ لیکن چار مئی ۱۹۵۶ء کے اخبار ڈان سے معلوم ہوا کہ ۳ر مئی ۱۹۵۶ء کو لاہور میں امریکہ کے ماہر اقتصادیات Dr. Woytinsky نے روٹری کلب کی میٹنگ میں ایک جدید انکشاف کا اظہار کیا کہ اگر کسی ملک کے غریب آدمی اپنی کم مائیگی پر قانع ہو جاتے ہیں تو وہ قوم اقتصادی ترقی نہیں کر سکتی اُن کے اپنے الفاظ یہ ہیں:-

So long as people are content with their poverty and do not take a proper share in the economic activity of their country, there is little hope or possibility of any sound economic growth of the nation.

ترجمہ:- جب تک لوگ اپنی موجودہ حالت غریبی سے قانع ہیں اور ملک کی اقتصادی تحریکات میں حصہ نہیں لیتے اُس وقت تک قوم کی اقتصادی ترقی کا کوئی امکان نہیں ہے۔

اس سے یہ اصول قائم ہوا کہ انسان کو اپنی موجودہ حالت پر قانع نہیں رہنا چاہیئے۔ اس اصول کو فقط اقتصادیات ہی میں تو منحصر نہیں کر سکتے۔ سیاسی حالت میں بھی، خانگی زندگی کے لئے بھی، تعلقات باہمی کے لئے بھی یہ اصول قائم ہوگیا کہ اپنی موجودہ حالت پر قناعت نہ کرنی چاہیئے۔ گویا Discontent رہنا ہی باعث ترقی ہو سکتا ہے۔ دنیا میں پہلے ہی Hurry ہے اور اب اس اصول نے تو اُس کا درجہ بڑھا کر Hurricane میں تبدیل کر دیا۔ اطمینان قلب (Peace of Mind) تو رخصت ہوا۔ یہ Industrialism کی ترقی کا نتیجہ ہے۔ جو انسان کی خوشی، راحت اور اطمینان قلب کے لئے ایسا ہی ہے جیسے کپڑوں میں کیڑا۔ یا انسان کے جسم میں سرطان۔ گولڈ سمتھ نے کیا اچھا کہا ہے:-

Ill fares the land, to hastening ills a prey, where wealth accumulates and men decay.

ترجمہ:- وہ ملک سرعت سے آنے والے مصائب کا شکار ہو جاتا ہے۔ جہاں دولت تو جمع ہوتی رہتی ہے لیکن انسانیت مریض ہو جاتی ہے۔

غریب لیکن قانع کسان کی حالت اس طرح بیان کرتا ہے۔

His best companions, Innocence and Health,

And his best riches, ignorance of wealth.

ترجمہ:- اُس کے بہترین ساتھی معصومیت اور صحت تھے۔ اور اُس کی سب سے بڑی دولت یہ تھی کہ وہ دولت سے بے خبر تھا۔

یہ انگلستان میں Industrialism کے آنے سے پہلی کی حالت تھی۔

جو اصول مغربی تہذیب نے جس کے نمائندہ Dr. Woytinsky ہیں قائم کیا ہے، وہ تو سوسائٹی کے سارے درجوں کو برابر کرکے ملک میں بدامنی بے چینی اور اضطراب پیدا کرنے کا ذریعہ بن جائے گا۔ جب ہر ایک آدمی ایک دوسرے سے بڑھ کر دولت جمع کرنے کو اپنا مقصد حیات سمجھے گا تو ملک سے اطمینان قلب اور سکون رخصت ہو جائیں گی اور اُس Discontentment کی حکومت ہو جائیگی جس کو یہ ڈاکٹر صاحب اچھا سمجھتے ہیں۔

یہ ترقی نہیں ہے جس کو یہ لوگ ترقی سمجھتے ہیں۔ ایٹم بم اور ہوائی جہاز ترقی کے معیار نہیں ہیں۔ بلکہ ترقی کا ایک ہی معیار ہے اور وہ انسان کی راحت اور خوشی ہے۔ آج کل کی زندگی میں سرعت بے جا ہے اور یہ اطمینان قلب کے منافی ہے۔ در اصل انسان کو فرصت کی بھی ایسی ہی ضرورت ہے جیسی کام کی۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو دنیا میں ترقی ان ہی لوگوں کے ذریعہ سے ہوئی ہے جن کو فرصت تھی، سائنس کی ایجادات، فلسفہ کی نکتہ سنجیاں، علم ادب کی پرواز، شاعری کی دل آویزیاں وغیرہ یہ سب اون لوگوں کی مرہون منت ہیں جن کو فرصت تھی۔ ہاں فرصت کا صحیح استعمال بھی ضروری ہے۔ اور یہ صحیح استعمال بغیر صحیح علم کے ناممکن ہے۔ علم کس چیز کا ہونا چاہئے۔ آج کل کے فلاسفران تین امور بتاتے ہیں جن کا علم ہونا چاہئے۔ یعنی (۱) حق (۲) حُسن اور (۳) نیکی۔ یہاں حسن سے مطلب ہے ہر شے کا اپنے موزوں مقام پر قائم ہونا۔ لیکن ان کے لئے بھی ایک معیار ہونا چاہئے۔ اگر معیار میں اختلاف ہوا تو شبہ پیدا ہو جائے گا اور جہاں شبہ پیدا ہوا وہاں مقصد کی یکسوئی نہ رہی۔ اور جہاں مقصد میں یکسوئی نہ رہی وہاں امن و اطمینان نہیں۔ اور جہاں امن و اطمینان نہیں وہاں خوشی نہیں۔ انسانی غور و فکر کی ابتدا سے آج تک اس ایک معیار ہی کی تلاش رہی ہے۔ چونکہ انسان میں خود غرضی کا جذبہ سب پر فائق ہے۔ لہٰذا انسان حق و حسن و نیکی کا ایک معیار نہیں قائم کر سکتا۔ جس میں اُس کی غرض وابستہ ہو گی اُس کو ہی حق سمجھے گا۔ اور جس کو وہ خود اچھا سمجھے گا اُس کو ہی حُسن اور نیکی خیال کریگا۔

اسلام کہتا ہے کہ اس معیار کا قائم کرنے والا وہ ہے جس نے انسان کو بھی پیدا کیا کیا ہے یعنی خدا۔ اس معیار کو واضح کرنا ہی فلسفۂ اسلام ہے۔

اتنی بحث کے بعد ترقی اور ترقی کے زمانہ کی یہ تعریف معلوم ہوئی۔

ترقی اس کو کہتے ہیں کہ انسان کو حق، حُسن اور نیکی کا معیار معلوم ہو۔ اور اُن کے حصول کو اپنا مقصد اوّلین قرار دے۔ ترقی کا زمانہ وہ ہوگا جو انسان کے اس مقصد کے حصول میں مدد دے۔

ظاہر ہے کہ موجودہ مغربی تہذیب وہ نہیں ہے اور نہ موجودہ زمانہ ترقی کا زمانہ ہے۔ کیونکہ یہاں تو بے چینی اور اضطراب ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے۔ اس میں نہ خوشی ہے اور نہ یہ ترقی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ خدا اور خدا کے قانون کی طرف سے اعراض کرکے انسان نے دولت و ثروت کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا ہے۔

باب دوم

فلسفہ اور حکمت۔ مذہب اور عقل و سائنس

یُؤتِی الحِکمَۃَ مَن یَّشَآءُ ۚ وَمَن یُّؤتَ الحِکمَۃَ فَقَد اُوتِیَ خَیرًا کَثِیرًا۔

البقرۃ ۲ : ۲۶۹

ترجمہ:۔ خدا جس کو چاہتا ہے حکمت عطا فرماتا ہے اور جس کو (خدا کی طرف سے) حکمت عطا کی گئی تو اس میں شک ہی نہیں کہ اُسے خوبیوں کی بڑی دولت ہاتھ لگی۔

عام طور سے فلسفہ کا ترجمہ حکمت کیا جاتا ہے۔ لیکن جنھوں نے اس مضمون کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ فلسفۂ یونانی میں اور حکمتِ قرآنی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ جس دعوی سے فلسفہ نے اپنی زندگی شروع کی وہ حکمت ہی کا پیراہن تھا۔ لفظ Philosophy جس کو اُردو میں فلسفہ کہتے ہیں یونانی زبان کے دو اجزا سے مرکب ہے Philo جس کے معنی محبت کرنے والے کے ہیں۔ اور sopher جس کے معنی عقل کے ہیں Philosopher کے معنی عقل سے محبت کرنے

والے کے ہوئے۔ اور Philosophy کے معنی ہوئے عقل سے محبت کرنے کا ہنر یا علم۔ یہ بہت اچھی شے ہوئے۔ حکمت بھی عقل سلیم ہی پر مبنی ہے اور وہ حکمت اسلام کی روح ہے۔ نتیجہ نکلا کہ اگر فلسفہ عقل سلیم و صحیح پر مبنی ہے تو وہ حکمت ہے، اصلی فلسفہ ہے۔ قرآن شریف کا فلسفہ عقل سلیم پر مبنی ہے۔ لہذا صحیح واصلی فلسفہ ہے۔ حکمت ہے۔

فلسفۂ یونان بھی بہت دور تک عقل و حکمت کے ساتھ چلتا رہا۔ اور دنیا کو اس نے بہت فائدہ پہنچایا۔ سب سے پہلے یونان کے بتوں کو اس نے ہی توڑا تھا۔ اس فلسفہ کی ابتداء میں اس زمانہ کے تمام علوم اس میں شامل تھے۔ آخر کار ان میں وہ تمام علوم داخل ہو گئے جن کا تعلق عقل سے تھا۔ یعنی طب، منطق، نفسیات، اخلاقیات۔ طبیعیات، ہیئت وغیرہ وغیرہ۔ رفتہ رفتہ لفظ فلسفہ کا اطلاق مظاہر قدرت، فطرت کے اسباب، ان کی غایت اور قوانین پر ہونے لگا۔ قرآن شریف نے بھی ان مظاہر قدرت کی طرف اشارہ کر کے فرمایا ہے کہ افلا تعقلون۔ یعنی غور و فکر کرو تو یہ ہی مظاہر قدرت کائنات کے خالق کی طرف دلالت کرتی ہوئی نظر آئیں گی۔

اتنی دور تک ساتھ ساتھ چلنے کے بعد جب عقل انسانی کی انتہا پر پہنچ گئے تو اب راہیں کٹ گئیں۔ حکمتِ قرآنی نے کہا کہ لا علم لنا اِلّا ما علمتنا۔ اور آگے چلنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ ؎

اگر یک سر موئی برتر پرم فروغِ تجلّی بسوزد پرم

فلسفۂ یونان نے عقل انسانی کے لئے کوئی حد مقرر نہیں کی۔ اور گمان کیا کہ انسان کائنات کی حقیقت اوّل معلوم کر سکتا ہے۔ جب معاملہ یہاں تک پہنچا تو حکمتِ قرآنی تو یہ کہہ کر ہمیشہ کے لئے اس سے علٰحدہ ہو گئی کہ لکم دینکم ولی دین لیکن دہریت اس کے ساتھ ہو لی۔ بلکہ اس کی رہبر بن گئی۔ فلسفۂ یونان کو حقیقت اوّل تو کیا ملتی، خدا کو بالکل ہی کھو بیٹھا۔ عقل سلیم نے خدا کی طرف دلالت کی اور عقل ناقص نے خدا سے دوری اختیار کر لی، یہ ہے فرق حکمتِ قرآنی اور فلسفۂ یونانی میں قرآن شریف نے حکمتِ قرآنی کی تعریف ان الفاظ میں کی یہاں تک کہ اس کا درجہ نبوت سے ملا دیا۔

فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُم مُّلْكًا عَظِيمًا ۴:۵۴

وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْاِنْجِيلَ ۵ : ۱۱۰

اُولٰئِكَ الَّذِيْنَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۶ : ۹۰

وَآتَيْنَاهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۱۹ : ۱۲

جناب امام جعفر صادق سے کسی نے سوال کیا کہ عقل کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ عقل وہ ہے جس کے ذریعہ سے خدا کی عبادت کی جاتی ہے اور جنت حاصل ہوتی ہے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ جناب امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا کہ دین اُس ہی کے لئے ہے جو عاقل ہے۔ اور جس کے پاس دین ہے وہ ہی جنت میں داخل ہوگا۔ انسان کو اُس کے اعمال و عبادات کا ثواب اُس کی عقل کے مطابق ملتا ہے۔ (کافی۔ کتاب العقل)

فلسفۂ یونان کی صورت عقل سلیم کی حدود سے تجاوز کر کے کیسی ہوگئی خود اہلِ فلسفہ کی زبانی سنئے۔

1. This is the tragedy of almost every civilisation—that its soul is in its faith, and seldom survives Philosophy. (3)

2. A nation is born stoic and dies epicurean. At its cradle religion stands, and philosophy accompanies it to the grave. (4)

(3) Wherever philosophy arises, the moral health of the nation decays. (5)

(4) It was even a saying among the philosophers themselves that since learned men had appeared, honest men were nowhere to be found. (6)

(حاشیہ ۳ و ۴ و ۵ و ۶ صفحہ ۴۴ پر ملاحظہ ہو)

ترجمہ:۔ (۱) تقریباً ہر قوم کی تہذیب کے ساتھ یہ المیہ ہوا ہے کہ اُس کی روح توفیقین محکم میں ہوتی ہے۔ اور فلسفہ اُس کو برباد کر دیتا ہے۔

(۲) قوم جب اُبھرتی ہے تو اوّل اوّل وہ لذات دنیاوی سے نفرت کرتی ہے لیکن آخرکار عیش پرست ہوکر وہ مرجاتی ہے۔ (اقبال نے اس ہی کلیہ کو اس طرح بیان کیا ہے ۔ آ ہم تجھے بتلائیں تقدیر امم کیا ہے — تلوار و سناں اوّل اور چنگ و رباب آخر)
اُس کے مہد کے پاس تو مذہب اُس کی نگرانی کرتا ہے۔ لیکن پھر فلسفہ آجاتا ہے اور وہ اُس کو لحد تک پہنچا دیتا ہے۔

(۳) جب کبھی کسی قوم میں فلسفہ پیدا ہوتا ہے تو قوم کے اخلاق گرجاتے ہیں۔

(۴) خود فلاسفران میں یہ مقولہ رائج تھا کہ جب سے یہ عقل والے لوگ اٹھے ہیں تب سے ایمان دار آدمی کہیں نہیں ملتے۔

فلسفہ کے متعلق انگلستان کے فلاسفر Mr Bacon کا مقولہ بھی سننے کے قابل ہے۔ وہ کہتے ہیں:

A little philosophy inclineth a man's mind to atheism, but depth in philosophy bringeth men's minds about to religion (7)

ترجمہ:- تھوڑا سا فلسفہ کا علم انسان کے دماغ کو دہریت کی طرف راغب کرتا ہے۔ لیکن اس کا گہرا مطالعہ انسان کے دماغ کو پھر مذہب کی طرف راجع کر دیتا ہے۔

حدیث صحیح میں وارد ہوا ہے کہ جب خداوند تعالےٰ نے عقل کو خلق کیا تو اُس سے مخاطب ہوکر فرمایا: ما خلقت خلقا احب الی منک ولا

---

(3) Will Durant: Our Oriental Heritage, Chap. viii, P. 193

(4) Ibid. Chap. ix. 259

(5) Will Durant: The Story of Philosophy, P. 232

(6) Rousseau · A Prize Essay for the Academy of Dijon.

(7) Forty Thousand Quotations, Compiled by Charles Noel Douglas, P. 1303

اکملتک الانی من احب۔ یعنی میں نے کوئی مخلوق ایسی پیدا نہیں کی جس سے مجھے تجھ سے زیادہ محبت ہو۔ اور تجھ کو میں نے صرف اُن لوگوں میں کامل کیا ہے جن سے میں محبت کرتا ہوں۔

کتنے کم سمجھ ہیں وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اسلام کے اصول و قواعد عقل کے خلاف ہیں۔ در اصل تو فلسفہ اور مذہب میں کچھ اختلاف نہ ہونا چاہئے۔ کیوں کہ دونوں کا تعلق انسان اور اُس کے ماحول سے ہے اور دونوں حق کے متلاشی ہیں لیکن مغربی تہذیب کے زیر اثر پرورش یافتہ، علماء، فلاسفہ اور مصنفین یک زبان ہوکر کہتے ہیں کہ فلسفہ و مذہب میں اختلاف ہے۔ اُن کا یہ کہنا ٹھیک ہے کیونکہ اُن کے زیر نظر تو وہ ہی اُن کا نقلی فلسفہ ہے جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں اور اُن کا وہ مذہب ہے جو اس ہی قسم کے فلسفوں سے اثر لیتا ہوا مسخ ہوکر اُن تک پہنچا ہے۔ ان اثرات سے مل کر مذہب ایک مرکب شے بن گئی ہے۔ نہ تو دہریت کا فلسفہ رہا اور نہ خدائی حکمت۔ لہذا اختلاف ضروری تھا اور یوں بھی وجہ اختلاف عیاں ہے۔ یہ فلسفہ چونکہ عقل انسانی پر مبنی ہے اور عقل انسانی ہمیشہ بدلتی رہتی ہے لہذا فلسفہ میں یقین مطلق نہیں ہے۔ اُس کو خود بھی شک رہتا ہے، دوسروں کو بھی شک میں ڈالتا رہتا ہے، اُس کے نظریے آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔ لہذا یہ فلسفہ یقین کے لئے زہر قاتل ہے اور اُس کے طلبہ کی ذہنیت یقین کے برخلاف ہو جاتی ہے۔ اور مذہب مبنی ہی محض یقین پر ہے۔ انسان کی وہ زندگی جس میں faith, یعنی یقین نہ ہو انسانی زندگی کہلائے جانے کے قابل نہیں دوسری وجہ اختلاف یہ ہے کہ فلسفہ محض تخئیں ہے۔ خیال ہے۔ خیالی تصور ہے۔ وہ کبھی نہیں سوچتا کہ میں جو اپنی عقل اور منطق سے نظریئے قائم کر رہا ہوں وہ قابل عمل بھی ہیں۔ افلاطون نے ان دونوں کی مدد سے ایک خیالی ریپلک قائم کر دی۔ خیال تو اچھا تھا کہ جب تک حکمران عدل مطلق نہ کریں گے ظلم رہے گا۔ لیکن وہ خیالی نظام ایسا ناقابل عمل تھا کہ کسی ملک میں اور کسی زمانہ میں وہ خیالی ریپبلک قائم نہ ہوسکی۔ ذہن اور قوت متخیلہ کو ایک خاص قسم کی تشکیل کرنے اور تربیت دینے کے علاوہ۔ یہ فلسفہ انسان کی عملی زندگی میں مفید اور کارگر ثابت نہ ہوا۔ مذہب کا مقصد اور

منتہی ہی عمل ہے۔ اگر عمل نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ لہٰذا خدائی حکمت میں بار بار عمل پر زور دیا گیا ہے اور قرآن شریف میں جہاں جہاں نجات، جنت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ وہاں صراحتاً ایمان وعمل دونوں کی شرط رکھی ہے۔ افلاطون جیسی خیالی ریپبلک کے متعلق Livius کہتا ہے:۔

A republic of Philosophers, such as speculative men are fond of forming in imagination, but which was never known.

ترجمہ:۔ وہ جمہوریت جس کے حکمران فلاسفران ہوں جیسی کہ خیالی آدمی اپنے تصور میں بنانے کے شائق ہیں لیکن جو کبھی معرض وجود میں نہیں آئی۔

ایسی روزمرہ کی باتیں کہ انسان کا مقصدِ حیات کیا ہے یا ہونا چاہیئے۔ نیکی کیا ہے۔ بدی کیا ہے۔ نیکی کیوں اچھی ہے۔ بدی کیوں بُری ہے ان امور کو فلسفہ قطعی طور سے نہ فیصلہ کر سکا۔ بہت بڑی بڑی کتابیں لکھی گئیں۔ بحثیں ہوئیں لیکن نتیجہ نہ کچھ نکلا سوائی اس کے کہ بہت سے فرقے بن گئے جن میں آپس میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہ کیوں ایسا ہوا۔ اس وجہ سے کہ فلسفہ کے پاس کوئی اٹل اور مستقل معیار نہیں ہے۔ فلسفہ کو ہر ایک شخص کے قیاس وخیال کے رحم پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ اسلام میں ایسا نہیں ہے۔ وہاں معیار مقرر ہے۔ اور معیار بھی ایسا مستقل کہ خدائی لایزال کا قائم کیا ہوا۔ ممکن ہے کہ اس کا جواب دیا جائے کہ اسلام میں بھی تو فرقے پیدا ہو گئے۔ ہم کہتے ہیں کہ اسلام میں فرقے نہیں ہوئے۔ بلکہ مسلمان متفرق ہو گئے۔ اسلام تو وہ ہی ہے، جو جناب رسول خدا لائے تھے لیکن فلسفہ وہ نہیں ہے جو پہلے فلاسفہ مثلاً تھالیس امپڈو کلیز یا افلاطون اور ارسطو نے ایجاد کیا تھا۔ ہر ایک فلاسفی کا علیحدہ فلسفہ ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے مسلمانوں میں بھی فرقے اس وقت پیدا ہوئے جب اُنھوں نے فلسفہ کی تقلید میں اپنے قیاس کو امور اسلام میں دخل دیا۔

ان کے علاوہ اور بہت سے اہم مسائل ہیں جو مذہب اور فلسفہ کے سامنے برائے حل پیش ہوئے ہیں۔ جب انسان کی آنکھ اس دنیا میں کھلی تو اُس نے اپنے ماحول پر غور و فکر کرنا شروع کیا۔ میں کون ہوں، کہاں سے آیا ہوں، میرے پہنے

کی غرض و غایت کیا ہے، کیا میں بھی جانوروں کی طرح کچھ دنوں میں ہمیشہ کے لئے معدوم ہو جاؤں گا۔ یہ دنیا کیا ہے، کیوں کر معرض وجود میں آئی۔ اس کا بنانے والا اور اس ساری کائنات پر حکومت کرنے والا، اور اُن کا انتظام کرنے والا کوئی تو ضرور ہونا چاہیئے۔ وہ کون ہے۔ مجھے اس دنیا میں کس طرح رہنا چاہیئے۔ اپنے خاندان والوں رشتہ داروں اور غیروں سے کیسے تعلقات رکھنے چاہئیں۔ دنیا میں مجھ سے زیادہ زبردست کون کون سی طاقتیں ہیں۔ ان کے ساتھ میرا برتاؤ کیسا ہونا چاہیئے۔ اپنی جان، اپنے مال اور اپنی اولاد کو کس طرح محفوظ رکھنا چاہیئے۔ آفتاب، ماہتاب، سیارے ستارے یہ کیا ہیں، کیوں ہیں اور ان کا تعلق ہماری زمین سے کیا ہے۔ معاشرت معیشت، اخلاقیات، حکومت وغیرہ سب ان سوالات کے صحیح جوابات پر مبنی ہیں۔ اگر ان جوابات کو حکمتِ خداوندی و قرآنی کی روشنی میں مرتب کیا جاتا تو دنیا میں افراط تفریط، فتنہ و فساد، نفرت و عداوت ظلم وجود نہ ہوتے۔ اسلام نے ان جوابات کو پیش کیا لیکن انسان کی عقل نے بغاوت کی اور ان پر عمل نہ کیا۔ نتیجہ وہ ہوا جو ہم دیکھ رہے ہیں۔

مغربی تہذیب نے یہ مسلمہ قائم کیا ہے کہ فلسفہ و سائنس و مذہب کا آپس میں اتحاد نہیں ہو سکتا۔ جہاں فلسفہ و سائنس ہوں گے وہاں سے مذہب گریز کر جائیگا۔ جہاں تک اس مغربی تہذیب کے وطنی مذہب کا تعلق ہے تو یہ کلیہ درست ہے۔ یورپ میں جو مذہب رائج ہوتا رہا ہے وہ ایسا ہی تھا کہ عقل و حکمت سے گریز کر جاتے۔ سب سے پہلے یونان کی داستانیں تھیں جن کا نام مذہب رکھ لیا تھا۔ بعید از عقل، خلاف از قیاس ایک سیر کہسار قائم کر لی تھی؛ کوہ المپس اور اس کے خدا۔ یہ بھی کوئی خدا تھے۔ انسان نے اپنی ہی خواہشات و نفسیات برطرے پیمانہ پر ان خیالی آبادیوں کو دیدی تھیں۔ یونان کے تمام فلاسفران ہمیشہ اُن کے خلاف رہے اور اس مذہب کا مضحکہ اُڑاتے رہے، کمزوری اور شکست کے جھونجل میں انھوں نے سقراط کو ہلاک کر دیا کہ یہ ہمارے نوجوانوں کو ہمارے ملک کے خداؤں کے خلاف بھڑکاتا ہے۔ وہ مذہب تو یوں گیا۔ سقراط گیا، لیکن اُس کی عقل کی باتیں تو نہیں مریں۔

اس کے بعد یہ سلسلہ یورپ میں مسیحیت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ مسیحیت

کے کارکنان اوّل مثلاً پیٹر اور پال کے لئے ہمارے پاس سوائے تعریف کے اور الفاظ نہیں ہیں۔ اُنھوں نے دور و دراز ممالک میں سفر کر کے نہایت جرأت و خلوص کے ساتھ صحیح وحدانیت کے اعتقادات دنیا میں پھیلانے کی کوشش کی۔ یہ لوگ حضرت عیسیٰ کو ایک نبی برگزیدہ سمجھتے تھے۔ ابھی تک عیسیٰ کی ابنیت و امتزاج فطرت بشریہ والہیہ کے اعتقادات پیدا نہیں ہوئے تھے۔ یہ اعتقادات تو بعد کی پیداوار ہیں جب کارکنان مسیحیت کا مقابلہ نہایت سختی سے ملک کے مروجہ مذہب متھرا ازم سے ہوا۔ وہ اس نتیجہ پہ پہنچے تھے کہ اگر وہ متھرا ازم کے بڑے بڑے اعتقادات اپنے مذہب میں نہ لیں گے تو مسیحیت کو شکست ہو جائے گی۔ لہذا اُنھوں نے یہ دونوں اعتقادات اور بہت سے رسومات متھرا ازم سے لے کر اپنے مذہب میں داخل کر لیں۔ اور بائیبل کو ان اعتقادات کے مطابق کرنے کی غرض سے بہت جلد اُسے تبدیل کر دیا۔ زبان بھی دوسری دیدی اور مضمون بھی دوسرا دیدیا۔ حضرت عیسیٰ اور اُن کے اصلی حوارئین کی زبان ارمی تھی۔ اُس میں ہی بائیبل تھی۔ اُس کو گریک یعنی یونانی زبان سے بدل دیا۔ اور پھر لاطینی زبان میں آ گئی۔ تفصیلات کے لئے دیکھو ہماری کتاب **البلاغ المبین حصہ دوئم۔ طبع ثانی صفحات ۳۷۹ تا ۳۹۵۔**

اس ہی اصول صلح و آشتی مابین حق و ناحق کو لئے زیر نظر رکھ کر اس مذہب کے پادری آگے بڑھے اور بجائے اس کے کہ اپنے زمانہ کو اپنے مذہب کے مطابق کرتے اُنھوں نے اپنے مذہب کو لئے اپنے زمانوں کے مطابق کر لیا۔ اُنھوں نے غلط تاویل و غلط قیاس کی ذریعہ سے اپنے مذہب کو ایسا بنا لیا تھا کہ وہ ذرا بھی عقل کی روشنی کی تاب نہیں لا سکتا۔ اس مذہب کے چند اصول جو عقل سلیم و صحیح لہذا فلسفہ اور سائنس کے خلاف ہیں یہ ہیں (۱) اعتقاد کہ بیماریوں، وباؤں، طوفان اور دیگر آفتوں کے پیدا کرنے والے جادو اور جادوگرنیاں تھیں۔

(۲) معجزات کی بھرمار۔ یہاں تک کہ ہر پادری کے جوتوں اور چادروں سے معجزے ظاہر ہونے لگے۔

(۳) کلیساؤں میں بت پرستی۔ اور یہ اعتقاد کہ بتوں اور اُن کی تصاویر سے معجزات صادر ہوتے ہیں۔

(۴) عورتوں کے متعلق اعتقاد کہ یہی معصیت کا اصلی سبب ہیں۔ شیطان کے ایجنٹ ہیں۔ ان سے چھو جانا گناہ پیدا کرتا ہے۔ یہ تو محض دوزخ میں جلنے کے لیے ہیں۔ ان کی نجات کبھی نہ ہوگی۔

(۵) Atonement. یعنی اعتقاد کہ جب شیطان نے حوا کو اور اُس کے ذریعہ سے آدم کو ورغلا لیا تو خدا کو بہت غصہ آیا اور اُس نے اپنے بیٹے حضرت عیسیٰ کو صلیب کے لیے پیش کیا۔ تاکہ وہ آدمیوں کے گناہوں کا عوض ہو جائے اور آدمی کی روح پاک ہو جائے۔

(۶) خدا کی ویسی ہی شکل ہے جیسی کہ انسان کی اور خدا اپنے انبیاء یا Patriarchs کے سامنے اپنی شکل یعنی انسانی صورت میں ظاہر ہوتا رہا ہے۔

(۷) Papal Dispensations یعنی گناہوں کی پاداش سے بریت کی دستاویزات۔ پوپ اپنی فیس لے کر جو گناہ کی عظمت کے تناسب سے ہوا کرتی تھی یہ پروانہ دیتا تھا۔ یہ عقیدہ پھیلایا گیا کہ اُس سے اُس گناہ گار کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں اور حرام نکاح جائز ہو جاتا ہے اور پھر وہ سیدھا مزید بازپرس کے بغیر جنت میں چلا جاتا ہے۔ حرام نکاح کی جوازیت کی اُس زمانہ میں بڑی ضرورت تھی ورثہ کی تقسیم کا دارومدار اس پر تھا۔

ایسے ہی اور بہت سے اعتقادات تھے جو عقل سلیم کے خلاف تھے۔ فلسفہ اور سائنس نے مل کر خوب ان کا مذاق اڑایا اور بتایا کہ بیماریوں، طوفان، اور دیگر مصائب کے لیے تو قوانین قدرت وتحت ہیں جن پر اُن بے چاری جادوگرنیوں کا کچھ اختیار نہ تھا جو نہایت ظلم و بے دردی کے ساتھ پادریوں کے حکم اور ان کے اہتمام سے قتل کی گئیں۔ اب یہ خیال عام لوگوں کے دل میں بھی جاگزیں ہو گیا کہ اس مذہب کو عقل سے کچھ تعلق نہیں اور پھر آئندہ چل کر یہ خیال عام ہو گیا اور ہر ایک مذہب کو خلاف عقل سمجھا جانے لگا۔

ہر ایک صاحب غور و فکر پر واضح ہے اور ہم اس کتاب میں انشاء اللہ اس کو ثابت کریں گے کہ اسلام اس بے عقلی کے دائرہ سے باہر ہے۔ نہ اسلام مسخ ہوا اور نہ اسلام کی کتاب (قرآن شریف) لفظاً محرّف ہوئی۔ ہاں یہ نہ تسلیم کرنا خلاف

انصاف و دیانتداری ہوگا کہ عام مسلمانوں کی اکثریت کا مذہب یونانی، ایرانی اور ہندوستانی فلسفوں کے زیر اثر آن کر اسی طرح مسخ ہوگیا کہ جس طرح یہودیت اور مسیحیت مسخ ہوئی تھیں۔ یہ مسلمات تاریخیہ میں سے ہے اور ہم نے اس کو اپنی کتاب **نور المشرقین من حیاۃ الصادقین** میں بیان کیا ہے۔ ہر ایک شخص نے اپنے لئے ایک علیحدہ "اسلام" اپنے قیاس کے مطابق بنا لیا ہے۔ مغربی تہذیب کے لادینی کے اصول اپنی رہنمائی کے لئے منتخب کر لئے ہیں۔ اور اپنے تیار کردہ اسلام کو ان اصولوں کے ڈھانچہ میں ڈھال لیا ہے۔ مثلاً۔

(۱) مسلمان مولوی تو تنگ دل اور تنگ نظر ہیں۔ دراصل سب مذاہب سچے ہیں۔

(۲) ہر وقت مذہب کو اپنے ساتھ نہیں لئے پھرنا چاہیئے۔ مسجد اور گرجا کے باہر کوئی مذہب نہیں ہے۔

(۳) مذہب کو حکومت سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ مذہب کے اصولوں کو حکومت کی سیاست سے علیحدہ رکھنا چاہیئے۔

(۴) دوزخ، جنت، حور، غلمان کچھ نہیں۔ یہ تو محض لوگوں میں کردار نیک پیدا کرنے کے لئے وعدہ وعید کئے گئے ہیں۔ ان کو فقط استعارات سمجھنا چاہیئے۔

(۵) دنیاوی ترقی کا نام اسلام ہے۔ دنیاوی تنزل کا نام کفر ہے۔ انگریز، جرمن روسی اور امریکن سچے مسلمان نہیں۔ عرب و ایران و شام کے مسلمانان اصلی کافر اگر کسی کو یقین نہ آئے تو علامہ عنایت اللہ مشرقی کا تذکرہ ملاحظہ کرے۔

(۶) انسان کی زندگی کئی حصوں میں منقسم ہے۔ مثلاً خانگی زندگی، سیاسی زندگی، پبلک زندگی، دفتری زندگی، پرائیویٹ زندگی، مذہبی زندگی وغیرہ وغیرہ۔ سوائے مذہبی زندگی کے اور وہ بھی مسجدوں کے اندر اور کسی زندگی پر مذہبی رنگ نہ ہونا چاہیئے۔

اگر ان سے کہو کہ علماء دین جو ازمنہ ماضیہ میں گذرے ہیں وہ تمہارے ان خیالات کی تائید نہیں کرتے اور احادیث رسول تمہارے خلاف ہیں تو جواب ملتا ہے۔ کہ "اسلام" میں جو کچھ خرابیاں ہیں اور فرقہ پردازیاں ہیں وہ ان ملاؤں ہی کی توپیدا کردہ ہیں۔ جنھوں نے اسلام کو خراب کر دیا ہے۔ احادیث رسول سب غلط ہیں۔ قابل اعتنا

نہیں صحیح بخاری، صحیح مسلم، ترمذی وغیرہ سب غلط حدیثوں سے بھری پڑی ہیں۔ سب تفاسیر قرآن غلط۔ تیرہ صدیوں تک کسی نے قرآن کو سمجھا ہی نہیں۔ اب ہم کو خدا نے خاص طور سے قرآن کے صحیح معانی سمجھنے اور اُن کی تبلیغ کرنے کے لئے پیدا کیا ہے۔ اس جدید اسلام کا خالق کراچی کے افق سے طلوع ہو رہا ہے۔

مذہب اسلام کی تاریخ میں یہ بھی ایک عجیب واقعہ ہے کہ مسلمانوں کے بہتر سے زیادہ فرقے۔ عقائد میں ایک دوسرے کے بالکل برعکس و متضاد۔ لیکن ہر ایک فرقہ کہتا ہے کہ صحیح اسلام فقط ہمارے ہی پاس ہے اور کسی کے پاس نہیں۔ اس کی تشریح آگے آتی ہے۔

باب سوم

اسلام سے کون سا مذہب مراد ہے

اس باب کا عنوان لوگوں کو عجیب معلوم ہوگا۔ لیکن یہ بہت ضروری ہے۔ مسلمان مورخین و مصنفین نے اپنے موروثی عقائد سے مجبور ہو کر اور یورپین مورخین نے بغیر سوچے سمجھے اُن کی تقلید میں یہ وطیرہ اختیار کر لیا ہے کہ اسلام سے وہ مذہب مراد لیتے ہیں جو آنحضرت کے بعد کے آنے والے خلفاء و سلاطین کے اقوال و افعال و عقائد نظام اور طرز عمل سے مستنبط ہوتا ہے۔ یہ بات اُن کے روز مرہ کے تقاریر اور اُن کتابوں سے ظاہر ہے جن کے عنوان ایسے ہوتے ہیں: اسلام کا سیاسی نظام، اسلام کا طرزِ حکومت، اسلام کے عقائد وغیرہ وغیرہ۔ ان کتابوں میں رسول خدا کے طرز عمل و دستورِ حکومت کا تو ذکر تک نہیں ہوتا۔ لیکن آں حضرت کے بعد کے آنے والے خلفاء و سلاطین کے طرز حکومت، سیاست، اصول جہاں بانی، اقوال و افعال اور عقائد کا ذکر ہوتا ہے صریحاً یہ غلط ہے دراصل اسلام تو وہ ہے جو آں حضرت نے سکھایا اور خود عمل کر کے دکھایا۔ اُن کے بعد کے خلفاء اور سلاطین کو آنحضرت کے مقرر کردہ اسلام کی ترمیم و تنسیخ کا اختیار نہ تھا۔ اُن کا طرز عمل، اُن کا مجموعہ عقائد، اُن کی سیاست اور طرزِ

حکومت تو اس کشمکش کا نتیجہ ہیں جو ان کو اپنا اقتدار و تسلط قائم کرنے اور اس کو مستقل و مستحکم کرنے میں پیش آئی تھی اور ظاہر ہے کہ ان امور کے لئے جن عقائد و اصول و طرز عمل کی ضرورت ہوتی ہے ان کا تعلق صحیح مذہب سے نہیں ہوتا۔ جن بزرگوں کو تفصیل کی ضرورت ہے اور وہ اس پر ذرا مفصل بحث چاہتے ہیں ان کو چاہئے کہ ہماری تین کتابیں ضرور پڑھیں یعنی البلاغ المبین حصہ اول و دوم اور کتاب التفریق والتحریف فی الاسلام۔

اب یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ اتنے فرقوں اور معتقدات کی موجودگی میں یہ فیصلہ کیونکر کیا جاوے کہ صحیح اسلام کس کے پاس تھا اور اب کس فرقہ میں تلاش کریں ایسے تنازعات کا فیصلہ کرنے کا اصول بھی قرآن شریف نے بتا دیا ہے تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَۃٍ سَوَاءٍ بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمْ ۳ : ۶۴ تنازعہ زیر بحث یہ ہے کہ آیا جناب رسول خدا نے اسلام کی ہدایت و قیادت و جمعیت کے لئے کوئی مرکز مقرر کیا یا نہیں۔ اور اگر کیا تو وہ کون سا مرکز تھا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ مشترک اور مسلمہ کلمہ اس تنازعہ میں کونسا ہو سکتا ہے۔ جس کو سب تسلیم کرتے ہیں۔ یونان و ایران کے فلاسفران بھی اس کی تحکیم کو اسی طرح قبول کرتے ہیں جس طرح ہندوستان و انگلستان کے حکماء و مدبران ماضی و حال مانتے ہیں۔ جو انسان اور حیوان کے درمیان مابہ الامتیاز ہے جس کی حکومت تمام انبیاءؑ کے ساتھ ساتھ رہی ہے اور تا قیام قیامت جاری رہے گی جس کی طرف خدا نے انسان کی توجہ دلائی اور جس کو قرآن نے ایمان و کفر کے تنازعہ میں ثالث مقرر کیا۔ وہ کیا ہے۔ وہ انسان کی عقل سلیم ہے یعنی وہ عقل جو حکم بننے کے درجہ تک ترقی کر چکی ہے اور جو کسی عصبیت یا جدی و ناجائز میلان سے موثر نہ ہو۔

اب وہ سوالات مقرر کریں جو ہمارے اس تنازعہ میں پیدا ہوتے ہیں اور پھر دیکھیں کہ یہ صحیح عقل انسانی اس کا کیا جواب دیتی ہے۔ وہ سوالات یہ ہیں۔

(۱) قرآن شریف نے حکم دیا ہے کہ ایک حبل اللہ ہے اس کو تم مستحکم پکڑے رہو۔ اور امم سابقہ کی طرح متفرق نہ ہو جاؤ۔ فطرت انسانی میں متفرق ہو جانا ہے۔

چنانچہ قرآن نے خود بتایا کہ پچھلے لوگوں نے متفرق ہو کر اپنے مذہب اور اپنی حکومت کو خود ضائع کر دیا۔ اس تفرقہ سے بچانے کے لئے کسی مرکز کی ضرورت تھی یا نہیں۔

(۲) جناب رسولِ خدا اس ضرورت اور اس حکم خداوندی سے واقف تھے یا نہیں۔

(۳) جناب رسولِ خدا کو ضرور علم ہونا چاہیئے تھا اور تھا، تو پھر آپ نے کوئی مرکز مقرر کیا یا نہیں۔

(۴) ضرورت بھی تھی۔ آنحضرت کو اس ضرورت کا علم بھی تھا تو آنحضرت نے کون سا مرکز مقرر کیا۔

(۵) یہ بھی ضروری تھا کہ جس کو صاحب مرکز بنانا تھا اُس کو ابتداء ہی سے جناب رسولِ خدا اپنے زیر تعلیم رکھتے۔ اور اس وقت سے رکھتے کہ ابھی مخالف نظریہ یعنی کُفر کا شائبہ بھی اُس پر نہیں پڑا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ مہد کے اثرات لحد تک ساتھ رہتے ہیں۔

(۶) یہ بھی ضروری تھا یا نہیں کہ اس مرکز کا اعلان آپ وقتاً فوقتاً امت کے سامنے کرتے رہتے۔ اور اپنی رحلت کے زمانے کے نزدیک بھی کرتے۔

(۷) اُمت اسلامیہ کے اس وقت دو طبقے تھے، اصحابِ رسولؐ اور آلِ رسولؐ۔ وہ مرکز ان دونوں میں سے کس میں ہونا چاہیئے تھا۔ مولوی شبلی کا تو یہ قول ہے اور صحیح ہے۔ کہ "باہر والوں کی نسبت گھر والے حالات سے اچھی طرح واقف ہوتے ہیں" (8) اور اصحابِ رسول میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کا بچپن اور شباب عبادت اوثان اور رجس اصنام میں نہ گزرا ہو۔ یعنی اسلام کے مخالف نظریہ کے زیر اثر نہ رہا ہو۔

(۸) کیا یہ ضروری نہیں کہ جو مرکز مقرر کیا جائے اس کے افراد کے سوانح حیات اور اسلام پر اُس کے احسانات ایسے ہوں کہ انصافاً اور عقلاً یہ ہی سب کو ماننا پڑے کہ واقعی وہ ہی اس مرکز کی قیادت کی اہلیت رکھتے ہیں اور اس میں یہ بھی

(8)، شبلی: سیرۃ النعمان ص ۳۸، ۳۹۔ پوری متعلقہ عبارت یہ ہے: "امام ابو حنیفہ لاکھ مجتہد ہوں اور فقیہ لیکن فضل و کمال میں ان کو حضرت جعفر صادق سے کیا نسبت؟ حدیث و فقہ بلکہ تمام مذہبی علوم اہلبیت کے گھر سے نکلے۔ وصاحب البیت ادریٰ بما فیہا"

خوبی ہو کہ وہ آل میں بھی نزدیک ترین ہو۔ اور اصحاب میں بھی قریب ترین۔

جو جوابات ان سوالات کے عقل سلیم دیتی ہے اُن کا تذکرہ ہم نے تفصیل سے اپنی کتاب **البلاغ المبین حصہ اوّل و دوم** میں کیا ہے۔ اور ثابت کیا ہے کہ یہ مرکز آنحضرت نے اپنے اہل بیت میں منفرد کیا جس کے راس و رئیس حضرت علیؑ تھے۔ یہ تقرر رشتہ داری کی بناء پر نہ تھا۔ بلکہ حضرت علیؑ کی افضلیت اس کی ہی متقاضی تھی۔

اس بحث کا جواب تو کیا ہو سکتا تھا۔ مولوی شبلی علیہ الرحمۃ نے اپنے دماغ پر زور ڈال کر یہ بات پیدا کی کہ جناب رسولِ خدا کے لائے ہوئے اسلام میں ہر زمانہ کے ساتھ چلنے اور اُس کی ضروریات کا مقابلہ کرنے کی اہلیت نہ تھی۔ زمانہ کی ترقی کے ساتھ وہ دوش بدوش نہیں چل سکتا تھا۔ اس کمی کو حضرت عمر نے اس اسلام کی ترمیم و تنسیخ کر کے پورا کیا اس رائے کی تردید ہم نے مفصل بحث کے ساتھ اپنی کتاب **التفریق والتحریف فی الاسلام** میں کی ہے۔ جناب رسولِ خدا کا اسلام دنیا کے ہر زمانہ اور ہر حالت کے لئے کافی تھا اور کافی رہے گا۔ کسی ترمیم و تنسیخ کی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ قرآن شریف کی تشریح و تاویل کی ضرورت تھی۔ اس تشریح و تاویل کی ضرورت کو اسلام کے دونوں بڑے فرقے مانتے ہیں۔ سوادِ اعظم کی رائے میں یہ تاویل کا زمانہ حضرت عمر کی وفات تک ختم ہو گیا۔ اس کے بعد صرف اُس کی پیروی کی ضرورت رہ گئی۔ مجلس شوریٰ میں خلیفہ کے لئے عبد الرحمٰن بن عوف کی طرف سے پیروی سنّتِ شیخین کی شرط کو لازمی قرار دینے کی حمایت اس ہی رائے کے مطابق ہو سکتی ہے۔ ورنہ یہ اعتراض عائد ہو گا کہ سنّتِ رسول کی پیروی کی شرط کیوں نہ لگائی۔ وہ معقول بھی ہوتی۔ اور مفید بھی۔ لیکن شیعیانِ علی کہتے ہیں کہ یہ تاویل کا زمانہ ۲۶۰ھ میں ختم ہوا جب اُن کا بارھواں اور آخری امام غیبت میں چلا گیا۔ اُس وقت تک دنیا الحاد بے دینی اور کفر کی ہر وہ حالت جو وہ اختیار کر سکتی تھی کر چکی تھی۔ اب قیامت تک کوئی نئی صورت اور حالت پیدا نہ ہو گی۔ اور اُس وقت تک جو صورت دنیا اختیار کرتی تھی اُس کے لئے امام موجود ہوتا تھا اور اپنے قول و فعل سے امت کو بتاتا تھا کہ اس خاص صورت و حالت میں کیا کرنا چاہیے۔ اور یہ سب کچھ قرآن ہی سے بذریعہ تشریح و تاویل نکال لیتا تھا۔ اس کے بعد قیامت تک کوئی ایسی صورت و حالت نہ پیدا ہو گی جو ان بارہ اماموں میں سے کسی امام کے زمانہ میں نہ رہی ہو۔ تمدنی معاشرتی انقلاب بھی جو ہونے تھے

ہو چکے تھے۔ آج کل جو تمدنی و اقتصادی و سیاسی نظریئے قائم ہو رہے ہیں وہ نئے نہیں ہیں۔ موجودہ زمانہ میں روس کا کمیونزم دنیا کے سامنے ہے۔ جس میں مزدور اور مالک کی باہمی کشمکش بہت نمایاں ہے۔ یہ کوئی نیا نظریہ نہیں ہے۔ بلکہ عرصہ ہوا دنیا اس سے آشنا ہو چکی ہے۔ اپنی ابتدائی حالت میں مصری بابلی، اشوری، ہندی اور ایرانی تہذیبوں میں پایا جاتا ہے۔ مندروں کے ساتھ شرفاء کی نوجوان کنواری لڑکیوں کا انسلاک جن کو خداؤں کے نام پر وہاں رکھا جاتا تھا لیکن ہر شہری کو اُن کے استعمال کا حق حاصل تھا اور واقعاً ہر شخص استعمال کرتا تھا صریحاً بغیر کسی شبہ کے نسوانی کمیونزم تھا بنو اسرائیل کے انبیاء نے اس کے خلاف بہت جدوجہد کی۔ یہ نسوانی کمیونزم اُس وقت بھی تھا جب عرب میں اسلام نمودار ہوا۔ Vestal Virgins کا ادارہ بھی موجود تھا، اگرچہ چرچ نے اُس کو دوسری شکل دیدی تھی۔ یہ کہنا خلاف انصاف ہوگا کہ ہر ایک Nun اور Monk ایسے ہی تھے کہ جیسی Gibbon نے اون Monasteries کا نقشہ کھینچا ہے۔ بعض ان میں سے بہت نیک اور مخلص تھے۔ لیکن ایسے بھی بہت سے تھے کہ جن سے مسیحیت بھی شرمانے لگی۔ اسلام کے ابتدائی دور میں اس حالت کی جوانی تھی۔ عرب میں نسوانی کمیونزم اسلام تک رہا۔ قیافہ شناسوں کی جماعت جو عرب میں پیدا ہو گئی تھی وہ اس کا ہی نتیجہ تھا۔ پانچ بھائی اور ایک دروپدی کا قصہ تو سنا ہوگا۔ یہ بھی کمیونزم ہی کی شکل تھی۔ ہندوستان میں تو یہ رسم بہت عرصہ تک رہی۔ اقتصادی کمیونزم بھی تقریباً اُس شکل میں کہ جیسا اب یہ روس میں قائم ہے مزدک اور مانی کے مکتب سے نکلا ہے۔ بلکہ روس نے ان سے ہی سیکھا ہے۔ زیادہ صحیح یہ کہنا ہوگا کہ یورپ نے اس کے گر مزدک اور مانی سے لئے اور روس نے اس کو یورپ سے لیا۔ سیاست میں زمانہ حال کی دنیا صریحاً Machiavelli کی پیروی کر رہی ہے۔ اور Machiavelli نے اپنے Prince کو قدماء کے مروجہ اصولوں پر مرتب کیا تھا۔ تجارت کی رقابت موجودہ زمانہ میں بہت نمایاں ہے۔ دراصل دونوں عالمی جنگوں کی تہہ میں یہ ہی رقابت تھی۔ یہ وہ ہی تجارت کی رقابت ہے۔ جو ایرانِ پارینہ اور یونانِ قدیمہ کی لڑائیوں اور رومیوں اور اہل فینیقیا کی لڑائیوں کا باعث تھی۔ مزدوروں اور مالکوں کی کشمکش آج کل بہت

گرم ہے۔ لیکن روما ئی قدیم میں امراء اور عوام الناس Patrician & Plebeians میں کیا کچھ کم کشمکش رہی ہے۔ اخلاقیات، معاشیات، معاشرت، اور سیاست یہ سب اُس ہی فطرتِ انسانی پر مبنی ہیں جو ہمیشہ ایک سی رہی ہے اور رہے گی۔ اس موجودہ دنیا میں کوئی نئی چیز نہیں ہے جو پہلے نہ تھی۔ کوئی نیا نظریہ نہیں ہے جو پہلے نہ تھا۔ ان ہی معنوں میں کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ اپنے تئیں دہراتی ہے۔ ان تمام امور پر حضرات آئمہ علیہم السلام کے خطبات، ہدایات اور تنبیہات موجود ہیں غرضیکہ ۲۶۰ھ ہجری (۸۷۴ء) کے بعد دنیا میں کوئی ایسی نئی Ideology یا Theory ظاہر نہیں ہوئی جو پہلے نہ رائج رہ چکی ہو دہریت، بت پرستی۔ نیچر پرستی، عقیدہ تعدد الٰہ، فلسفیانہ انکار خدا، مسئلہ خیر و شر جبر و اختیار یہ سب تفصیلے زیر بحث آ چکے تھے، اہرمن و یزداں کی دو خدائی، عیسائیوں کی سہ خدائی وغیرہ وغیرہ یہ سب عقائد مذہبی صورت اختیار کر چکے تھے۔ آقا و غلام کا تعلق، بادشاہ و رعایا کے آپس کے حقوق و فرائض، ناجائز رسوخ و اثر، امراء و غرباء کی کشمکش، حکام کا تقرب اور اُس کے ناجائز اثرات، حکومت کا ظلم، رعایا کی چیرہ دستی، بادشاہت، جمہوریت، انتخاب وغیرہ وغیرہ کوئی عقیدہ یا مسئلہ ایسا نہ تھا جو اس عرصہ میں مسلمانوں کے سامنے نہ آیا ہو اور آئمہ علیہم السلام کے زمانہ میں اس پر بحث نہ ہوئی ہو۔ اور اس کے متعلق ان کی تعلیم نہ ہو۔ ان حضرات کی تعلیم عملی بھی تھی۔ شاہان جور و استبداد کی حکومت میں کس طرح رہنا چاہیے۔ قید میں رہ کر، تلوار کے نیچے، زبان بندی کی حالت میں دست بندی کی صورت میں ہر طرح سے عملاً حق کی تبلیغ کر کے دکھا دیا۔ جب تعلیم کا ہر درس ختم ہو گیا اور کوئی مضمون باقی نہ رہا تو امام علیہ السلام غیبت میں چلے گئے۔ تاویل و تشریح کا زمانہ ختم ہوا۔ تقلید کا زمانہ شروع ہوا۔ یہ اب تک ہے اور اُس وقت تک رہے گا کہ جب تک امام علیہ السلام پھر نہ ظاہر ہوں۔

لہٰذا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ اسلام سے مراد وہ اسلام ہے جس کی تعلیم و تشریح و تفصیل جناب محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اُن کے مقرر کردہ معلمان و شارحینِ اسلام اور مفسرینِ قرآن یعنی آلِ محمدؐ کے اقوال سے ہوتی ہے، اور اس کتاب میں اُس ہی اسلام سے مراد ہے۔ عقلِ سلیم بھی یہی کہتی ہے۔ جنابِ

محمد مصطفےٰ بانیٔ اسلام اور معلم اسلام تھے۔ اصلی اسلام تو وہ ہی ہے جس کی تعلیم انھوں نے کی۔ بعد کے خلفاء و سلاطین کو کوئی حق نہ تھا کہ اُس اسلام میں ترمیم یا تنسیخ کریں۔

کسی شے کی قدر و قیمت اور اُس کی ماہیت مقابلہ ہی سے اچھی طرح عیاں ہوسکتی ہے۔ اسلام کا بنیادی کلمہ لاالہ سے شروع ہوتا ہے۔ اور جھوٹے خداؤں کی نفی نہیں ہوسکتی جب تک یہ نہ معلوم ہو کہ وہ جھوٹے خدا کون اور کیسے ہیں۔ چنانچہ قرآن شریف میں اُن کی تشریح و تفصیل اچھی طرح کی گئی ہے۔ فلسفہ اور مذہب اسلام دونوں میں مضمون زیر بحث ایک ہی ہے۔ یعنی انسان اور اُس کا ماحول۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس ایک ہی مضمون یا مقصد کے لئے جو دو مختلف راستوں سے مسافت طے کی گئی ہے اور اُس کے متعلق نتائج اخذ کئے گئے ہیں وہ کیا کیا ہیں۔ ان کے مقابلہ سے معلوم ہوگا کہ کس نے صحیح نتائج اخذ کئے ہیں اور کس نے غلطی کی ہے۔ اور غلطی کی ہے تو کہاں؟

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ ہم نے آل محمد کے فلسفہ کا علیٰحدہ عنوان قائم نہیں کیا۔ وجہ یہ ہے کہ آل محمد کا اپنا کوئی علیٰحدہ فلسفہ نہ تھا۔ آل محمد کا وہ ہی فلسفہ تھا جو محمد مصطفےٰ کا تھا اور محمدؐ کا وہ ہی فلسفہ تھا جو اسلام کا یعنی قرآن کا فلسفہ ہے۔

باب چہارم

ارکانِ حیاتِ ابدی

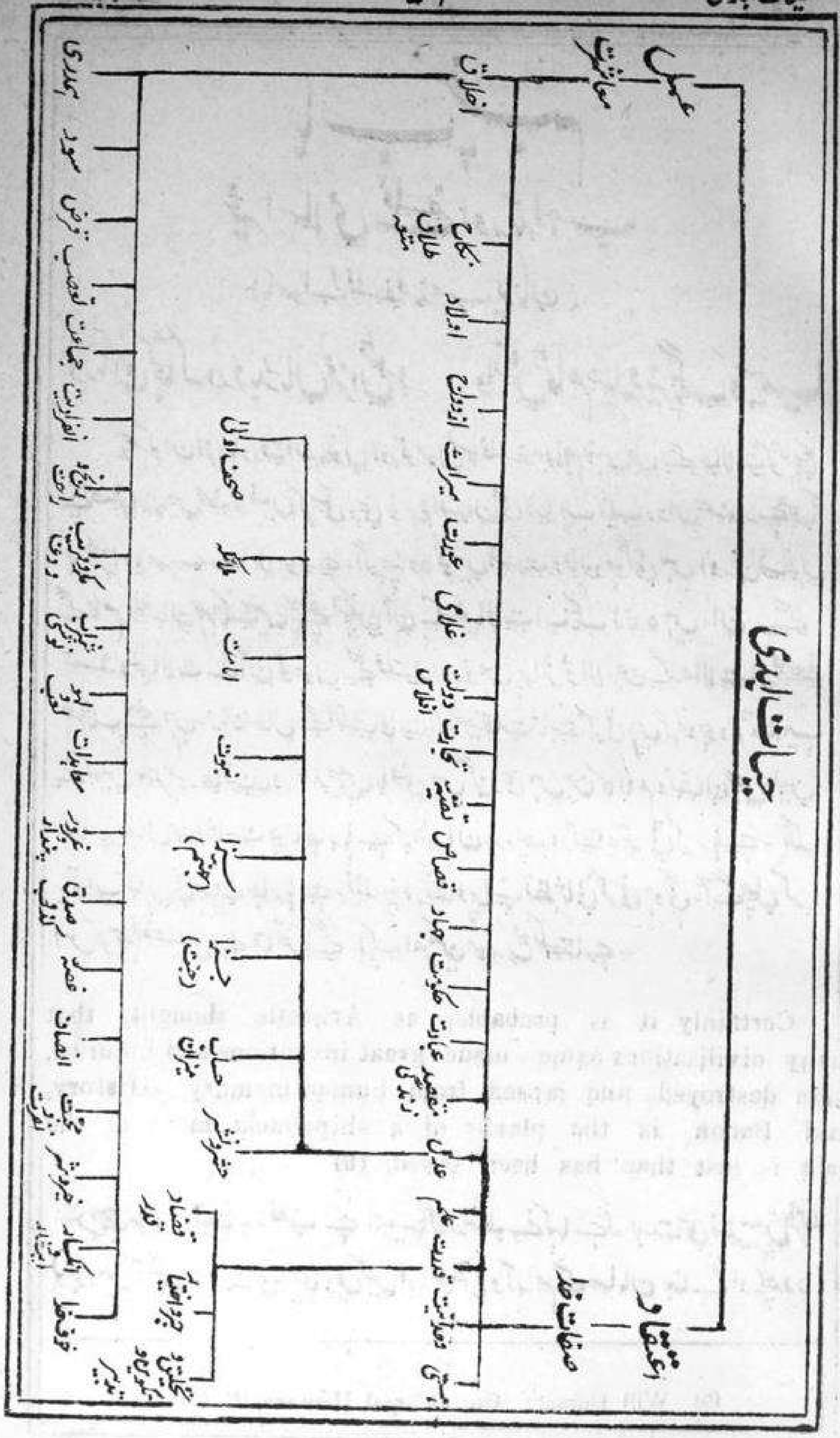
در محیط

فلسفۂ اسلام

نقشۂ منسلکہ ہذا سے وہ ارکانِ اسلام واضح ہوتے ہیں جن پر مسلمان کی حیاتِ ابدی کا انحصار ہے۔ کتاب ہذا میں بہ تحت فلسفہ اسلام ان کا ہی ذکر

کیا جائے گا۔ ارشاد خداوندی کے مطابق مسلمان کی نجات کے لئے حسنِ اعتقاد (ایمان) اور صلاحیت عمل کی ضرورت ہے۔ اعتقاد میں ہستی خدا، صفاتِ خدا اور عدل خدا ضروری ہیں صفات میں وحدانیت، قدرت اور علم آتے ہیں۔ ہم نے عدل خداوندی کے تحت میں نبوت، امامت، ملائکہ، حشر و نشر حساب، میزان جزا و سزا اور صحفِ اولیٰ کو رکھا ہے کیونکہ یہ سب عدل خداوندی کی شاخیں ہیں۔ نبوت امامت اس وجہ سے قائم ہوئی کہ انسان کو جس کے پاس پہلے کوئی علم نہ تھا اور جس کی فطرت میں برائی کی طرف میلان تھا اس طرح بے مہار اور بے ہدایت کے نہ چھوڑ دیا جائے۔ انبیاء و ائمہ اس کو صحیح راستہ دکھانے اور اس راستہ پر ڈالنے کے لئے موجود ہوں حشر و نشر، سزا و جزا، میزان اُس آخری عدالت کے شعبے ہیں جہاں مثقال ذرہ کے برابر بھی ظلم نہیں ہوتا۔ ان کا مقصد و مدعا یہ ہے کہ مظلوم کی دادرسی ہو جائے۔ ظالم کو سزا مل جائے۔ نیک بندوں کو اُن کے نیک اعمال کی جزا اور بد بندوں کو ان کے بداعمال کی سزا مل جائے۔ دراصل سارا فقہ اسلام عدل اور محض عدل پر مبنی ہے۔ شرک کو بھی تو قرآن میں ظلم عظیم کہا ہے۔

صفات خداوندی تو بہت ہیں، کہتے ہیں کہ خدا کے یک صد نام ہیں۔ اور ہر ایک نام سے اُس کی خاص صفت کا اظہار ہوتا ہے۔ ہم نے جو محض پانچ صفات یعنی ہستی، عدل، قدرت، وحدانیت اور علم رکھے ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ باقی صفات کو نظرانداز کر دیا۔ بلکہ وہ تمام صفات بلکہ سارا نظام فقہ ان ہی میں آ گیا جیسا کہ نقشہ منسلکہ سے ظاہر ہے اس نقشہ میں امور معاشرت کو اخلاقیات سے علیحدہ دکھایا گیا ہے۔ دراصل یہ دونوں ایک ہی ہیں۔ یعنی ایک کو دوسرے سے بہت تعلق ہے۔ ایک کے امور دوسرے کے اندر آتے ہیں۔ مثلاً معاہدات کو اس خیال سے کہ اسلام میں معاہدات کی بناء اخلاق و خصائل حمیدہ پر رکھی گئی ہے۔ ہم نے زیر عنوان اخلاق دکھایا ہے۔ لیکن معاشرت کے عنوان کے نیچے بھی وہ آ سکتے ہیں۔ یہ ہی صورت قرض و سود کی ہے۔ رومن قانون میں قرض و سود و معاہدات معاشرت کے تحت میں رکھے گئے تھے۔ ان میں ہمدردی اور مقروض کی بے چارگی کو دخل نہ تھا لیکن اسلام نے ان پر بہت زور دیا ہے۔ یہ ہی بہت بڑا فرق ہے۔ اسلام کی معاشرت میں اور مغربی تہذیب کی معاشرت میں۔ اب وہ نقشہ ملاحظہ ہو۔


حیات ابدی
اعتقاد
صفات خدا
ہستی
وحدانیت
قدرت
علم
عدل
تخلیق و تکوین و تدبیر
جبر و اختیار
قضا و قدر
حشر و نشر
حساب میزان
جزا (جنت)
سزا (جہنم)
نبوت
امامت
ملائکہ
صحف اولی
عمل
معاشرت
مقصد زندگی
عبادت
حکومت
جہاد
قصاص
تقیہ
تجارت
دولت افلاس
غلامی
عورت
میراث
ازدواج
اولاد
نکاح طلاق متعہ
اخلاق
خوف خدا
انکسار و
خیر و شر
محبت و نفرت
انصاف
غصہ
صدق کذب
غرور پندار
معاہدات
لہو و لعب
شراب نوشی
مکر و فریب و دغا
رنج و راحت
انفرادیت
جماعت
تعصب
قرض
سود
ہمدردی

باب پنجم

غیر اسلامی فلسفے اور مذاہب

(ماسوائے فلسفہ و مذہب یونان)

دانش تمام حیلہ و نیرنگ و سیمیا
درمان کجا کہ درد بدرماں فزوں شود

ہم کو ان ازدیاد رفتہ انسانوں اور قوموں کا فلسفہ معلوم نہیں جن کے حالات کو تاریخ اپنے صفحات میں محفوظ نہیں کر سکی۔ بنی نوع انسان کی تہذیب ایک رواں سمندر ہے جس کا ہر ٹکڑا دوسرے سے ملا ہوا ہے۔ اگرچہ وہ قومیں نیست و نابود ہو گئی ہیں اور ان انسانوں کے نام و نشان ہم تک نہیں پہنچے لیکن اُن کے خیالات اب تک زندہ ہیں۔ ان کے فلسفہ و خیالات نے اُن قوموں کے فلسفہ اور ذہن پر اثر ڈالا، جن کے حالات اور فلسفے ہم تک پہنچے ہیں۔ زمانۂ حال کے انکشافات اور تحقیقات ثابت کرتی ہیں کہ موجودہ تہذیب سے کہیں بہتر اور طاقتور تہذیبیں ماضی میں گزری ہیں جن کا نام و نشان بھی نہیں ملتا۔ یہ خیال غلط ثابت ہوتا جا رہا ہے کہ انسان بذریعہ ارتقاء ترقی کر رہا ہے۔ بلکہ یہ تو اب تنزل کی طرف جا رہا ہے۔ نظریۂ ارتقاء پر اب نظر ثانی کرنی ہوگی۔ آگے چل کر اس کو ہم تفصیل سے بتائیں گے۔ ایک امریکن مورخ لکھتا ہے۔

Certainly it is probable, as Aristotle thought, that many civilisations came, made great inventions and luxuries, were destroyed, and lapsed from human memory. History, said Bacon, is the planks of a shipwreck; more of the past is lost than has been saved. (9)

ترجمہ :- یقیناً یہ اغلب ہے۔ جیسا کہ ارسطو نے کہا ہے کہ بہت سی تہذیبیں معرض وجود میں آئیں۔ بہت سی ایجادیں کیں اور عیش و آرام کے سامان بنائے اور پھر وہ

(9) Will Durant: Our Oriental Heritage, P. 107.

ایسی نیست و نابود ہوگئیں کہ اُن کی یاد تک بالکل جاتی رہی ۔ بیکن کہتا ہے کہ تاریخ تو ٹوٹے ہوئے بڑے جہاز کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہے ۔ ماضی کا جتنا حصہ باقی رہ گیا ہے اُس سے کہیں زیادہ ضائع ہوگیا ہے ۔

یہ تو انسانی ضائع شدہ تہذیبیں تھیں جن کا اثر زمانہ حال پر موجود ہے انسان نے تو بہت کچھ جانوروں سے سیکھا ہے ۔ کوّے کا قابیل کو جرم چھپانے میں سبق پڑھانا قرانی صداقت ہے ۔ اور بھی بہت سے جانور ہیں مثلاً شہد کی مکھیاں چیونٹیاں ، چیل ، مچھلیاں وغیرہ جن سے انسان نے علم حکومت واتحاد و معیشت و معاشرت حاصل کیا ہے ۔ چیل اور مچھلیوں سے ہوائی جہاز بنانے میں مدد لی ۔ یہ ہی امریکن مورخ لکھتا ہے ۔

The dog that buried the bone which even a canine appetite could not manage, the sqirrel that gathered nuts for a later feast, the bees that filled the comb with honey, ants that laid up stores for a rainy day—these were among the first creators of civilisation. It was they, or subtle creatures like them, who taught our ancestors the art of providing for to-morrow out of the surplus of to-day, or of preparing for winter in summer's time of plenty. (10)

ترجمہ :" وہ کتا جو باوجود اپنی مشہور جوع الکلب کے ہڈی کھاتے کھاتے چھوڑ دیتا ہے اور اُس کو آئندہ کے لئے زمین میں دبا کر محفوظ کرلیتا ہے ، وہ گلہری جو اخروٹ و بادام کو پھر کھانے کے لئے بچا رکھتی ہے ، شہد کی مکھیاں جو اپنے چھتے کو شہد سے بھر لیتی ہیں ، چیونٹیاں جو برسات کے دنوں میں کھانے کے لئے ذخیرہ جمع کر رکھتی ہیں یہ ہماری تہذیب کے سب سے پہلے بنانے والے ہیں ۔ ان جانوروں نے یا ان جیسے دوسرے زیرک جانوروں نے ہمارے آباؤ اجداد کو آئندہ کا خیال کرنا اور موجودہ زیادہ ذخیرے میں سے بُرے دنوں کے لئے بچا رکھنا سکھایا تھا ۔"

یہ تو انسان کی حقیقت ہے ، جسمانی حالت تو یہ ہے کہ گندے پانی جیسے ایک قطرہ سے بنا ہے ۔ ذہنی و عقلی کیفیت یہ ہے کہ کوّے اور کتّے اور چیونٹیاں

(10) Will Durant: Our Oriental Heritage, P. 6.

اس کو عقل سکھانے والے ہیں اور ان قوانین کے ماتحت جو خداوند تعالےٰ نے اس کی پرورش کے لئے پیدا کر رکھے ہیں بڑھ کر کچھ بڑا ہوا تو کہنے لگا کہ مجھ سے بڑا کوئی بھی نہیں اور میری عقل ہی سب کچھ فیصلہ کرنے والی ہے۔ اس ذلیل ہستی کا خدا سے انکار کرنا، یہ بھی عجائبات قدرت میں سے ایک اعجوبہ ہے۔

اب ہم غیر اسلامی ضوابط حیات یعنی فلسفوں کا اور مذاہب کا ذکر کرتے ہیں کیوں کہ مقابلہ ہی سے اشیاء و نظریات کا حسن و قبح اچھی طرح نمایاں ہوتا ہے۔ جیسا ہم پہلے کہہ آئے ہیں فلسفہ و مذہب کا مضمون ایک ہی ہے اکثر ان فلسفوں میں مذہبی اعتقادات شامل ہوتے ہیں لہذا ہم نے خالص فلسفہ اور فلسفۂ مذہب کو علیٰحدہ نہیں لکھا۔ ممکن ہے کہ ہمارے اس بیان سے چینی اور یونانی فلسفہ مستثنیٰ ہوں۔ لیکن پھر بھی یونانی فلسفہ میں مذہب کی آمیزش آہی جاتی ہے۔ اور مصری فلسفہ میں اخلاقیات و سیاسیات بہت نمایاں ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو اخلاق بھی مذہب ہی کا ایک جزو ہے۔ غیر اسلامی فلسفے، سوائے فلسفۂ یونان کے جن کا ہم ذکر کریں گے یہ ہیں۔

۱۔ مصری فلسفہ اور مذہب۔

۲۔ بابلی فلسفہ و مذہب جس میں عیلام۔ عقاد، بابل، سمیر، اور اشوریوں کے فلسفہ اور مذہب کا ذکر ہے۔

۳۔ ہندوستان کا فلسفہ یعنی ویدوں کا فلسفہ اور مذہب۔

۴۔ ایران کا فلسفہ یعنی (ا) مذہب زرتشت، (ب) مذہب زرتشت اپنے بانی کے بعد۔

۵۔ (ا) بود مذہب اور اس کا فلسفہ (ب) بود مذہب اپنے بانی کے بعد۔

۶۔ جین مذہب اور اُس کا فلسفہ۔

۷۔ چین قدیم کا مذہب اور فلسفہ۔

(۱) مصر قدیم کا مذہب اور فلسفہ

دنیا میں سب سے پُرانا فلسفہ مصر کا ہے۔ اس کے بعد دنیا پر بابل کا فلسفہ

قابض ہونے لگا۔ بابل سے یونان نے سیکھا۔ اور وہ مختلف صورتیں بدلتا ہوا زمانۂ حال کی مغربی تہذیب میں کارفرما نظر آتا ہے۔ بابل کے ساتھ ساتھ ہی ہندوستان و چین و ایران میں فلسفے نے عروج پکڑا تھا۔ یہ چھٹی صدی قبل مسیح کی بات ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب تمام مہذب دنیا پر فلسفہ کا قبضہ تھا۔

یونان میں مصری عقل بطور مثل کے مشہور تھی۔ اور اہل یونان فلسفہ میں مصریوں کے مقابلہ میں اپنے تئیں بچہ سمجھتے تھے۔ دنیا میں فلسفہ کی سب سے پہلی دستاویز یا نظیر وہ ہدایات اور ضوابط عمل ہیں جو ۲۸۸۰ قبل مسیح میں ممفس گے گورنر اور فرعونِ خاندان پنجم کے وزیر اعظم پتاہ ہوٹپ Ptah-hotep نے اپنے لڑکے کے لئے تیار کی تھیں۔ اُن کو اٹھارویں خاندان کے کسی منشی نے قدیمی نشانات سمجھ کر لکھ لیا تھا۔ ہدایات ایسی تھیں مثلاً..... زیادہ بولنے کی نسبت خاموشی بہتر ہے۔ گفتگو اور فعل میں غرور نہ ہونا چاہئے وغیرہ وغیرہ۔ ایک مصری دانشمند اپودر Ipuwer ہے جس کے فلسفہ پر رنج غالب ہے۔ غالباً وہ زمانہ ہی ایسا تھا۔ خودکشی کی وارداتیں بڑھ رہی تھیں۔ ان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ کیا اچھا ہو اگر تمام لوگوں کا خاتمہ ہو جائے۔ نہ عورتوں کو حمل رہے۔ اور نہ بچے پیدا ہوں۔ آخر کار ایسے دانشمند حاکم کی خواہش کرتا ہے کہ جو ظلموں کو دور کر دے۔ اور فتنہ و فساد کو ختم کر دے۔ اور کہتا ہے کہ کہاں ہے وہ ظلموں کو دور کرنیوالا بادشاہ۔ وہ ضرور ہے لیکن اُس کی طاقت نظر نہیں آتی۔ ایک انگریز مورخ لکھتا ہے کہ یہ یہودیوں کے مسیحا والے عقیدہ کا پرتو ہے۔ ممکن ہے کہ اُس کا یہ خیال صحیح ہو۔ کیونکہ یہ خبر خداوند تعالیٰ کی طرف سے آدم سے لے کر آنحضرتؐ تک سب انبیاء کو دی گئی تھی کہ زمانہ آخر میں ایک بزرگ ظاہر ہو کر دنیا کو ظلم اور زیادتی سے پاک کرے گا۔ لہذا ہر زمانہ کے غور و فکر کرنے والے انسان اوس کے منتظر رہے ہیں۔ یہ ہی خیالات چھن چھن کر اس فلاسفر کے پاس بھی پہنچے ہونگے۔ مصر میں وہ زمانہ بھی یاس و ناامیدی کے خیالات کا زمانہ تھا۔ اُس وقت عرب کے چرواہے بادشاہ ہکسوس Hyksos مصر میں حکومت کر رہے تھے۔ ہکسوس کا غلبہ مصر میں ۱۷۳۰۔۱۵۸۰ ق م قیاس کیا گیا ہے۔ ان کے ہی زمانہ میں حضرت یوسفؑ مصر میں آن کر حکمران ہوئے تھے۔

مصر قدیم کا مذہب۔ تمام دنیا کو صنم پرستی کا سبق مصر نے دیا تھا۔ اور اس صنم خانہ سے جو صنم نکلے وہ ہی تمام دنیا میں پھیلے مصر قدیم کا مذہب تقریباً ۳۰۰۰ ق م سے ۳۹۱ء تک کثرت آلہ Polytheism کا عقیدہ رہا ہے۔ مصری لوگ اپنی صنم پرستی میں ایسے راسخ الاعتقاد تھے کہ اُن کے ہر فعل میں، ہر قول میں، ہر حرکت میں مذہب ہی کا رنگ ہوتا تھا۔ مصری مذہب کو سمجھے بغیر کوئی شخص اہل مصر کو نہیں سمجھ سکتا۔ کثرت اصنام میں ہندوستان یونان اور مصر ایک دوسرے سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔

سب سے پہلے ان کے خدا مناظر قدرت اور حیوانات تھے۔ اوّل اوّل ان کے دو بڑے خدا تھے۔ ایک تو آسمان اور دوسرے دریائے نیل۔ مصر کی صنم پرستی کے آخر تک یہ دونوں خدا رہے ہے۔ مصریوں کا خیال تھا کہ سب سے پہلے آسمان موجود تھا اور اُس کو ایک بہت بڑی گائے سنبھالے ہوئے تھی۔ دس ہزار ستارے اُس گائے کے پیٹ پر لگے ہوئے تھے۔ اُن کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ آسمان خدا تھا۔ زمین بھی خدائنی تھی۔ اُس کا نام NUIT تھا۔ خدا یعنی آسمان نے زمین خدائنی کے اوپر لیٹ کر مجامعت کی۔ اس مجامعت سے زمین کو حمل ہو گیا۔ اور دنیا پر جتنی چیزیں اور حیوانات ہیں وہ سب اس حمل میں سے پیدا ہوئے۔ ستاروں کو بھی چھوٹے چھوٹے خدا سمجھتے تھے۔ ایک بہت بڑا خدا ساہو (Sahu) تھا جو دن میں تین مرتبہ خداؤں کو کھا جاتا تھا ایسا ہی ایک اور بڑا خدا کبھی کبھی چاند خدا کو کھا لیتا تھا۔ لیکن وہ تھوڑی دیر کے لئے۔ کیوں کہ انسانوں کی دعائیں اور باقی خداؤں کا غیظ و غضب ملکر اُس کو چاند کے اوگلنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ یہ چاند گرہن کی تشریح ہے۔

مصر میں سب سے پہلے چاند کی پرستش شروع ہوئی۔ لیکن سب سے بڑا خدا سورج تھا جس کو Ra یا Re کہتے تھے۔ سورج کے متعلق مختلف اوقات اور مختلف مقامات پر مختلف عقیدے رہے ہیں۔ ایک عقیدہ تو یہ تھا کہ زمین کو سورج اپنی شعاعوں سے حاملہ کرتا ہے۔ دوسرا عقیدہ یہ تھا کہ سورج یعنی Ra تمام حیوانات، نباتات و انسان کا پیدا کرنے والا ہے۔ جب پہلے پہل سورج نے طلوع کیا تو دیکھا کہ زمین بنجر چٹیل میدان کی صورت میں پڑی ہے۔ اپنی شعاعوں کے ذریعہ سے اُس نے زمین کو قوت پیدائش

دی اور اُس کی آنکھوں میں سے دنیا کی تمام نباتات، حیوانات اور انسان پیدا ہو گئے۔
ایک عقیدہ سورج کے متعلق یہ تھا کہ سورج خدا کا نام Horus ہے جو شاہین کی صورت اختیار کر کے روزانہ نگرانی کے لئے طلوع کرتا ہے اور پرواز کرتا ہوا چلا جاتا ہے۔ ایک اعتقاد یہ تھا کہ سورج ایک بچھڑا خدا ہے جو روزانہ پیدا ہوتا ہے اور روزانہ مر جاتا ہے۔

ہر شکل کی جان والی شے کی پرستش کرتے تھے۔ مثلاً کھجور، چشمہ اور گنج درخت ان کے خدا تھے۔ اور ان کے پرستار اُن کے چڑھاوے کے لئے لکڑیاں، انگور اور انجیر لاتے تھے۔ کسی زمانہ میں پیاز بھی ایک خدا تھی۔

جانوروں میں مصریوں کے لئے سب سے زیادہ خدا تھے۔ سانڈ، مگرمچھ، شاہین، گائے، ہنس، بکرا، مینڈھا، بلی، کتا، مرغی کے بچے، ابابیل، گیدڑ اور سانپ یہ سب خدا تھے اور ان کو خداؤں کے نام دئے ہوئے تھے۔ بسا اوقات خوبصورت نوجوان عورتوں کو ان جانور خداؤں کے پاس اونھیں خوش کرنے کے لئے بھیجتے تھے اور یہ عورتیں اُن نر جانوروں کے پاس جاکر اُن سے مجامعت کراتی تھیں۔ سانڈ اور بکرے کی خاص طور سے ان حسین عورتوں سے تواضع کی جاتی تھی۔ اور وہ ایسے سدھے ہوئے عادی ہو گئے تھے کہ ان عورتوں کو دیکھتے ہی بے چین ہو کر وہ ہی حرکات کرتے تھے جو ہم یہاں ان کو اپنی مادہ سے کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اور یہ عورتیں بھی اُن سے اسی طرح چمٹ جاتی تھیں اور اپنے تئیں اُن کے آگے پیش کر دیتی تھیں جس طرح کوئی عورت اپنے خاوند سے کرے۔ یہ خداؤں کو خوش کرنا تھا۔ اس میں کچھ شرم نہیں محسوس کی جاتی تھی۔ صنم پرستی کی ابتداء سے اُس کے خاتمہ تک یہ رسم باقی رہی۔ سانڈ اور بکرا Osiris خدا کے اوتار سمجھے جاتے تھے۔

Osiris خدا کا بت بنایا جاتا تھا جس کے تین اعضا، تناسل کھڑی ہوئی حالت میں رکھے جلتے تھے۔ اُس کا ایک مذہبی جلوس نکلا کرتا تھا اور عورتیں اس بت کو اٹھاتی تھیں اور وہ اس طرح بنے ہوئے ہوتے تھے کہ لچک دار کمانیوں کے ذریعہ سے عورتیں ان سے مجامعت کرتی تھیں۔ ایسی ہی رسم ہندوستان میں بھی تھی۔

پھر انسانوں کی شکل کے خدا ہونے لگے لیکن ان خداؤں کی عادت و اطوار

بالکل انسانوں کے سے تھے۔ خون پوست ہڈیوں کے بنے ہوئے اسی طرح کھاتے تھے، بھوک لگتی تھی، پیاس لگتی تھی عشق کرتے تھے۔ نفرت وحسد وبغض کرتے تھے۔ مارتے تھے۔ بڈھے ہوتے تھے اور پھر مر جاتے تھے۔ ان بڑے خداؤں میں Osiris اور Isis کا جوڑا تھا۔ جن کا لڑکا Horus تھا۔ مصری لوگ Isis کی پرستش بڑے شوق سے اور محبت سے اُس کو خدا کی ماں سمجھ کر کرتے تھے۔ ان بے شمار خداؤں میں چار بڑے خدا تھے Horus و Amon, Osiris, Isis یا Ra لیکن آخر میں تین خداؤں کی تثلیث مقرر کی گئی وہ تین یہ تھے، باپ osiris ماں Isis اور بیٹا Horus یہ ہی خیالات فضا میں پھیلے ہوئے تھے جن سے مسیحیت نے اپنی تثلیث لی ہے۔ فرعون بھی ایک خدا سمجھا جاتا تھا، جو سورج Ra کا لڑکا تھا۔ بادشاہ مذہب کا سردار اور سب سے بڑا پروہت ہوا کرتا تھا۔ اور مذہب کی رسوم وہ ہی ادا کرتا تھا۔

ہندؤں کی صنم پرستی سے مصر کی صنم پرستی کو بہت مماثلت ہے ہندوؤں کی طرح اُن کے یہاں بھی ایسے خدا ہوتے تھے جن کا سر اور چہرہ تو جانور کا۔ اور باقی سارا بدن انسان کا۔ ممکن ہے کہ اُس مجامعت حیوانی سے جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے ایسی مخلوط شکل کا کوئی بچہ پیدا ہو گیا ہوگا۔ اُس کو خدا سمجھ لیا گیا۔ اور پھر یہ تصور قائم کر لیا گیا۔ چند ایسے خدا ملاحظہ ہوں۔

(۱) گیدڑ کا سر اور چہرہ ۔ باقی سارا بدن آدمی کا .... Anubis

(۲) گائے کا 〃 〃 ۔ 〃 〃 〃 .... Hathor

(۳) شاہین کا 〃 〃 ۔ 〃 〃 〃 .... Horus

(۴) بطخ کا 〃 〃 ۔ 〃 〃 〃 .... Munt

(۵) گدھ کا 〃 〃 ۔ 〃 〃 〃 .... Mekhet

(۶) شیرنی کا 〃 〃 ۔ 〃 〃 〃 .... Sekhet

(۷) سینڈنی کا 〃 〃 ۔ 〃 〃 〃 .... Set

(۸) مینڈھے کا 〃 〃 ۔ 〃 〃 〃 .... Khanum

(۹) لقلق کا 〃 〃 ۔ 〃 〃 〃 .... Thoth

Sebek .... مگرمچھ کا سر اور چہرہ - باقی سارا بدن آدمی کا -

مصر میں دو مذہبوں میں آپس میں رقابت رہی ہے - ایک تو وہ مذہب جو Osiris کو خدائے اعظم مانتا تھا - یہ عوام الناس کا مذہب تھا - دوسرا وہ مذہب جس میں آفتاب کی پرستش Re یا Ra کے نام سے ہوتی تھی - یہ مذہب بادشاہ کے خاندان اور اُس کے درباریوں کا تھا - پانچویں خاندان کے زمانہ میں (2564-2424 B.C) فرعون کو خدائے Re کا بیٹا کہنے لگے اور سمجھنے لگے کہ Re کی شکل فرعون کی سی ہے - کیا بائیبل کے لکھنے والوں کا یہ کہنا کہ حضرت عیسیٰ خدا کے بیٹے ہیں یا یہ کہ خدا نے انسان کو اپنے سانچہ پر بنایا ہے ان ہی خیالات سے تو نہیں لیا گیا -

ان دونوں مذہبوں کا فرق صرف موت کے بعد کی حالت کے اعتقاد میں تھا - Osiris کے مذہب میں تو یہ اعتقاد تھا کہ موت کے بعد Osiris ارواح پر حکومت کرتا ہے اور اُن کے دنیاوی اعمال کی جانچ پرتال کر کے اُن کو جنت یا ظلمت کی طرف بھیج دیتا ہے - Re کے ماننے والوں کا اعتقاد تھا کہ وہ اپنے پرستاروں کو زندہ آسمان پر اُٹھا کر انھیں غیر فانی بنا دیتا ہے - یوں تو Re والا مذہب یقیناً زیادہ کشش رکھتا ہے لیکن خرابی یہ ہوئی کہ اس زندہ اُٹھنے اور حیات دوام پانے کی قیمت روپیہ پیسے کی صورت میں لی جاتی تھی - اہرام بنانے والوں کے زمانہ میں یہ قیمت اتنی بڑھ گئی تھی کہ صرف فرعون یا اُس کے وہ درباری ہی ادا کر سکتے تھے جن کو قیمت کی ادائے گی میں فرعون بھی حصّہ دیتا تھا یہ اہرام ان ہی کوششوں کی نشانیاں ہیں جو ان امراء نے بقاء دوام حاصل کرنے کے لئے کی تھیں - ان اہرام کے بنانے میں قوم کا بہت سا روپیہ خرچ ہوا جس سے تمدنی و مالی تنزل ہوا - اور آخر کار غربا اور عوام الناس میں امراء کی طرف سے بددلی پھیل گئی اُنھوں نے سوچا کہ ہم تو نہ قیمت ادا کر سکیں گے اور نہ بقاء دوام حاصل کر سکیں گے پھر Re کی پرستش کیوں کریں - Osiris ہی کی پرستش کیوں نہ کریں جس سے مرنے کے بعد سابقہ پڑے گا - فرعون کے حصول بقاء دوام میں ہم کیوں مدد کریں - اس وجہ سے وہ Osiris کی طرف چلے گئے - یہ خدا کی خدائی کیا ہوئی یہ تو خدائی Democracy ہو گئی - جس کو جی چاہے گا رائے دیں گے - اور رائے کی قیمت وصول کریں گے -

Heliopolis وہ شہر تھا کہ جہاں سورج (Re) کی پرستش کے لئے بہت بڑا مندر یا ہیکل بنا ہوا تھا۔ جب اُس کے پروہتوں نے یہ دیکھا کہ لوگ Osiris کی طرف مائل ہوتے جا رہے ہیں تو انھوں نے اپنے خدا Re کے ساتھ Osiris کو بھی ملا لیا۔ یہ Coalition Government بن گئی اور Osiris بھی Re کی طرح اپنے پرستاروں کو بقاءِ دوام دینے لگا۔

لیکن انبیاءِ سابقہ کی تعلیم بھی اپنا اثر ڈالنے لگی۔ لوگوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہونے لگا کہ پتھر پہ پتھر رکھنے سے خدا کیا خوش ہوگا۔ بلکہ Re تو عمل میں نیکی اور قول میں راستی چاہتا ہے۔ اس پر لوگ بہت کچھ لکھنے لگے اور ان کی تحریروں اور بنی اسرائیل کے انبیاء کی تعلیم میں بہت کچھ مماثلت پائی جاتی ہے۔ اب Osiris کے متعلق یہ عقیدہ قائم ہوا کہ وہ ایک اخلاقی جج ہے جو مرنے کے بعد ہمارے نیک و بد اعمال کا موازنہ کرے گا۔ تمام مردوں کی روحیں اُس کے سامنے پیش ہوں گی اور جن لوگوں کے نیک کاموں کا پلڑا بُرے کاموں سے بھاری ہوگا وہ Osiris میں مدغم ہو جائیں گے۔ اُس کے متعلق یہ بھی عقیدہ تھا کہ وہ خود بھی مرے گا۔ مرنے کے بعد زندہ ہوگا۔ اور پھر اپنے پرستاروں کو حیاتِ ابدی بخشے گا۔

ایک امریکن عیسائی مورخ لکھتا ہے کہ یہی وہ خیالات تھے جو مسیحیت میں داخل ہو گئے۔ مصریوں کا عقیدہ تھا کہ جسم کے اندر دو چیزیں ہیں۔ ایک Ka یعنی جسم کا چھوٹا نمونہ اور دوسرے روح۔ یہ تینوں چیزیں یعنی جسم، Ka، اور روح موت کے بعد بھی اُس عرصہ تک زندہ رہتے ہیں کہ جب تک بدن کا گوشت باقی رہتا ہے۔ اور اس وجہ سے وہ مصالح لگا کر جسم کو برقرار رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔ اس کو ممی کہتے تھے۔ لیکن جو روحیں نیک آدمیوں کی ہوں گی وہ osiris تک پہنچ جائیں گی اور وہ انھیں آرام و راحت کے ساتھ باغ میں بھیج دے گا۔ جہاں ہر ایک کھانے کی چیز نفاست اور کثرت کے ساتھ ہوگی۔ یہ بھی اعتقاد تھا کہ osiris سوال و جواب کرے گا۔ جو اس میں فیل ہو جائے گا وہ ظلمتِ دوام میں اپنی قبر میں پڑا رہے گا۔ کہا جاتا تھا کہ osiris ہر ایک کے دل کو ایک میزان میں تولے گا تاکہ اُس کی صداقت معلوم کر سکے۔ یہ سب کچھ اصلی مصری مذہب اور انبیا کی تعلیم کا ملا ہوا مکسچر ہے۔

انبیاء کی تعلیم کے اثر کا بین ثبوت اخناطون فرعون کی ہستی ہے۔ فراعنہ میں یہ ایک فرعون ہے جو کہ موحد تھا اور اس کی مناجاتیں انبیاء سابقہ کی مناجاتوں کے نمونہ پر تھیں وہی تخئیل کی رفعت، وہی اپنی عاجزی کی فریاد اور وہی خدائے واحد کی حمد۔ عظمت اور قدرت کے راگ ہیں۔ اُس کا اصلی نام Amenhotep IV تھا اور Ikhnaton کے نام سے معروف ہے۔ اُس کا زمانہ ۱۳۸۰ ق م سے ۱۳۶۲ ق م ہے - یہ Will Durant کی رائے ہے۔ لیکن Toynbee نے اُس کا زمانہ ۱۳۷۵ ق م سے ۱۳۵۸ ق م قرار دیا ہے۔ اُس کے زمانہ میں Amon سب سے بڑا خدا سمجھا جاتا تھا۔ اور اُس کا مندر Karnak میں تھا۔ اس کے ساتھ بے شمار جوان عورتیں خدا کے نام پر رکھی ہوئی تھیں۔ خدا تو اُن کا کیا استعمال کرتا وہ سب پروہتوں کے عیش وعشرت کے لئے تھیں۔ اس نوجوان بادشاہ نے جو خود پرہیزگاری کا نمونہ تھا اُس کو رنڈی خانہ سمجھا، اور بینڈھا جو خدائی Amon کے نام پر ذبح کیا جاتا تھا اُس کے خیال میں فضول تھا۔ اسی طرح پروہتوں کے جادو، تعویذوں اور پیشین گوئیوں کو دھوکہ بازی سے منسوب کیا۔ نہایت جرأت کے ساتھ اُس نے ان تمام رسوم اور رنڈی خانہ کو بند کرایا۔ اور اعلان کیا کہ خدا صرف ایک خدائی واحد ہے جس کو اپنی زبان میں Aton کہا۔ اُس نے اپنا نام "اخن اطون" رکھا تھا جس کے معنی ہیں اطون، یعنی خدا راضی ہوا۔ اُس نے اعلان کیا کہ کثرت الہ کا عقیدہ اور یہ رسوم سب بت پرستی ہے۔ اُس نے حکم دیا کہ تمام بُت توڑ دئے جائیں۔ اپنے باپ کے بُت کو بھی توڑ دیا۔ وہ تین عقیدے جو مصر کی بلکہ تمام دنیا کی صنم پرستی کی روح تھے اُس نے ناجائز قرار دئے۔ یعنی۔

(۱) ہر ملک بلکہ ہر شہر کے علیحدہ خدا ہونے۔

(۲) کثرت الہ

(۳) خدا کو شکل و جگہ میں محدود کرنا۔

اخناطون نے کہا کہ خدائی واحد تمام دنیا کا خدا و رب ہے، خدا ایک ہے بہت سے خداؤں کا اعتقاد شرک و بُت پرستی ہے۔ خدا کی کوئی خاص شکل یا جسم نہیں ہے۔ اُس نے حکم دیا کہ کوئی شخص خدا کی شکل کی تصویر نہ بنائے اور نہ بُت

تراشے۔ یہ وہ خیالات اور احکام تھے۔ جنھوں نے مصر میں انقلاب پیدا کر دیا۔ مذہبی پروہتوں کی بہت طاقت تھی اور لوگوں کے دلوں میں بتوں کی محبت راسخ ہو چکی تھی لہٰذا اخناطون کے مرتے ہی مصر پھر اپنی صنم پرستی کی طرف عود کر گیا۔ ہم اُس کی مناجات کے چند حصے نقل کرتے ہیں۔ یہ اُس کے انگریزی کا اُردو میں ترجمہ ہے۔

ترجمہ:۔ عورت کے رحم میں نطفہ پیدا کرنے والے اور مرد کے اندر تخم بنانے والے، ماں کے پیٹ میں بچے کے اندر روح ڈالتا ہے۔ اور اُس کی تسلّی کے سامان پیدا کرتا ہے تاکہ وہ بے چین نہ ہو، رحم کے اندر ہی تو اُس کی پرورش کرتا ہے۔ جو کچھ تو بناتا ہے اُس میں سانس ڈال کر جان پیدا کرتا ہے، جب وہ ماں کے جسم میں سے باہر آتا ہے تو اُس کو طاقت نطق دیتا ہے اور اُس کی ضروریات مہیا کر دیتا ہے۔

انڈے میں چوزے کو تو سانس دیتا ہے کہ وہ زندہ رہے۔ اور تو ہی اُس کو اُس حالت میں لے آتا ہے کہ وہ انڈے کو کھٹکے۔ وہ انڈے سے باہر نکلتا ہے اور چہچہاتا ہے.....

تیرے مخلوقات طرح طرح کی ہے، ہماری آنکھوں سے وہ پوشیدہ ہیں۔ اے خدائے واحد جس کی طاقتیں کسی اور میں نہیں ہیں۔ تو نے اپنی مشیت کے مطابق زمین بنائی، جب تو اکیلا تھا۔ (کسی نے تجھے مدد نہیں دی)

اے خدائے لایزال! تیرے کام کیسے اچھے ہیں۔

ہم نے اخناطون کے حالات ذرا تفصیل سے لکھے ہیں تاکہ ہمارے اس نظریہ کی تائید ہو کہ حق کی تعلیم و ہدایت اُس وقت سے ہے کہ جب سے انسان دنیا میں آیا لیکن شیطان بھی ساتھ ساتھ ہی لگا رہا۔ اور یہ دونوں طاقتیں حق و باطل ساتھ ساتھ چلتی رہیں۔ یہ خیال غلط ہے کہ انسان وحدانیت تک محض اپنی کوشش سے اور قواعد ارتقاء کے بموجب پہنچا ہے۔

مصر کے حالات ہم نے مندرجۂ ذیل کتابوں سے اخذ کیے ہیں۔ (۱۱)

(11) Encyclopedia of Religion and Religions: Arts. Egyptians, Ancient; and Atonism;

(باقی حاشیہ صفحہ ۷۱ پر)

ہمارے ناظرین کو جو یہاں تک ہمارا ساتھ دیتے آئے ہیں اچھی طرح معلوم ہو گیا ہو گا کہ تمام ممالک میں صنم پرستی تقریباً ایک ہی نمونہ کی تھی، ہندوستان سے لے کر ایران یونان و مصر تک ایک ہی قسم کا Pantheon تھا یعنی خداؤں کی ایک جماعت تھی جو پہاڑوں کی چوٹیوں یا آسمان کے بادلوں یا جنگلوں میں رہتے تھے۔ ہندوستان کا ہمالیہ، ایران کا کوہ دماوند یونان کا کوہ اولیمپس، اور مصر کی وادی نیل۔ عراق کی دجلہ وفرات کی وادیاں، سب ایک ہی قسم اور ایک ہی صفات رکھنے والے خداؤں کی جولانگاہیں تھیں۔

یہاں ہم ان مذاہب کے دو مشترک عقائد کی طرف خاص طور سے توجہ دلاتے ہیں (۱) ایک تو بھوت پریت کا عقیدہ جس کو انگریزی میں Demenology. کہتے ہیں (۲) اور دوسرا اپنے بادشاہوں اور مشاہیر کو خدائی کا درجہ دینا جس کو انگریزی میں Deification کہتے ہیں۔

Demonology. یعنی اعتقاد ارواح خبیثہ

ارواح خبیثہ کی موجودگی کا اعتقاد ازمنہ بعیدہ کی ہر قوم میں پایا جاتا ہے۔ اُن کا خیال تھا کہ بھوت، پریت اور ارواح خبیثہ ہم کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اُس کا دفعیہ اس طرح کرتے تھے کہ قربانیوں کے ذریعہ سے اُن کو خوش رکھتے تھے۔ بابل، سمیریا، عقاد، ایران ہندوستان اور مصر کے مذاہب میں یہ اُن کا جز وایمان تھا۔ اور جب زرتشتی مذہب بگڑا تو اُس کے پیرو بھی پلٹ کر اس ہی سابقہ اعتقاد پر چلے گئے۔ ان مذاہب کے لوگوں کا خیال تھا کہ ساری دنیا ان ارواح خبیثہ سے بھری ہوئی ہے اور وہ لوگ نہایت توجہ اور غور کے ساتھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۰ کا)

Toynbee's Study of History, Vol I. & Vol. V.

Will Durant: Our Oriental Heritage, Chap viii.

Cambridge Ancient History, Vol iii.

Encyclopedia of Religion and Ethics.

ان ارواح خبیثہ کی ماہیت اُن کے نام اور کام معلوم کرنے کی کوشش میں مشغول رہتے تھے۔ اسی طرح سحر و فسوں وجادو کا اعتقاد عام تھا۔ ان معتقدات نے مسیحیت اور یہودیت اور ان کی کتابوں پر بھی اثر کیا۔ دیکھو (۱۲)

Deification یعنی انسان کو خدا کا درجہ دے کر اور خدا مان کر اس کی پرستش کرنا۔

اس کے لفظی معنی ہیں خدا بنانا۔ اس اعتقاد کی ایجاد تو مذہب کے ذمہ ہے۔ لیکن اسکی نشوونما میں مذہب اور حکومت دونوں نے مل کر کام کیا ہے۔ بادشاہوں کا پہلا خیال یہ ہوتا ہے کہ اپنی حکومت کو کس طرح مستحکم و مستقل بنایا جاوے۔ ازمنہ بعیدہ میں یہ کام بادشاہ کو خدا منوا کر کیا گیا۔ اور جب یہ ناممکن ہوگیا تو عوام الناس میں ایسے نظریات و معتقدات ایجاد کر کے پھیلائے گئے کہ جن سے بادشاہ کی حکومت کی تائید ہو۔ وہ معتقدات دراصل مذہب ہی کے رنگ میں ہوتے ہیں۔ بادشاہانِ وقت یہ طریقہ مذہب کے خاطر اور اُس کی محبت سے نہیں اختیار کرتے۔ بلکہ یہ اُن کی سیاست کے اغراض کے لئے ہوتا ہے، اگرچہ اُس پر مذہب کا رنگ چڑھا دیا جاتا ہے۔ دیکھو۔(۱۳)

Deification کی تین صورتیں ہیں۔(۱) بادشاہ کو خدا ماننا اور اُس کی پرستش بطور خدا کرنی (۲) بادشاہ کو خدا کا بیٹا ماننا اور اُس کی پرستش کرنی اور (۳) بادشاہ کو خدا کا اوتار مان کر اُس کی پرستش کرنا۔

دنیا میں یہ تینوں طریقے جاری رہے ہیں۔ یہ زیادہ تر اُن بادشاہوں اور فاتحین کے لئے ہوتا تھا جو تلوار کے زور سے اپنی حکومت کو بہت وسیع کر لیا کرتے تھے۔ اور سابقہ بدامنی و پریشانی کو دور کر کے اپنی رعایا کے لئے امن وامان وخوشحالی کی زندگی ممکن بناتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ ایک مستقل مذہب بذاتِ خود بن گیا اس کی مثالیں

---

(۱۲) (12. Toynbee's Study of History, Vol. V. P. 554

(۱۳) (13) Toynbee's Study of History, Vol. V. P. 647

تاریخ کے ابتدائی دور یعنی زمانہ سمیریا اور مصری تہذیب سے لے کر یونانی اور رومی تاریخ تک ملتی ہیں۔ جب دنیا میں مذہب عیسوی رائج ہوا تو اس نے انسانوں کو خدا بنانے کی رسم کی مخالفت تو ضرور کی۔ لیکن ان خیالات سے متاثر بھی ہو گئی۔ یا متاثر ہونے پر مجبور ہو گئی۔ کیونکہ جس زمانہ میں مسیحیت کی ابتدا ہوئی تو یہ خیالات لوگوں کے دل و دماغ پر مستولی تھے۔ اور بغیر لپٹے میں ان عقائد کو لئے ہوئے ان لوگوں میں جذب و اثر پیدا کرنا مسیحیت کے لئے ناممکن تھا۔ لہٰذا مسیحیت نے اپنے پیغمبر کو دنیا کے سامنے خدا کا بیٹا قرار دے کر پیش کیا۔ اور یہ تخیل لوگوں میں مقبول ہو گیا کیونکہ وہ پہلے سے اس کے عادی تھے۔

چین کے مدبر اعظم اور فلاسفر **Confucius** نے بادشاہ کو خدا کا بیٹا ماننے کی تلقین کی۔ جاپان میں بھی بادشاہ کو خدا کی اولاد کہا جاتا ہے۔ جاپانی سلطنت کے اوّل تین بانیوں کو خدا مانتے ہیں موجودہ بادشاہ ان کی اولاد سے ہے (13a)

(۲) فلسفہ و مذہب بابل جس میں عیلام، عقاد، بابل، سمیر اور اشوریوں کے فلسفہ و مذہب کا ذکر ہے

دنیائے قدیم میں بابل کی حکومت اور اس کی تہذیب کو بہت شہرت حاصل تھی۔ دراصل آج کل کی مغربی تہذیب اُس کا ہی نتیجہ ہے۔ اس کی حکومت کا علاقہ دریائے فرات اور دریائے دجلہ کے درمیان کی وادی ہے۔ یہ قوم اور یہ حکومت دو اقوام قدیم عقاد اور سمیر کے ملنے سے پیدا ہوئے تھے لفظ بابل دو الفاظ سے مل کر بنا ہے۔ باب اور ایل باب کے معنی دروازہ اور ایل کے معنی خدا کے ہیں جیسے جبرئیل، میکائیل، اسرافیل، عزازیل، عزرائیل، ان میں ایل خدا ہی کے معنی میں استعمال ہو رہا ہے۔ بابل کے معنی ہوئے باب اللہ۔ تعجب نہیں اگر زمانہ حال کے ایرانی باب نے اپنا لقب بابل کے باب اللہ سے لیا ہو۔ بابل کا فلسفہ بہت مختصر ہے۔ اور اس میں بھی مذہبی تخیل زیادہ ہے چند

(13a) Toynbee's Study of History, Vol. V. PP. 647, 651-56.

الواح ملی ہیں جن میں کچھ فلسفیانہ انداز ہے ایک تختی پر تو بال تنزو کے خیالات کندہ ہیں اور دوسری تختی پر طبیعت الانلیل کے خیالات نقش ہیں۔ انلیل بھی خدا کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ان دونوں کا فلسفہ اس تعجب کو ظاہر کرتا ہے کہ دنیا میں نیک آدمی کیوں تکلیف میں رہتے ہیں۔ بال تنزو کہتا ہے کہ میں نے سب سے زیادہ خداؤں کے احکام کی تعمیل کی ہے۔ لیکن پھر مجھ پر پے در پے مصائب پڑ رہے ہیں۔ میرے ماں باپ مر گئے۔ میری جائیداد برباد ہو گئی۔ اور جو کچھ باقی تھی وہ ڈاکوؤں نے لوٹ لی۔ توریت کی کتاب ایوب کی طرح اس کے دوست سمجھاتے ہیں۔ کہ یہ غالباً کسی ایسے گناہ کی سزا ہے جو تم کو یاد نہیں رہا۔ یا تم کو جو غرور ہو گیا تھا یہ اس کی پاداش ہے۔ وہ اس کو یقین دلاتے ہیں کہ یہ مصائب بھی دراصل بھلائی کی ایک شکل ہے۔ خدا کی ایک بڑی تجویز کا حصہ ہے۔ انسان اپنی کم فہمی کی وجہ سے خدا کے پورے منصوبہ کو دیکھ نہیں سکتا۔ بال تنزو کو چاہیئے کہ صبر کرے اور خدا پر یقین کامل رکھے۔ نتیجہ اچھا ہو گا۔ اب بال تنزو خداؤں کو مدد کے لئے پکارتا ہے اور یہاں وہ تختی ختم ہو جاتی ہے۔ (۱۷)

طبیعت الانلیل **Tabi utul Enlil** غالباً **Nippur** کا حاکم تھا وہ ایک سخت بیماری میں مبتلا ہو گیا۔ آنکھوں سے اندھا اور کانوں سے بہرا ہو گیا۔ جسم پر زخم ہو گئے۔ دوست نفرت کرنے لگے۔ اس تختی پر اس کے الفاظ کندہ ہیں کہ میں کیسا پرہیزگار آدمی تھا۔ کیا میں نے خدا کے لئے قربانی نہیں کی اور کیا قربانی میں سے خدا کا حصہ ہمیشہ سب سے پہلے نکال کر علیحدہ نہیں کر دیا۔ کیا میں نے خدا کی بیوی خدائنی کو کھانے پر دعوت نہیں دی۔ کیا میں ہمیشہ خدا سے دعا اور التجا نہیں کرتا رہا ہوں۔ میں نے اپنی رعایا کو خدا کے نام کی حفاظت کرنا سکھایا۔ اور یہ سب کچھ اس امید پر کیا کہ خدا مجھ سے خوش ہو گا۔ آخر کار وہ اپنی بیماری پر غور کرتے کرتے اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ کوئی شخص آسمان کے خداؤں کی مشیت

Hermann Schneider: History of World Civilisation, 66

سے واقف نہیں ہو سکتا۔ خدا کی مشیت یا منصوبہ یا ارادہ جو محض ایک راز اور بھید ہے کوئی نہیں معلوم کر سکتا۔ ایک آدمی کل زندہ تھا آج مر گیا۔ کل خوش تھا آج رنج و غم میں پھنسا ہوا ہے۔ ایک لمحہ میں وہ گاتا اور کھیلتا ہوا نظر آتا ہے۔ دوسرے لمحہ میں فریاد اور ماتم کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ مجھے مصیبت نے جال میں پھنسا دیا ہے، میری آنکھ ہے لیکن دیکھ نہیں سکتا۔ کان ہیں لیکن سن نہیں سکتا۔ میرے اعضائے تناسل میں زخم پڑ گئے ہیں۔ انتڑیاں جل رہی ہیں۔ تمام دن بیماری کا بھوت میرا تعاقب کرتا رہتا ہے۔ اور رات بھی ایک لمحہ آرام نہیں کرنے دیتا۔ میرے اعضاء کٹ گئے ہیں۔ رات بھر بیل کی طرح اپنے پاخانہ میں لتھڑا ہوا پڑا رہتا ہوں۔ اور بھیڑ کی طرح میرا جسم میرے پاخانہ سے لت پت ہو جاتا ہے لیکن مجھے یقین ہے کہ میری یہ مصیبت دور ہو جائے گی۔ اور ایک دن خدا میرے اوپر اپنا فضل و کرم کرے گا۔ آخر کار اس کے دن پھرتے ہیں۔ ایک روح آتی ہے اور اس کی ساری بیماریوں کو دور کر دیتی ہے۔ ایک طوفان اٹھتا ہے اور وہ اس کے جسم سے بیماری کے تمام بھوتوں کو نکال دیتا ہے۔ (15)

بائبل کی کتاب ایوب سے اس میں کتنی مشابہت ہے۔ ایک مورخ کا خیال ہے کہ کتاب ایوب کے لکھنے والے نے اس یا ایسی ہی تحریروں سے متاثر ہو کر کتاب ایوب لکھی تھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان تختیوں کی تحریر کی بناء کتاب ایوب تھی۔ کیونکہ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ کتاب ایوب پہلے لکھی گئی یا یہ تختیاں۔

دنیا کی یہ حالت کہ نیک آدمیوں کو حد سے زیادہ رنج و غم پہنچتا ہے بال تترو اور طبیعت الأہلیل کو تو خدا کی طرف لے گئی۔ لیکن ایسے آدمی بھی تھے جو اس حالت کو دیکھ کر خدا کے اور اس کے فضل و کرم کے منکر ہو گئے۔ لیکن یہ خدا دہی اہتمام تھے چنانچہ ایک لوح دستیاب ہوئی ہے جس میں گبرو Gabarru. کا حال درج ہے۔ وہ اس ہی بات پر اپنے خداؤں سے منکر ہو گیا۔ (16) یہ وہ حالت ہے جو اکثر لوگوں کے مشاہدہ میں آتی

(15) Morris Jastrow: The Civilisation of Babylonia & Assyria P.P. 475-483
S. Langdon: Babylonian Wisdom.

(16) G. R Tabouis: Nebuchadnezzar, PP. 254.393.

ہے۔ اس پر مفصل بحث تو ہم فلسفۂ اسلام کے تحت میں کریں گے۔ لیکن ایک بات قابل غور ہے وہ یہ کہ جن کو ہم نیک آدمی سمجھتے ہیں آیا وہ واقعی نیک بھی ہیں یا نہیں۔ ممکن ہے کہ اُن کی چند نیکیاں جو سطح پر ہیں اُن برائیوں اور بدیوں کے مقابلہ میں کچھ نہ ہوں جو انھوں نے اپنی عمر کے کسی حصّہ میں کی ہیں۔ محض ظاہری عبادت یا گفتگو تو نیکی کا ثبوت نہیں ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اُن کی نیکیوں کا انعام عاقبت کے لئے محفوظ ہو۔ اور یہاں ان کی بدیوں کی سزا ئیں کردہ بدیاں محو ہو جائیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ اُن کا امتحان صبر و ایمان ہے اور دوسروں کے لئے ایمان کی ازدیاد کا سبب۔

کسی خالص فلسفہ میں عاقبت اور دوسری زندگی کا ذکر نہیں آتا کبھی کبھی خدا کا نام تو اس وجہ سے آجاتا ہے کہ فلسفہ اور مذہب کی حدیں ملتی ہیں اور خدا کے ذکر کے لئے انسان اپنی فطرت سے مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ہے کہ تعلیم انبیا فضا میں پھیلی ہوئی تھی، یہیں تو حضرت ابراہیم کا وطن تھا۔ وہ تعلیم ان کے خیالات پر اثر انداز ہو رہی تھی۔

یہ ظاہر ہوا ہو گا کہ ان اقوام کا فلسفہ ان کے مذہب کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ لہٰذا بغیر ان کے حالات و واقعات کے معلوم کئے ہوئے ان کا مذہب اچھی طرح سمجھ میں نہیں آسکتا۔ وہ اقوام یہ ہیں۔ عیلام، بابل، عقاد، سمیر، اور اشوری۔ ان کے واقعات کے معلوم کرنے کے دو ہی ذرائع ہیں ایک تو توریت اور دوسرے آثار قدیمہ توریت میں پرانے نام ہیں جن کا معلوم کرنا اور پتہ لگانا اکثر مشکل ہو جاتا ہے۔ اور آثار قدیمہ تو مٹی پتھر ہیں جن کے سمجھنے کے لئے قیاسات کے سوا اور کچھ نہیں۔ ان اقوام کے حالات کو مسلسل ترتیب دیکر ان کی تاریخ لکھنی بہت مشکل ہے۔ اور پھر جو تاریخ بنتی ہے اوس میں قیاسات کا تناسب بہت زیادہ ہوتا ہے۔

دوسری بات جو قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ اگر ان قیاسات کو بھی تاریخی درجہ دیا جائے تو یہ تاریخ بھی حضرت نوح کے بعد ہی سے شروع ہوتی ہے۔ ان اقوام کے واقعات کی تاریخ میں ایک بہت بڑے طوفانِ آب کا ذکر آتا ہے۔ اور اُس طوفان سے پہلے کی تاریخ نہیں ملتی۔ وہ طوفان سوائے طوفان نوح اور کون سا طوفان ہو سکتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بجا ہو گا کہ طوفان نوح میں ساری دنیا غرق ہو گئی سوائے اُن چند نفوس کے جو آپ کی کشتی میں بچ رہے۔ اُس زمانہ کی

آباد دنیا بھی کوئی زیادہ بڑی نہ تھی بس شام وعرب و وادی دجلہ وفرات اور کچھ وادی نیل جو شام سے ملحق تھی۔ اُس زمانہ میں مصر و شام خشکی سے ملے ہوئے تھے۔ یہ تھی اُس زمانہ کی ساری کائنات ابھی ہندوستان وچین مہذب دنیا میں شامل نہیں ہوئے تھے، یہ جو کہا جاتا ہے کہ طوفان نوح میں ساری دنیا نیست و نابود ہوگئی اور اُس کو پھر سفینہ والوں نے آباد کیا درست ہی معلوم ہوتا ہے۔

سب سے پرانے تاریخی زمانہ میں مہذب دنیا میں دو ہی قومیں آباد تھیں آریا اور سامی۔ تمام سامی اقوام کی ابتداء عرب میں ہوئی۔ اور یہ سب قومیں سام ابن نوح کی طرف منسوب ہیں۔ ایک انگریزی مورخ لکھتا ہے جس کا ترجمہ نقل کیا جاتا ہے۔

ترجمہ:۔ سامیوں کا منبع اور پہلی رہنے کی جگہ ملک عرب تھا۔ اُس خشک قطعہ آراضی میں سے کہ جہاں کوئی درخت سوائے شجر انسانی کے نشو و نما نہیں پا سکتا تھا قافلے کے بعد قافلے اُن جفاکش لوگوں کے جن کے گزارے کے لئے جنگل اور نخلستان کافی نہ تھے اور جو اب اُس سے بہتر جگہ کی تلاش میں تھے، سمندر کی لہروں کی طرح ایک دوسرے کے بعد نکلتے آئے اور جو وہیں باقی رہ گئے انھوں نے عرب اور بدوی تہذیب قائم کی۔ (17)

ان قافلوں میں سے بابل، شام، وادی دجلہ و فرات یعنی عیلام وغیرہ وسط ایشائی آبادیاں ہوئیں۔ عیلام وہ ہی رقبہ تھا جو اب ایران کہلاتا ہے۔ شمال میں یہ ملک Caspian Sea تک پھیلا ہوا تھا۔ اس ہی علاقہ سے پھر آریاؤں کی شاخ اُٹھی۔ ایک تو ہندوستان کی طرف گئی اور دوسری یورپ کی طرف گئی اس ہی نام کو لے کر وہ ملک آباد ہوا جس کو ایران کہنے لگے۔ یہ وہ نظریات ہیں جو بذریعہ انکشافات ارضی اب تک ثابت ہو چکے ہیں۔ (18)

(17) Will Durant: Our Oriental Heritage, Chap. xi. P. 291, Chap, xiv. P. 397 & note

(18) Toynbee: Study of History, Vol. I. P. 132n; Vol. ii. P. 134; Vol. iii. P. 447

ان پر نظر غور ڈالنے سے اچھی طرح ثابت ہے کہ ان ممالک کی ساری آبادی کا سرچشمہ اور منبع ایک ہی ہے اور وہ عرب ہے۔ اور زمانۂ قدیم کی مہذب دنیا کی ساری آبادی ایک ہی رشتہ میں منسلک ہے۔ لہذا ان مقامات میں پیغمبروں کا مبعوث ہونا ایسا ہی تھا کہ وہ گویا ساری دنیا کے لئے مبعوث ہوئے۔ اور پھر قریہ بہ قریہ بھی ڈرانے والے اور بشارت دینے والے ہوتے رہے جیسا کہ قرآن شریف کی شہادت ہے۔

عرب میں سے نکل کر ساری دنیا میں آبادی کا ہونا مسلمات تاریخیہ میں سے ہو گیا ہے پہلے وسط ایشیا کا جو نظریہ تھا وہ اب قائم نہیں رہا۔ ایک نامور مورخ لکھتا ہے۔

The term Semite comes from Shem in the Old Testament through the Latine] of the Vulgate, the assumption being that the Semites were the descendants of Noah's eldest son. According to Scientific usage, however, the term is a linuistic one; it applies to him who speaks or spoke a Semitic tongue. The Semitic languages are now recognised as a distinct family comprisiug Assyro—Babylonian (Akkadian), Canaanite (Phoenician), Aramaic, Hebrew, Arabic and Ethiopic....... ....

This linuistic kinship among the Semitic-speaking peoples is the most important bond that justifies their inclusion under one name. but is not the only bond. A comparison of their social institutions, religious beliefs, psychological traits and physical features reveal impressive points of resemblance. The inference is inescapable: at least certain ancestors of those who spoke Babylonian, Assyrian, Amoritic, Canaanite, Hebrew, Amaratic, Arabic and Abyssinian — before they became thus differentiated — must have formed one community speaking the same tongue and occupying the same locale.

Where was the home of that community? The most plausible theory makes it the Arabian peninsula — (The author here gives the reasons on which this view is based.)

Around 3500 B.C. a Semitic migration from the peninsula

moved north-eastward and spread its component nomadic parts over the settled and highly civilised Sumerian population of Mesopotamia, producing the Akkadians (later called Babylonians of history) ....

A millenium or so after the first migration another one from the desert brought and deposited the Amorites in the northern plains of Syria. This migration comprised the people who were seen later in occupation of the maritime plain calling themselves Canaanites and called Phoenicians by the Greeks with whom they traded.

Between 1500 and 1200 B.C. a third exodus from Arabia introduced the Aramaeans into Coel-Syria and the Damascus region and spread the Hebrews in the southern part of the country. About 500 B.C. still another Arabian outflow established the Nabataeans north-east of the Senaitic peninsula, with their capital at Petra, which attained an amazingly high degree of civilisation under Roman auspices. (19)

(اس نظریہ کے لئے کہ عرب ہی تمام سامی اقوام کا ابتدائی گھر تھا۔ دیکھو (۲۰)

ترجمہ۔ لفظ سامی حضرت نوح کے بڑے بیٹے سام کی طرف منسوب ہے جن کا ذکر بائبل کے عہد عتیق میں ہے۔ خیال یہ کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ اون کی اولاد ہیں۔ لیکن سائنس زباندانی کے مطابق یہ لفظ زبان سے زیادہ تعلق رکھتا ہے۔ یہ اُس شخص پر حاوی ہوتا ہے جو سامی زبان بولتا ہے۔ اب سامی زبانیں ایک جدا نوع سمجھی جاتی ہیں جن میں اشوری، آغاز، کنعانی یعنی فینیقیہ، ارامی، عبرانی، عربی اور حبشی زبانیں شامل ہیں۔

---

(19) Philip K. Hitti : History of Syria, Part. ii. Chap. vi. P. 61-4

(20) A'rz-ul-Quran, Vol. i: P. 109 by Syed. Suleman Nadvi

Syke's History of Persia, Vol. i. P. 87 ; see also Will Durant's Our Oriental Heritage, Chap. xi. P. 291.

یہ ہمزبانی کا تعلق یا رشتہ جو سامی زبانیں بولنے والوں میں ہے نہایت اہم سلسلہ ہے جس سے ان سب کا ایک نام کے اندر آنا جائز ہے لیکن یہ صرف تنہا رابطہ نہیں ہے۔ اگر ان کی معاشی اداروں، مذہبی عقائد، نفسیاتی علامتوں اور جسمانی شکل وشباہت کا آپس میں مقابلہ کیا جائے تو بہت سے مشابہت اور مماثلت کے صریح نشانات ملتے ہیں۔ ان سب سے واضح نتیجہ نکلتا ہے کہ ان لوگوں کے آباؤ اجداد جو بابلی، اشوری، اموری، کنعانی، عبرانی، ارامی، عربی اور حبشی زبانیں بولتے تھے، آپس میں جدا ہونے سے پہلے ایک ہی جماعت تھے، ایک ہی زبان بولتے تھے اور ایک ہی جگہ رہتے تھے۔

اس جماعت کی جائے رہائش کہاں تھی؟ نہایت صحیح اور قابل یقین یہ نظریہ ہے کہ وہ جگہ عرب کا جزیرہ نما تھا۔ (یہاں مصنف اس تھیوری کے ثبوت میں وجوہات اور دلائل بیان کرتا ہے۔)

۳۵۰۰ ق م کے لگ بھگ سامیوں کا ایک گروہ عرب سے نکل کر شمال مشرق کی طرف گیا اور عراق میں وہاں کی مہذب قوم سمیر سے جا کر مل گیا۔ اور ان کے اختلاط سے اب قوم آغاد بنی جس کو بعد میں بابلی کہنے لگے۔

اس پہلی نقلِ مکانی کے تقریباً ایک ہزار سال بعد ایک اور جماعت اموریوں کی عرب سے نکل کر شام کے میدانوں میں آباد ہوگئی یہ جماعت اُن لوگوں پر مشتمل تھی جو بعد میں سمندر کے ساحل کے میدانوں میں دیکھے گئے تھے اور اپنے تئیں کنعانی کہتے تھے لیکن یونانی جن کے ساتھ ان کی تجارت تھی وہ ان کو فنیقی کہتے تھے۔

۱۵۰۰ ق م اور ۱۲۰۰ ق م کے درمیان ارامی قوم عرب سے نکل کر شام اور دمشق میں پھیل گئی اور اس طرح عبرانی قوم جنوبی حصے میں آباد ہوگئی۔

پھر ۵۰۰ ق م کے قریب ایک تیسری نقل مکانی عرب سے ہوئی اور اُس میں نبطی لوگ تھے جو عرب سے نکل کر سینائی جزیرہ نما کے شمال مشرق میں آباد ہوگئے اُن کا دار السلطنت شہر PETRA تھا جس نے

رومیوں کی تہذیب کے ماتحت نہایت اعلیٰ درجہ حاصل کر لیا۔

اب ذرا ہم دنیائے قدیم کا اطلس کھول کر اپنے آگے رکھ لیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ یہ قومیں کہاں رہنے لگیں۔ ہمارے سامنے Hammond & Co کا اطلس ہے جس کا نام انھوں نے .The March of Civilisation رکھا ہے۔

اس کے صفحہ B6 پر دنیائے قدیم کا نقشہ ہے۔ یہ سب اقوام عراق میں دریائے دجلہ و فرات کی وادیوں میں رہتی تھیں۔ دنیائے قدیم کی تہذیبیں ہمیشہ دریا کی وادیوں یا سمندر کے ساحلوں پر پیدا ہوئی ہیں اور نشو و نما پائی ہے۔ ہندوستانی آریاؤں کی تہذیب دریائے گنگا، جمنا اور دریائے سندھ کی وادیوں میں بڑھی اور پلی۔ مصر کی تہذیب کا سہارا دریائے نیل تھا۔ فنیقی تہذیب سمندر کے ساحل پر قائم ہوئی۔

عیلام .Elam (عیلام) دریائے دجلہ کے شمال و مشرق کی طرف میڈیا Media سے ملا ہوا تھا۔ بابل کی سلطنت دریائے دجلہ و فرات کے درمیان میں تھی۔ بابلی سلطنت کے شمال میں ان ہی دونوں دریاؤں کے درمیان سلطنت آغاد تھی۔ بابل سلطنت کے جنوب میں سلطنت سمیر اور اُس کے جنوب میں ملک کلدانیان واقع تھا۔ اشوریا آغاد کے شمال میں بحیرۂ خضر یعنی Caspian Bay تک تھا۔ غرض یہ سب سلطنتیں زمانہ حال کے عراق و ایران کے رقبہ میں خلیج فارس کے اوپر Caspian Sea. تک پھیلی ہوئی تھیں۔ میڈیا کا رقبہ اب ایران میں شامل ہے۔ ان سب میں آپس میں لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں اور ایک دوسرے کے ملک پر قبضہ کرتے رہتے تھے۔ ایک مورخ زمانہ حال کے موجودہ نقشہ پر عیلام کے دارالسلطنت سوسا کی حدود اس طرح بیان کرتا ہے خلیج فارس سے دریائے دجلہ کے ساتھ ساتھ اپنی انگلی شمال کی طرف لے چلو۔ اور عمارہ تک اسی طرح چلو۔ پھر مشرق کی طرف عراق کی سرحد کو کاٹ کر موجودہ قصبہ شوشان تک پہنچ جاؤ۔ یہی زمانہ ماضی کے سوسا (Susa) کا رقبہ تھا۔ اور یہ ہی مرکز تھا اُس سلطنت کا جو عیلام کے نام سے مشہور تھی۔ یہ شہر سوسا جس کے مغرب کی طرف جنگلی دلدل اور مشرق کی طرف ایران کے پہاڑ تھے ایک بڑی تہذیب کا مرکز تھا۔ جو 500ھ ق م کے زمانہ میں تھی۔ آئینوں اور جواہرات کے علاوہ یہاں کے مٹی کے برتن ایسے عمدہ اور نفیس بنتے تھے جس سے بہتر انسان اب تک نہیں بنا سکا ہے۔ پہیے دار

گڈون کا استعمال تاریخ بنی نوع انسان میں سب سے پہلے یہاں ہوا۔ یہ شہر سوسا تاریخ کے چھ ہزار برس تک قائم رہا۔ اس کے اوپر سے بہت سی سلطنتوں کے طوفان گزر گئے اور اس کی رونق ویسی ہی رہی۔ سمیریا، بابلی، مصری، اشوری، ایرانی، یونانی اور رومی سلطنتیں باری باری سے اس پر قابض ہوئیں۔ اور اب چودھویں صدی عیسوی تک شوشان کے نام سے اس کی رونق باقی تھی۔

ایران کی سب سے پورانی تہذیب Elam (عیلام) سے شروع ہوئی۔ اس کا دارالسلطنت Susa (سوس) دنیا کا سب سے پورانا شہر ہے جو اب تک معلوم ہوا ہے۔ توریت میں اس ہی عیلام کا ذکر ہے۔ یہ قوم عرب سے نکل کر اس جگہ تقریباً ۳۵۰۰ ق م میں آباد ہوئی۔ بابل اور اسیریا سے اس کی لڑائیاں ہوتی رہیں۔ آخر کار اسیریا کے بادشاہ اشور بانی پال نے اس کی دارالسلطنت پر قبضہ کر کے ۶۴۵ ق م میں اس کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ اس طویل جنگ میں تاریخ کا سبق پھر دھرایا گیا۔ قومیں اپنے ہی ہاتھ سے تباہ و برباد ہوتی ہیں۔ عیلام کی شکست خود عیلامیوں کے ہاتھ سے ہوئی۔ نئے بادشاہ کی تخت نشینی کے موقعہ پر عیلام کے چند شہزادے جلا وطن کر کے نینوا میں بھیجدیئے گئے تھے۔ اس باہمی تفرقہ سے اشور بانی پال نے خوب فائدہ اٹھایا۔ عیلام کی پارٹیوں کو ایک دوسرے سے لڑوا دیا۔ نینوا میں جو شہزادے جلاوطنی کی حالت میں تھے اون کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ فطرتِ انسانی کے مطالعہ کرنے والے کو اس فطرت کے متعلق نتائج نکالنے میں اس سے مدد ملے گی کہ جس فوج نے عیلام کے دارالسلطنت سوسا کو فتح کر کے عیلامی سلطنت کو صفحہ دنیا سے مٹا دیا وہ عیلامیوں ہی سے مرکب تھی اور اس کا جنرل عیلام کا ایک شہزادہ تھا۔ اشور بنی پال کے اصول پر رومیوں نے عمل کیا اور اپنی پالیسی رعایا میں پھوٹ ڈال کر حکومت کرنا قائم کی۔ انگریزوں نے بھی ہندوستان میں اس پر ہی عمل کیا۔ اور شرم سے کہنا پڑتا ہے کہ مسلمانوں کے بادشاہوں نے بھی یہ ہی طریقہ استعمال کیا۔ یہ تو فطرت انسانی کی گراوٹ کی حالت تھی۔ اب اُس کی رفعت بھی ملاحظہ ہو۔ اور صحیح اسلام کے بادشاہوں کی بھی شان دیکھو۔ معاویہ اور حضرت علیؑ کی لڑائیاں دنیا کی سلطنت کے لئے فیصلہ کن لڑائیاں تھیں۔ اور معاویہ نے اس سازشی اصول پر بہت اچھی طرح عمل کیا۔ حضرت علیؑ کے لشکر میں روپیہ کی رشوت

کے ذریعہ سے خوب پھوٹ ڈالی۔ اور جو آدمی رشوت سے مل سکتے تھے انھیں روپیہ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ اور جو رشوت سے بالاتر تھے اُن کا زہر سے خاتمہ کیا۔ اس پھوٹ کا دوسرا ذریعہ حضرت عثمان کے خون کا مطالبہ تھا۔ اور غلط پروپاگنڈا کر کے لوگوں کو اپنی طرف ملا لیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب آخری حیلہ قرآن کو نیزوں پر بلند کرنے کا اختیار کیا تو علیؑ کی تقریباً ساری فوج ہی معاویہ کی ہم زبان ہو گئی۔ لیکن علیؑ نے ان سازشوں اور مکروں کا جواب سازش و مکر سے نہ دیا۔ اگر چاہتے تو وہ یہ اچھی طرح کر سکتے تھے۔ عمرو بن العاص متذبذب تھا کہ علیؑ کی طرف جائے یا معاویہ کی طرف، اگر چاہتے تو علیؑ اس کے تذبذب سے فائدہ اٹھا کر اُس کو اپنی طرف کر لیتے۔ لیکن نہیں کیا۔ اور معاویہ نے حکومت کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ علیؑ نے جب سقیفہ میں سازش نہ کی تو یہاں کیا کرتے۔ تقریباً سارا چودھواں باب کتاب پیدائش یا تکوین عیلام کے ہی متعلق ہے۔ عیلام کا ایک بڑا بادشاہ قدر لغامر تھا۔ جس نے سلطنتِ عیلام کو بحرِ متوسط تک بڑھا دیا تھا۔ اُس کا ذکر توریت کے اس باب میں قدر لاؤمر CHAD OR LOOMER کے نام سے ہے۔

سمیریا اور عقاد (اکاڈ)

پھر نقشہ کو لو خلیج فارس سے وہاں تک جہاں دجلہ و فرات علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں جاؤ اور پھر فرات کے ساتھ ساتھ مغرب کی طرف آجاؤ تو لائن یا راستہ کے شمال و جنوب میں سمیریا کے پرانے شہر زمین میں دبے ہوئے ملیں گے۔ یہ شہر Eridu (موجودہ ابو شہرین) اُر، ur (موجودہ مکیر) اُرک (جو بائبل میں Erech کے نام سے ہے اور موجودہ ورقہ)، لارسا Larsa (بائبل کا Ellazsar موجودہ سینکرہ) لگاش Lagash (موجودہ شیر ولا) Nippur (Niffer) اور نیسین Nisin ہیں لب اگر فرات کے ساتھ ساتھ چلو تو زمانہ قدیم کا نہایت مشہور شہر بابل ملتا ہے اُس کے مشرق میں نہایت قدیم تہذیب کی جگہ Kish کا مقام ہے۔ اس سے اور تقریباً ۶۵ میل آگے فرات ہی کے ساتھ ساتھ چلو تو شہر Agade کا مقام ملتا ہے جو پرانے زمانہ میں سلطنت اکاڈ کا دار السلطنت تھا۔ یہ سارے شہر زمین میں دبے ہوئے تھے

اور اب انیسویں صدی میں زمین کا سینہ چاک کرکے اُنھیں نکالا تو اُس سمیرین تہذیب کا پتہ چلا جو زمانۂ قدیم کے عجائبات میں سے تھی۔ اس تہذیب کو زمین کھود کر نکالنا فن آثار یات قدیمہ کا معجزہ ہے۔ یونانیوں، رومیوں اور یہودیوں کو اس تہذیب کا علم نہ تھا جو ۵۰۰ ۴ ق م کے زمانہ میں اپنی جوانی پر تھی۔ ایک مورخ کہتا ہے کہ ابھی تو اس کی ابتداء ہے۔ جب کھدائی زیادہ ہوگی اور لوگ اُن چیزوں کا مطالعہ کریں گے جو نکلی ہیں تو اس علم میں بہت زیادتی ہوگی۔ ان کھنڈرات سے انسان کی زندگی کی حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ شاعر کا یہ شعر یاد آتا ہے ؎

پردہ داری می کند بر طاق کسریٰ عنکبوت
بوم نوبت می زند بر گنبدِ افراسیاب

اضحت منازلھم قفرا معطلۃ
وساکنوا اھالی الاجداث فد نزلوا

یعنی اُن کے رہنے کے گھر غیر آباد ویران ہوگئے اور ان گھروں کے رہنے والے قبروں میں اُتار دیے گئے۔ صدق اللہ وھو اصدق الصادقین۔

وما الحیوٰۃ الدنیا الا متاع الغرور۔ انسان کی زندگی دھوکا ہی دھوکا ہے۔

پکی مٹی کی الواح زمین میں سے نکلی ہیں۔ جن سے ان کی تاریخ کا کچھ پتہ چلتا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بادشاہ ہوئے۔ جن میں ایک دو نیک اور باقی سب ظالم تھے۔ ان ظالموں میں سے ایک Lugal-Zaggist تھا جس کا زمانہ غالباً ۲۷۷۶ ق م سے ۲۶۵۳ ق م تک تھا۔ ان کے شاعروں کے کلام میں ایک بہت بڑے پانی کے طوفان کا ذکر ہے۔ جس کی تصدیق ۱۹۲۹ء میں Prof. Woolley نے بھی اپنی کھدائیوں کے ذکر میں کی ہے۔

اس ہی درمیان میں قوم عقاد نے سلطنت قائم کر لی تھی۔ اُن کا بادشاہ سرغون Sargon تھا۔ جس کا زمانہ غالباً ۲۶۵۲ ق م سے لغایت ۲۵۹۷ ق م تھا۔ اس کی ماں مندر کی رنڈی تھی۔ مورخین اس کو سرغون اعظم کہتے ہیں کیونکہ اس نے بنی نوع انسان کے لئے عظیم مصائب پیدا کئے تھے۔ مورخین اُس کو ہی اعظم کا خطاب دیتے ہیں جو بنی نوع انسان کا سب سے

زیادہ برباد کرنے والا ہوتا ہے۔ اس سرغون نے Lugal-Zaggisi کو شکست دی اور قید کر کے Nippur لے گیا۔ عیلام کو بھی اس نے فتح کیا اور آخرکار خلیج فارس پہنچ کر اپنے اسلحہ اوس کے پانی میں دھوئے۔ اس کا ایک لڑکا Naram-Sin اُس کا جانشین ہوا۔ اُس کا زمانہ غالباً ۲۷۵۲ ق م سے ۲۵۱۷ ق م تک تھا۔

Ur. بھی نہایت دولتمند اور آرام وعیش وعشرت کا شہر تھا۔ حضرت ابراہیم Ur ہی کے علاقہ کے رہنے والے بیان کئے جاتے ہیں، اس شہر کا زمانہ ۳۵۰۰ ق م سے ۷۰۰ ق م تک تھا۔ اس کا سب سے بڑا بادشاہ Ur-enger. تھا جس کا زمانہ پُرامن تھا۔ تمام مغربی ایشیا کو اپنے قبضہ میں لے لیا۔ اور تمام سلطنت سمیریا کے لئے ایک ضابطۂ قانون مرتب کیا۔ تاریخ میں یہ پہلا ضابطۂ قانون ہے۔ اس کا بیٹا Dungi اُس کا جانشین ہوا جس نے نہایت کامیابی سے اٹھاون سال حکومت کی۔ اس کامیابی کی وجہ سے اُس کو خداؤں کی جماعت میں داخل کر لیا گیا اس کی اور اس کے تین جانشینوں کی پرستش برابر خدا سمجھ کر ہوا کی۔

اب یہ امن وامان کا زمانہ ختم ہوا۔ اہل عیلام اور دیگر اقوام نے جن کو اُنھوں نے فتح کیا تھا سمیریا اور اکاڈ سے بدلہ لیا۔ یہ غالباً ۲۱۸۰ ق م کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ یہ بدامنی کا زمانہ ۲۰۰ سال تک رہا۔

پھر بابل کے رہنے والے اموری خاندان کے ایک فرد حمورابی Hammurabi. (۱۹۴۷ ق م تا ۱۹۰۵ ق م) نے سلطنت سمیر واکاڈ کو از سرِنو زندہ کیا۔ دنیائے قدیم کا یہ بہت مشہور بادشاہ ہے۔ اس کی شہرت فتوحات سے زیادہ اس کے ضابطہ قانون پر مبنی ہے جو اُس زمانہ کے لحاظ سے نہایت اعلیٰ تھا۔ اکثر اس کا مقابلہ حضرت موسیٰ کے قانون سے کیا جاتا ہے۔ جو قانون حمورابی سے تقریباً پانچ صدیوں بعد آیا تھا۔ لیکن اخلاقی معیار میں حمورابی کا قانون حضرت موسیٰ کے قانون کو نہیں پہنچتا۔ امور سیاست

میں اخلاق کے معیار کو بلند رکھنا بڑی بات ہوتی ہے۔ یہ بھی ممکن ہے جیسا علامہ سید سلیمان ندوی نے ارض القرآن میں لکھا ہے کہ حمورابی حضرت ابراہیم کا ہم عصر ہو اور یہ قانون اُس نے حضرت ابراہیم کی شریعت سے لے کر بنایا ہو۔ کرنل سائیکس نے اپنی تاریخ ایران میں حمورابی کا زمانہ سلطنت ۲۲۶۷ ق م سے لے کر ۲۲۱۳ ق م تک لکھا ہے۔ لیکن ہم اوپر کی لکھی ہوئی تاریخوں کو جو Toynbee سے لی گئی ہیں قابل ترجیح سمجھتے ہیں۔

حمورابی کا حلیہ جو Toynbee نے حمورابی کے مجسمہ سے لے کر لکھا ہے۔ قابل ذکر ہے۔ سر کے بال بالکل کترے ہوئے۔ اوپر کا لب بالکل منڈا ہوا، ڈاڑھی لمبی، یہ ہے اُس کا حلیہ جو اُس نے اپنے اموری آبا و اجداد سے ورثہ میں پایا تھا۔ گویا حضرت ابراہیم سے بہت پہلے سے یہ وضع قطع چلی آئی ہے۔ آپ نے کبھی اپنے محلہ کی مسجد کے امام کو دیکھا ہے۔ یہ ہی وضع قطع اُس کی ہوتی ہے۔ مسجد کے یہ ملا واقعی قابل عزت ہیں جنھوں نے اتنی پورانی وضع کو برقرار رکھا ہے۔(۲۱)

اہل سمیریا بھی اپنے مردوں کے ساتھ سونا، چاندی، جواہرات، آلات حرب وغیرہ دفن کر دیتے تھے جو ان کی قبروں سے اب برآمد ہوئے ہیں۔ غلامی کا رواج بہت زیادہ تھا۔ بیماریوں کے متعلق ان کا خیال تھا کہ بدن پر بد ارواح کے قبضہ کر لینے سے پیدا ہوتی ہیں۔ جھاڑ پھونک کو دوا پر ترجیح دی جاتی تھی۔ قمری مہینوں کا استعمال تھا۔ ہر ایک تیسرے یا چوتھے سال ایک مہینہ زیادہ کر دیتے تھے تاکہ مہینے موسم کے مطابق ہو جائیں۔

مذہب:۔ بادشاہ Ur-engor نے اپنا ضابطہ قانون اپنے خدا شمس کی طرف منسوب کیا تھا۔ ان کے یہاں بھی خداؤں کی کثرت تھی۔ ہر ایک شہر کے لئے خدا تھا۔ انسان کا ہر کام کسی نہ کسی خدا سے منسوب ہوتا تھا۔ سورج کی پرستش بہت پرانی تھی۔ شمس خدا بہت بڑا خدا مانا جاتا تھا۔ اُس کی نسبت خیال کیا جاتا تھا کہ رات وہ شمال کی تاریکیوں میں گزارتا تھا۔ صبح ہوتے ہی وہ آسمان پر

(۲۱) (21) Toynbee's Study of History, Vol. V. P 229n.

چڑھ جاتا تھا۔ سورج اُس کی رتھ کا صرف ایک پہیہ تھا۔ شہر Nippur کا بڑا خدا انلیل Enlil تھا۔ اُس کی بیوی نن لیل Nin-lil تھی۔ یورک Uruk میں کنواری خدائنی Innini کی پرستش ہوتی تھی۔ آغاد اُس کو ہی Ishtar. کہتے تھے۔ لگاش میں Ninkarsag. خدائنی کی عبادت ہوتی تھی۔ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ رحمدل خدائنی ہے جو انسانوں کے رنج وغم میں شریک ہے اور سنگدل خداؤں سے اُن کی سفارش کرتی ہے۔ غرض اسی طرح کے بہت سے خدا تھے۔ ان کا بھی یہ ہی تصور تھا کہ ساری ہوا میں۔ جن، بھوت، پریاں اور فرشتے رہتے تھے۔ فرشتے نیک ارواح تھیں۔ ہر ایک سمیری کے ساتھ ایک فرشتہ اُس کی حفاظت کے لئے ہوتا تھا۔ اور ایک بری روح بھی ہوتی تھی۔ جس کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ اچھے فرشتے کو دور کر کے خود سمیری کی روح و جسم پر قبضہ کر لے۔ اُن کا اعتقاد تھا کہ ہر ایک مندر میں خدا بستے ہیں جن کو خوراک، دولت اور عورت پہنچانا ان لوگوں کا فرض تھا۔ اُن کے خداؤں کے کھانے میں بیل، بکری، بھیڑ۔ فاختہ، مرغی کے چوزے، بطخیں، مچھلی، کھجوریں۔ ککڑیاں، کھیرے، انجیر، مکھن، تیل روٹیاں ہوتی تھیں۔ پہلے پہلے انسان کا گوشت بھی ہوا کرتا تھا۔ ایک لوح میں لکھا ہوا ملا ہے "بھیڑ (Lamb) انسان کے عوض میں ہے اور انسان نے اپنی جان کے عوض بھیڑ دیدی ہے" یہ وہ ہی تخیل ہے جو یہودیت اور مسیحیت میں Lamb کے متعلق ہے۔ قدرتی طور پر مندروں کے پروہت بہت دولت مند اور صاحب اختیار اور صاحب رسوخ ہو گئے۔ درحقیقت وہ ہی بادشاہ ہوا کرتے تھے۔ اور بادشاہوں اور مذہبی سرداروں کے تنازعات شروع ہو گئے تھے۔

اس موت کے بعد روح کی کسی حالت کے تو معتقد تھے لیکن جنّت و دوزخ کا خیال نہیں آیا تھا۔ یونانیوں کی طرح سمجھتے تھے کہ تمام مردوں کی روحیں خواہ نیک ہوں خواہ بد ایک تاریک جگہ میں بھیجدی جاتی ہیں۔ اون کی عبادت قربانیاں اور دعائیں محض اس دنیا کے مفاد کے لئے ہوتی تھیں۔

اُن کا اعتقاد تھا کہ خداؤں نے انسان کو خوشی و راحت کے لئے پیدا کیا تھا۔ لیکن اُس کو اپنے ارادہ میں مختار بھی بنایا تھا، اس آزادی ارادہ کی وجہ سے

انسان نے گناہ کیئے - اور گناہوں کی سزا میں ایک بہت بڑا طوفانِ آب آیا جس میں سب سوائے ایک جولاہے نامی ڈگ ڈگ کے غرق ہو گئے - لیکن پھر اس جولاہے نے بھی ایک شجر ممنوعہ کا پھل کھالیا جس کی وجہ سے بقاء دوام اور طوالت عمر سے محروم کر دیا گیا - یہ صاف بتا رہا ہے کہ انبیاء کی تعلیم اون کے کانوں میں پڑی ہوئی تھی -

ان کی عبادت گاہوں کے ساتھ جوان اور حسین عورتیں ہوا کرتی تھیں خداؤں سے اور ان کے نمائندگان پروہتوں سے مباشرت کرنے کی خدمت ان کے سپرد ہوا کرتی تھی تاکہ ان کے خدا مندروں میں آنکر اس حظ و راحت سے محروم نہ رہیں - باعزت اور شریف خاندان کی عورتیں اس خدمت کو اپنا شرف سمجھتی تھیں - اور لڑکیوں کے باپ فخر کرتے تھے کہ اُن کی لڑکیاں اس قابل سمجھی گئیں - بلکہ ان کا جہیز بنا کر اس مندر کے پروہتوں کے حوالہ کر دیتے تھے -

بابل (Babylon.)

عقاد اور سمیریوں کی تہذیبوں اور قوموں سے مل کر بابل کی تہذیب اور بابلیوں کی قوم پیدا ہوئی ہے - بابل تمام جنوبی عراق کا دارالسلطنت تھا - یہ امر واقعہ ہے کہ اس کی تہذیب کے بہت سے حصے زمانہ حال کی تہذیب میں موجود ہیں اور اس قوم نے دنیا کو وہ علوم سکھائے جو اب تک یاد ہیں - علم نجوم کی ابتدا بابل میں ہوئی اور یہ اُس کا خاص علم تھا - یونانیوں کو بابل ہی نے فلسفہ سکھایا - ریاضی سکھائی اور علم طبیعیات کے سبق دئے - سب سے پہلے قانون کا ضابطہ بابل ہی نے بنایا - اس کے مشہور بادشاہوں میں سے حمورابی پہلا مشہور بادشاہ ہے - اور اس کا ہی ضابطہ قوانین مشہور ہے - سحر و جادو دنیائے قدیم میں بہت رائج تھا - اور اگر اُس کی ابتداء بابل میں نہیں ہوئی تو یہ تو یقینی امر ہے کہ اُس کا عروج یہاں ہی ہوا - زمانۂ قدیم کے بہت سے پیغمبروں کی تعلیم سے اہل بابل واقف تھے - ایک مورخ جو مذہب کی قیود سے آزاد ہے کہتا ہے کہ یہودیوں کو اُن کی داستانیں .Mythology بھی بابل سے ملی ہیں[۲۲] - انبیاو

(22) Will Durant: Our Oriental Heritage. Chap. ix. P.218

کے حالات کو اُس نے داستانوں سے تعبیر کیا ہے۔

قرآن شریف سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ اہل بابل کو انبیاء اور اُن کی تعلیم کا علم تھا۔ اور نیز یہ کہ جادو میں اُنھوں نے بہت ملکہ حاصل کر لیا تھا۔ ۲۳؎

جادو کیا ہے اس کی اصلیت کتنی ہے۔ اس میں کچھ اثر ہے یا نہیں۔ اور اگر اثر ہے تو کیوں۔ اس بحث کو، فلسفہ اسلام حصہ دوم میں دیکھو جہاں یہ بحث تفصیل سے درج کی گئی ہے۔ اور اسلام کا نظریہ بتایا گیا ہے۔

اسی طرح نجوم اور نجوم کی پیشین گوئیوں کی مفصل بحث فلسفہ، اسلام حصہ دوم میں دیکھو۔

بابل کی کہانی تو بہت بڑی ہے جس نے یونان کو فلسفہ سکھایا، دنیا کی توجہ علم ہیئت کی طرف دلائی، بہترین ضابطہ قانون پیش کیا، جو موجودہ مغربی تہذیب کا سرچشمہ ہے۔ جس نے نہایت عظیم الشان سلطنت پیدا کی اُس کی داستان کے لئے تو کئی راتیں چاہئیں۔ اور پھر بھی یہ کیفیت ہو گی کہ ع شب آخر گشتہ و افسانہ از افسانہ می خیزد۔ اختصار کے ساتھ ہم چند باتیں کہتے ہیں:۔

اس کے دو بادشاہ بہت عظیم الشان گزرے ہیں۔ ایک تو حمورابی اور دوسرے دور میں بنو حذرزار Nebuchadrezzar جس کا ذکر بائیبل کی کتاب دانیال میں ہے۔ اور جس کا زمانہ ۶۰۵ ق م سے ۵۶۲ ق م تک تھا

حمورابی Hammurabi اس کا زمانہ ۲۱۲۳ ق م سے ۲۰۸۱ ق م تک رہا ہے

اس کا ضابطہ قوانین بہت مشہور ہے جس کو ۱۹۰۲ء سے پہلے کوئی جانتا بھی نہ تھا، اُس سال Susa کی کھدائیوں میں ایک بڑے مخروطی شکل کے خاص پتھر کے ستون پر یہ ضابطہ کھدا ہوا ملا، جہاں اس کو تقریباً B.C. ۱۱۰۰ میں بابل سے بطور مال غنیمت عیلام کی افواج لے گئی تھیں۔ اس ضابطہ میں 285 دفعات ہیں۔ ایک امریکن مورخ کہتا ہے کہ یہ ضابطہ زمانہ حال

۲۳؎ (23) Holy Quran Sura Al-Baqar, Ayets 102, 103.

کے یوروپین ممالک کے ضابطوں سے کسی حالت میں کم نہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ کئی امور میں اُن سے بہتر ہے اُس کی رائے میں اس کا اور حضرت موسیٰ کے ضابطہ قانون کا مخرج ایک ہی ہے ؁ حمورابی اور حضرت موسیٰ دونوں کا دعویٰ ہے کہ اپنا اپنا ضابطہ وقانون براہِ راست اُنھوں نے خدا سے حاصل کیا ہے۔

حمورابی کا ضابطہ قانون انصاف، رحم، زیرکی پر مبنی ہے۔ اور اُس میں بہت سے اصول ایسے ہیں جو اسلام کے فقہ کے مطابق ہیں مثلاً قصاص، عدل، غریبوں کی حفاظت ظلم سے پرہیز وغیرہ وغیرہ۔ اس ضابطہ کے انصاف کا نمونہ ہم بتاتے ہیں۔ اس میں ایک دفعہ یہ تھا کہ اگر ملزم نے ڈاکہ ڈالا ہے، چوری کی ہے، یا کسی کو ناجائز قتل کیا ہے اور ملزم بھاگ گیا ہے دستیاب نہیں ہوتا تو مستغیث خدا کے سامنے قسم کھا کر کہیگا کہ میرا اتنا نقصان ہوا ہے تو پھر وہ رقم شہر کے گورنر کو ادا کرنی ہوگی۔ قتل کی صورت میں ایک مقررہ رقم ادا کرنی پڑتی تھی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ حکومت کی غفلت ہی سے ایسا ہوتا ہے۔ لیکن آج مہذب دنیا میں کوئی ملک ایسا ہے جو اپنے یہاں یہ نہایت عادلانہ قانون جاری کرے۔

حمورابی کی حکومت ۲۱۲۳ ق م تا ۲۰۸۱ ق م رہی ہے۔ اس کے خاندان کا خاتمہ حطی قوم کے بادشاہ نے ۱۷۵۰ ق م میں کر دیا۔ وہ تو لوٹ مار کر کے چلا گیا۔ اور بابل پر قوم KASSITES کا قبضہ ہوگیا۔ ان کی سلطنت ۱۷۵۰ ق م سے ۱۱۷۳ ق م تک رہی۔ ایک مورخ نے اس سلطنت کا زمانہ ۱۷۴۶ ق م سے ۱۱۶۹ تک لکھا ہے۔

اس ہی دوران میں اشور (Assyria.) کی طاقت بڑھنے لگی اور آخر کار Assyria. کے بادشاہ سناخرب (۷۰۵ ق م تا ۶۸۱ ق م) نے ۶۸۹ ق م میں بابل پر قبضہ کر کے اپنے لڑکے Esarhaddon کو اپنی طرف سے وہاں کا گورنر جنرل بنا دیا لیکن بابل نے میڈیا Media سے ساز باز کر لی اور میڈیا نے اسیریا کے دار السلطنت نینوا پر ۶۱۲ ق م میں قبضہ کر کے اسیریا کو ختم کر دیا۔

؁ (24) Will Durant: Our Oriental Heritage. Chap. ix. P. 230n

اور نینوا ایسا برباد ہوا کہ پھر نہ آباد ہوا۔ بابل کو ایران کے بادشاہ کروش اعظم Cyrus the Great. نے ۵۳۹ ق م میں فتح کر کے اپنے ملک میں ملا لیا۔

مذہب:۔ اہلِ بابل کا وہی مذہب تھا جو سمیریوں اور آکادیوں کا تھا۔ شہر کا بادشاہ شہر کے خدا کا نائب سمجھا جاتا تھا۔ اور اسی وجہ سے ٹیکس خدا کے لئے ہوتے تھے اور اُس کی طرف سے ہوتے تھے۔ اور جمع ہو کر مندروں کے خزانوں میں جاتے تھے۔ جس طرح یورپ کے بادشاہوں کا طریقہ تھا۔ اور انگلستان کا اب تک ہے کہ بادشاہ بادشاہ نہیں سمجھا جاتا تھا جب تک پوپ یا اہل چرچ اُس کو تاج نہ پہنا دیں۔ اسی طرح بابل کا بادشاہ اپنی حکومت اور اپنا اختیار پروہتوں سے لیتا تھا۔ اس کی بڑی رسم یہ ہوتی تھی۔ کہ ایک جلوس نکلتا تھا اور بادشاہ سب سے بڑے خدا مردک کی مورتی ہاتھ میں لے کر آگے آگے چلتا تھا۔ بادشاہ کی پوشاک بھی پروہت کی سی ہوتی تھی۔ بادشاہ کے لئے اس کا سب سے زیادہ فائدہ یہ تھا کہ بادشاہ سے بغاوت کرنا خدا سے بغاوت کرنے کے مرادف تھا۔ بابل کی سلطنت ہمیشہ مذہبی سلطنت رہی ہے۔ اس طرح مندروں کی دولت بہت بڑھ گئی تھی۔ امراء اپنے گناہوں کے تاوان کا روپیہ مندر کو بھیجتے تھے۔ اور بادشاہ کو اگر کچھ خوشی کا موقع ہوتا تھا تو وہ بھی نذرانہ اور شکرانہ مندروں ہی کو بھیجتا تھا۔ فوج کے مال غنیمت کا بھی بڑا حصہ سب سے پہلے مندر کو ملتا تھا۔ بہت سی زمینیں مقرر تھیں جن کی پیداوار مندروں کو ملتی تھی۔ اس طرح پروہت بہت امیر ہو گئے اور وہ تجارت کرتے کرتے بڑے تاجر بن گئے۔ اپنا روپیہ کم سود پر لوگوں کو دیتے تھے۔ بسا اوقات غریب قرض داروں سے اصل بھی واپس نہیں لیتے تھے۔ یہ کہہ کر اُن سے درگذر کر جاتے تھے کہ جب مردک تم پر مہربان ہو گا اور تم امیر ہو جاؤ گے تو ہمارا روپیہ دیدینا ورنہ نہیں۔

بابل کے بھی بے شمار خدا تھے۔ ایک دفعہ حکومت نے ان کی فہرست بنوائی تو وہ ۶۵۰۰۰ نکلے، ہر ایک شہر، ہر ایک گانوں کے ہر ایک خاندان کے علحدہ علحدہ خدا تھے۔ اُن کی علحدہ علحدہ پرستش ہوتی تھی۔ اور سب سے بڑے خدا کو بھی مانتے تھے۔ اُس کی بھی پرستش کرتے تھے۔ وہ خدا بھی آدمیوں سے

ملے جلے رہتے تھے۔ مندروں میں اُن کی بود و باش تھی۔ وہیں وہ کھانا کھاتے تھے۔ اور وہیں وہ مذہبی حسین عورتوں کے وصل سے متمتع ہوتے تھے۔ اور بابل کی آبادی بڑھایا کرتے تھے، غرضکہ پروہت ہر بہانے سے ہر ایک عمدہ چیز لیتا تھا، دولت، عزت، عورت سب اُس کو مل جاتے تھے، اور وہ سب خدا کے نام پر۔

بابل کے سب خداؤں کا تذکرہ کرنا بے سود ہے۔ اور اس کتاب کے مقصد سے باہر۔ ان خداؤں میں مردوک سب سے بڑا خدا تھا۔ لیکن Bal یا Bel بھی بہت اہم تھا۔ یہ زمین تھی جس کو خدا تصور کیا گیا تھا۔ ہر ایک آدمی آخر کار اس میں ہی جاتا تھا۔ لہٰذا اس کی بہت پرستش کی جاتی تھی۔ بابل دراصل باب بل تھا۔ یعنی بل خدا کا دروازہ۔ کثرتِ استعمال سے بابل ہو گیا۔

ایک خدائینی اشتر Ishtar تھی۔ یہ وہ ہی تھی جو شام میں Astarte، یہودیوں میں Ashtoreth تھی۔ مصر میں اس کے مقابلہ میں Isis یونان میں Aphrodite اور روم میں Venus تھیں۔ Ishtar کی صفات بھی دلچسپ اور متضاد تھیں۔ وہ عشق کی دیوی بھی تھی اور لڑائی کی بھی خدائینی تھی۔ وہ ماؤں کی بھی محافظ خدائینی تھی اور رنڈیوں کی بھی۔ اور اُس کو مہربان قحبہ کہتے تھے۔ اہلِ بابل اس کو کنواری، مقدس کنواری اور کنواری ماں کہہ کر پکارتے تھے۔ ایک دفعہ اُس کو ایک شیر سے عشق ہو گیا۔ اُس کو بہلا کر اپنے پاس بلا لیا اور اپنا کام کرا لیا اور پھر اُس کو قتل کر دیا۔

تخلیق کائنات کا قصہ بھی سنئے۔ پہلے کچھ نہیں تھا طیامت (Tiamat) خدائینی اور Apsa یعنی سمندر باپ تھے۔ ان دونوں کے پانی ملے اور چیزیں بننی شروع ہوئیں۔ اتنے میں طیامت نے باقی تمام خداؤں کو مار ڈالنے کی کوشش کی۔ اُس وقت مردوک بڑے خدا نے مداخلت کی اور طیامت کو قتل کر دیا۔ اس طرح کہ جب اُس نے مردوک کو نگلنے کے لئے مُنہ کھولا تو مردوک نے اندر نیزہ ڈال کر ختم کر دیا۔ مردوک نے مردہ طیامت کے دو حصے کئے۔ ایک حصہ کو اوپر لٹکا دیا تو وہ آسمان بن گیا۔ دوسرا حصہ اُس نے اپنے پیروں

کے نیچے رکھا اور وہ حصّہ زمین بن گیا۔

اسیریا Assyria.

بابل کی سلطنت کے دوران میں اُس سے تین صد میل شمال کی طرف اسیریا کی سلطنت قائم ہو چکی تھی۔ عیلام، اسیریا، عقاد، اور بابل کی تہذیبیں ایک ہی سلسلہ میں اور ایک دوسرے کے مشابہ تھیں جو تہذیب سمیریا میں شروع ہوئی تھی وہ ہی بابل میں پختہ ہوئی اور جو تہذیب بابل میں پختہ ہوئی تھی وہ اسیریا میں جاکر مکمل ہوئی۔

اسیریا کی سلطنت چار شہروں کے اردگرد قائم ہوئی تھی یعنی (۱) اشور موجودہ قطعات شیر گھاٹ (۲) اربیلا موجودہ اربل (۳) کلخ موجودہ نمرود اور (۴) نینوا موجودہ کیونجک Kuyunjik۔ اشور دراصل ان کا ایک خدا تھا جس کے نام پر اشور شہر آباد ہوا۔ نینوا بھی ایک خدا نینی Nina کے نام پر آباد ہوا تھا۔

اسیریا کی سلطنت کے دو امور بہت نمایاں ہیں ایک تو اس کی فتوحات اور وسعت اور دوسرے اس کے بے انتہا مظالم۔ اگر ان کے ظلموں کی مثال ملتی ہے تو وہ اسیریا کے جانشینوں یعنی دمشق کے فرماں روایوں ہی کے کارناموں میں ملتی ہے۔ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اسیریا نے وہ ظلم اپنے دشمنوں پر کیئے اور اموی شاہانِ دمشق نے وہ ظلم اپنے بھائیوں پر کیئے۔ فتوحات میں بھی دمشق ہی نینوا سے ٹکر کھاتا ہے۔

شروع شروع میں اسیریا کی حکومت محض شہر اشور پر مشتمل تھی۔ یہ شہر دریائے دجلہ کے کنارے Agade. کے شمال کی طرف واقع تھا۔ اشور کی حکومت کی تاریخ کئی حصّوں میں منقسم ہو سکتی ہے۔ ایک تو وہ زمانہ تھا جب تقریباً ۳۵۰۰ ق م میں عرب کی سرزمین سے کئی جماعتیں نکل کر یہاں آباد ہوئیں۔ اون میں سے ایک جماعت نے اشور میں سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ یہ سلطنت ۳۵۰۰ ق م سے ۱۸۰۰ ق م تک اسی حال میں رہی۔ پھر

۱۸۰۰ ق م اور ۱۵۰۰ ق م کے درمیان یہ اسیریا کی سلطنت بڑھنی شروع ہوئی اور شمال کی طرف پھیلی۔ اب اشور کی بجائے نینوا دارالسلطنت ہوگیا۔ اسیریا اس راستہ پر واقع تھا جو بابل سے مغرب کی طرف ملتا تھا۔ اُس نے ہمسایہ سلطنتوں کو فتح کرنا شروع کردیا۔ اس کی لڑائیاں اکثر بابل سے رہی ہیں ۱۳۰۰ ق م کے قریب ارامی (عربی) قوم نے عرب سے نکل کر ان تمام سلطنتوں پر قبضہ کرلیا۔ اور اسیریا کی پوراتی سلطنت کا خاتمہ کردیا۔ ۹۷۰ ق م میں پھر اسیریا نے ابھرنا شروع کردیا۔ یہ اسیریا کی حکومت وسطی کہلاتی ہے جو ۹۷۰ ق م سے ۷۴۵ ق م تک رہی۔

ظلم وفتوحات میں اس سلطنت کا درجہ بہت اونچا تھا۔ اس زمانہ میں ایک بادشاہ اشورنذیر پال .Assurnazirpal تھا جس کا زمانہ حکمرانی ۸۸۴ ق م سے ۸۶۰ ق م تک تھا۔ اُس نے بہت سے ملکوں کو فتح کرلیا۔ قیدیوں کو جمع کرکے جن میں بچے بھی ہوتے تھے یک لخت آگ میں زندہ جلادیتا تھا۔ اس سلطنت کے ظلموں سے تنگ آکر تمام ماتحت سلطنتوں نے اس کے خلاف سازش واجتماع کرکے بغاوت کی اور آزادی حاصل کرلی۔ اب تیسری اور آخری دفعہ پھر اسیریا کی حکومت قائم ہوئی جو ۷۴۵ ق م سے ۶۱۲ ق م تک رہی۔ اس آخری دور میں اشوریہ کے بادشاہ سلطنت ہوئے ہیں۔ ایک سے ایک زیادہ ظالم تھا اور اُن میں بھی اشور بانی پال .Assurbanipal بہت ہی ظالم تھا۔ اسیریا کی سلطنت دنیائے قدیم کی تہذیب وتمدن کی وارث تھی۔ یونانی تہذیب پر اس کا بہت زیادہ اثر تھا۔ یوں بھی یونان کے اوّلین اور بڑے بڑے فلاسفر ساحل ایشیائی کوچک کے رہنے والے تھے۔ اسیریا کا اثر سیریا یعنی شام سے ہوتا ہوا یورپ میں پھیلا تھا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اس کی تہذیب کے اثرات اور اس کی فوجی تنظیم اور طریقہ جنگ کے بہت سے اصول اب تک دنیا کی بڑی طاقتوں کے زیر عمل ہیں۔ دمشق کے امویہ بادشاہوں نے اپنے ظلموں میں اسیریا کی تقلید کی ہے۔ سلاطین سابق کی تقلید میں یزید نے اپنے تئیں خدا منواتے کی کوشش کی تھی۔ اسیریا بہت ہی لڑاکا قوم تھی۔ اور جب تک یہ سلطنت قائم رہی اس نے اپنے ہمسایوں کو چین سے بیٹھنے نہ دیا۔

اشور بانی پال Assurbanipal کا زمانہ سلطنت ۶۶۸ ق م سے ۶۲۶ ق م

تک تھا۔ یہ بڑا فاتح اور ظالم تھا۔ اُس نے خود اپنے ظلموں کی فہرست دی ہے اور ان کو فخر سے بیان کیا ہے۔ جب اُس نے عیلام کو فتح کیا تو وہاں کے تقریباً سارے باشندوں کو تہِ تیغ کر دیا یا قیدی بنا لیا۔ کوئی جانور اور وہاں کا کوئی خدا نہ چھوڑا سب کو اپنے دارالسلطنت نینوا میں لے گیا۔ اُس زمانہ میں اور ان کے مذہب میں خدا بھی قیدی بنائے جا سکتے تھے۔ عیلام کو سنہ ۶۳۹ ق م میں فتح کیا پھر Susa کو لوٹ لیا۔ اور وہاں کے مردہ بادشاہوں کی ہڈیوں کو ان کی قبروں سے اکھیڑ کر نینوا میں بھیج دیا۔ اور اُن کی ہڈیوں پر وہ رسومات ادا کیں جو اُن کے عقائد کے بموجب ہڈیوں کے اندر رہنے والی ارواح کو ازسرِنو زندہ کر دیتی ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ وہ زندہ ہو کر اپنے ملک کی تباہی کو دیکھیں اور جلیں۔ مردوں کی ارواح کو تکلیف دینے کی یہ نئی ایجاد تھی جو اسیریا جیسے ظالموں ہی سے ممکن ہے۔ عیلامی بادشاہ کا سر اس کی محفل عیش و عشرت میں رکھا گیا۔ پھر اُس کو نیزے پر چڑھا کر نینوا کے دروازے پر لٹکا دیا۔ اس ہی رسم و رواج کی تقلید اموی بادشاہ یزید کیا کرتا تھا۔ عیلامی جنرل کی زندہ کھال کھنچوائی گئی اور پھر بکرے کی طرح اُسے ذبح کیا گیا اُس کے بھائی کو جانور کی طرح ذبح کر کے اُس کی بوٹیاں کیں۔ اور ان بوٹیوں کو تمام لوگوں میں تقسیم کر دیا۔ مسلمان بادشاہوں نے بھی اسیریا ہی کی تقلید کی جب وہ زندہ آدمیوں کی کھال کھنچواتے تھے اور گدی کے پیچھے سے زبان نکلواتے تھے۔ نفسِ اسلام اس نوعیت کی سزا کو کبھی روا نہیں رکھتا۔

آخر کار اس کے ظلم رنگ لائے۔ مفتوحہ اقوام سر مل کر اس کے خلاف ایک بڑی سازش کی۔ اشور بانی پال نے اپنی طرف سے اپنے بھائی .Shamash shum ukin کو بابل کا حاکم مقرر کیا تھا۔ خدا کی قدرت دیکھو وہ ہی بھائی اُس سازش کا لیڈر تھا جو اشور بانی پال کے خلاف اٹھی تھی۔ اُس سازش میں سلطنت بابل، عیلام، کلدانی قبائل، ارامی قبائل، شمالی عرب اور بہت سی شام کی جنوبی ریاستیں اور مصر کی سلطنت شامل تھیں، اشور بانی پال کو بہت تعجب ہوا، جب اُس نے دیکھا کہ اس بڑی تحریک کا لیڈر خود اُس کا بھائی ہے۔ بادشاہوں کو اکثر ایسے تعجب کے مواقع پیش آتے ہیں اشور بانی پال کی دلی حالت کا اندازہ اُس کی اپنی تحریر سے ہوتا ہے جسے ہم نیچے درج کرتے ہیں۔

۔۔ میں نے سارے مذہبی فرائض ادا کئے ہیں۔ میں نے مُردوں کے لئے قربانیاں کی ہیں۔ اور اپنے آباؤ اجداد بادشاہوں کے بھوتوں کے لئے شراب چڑھائی۔ پہلے یہ باتیں موقوف ہو گئی تھیں۔ میں نے از سرِنو ان کو جاری کیا۔ اور اُن کے قواعد بنائے۔ میں نے خداؤں اور آدمیوں کے ساتھ نیکی کی۔ مُردوں اور زندوں کے ساتھ بھلائی کی۔ پھر کیوں بیماری، مصائب اور آلام نے مجھے گھیر لیا ہے۔ ملک میں جو بدامنی ہے میں اُس کو دور نہیں کر سکتا۔ اور میرے خاندان میں جو تفرقے اور جھگڑے ہیں اُن کو میں نہیں روک سکتا۔ تکلیف دینے والی بدنامیاں مجھے ہمیشہ ستاتی ہیں۔ دماغی اور جسمانی کوفت مجھے مار ڈالتی ہے۔ میں رنج و غم میں رو رو کر اپنے دن گزار رہا ہوں۔ شہر کے خدا کی عید کے دن بھی میں مصیبت زدہ بدبخت غمگین ہوں۔ موت میری طرف آ رہی ہے۔ غم و ماتم، آہ وزاری میں میں اپنے دن پورے کر رہا ہوں۔ میں کہتا ہوں اے خدا میرے جیسے گنہگار کو بھی توفیق دے کہ میں تیرا نور دیکھوں۔ کب تک اے خدا تو مجھ پر عذاب نازل کرے گا۔ میرے ساتھ تو وہ سلوک ہو رہا ہے جس کا وہ شخص مستحق تھا۔ جو کبھی نہ خدا سے ڈرا ہو۔ اور نہ اُس کی بیوی خدا تعالیٰ سے ڈرا ہو۔[25]

یہ دنیا کی بے وفائی کا اچھا نمونہ ہے۔ یہ اُس زمانہ کے سب سے بڑے سلطنت کے بادشاہ کی حالت ہے۔ اب کس طرح بے گناہ بن کر اُن لعنات کو جتار ہا ہے جو اُس نے اپنے زعم میں اپنے خداؤں پر کئے تھے۔ اور خود جو ظلم کئے تھے وہ بالکل بھول گیا۔ یہ ذہنیت ایسی ہی ہے کہ جو شخص حج، نماز، عبادت، اس غرض سے کرتا ہے کہ پچھلا کیا ہوا گناہ تو سب دھل جائے اور اب مزید موقع دوبارہ وہ ہی ظلم وستم کرنے کا مِل جائے۔

اپنے ڈیڑھ سو سال کے زمانہ اقتدار میں اسیریا نے یہ ظلم وستم کئے۔

(25) Cambridge Ancient History, Vol. iii, P. 127

Will Durant: Our Oriental Heritage, Chap. x. P. 282

دمشق کا تاخت و تاراج ---------- ۷۳۲ ق م

ساریا " ---------- ۷۲۲ ق م

ساماریہ " ---------- ۷۱۴ ق م

بابل " ---------- ۶۸۹ ق م

سڈن " ---------- ۶۷۷ ق م

ممفس " ---------- ۶۷۱ ق م

تھیبز " ---------- ۶۶۳ ق م

سوسا " ---------- ۶۳۹ ق م

زمانہ حال کے ایک مشہور مورخ کی انگریزی عبارت کا ترجمہ ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

"جس طرح رومی قوم ہر فتح کے بعد ہزاروں قیدی بنالیتی تھی اور ان کو قید خانوں میں ڈال دیتی تھی۔ اور ہزاروں کو قومی سرکس میں بھوکے درندوں کے سامنے ڈال دیا جاتا تھا اور اُن کے ٹکڑے کئے جانے کا تماشہ لوگ دیکھتے تھے اسی طرح اہل اسیریا کو قیدیوں کے تکلیف دینے میں خاص خوشی حاصل ہوتی تھی۔ بچوں کی آنکھیں ان کے والدین کے سامنے نکالتے تھے اور ان کو اندھا کردیتے تھے۔ لوگوں کی زندہ کھال کھچواتے تھے۔ دیگوں میں زندہ آدمیوں کو ڈال کر اُن کے کباب بناتے تھے۔ اپنے لوگوں کے تماشہ کے لئے انسانوں کو پنجروں میں بند کرکے اُن کی نمائش کرتے تھے اور پھر جو بچتے تھے اُن کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے تھے ...... اشور بانی پال کہتا ہے کہ میں نے تین ہزار قیدیوں کو زندہ جلادیا۔ ان میں سے ایک کو بھی زندہ نہیں چھوڑا...... ان دشمنوں کے منہ میں سے زبانیں میں نے کھینچ لیں...... ان کے اعضا میں نے کتوں، اور سوروں کے آگے ڈال دیئے۔

ان ہی ظلموں کی تقلید اموی بادشاہان خصوصاً ان کے نائب حجاج ابن یوسف

(26) Our Oriental Heritage, Chap. x. P. 275

اور عباسی منصور دوانیقی نے کی تھی اس زیادتی کے ساتھ کہ یہ مؤخر الذکر لوگوں کو زندہ دیواروں میں بھی چن دیتے تھے۔ اسلامی فقہ کو خود مسلمانوں نے کتنا بدنام کیا ہے۔ اسیریا کی فتوحات بہت زیادہ تھیں لیکن ان فتوحات سے اسیریا کو بجائے فائدہ کے نقصان ہوا۔ مسلمانوں کی فتوحات میں اسیریا کی فتوحات اور ان کے نتیجہ میں اتنی مشابہت ہے کہ ہم مورخ کی اصل عبارت یہاں نقل کرتے ہیں۔

The extent of her conquests had helped to weaken her; not only had they depopulated her fields to feed insatiate Mars, but they had brought into Assyria, as captives, millions of destitute aliens who bred with the fertility of the hopeless, destroyed all national unity of character and blood, and became by their growing numbers a hostile and disintegrating force in the very midst of the conquerors. More and more the army was filled by these men of other lands, while semi-barbarous marauders harassed every border, and exhausted the resources of the country in an endless defence of its unnatural frontiers. [۲۷]

ترجمہ:- اس (اسیریا) کی فتوحات کی وسعت نے اس کو کمزور کر دیا۔ یہی نہیں کہ متواتر لڑائیوں کی وجہ سے کھیتوں کی زراعت کو مزارعان کی کمی کی وجہ سے نقصان پہنچا۔ لڑائی کا سلسلہ جب شروع ہو جائے تو ختم ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ بھی ہوا کہ ان لڑائیوں کی وجہ سے کروڑوں غیر ملکی لوگ قیدیوں کی صورت میں آئے اور انھوں نے قومی نسل اور خصلت کی یکرنگی اور یکجہتی کو برباد کر دیا۔ اور اپنی کثرت اور بڑھتی ہوئی افزائش کی وجہ سے اپنے فاتحان ہی کے بیچ میں ایک مخالف اور انتشار پیدا کرنے والی طاقت بن گئے۔ خود فوج کے اندر ان غیر ملکی لوگوں کی زیادتی ہو گئی۔ اس کے علاوہ ملک کی وسعت کی وجہ سے سرحدیں بڑھ گئیں، اور ان پر وحشی اور لٹیرے لوگ یلغار کر کے ستانے لگے جس کی وجہ سے ان غیر قدرتی سرحدوں کی دوامی حفاظت میں ملک کے وسائل اور ذرائع کو بہت نقصان پہنچا۔

[۲۷] (27) Our Oriental Heritage. Chap. x. P. 283.

See also Toynbee's Study of History, Vol. iii. PP. 150-4, 167-174

اشور بانی پال ۶۲۶ ق م میں مر گیا۔ اور بابل کی سازش نے ۶۱۰ - ۶۱۴ ق م میں اسیریا کی سلطنت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ ۶۱۲ ق م میں اسیریا کا دار السلطنت نینوا ہمیشہ کے لئے صفحۂ ہستی سے محو ہو گیا۔ وہ نینوا جو دنیا کی سب سے بڑی فوجی طاقت کا دار القرار تھا۔ وہ نینوا جس کے آگے تمام مہذب دنیا کے سرکش بادشاہوں کے سر خم تھے، وہ نینوا جس نے دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں کو فتح کر کے برباد کر دیا تھا، وہ نینوا جس کے عیش و عشرت کے افسانے تمام مہذب دنیا میں پھیلے ہوئے تھے اور قابل رشک سمجھے جاتے تھے تمام ظلموں اور گناہوں کا بوجھ اپنے سر پہ لے کر ہمیشہ کے لئے صفحہ دنیا سے ملیا میٹ ہو گیا۔ اب اُس کے افسانے عذاب الٰہی سے ڈرانے کے لئے عبرت کا سبق دے رہے ہیں، آج اُس کی یہ حالت ہے کہ اُس کے کھنڈرات پر جنگل کے خود رو سبزے نے بھی اُگنے سے انکار کر دیا۔ اور وہاں ایسی نحوست برستی ہے کہ جو بھولا بھٹکا مسافر وہاں آ جاتا ہے تو وہ بہت جلد وہاں سے نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ روایت ہے کہ جب امام حسینؑ دشت نینوا میں پہنچے تو اپنے اصحاب سے فرمایا کہ یہاں سے جلد نکل چلو کیونکہ اس خطۂ زمین پر عذاب الٰہی ہے۔

اب وہ سلطنت قائم ہوئی جس کو مورخین نے نیو بابل (Neo-Babylonian Empire) کا خطاب دیا ہے۔ آخر کار اس سلطنت کو بھی ایران کے کردش اعظم (Cyrus the Great) نے ۵۳۹ ق م میں فتح کر کے ختم کر دیا۔ ۶۳۹ ق م میں عیلام کی سلطنت دنیا سے رخصت ہوئی تھی۔ ۶۱۰ ق م میں اسیریا کی سلطنت فنا ہوئی۔ ویبقیٰ وجہ ربک ذو الجلال والاکرام۔ سچ ارشاد ہوا ہے۔

قُلْ سِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِينَ (النمل ۲۷: ۶۹)

ایسی قوموں کا یہی حشر ہوتا ہے۔ وَلَقَدْ أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوا وَجَاءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنَاتِ وَمَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِينَ ۝ ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ ۝ (یونس ۱۰: ۱۳، ۱۴)

یعنی تم سے پہلی اُمت والوں کو ہم نے ہلاک کر دیا جب اُنھوں نے ظلم کیا، حالانکہ اُن کے وقت کے رسول واضح اور روشن نشانیاں لے کر آچکے تھے اور وہ لوگ ایمان

نہ لائے ہم مجرموں کو یوں ہی سزا دیا کرتے ہیں۔ پھر ہم نے اُن کے بعد تم کو زمین میں ان کا جانشین بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسا کام کرتے ہو۔

جیسا کام مسلمانوں نے کیا وہ اُن کی موجودہ حالت سے ظاہر ہے اور جو جو عذاب الٰہی اُن پر آتے رہے اور آرہے ہیں وہ بھی عیاں ہیں۔

(۳) ویدوں کا فلسفہ اور مذہب

ہندوستان کا فلسفہ کبھی خالص فلسفہ نہیں ہوا۔ بلکہ ہمیشہ اس میں مذہب کی آمیزش رہی اگرچہ مذہب وہی قیاسی مذہب تھا لیکن یہ ضرور ہے کہ شروع شروع میں ویدوں میں خالص وحدانیت بھی ہے۔ لیکن زرتشتی مذہب کی طرح وہ بہت جلد مفقود ہوگئی۔ اوپانیشد نے کبھی کچھ کچھ فلسفہ کی طرف میلان ظاہر کیا ہے پہلے ہم اُن کا ہی ذکر کرتے ہیں۔

اوپانیشد دو الفاظ سے مرکب ہے۔ اوپا جس کے معنی نزدیک کے ہیں اور شد جس کے معنی بیٹھنے کے ہیں۔ جو نہایت ذہین اور مقرب شاگرد ہوا کرتے تھے اون کو گرو یعنی معلم اپنے پاس بٹھا کر رازداری کے امور بیان کرتے تھے۔ ان راز کے خطبات ہی کا مجموعہ اوپانیشد ہیں بعض کے بعد یہ سب سے پرانا فلسفہ ہے۔ اوپانیشد ۸۰۰ ق م اور ۵۰۰ ق م کے مابین مرتب ہوئے تھے۔ ان میں ایسے ۱۰۸ خطبے یا تقاریر ہیں جو مختلف رشیوں یا اُستادوں کی بیان کردہ ہیں۔ ان سب میں سب سے بڑے یجنوالکی Yajnavalkya مردوں میں اور گرگی Gargi عورتوں میں ہوئے تھے۔ یجنوالکی نے دنیا کے مصائب سے گھبرا کر گھر بار چھوڑ دیا تھا۔ اس کا فلسفہ جرمنی کے فلاسفر Schopenhaur. کی قنوطیت (یاس وناامیدی) سے بھی زیادہ بڑھ کر رہی ہے۔[۲۸]

ہندو فلسفہ کی ہمیشہ یہ تلاش رہی ہے کہ کوئی ایسا طریقہ مل جائے جس سے بار بار کے پیدا ہونے سے چھٹکارا حاصل ہو جائے۔

(28) R.E.Hume: The Thirteen Principal Upanishads Oxford U.P. 8 821

پہلا سبق جو اوپانیشد دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ انسانی ذہن محدود ہے۔ صرف اس کی مدد سے حق نہیں مل سکتا کمزور دماغ جس میں ذراسے ہوا و خوراک کی تبدیلی سے درد پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ کس طرح حقیقت لا محدود کو جس کا یہ ایک بہت ہی چھوٹا حصہ ہے معلوم کرسکتا ہے۔ وہ دوسری شے جس سے اس کو مدد لینی چاہیئے آتما ہے۔ یہ آتما دنیا کی روح اعظم ہے وہ باہر کی آنکھیں بند کرکے اندر غور کرنے سے ملتی ہے۔ اس کے لیئے انسان کو اپنے علم کا غرور اور اپنے ظاہری حواس کا بھروسہ چھوڑنا چاہیے، پندرہ دن تک برت رکھے۔ صرف پانی پی لے اور کچھ نہ کھائے۔ اس طرح دماغ کو امن ہوگا اور خاموشی کی عادت پیدا ہوگی۔ حواس میں پاکیزگی آجاتی ہے۔ اور ان کی بغاوت جاتی رہتی ہے۔ اب خاموشی کے ساتھ روح اپنے تئیں محسوس کرتی ہے۔ اور اس بڑی روح کو سمجھتی ہے جس کا یہ خود ایک حصہ ہے۔ آخر کار انسان کی شخصیت معدوم ہوجاتی ہے۔ اور وحدانیت و حقیقت اس کے سامنے آجاتے ہیں۔ (۲۹)

ہندو فلسفہ کی باطنی تعلیم میں یہ پہلا قدم ہے کہ ہماری خودی کی ماہیت جسم، ذہن و عقل یا شخصی نفس میں نہیں ہے بلکہ یہ وہ خاموش پر سکون عمیق ہستی ہے جو ہمارے ہی اندر ہے اور جس کو آتما کہتے ہیں، دوسرا قدم براہمہ ہے، یہ تمام کائنات کی روح عظیم ہے جو ساری کائنات پر چھائی ہوئی ہے۔ نہ مذکر ہے۔ نہ مؤنث ہے۔ بغیر جسم و شخصیت کے سب کو گھیرے ہوئے ہے۔ یہ ہاتھ سے نہ چھوئے جانے والی ہے اور کائنات کی ہستی یہ ہی ہے۔ یہ ہی حقیقت کی حقیقت ہے۔ نہ پیدا ہوئی۔ نہ مریگی اور نہ کبھی کمزور ہوگی۔ یہ براہمہ تمام کائنات کی روح ہے جس طرح آتما تمام روحوں کی روح ہے۔ یہ ہی وہ قدرت اور طاقت ہے جو تمام طاقتوں اور تمام خداؤں کے اوپر غالب اور مستولی ہے۔

غالباً اس ہی فلسفہ کی بنا و پر اہل ہنود حضرات کا خیال ہے کہ اُن کا مذہب بھی بہت اعلیٰ ہے۔ بت پرستی نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی تو سوچنا چاہیے کہ اس

(۲۹) (29) Katha Upanishad, iv. 1. II. 24 ; Chandogya Upanishad, vi. 7.

Radahakrisbnan: Indian Philosophy, Vol h PP. 145, 151

فلسفہ میں بھی دوسرے خداؤں کی ہستی کو مان لیا گیا ہے۔ اور یہ محض تخئیل ہے۔ مذہب کے لئے عمل چاہیئے۔ عمل کہاں ہے۔ براہمہ تمام کائنات کی روح ہے۔ اچھا ہے۔ لیکن عملی امور تو یہ چاہتے ہیں کہ دنیا کے ظلم وجور و مصائب کے لئے سزا وجزا ہو۔ اس کی طاقت براہمہ میں نہیں ہے۔ نہ وہ کسی کو بخش سکتا ہے۔ نہ معاف کر سکتا ہے۔ نہ سزا دے سکتا ہے۔ انسان کی کمزوری اور اس کے ماحول کی سختیاں اس امر کی متقاضی ہیں کہ اس کے گناہانِ صغیرہ کو بخشنے والا بھی کوئی ہو۔ وہ اس فلسفہ میں موجود نہیں ہے۔ ایک مشین ہے کہ لوگوں کو بار بار اس دنیا میں پیدا کر رہی ہے۔ دنیا میں آنا تو پھر سزا ہی ہے کیونکہ وہ ہی دنیا اور وہ ہی دنیا کے مصائب۔ اگر بادشاہ کے یہاں بھی پیدا ہو گئے تو کیا ہوا۔ بادشاہ کے یہاں پیدا ہونا امن وراحت وخوشی کی گارنٹی تو نہیں ہے۔ یجنوالکی حکیم سے ایک دانشمند نے سوال کیا کہ خدا کتنے ہیں اُس نے جواب دیا کہ تین صد تین اور تین ہزار تین۔ پھر یہ سوال دُہرایا گیا۔ اُس نے کہا تینتیس۔ پھر سوال کیا گیا۔ اُس نے کہا کہ چھ۔ پھر سوال کیا گیا۔ اُس نے کہا کہ دو۔ پھر سوال کیا گیا اُس نے جواب دیا کہ ڈیڑھ۔ پھر سوال کیا گیا تو اُس نے جواب دیا کہ ایک (۳۰)۔ غالباً اگر پھر سوال دُہرایا جاتا تو وہ کہتا کہ کوئی نہیں۔

تیسرا درجہ نہایت اہم ہے۔ اور وہ ہی ہندو فلسفہ کی جان ہے۔ وہ یہ کہ آتمہ اور برہمہ ایک ہی ہیں جو ہمارے اندر قوت ہے اور جس کو ہم نے روح الارواح کہا ہے وہ وہی ہے جو روحِ کائنات ہے۔ یعنی دوسرے الفاظ میں Subjective. اور Objective ایک ہی ہیں۔ اگر ہم میں سے ہماری شخصیت نکال لی جائے اور اُس کو نظر انداز کر دیا جائے تو ہماری حقیقت اور خدا کی حقیقت ایک ہی ہو جاتی ہے۔ یہ کائنات خدا میں سے کس طرح نکلی اس کو ایک اُستاد اپنے شاگرد کو یوں سمجھاتا ہے یہ انجیر ہے۔ اس کو توڑو اس کے اندر بیج نظر آتے ہیں۔ اُن میں سے ایک کو توڑو اب وہ اتنا باریک ہے کہ نظر نہیں آتا۔ ایسی باریک شے کائنات کی روح ہے۔ وہ ہی حقیقت ہے۔ وہ ہی آتما ہے۔ وہ ہی تم خود ہو (۳۱)

(30) Brihadaranyaka Upanishad, Vol. iii P. 9

(31) Chandogya Upanishad, Vol. vi 2

خدا اور انسانیت کی ماہیت ایک ہی ہے۔ یہ ہے اوپانیشد کے فلسفہ کی روح۔ اسلام کا فلسفہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ عابد اور معبود، خالق اور مخلوق کبھی ایک ماہیت کے نہیں ہو سکتے۔

بادشاہ جنک نے یجنا ولکی سے پوچھا کہ مہاراج اس بار بار کی پیدائش سے کس طرح چھٹکارا حاصل ہو سکتا ہے۔ اُس نے جواب میں فلسفۂ یوگ کی تلقین کی اور کہا کہ ریاضت و مشقت کے ذریعہ سے تمام خواہشات نفسانیہ کو مار کر انسان کی شخصیت معدوم ہو سکتی ہے۔ اور وہ اپنے تئیں روح کائنات کے اندر مدغم کر سکتا ہے اس فلسفہ کے نزدیک انسان کی یہ ہی انتہا اور آخری منزل ہے۔ یہ ہی اُن کی جنت ہے۔ تصوف پر بھی یہی اثر ہے۔ غالب کہتے ہیں ؎

عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا درد کا حد سے گزرنا ہے، دوا ہو جانا

یعنی زندگی ایک درد ہے۔ مصیبت ہے۔ وہ درد حد سے گزرا تو فنا ہو گئے۔ فنا ہونا تھا کہ خدا میں مل گئے۔ خدا میں ملنا تھا کہ عشرت نصیب ہو گئی۔ قطرہ بھی تو دریا میں جا کر فنا ہو جاتا ہے۔ اور یہ ہی اُس کی عشرت ہے۔ غالب کو تصوف سے خاص لگاؤ ہے۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے حیران ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

خود بھی کہتے ہیں ؎

یہ مسائل تصوف یہ ترا بیان غالب تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

معلوم ہوتا ہے کہ تصوف کے میخانہ کا خیال نہ رہا جہاں بادہ خواری بھی ولی ہونے کی ایک شرط ہے۔ چنانچہ حضرت حافظ فرماتے ہیں ؎

ما در پیالہ عکسِ رخِ یار دیدہ ایم اے بے خبر ز لذتِ شربِ مدامِ ما

ممکن ہے یہاں تاویل کو کام میں لایا جائے۔ ایک اور جگہ فرماتے ہیں ؎

بکوئے می فروشانش بجامے برنمی گیرند زہے سجادۂ تقویٰ کہ یک ساغر نمی ارزد

اوپانیشد کا یہ فلسفہ شریعت و فلسفہ اسلام کے بالکل خلاف ہے۔

شریعت اسلام کا نظریہ یہ ہے۔ یٰٓاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ۝ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ۝ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ۝ (الفجر، پ ۳۰)

روح کتنی ہی ترقی کرلے، کتنے ہی اعلیٰ درجہ اطمینان و رضا تک پہنچ جائے پھر بھی خدا سے علیحدہ اُس کے بندوں میں رہے گی۔ اور جنت میں علیحدہ داخل ہوگی۔ خدا کے اندر حلول کرنے کا کوئی بھی امکان نہیں۔

ویدوں کا زمانہ اور مذہب۔ جیمس ہیسٹنگز James Hastings نے اپنی انسائیکلوپیڈیا میں لکھا ہے کہ ویدوں کا زمانہ ۱۳۰۰ ق م سے ۲۰۰ ق م تک سمجھا جاتا ہے۔ وید چار ہیں۔ رگ وید، اتھر وید، شام وید اور یجر وید۔ اور یہ چاروں وید غالباً ۱۳۰۰ ق م اور ۱۰۰۰ ق م کے درمیان تیار ہوگئی تھیں۔ ان میں سب سے پرانا رگ وید ہے۔ محققین کا خیال ہے کہ زرتشت کے استاد میں ویدوں کے اثرات پائے جاتے ہیں۔ اگرچہ جب آریوں نے ایران چھوڑا تو ایرانی ان کو عداوت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ جدائی کسی لڑائی کی وجہ سے ہو۔ - - - - -

- - - - - - - - - - - - - - - -

رگ وید میں خداؤں کی تعریف اور بزرگی کے گیت ہیں۔ اتھر وید میں قربانیوں کا ذکر ہے۔ گویا یہ وید قربانی کی نگرانی کرنے والے پوجاریوں کے لئے ہے۔ یجر وید میں دعائیں اور قربانی کے اصول ہیں۔ سام وید میں محض راگ اور گیت ہیں۔ رگ وید کے شبد زیادہ تر علم الاصنام (MYTHOLOGY) کے متعلق ہیں۔ ان میں کثرت و تعدد الٰہ یعنی Polytheism. کا عقیدہ جلوہ گر ہے یہ ہی مذہب اُس زمانہ میں قدیم یونان، روم، مصر اور میگسو کا تھا۔ چنانچہ صحیح طور سے کہا گیا ہے کہ الکفرۃ ملۃ واحدۃ۔ کہیں کہیں ایک سب سے بڑے خدا کا عقیدہ بھی ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن وہ اس طرح کہ جو کچھ موجود ہے وہ ہی خدا ہے۔ خدا کی ہستی مادہ کے ساتھ وابستہ سمجھی گئی تھی۔ تمام کائنات ہی خدا تھی انگریزی میں اس کو (Pantheism.) کہتے ہیں۔ رگ وید کا کچھ حصہ جادو کے متعلق بھی ہے۔

اتھر وید کا زیادہ حصہ جادو کے متعلق ہے اور اس میں خاص طور سے ہمہ اوست یعنی Pantheism. کی تعلیم ہے۔ سام وید اور یجر وید بالکل قربانی کے متعلق ہیں۔

براہمنا - یہ دراصل ویدوں کے ضمیمہ ہیں - اور اُن کے رسوم اور ارکان کے متعلق ہیں - ویدوں کے بعد ہی مرتب ہوئے تھے - ان کا زمانہ ۹۰۰ ق م رکھا گیا ہے ان کی تعلیم کا مابہ الامتیاز یہ ہے کہ بہت سے خداؤں کی ہستی اور موجودگی مانتے ہوئے ایک سب سے بڑے خدا کا عقیدہ قائم کیا گیا ہے - وہ ایسا ہی ہے کہ جیسا امریکہ کا پریذیڈنٹ -

یہ امر قابل ذکر ہے کہ ویدوں سے پہلے اور آریوں کے آنے سے قبل ہندوستان کے قدیم باشندوں میں جن کو ناگا کہتے تھے ایک مذہب رائج تھا - آج کل بھی یہ لوگ آسام کی طرف پائے جاتے ہیں - اس مذہب میں اُن بے شمار بھوتوں اور ارواح خبیثہ کی پرستش رائج تھی جن کے متعلق خیال تھا کہ وہ پتھروں جانوروں، درختوں، دریاؤں، پہاڑوں، اور ستاروں میں رہتے ہیں - سانپوں اور اژدہوں کی پرستش عام تھی - ناگ یعنی سانپ خدا، ہنومان یعنی بندر خدا، نندی یعنی آسمانی بیل خدا اور یاکشا یعنی درختی خدا اس زمانہ کی یادگاریں اب تک باقی ہیں - یہ مذہب اُس زمانہ میں تمام دنیا میں عام تھا - انجیل کے تصنیف کرنے والے بھی اُس کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکے - چنانچہ انجیل میں اس آسمانی ناگ (Dragon) کا ذکر یوحنا کے مکاشفہ میں بار بار آتا ہے - گوتم بدھ کا مشہور درخت بھی درختوں کی پرستش و عظمت کے زمانہ کی یادگار تھی - کچھ بھوت اور ارواح تو نیک تھے - لیکن کچھ برے بھی تھے اور وہ ہی بیماری اور جنون پیدا کرتے تھے ان کے اثر کو زائل کرنے کے لئے اشلوک اور منتر کی ضرورت تھی - سوائے ان کے وہ کسی اور چیز سے مریض کو نہیں چھوڑ سکتے تھے - لہذا اتھر وید ایسے منتروں اور اشلوکوں کے لئے مخصوص ہے -

ویدوں کے خدا - شروع شروع میں ویدوں کے خدا بھی محض عناصر و مناظر قدرت تھے - مثلاً آسمان، زمین، سورج، آگ، ہوا اور پانی - یہ بھی ایک بڑا تعجب خیز قدرت کا کرشمہ تھا کہ انسان کو انسان کے اندر ہی سے پیدا کر دیا - پھر عورت و مرد کی ایک دوسرے سے خواہش مواصلت اور اس کا حظ - یہ ایسے امور تھے کہ ان کو ضرور خداؤں کی فہرست میں داخل ہونا چاہئے تھا لہذا داخل ہو گئے - عورت کے اندام نہانی کی بھی پرستش ہوتے لگی اور مرد کے

اعضاء تناسل کی بھی۔ عورتیں ۔ مردوں کے عضو تناسل کا جلوس نکالتی تھیں اور اُن کو دیوتا سمجھ کر اون سے مجامعت بھی کر لیتی تھیں۔ اس خیال کی بیہودگی یہاں تک بڑھی کہ ہر دلہن کا ازالۂ بکارت اُس ہی معبود لنگ سے کیا جانے لگا۔ یہ شہوت پرستی تھی جس کا نام زبان حال کے تکلف میں خدا پرستی رکھا گیا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ہندو عورت خدا پرست ہوتی ہے۔ مرد عورتوں کی اندام نہانی کا جلوس نکالتے تھے۔ ان ہی طاقتوں، قوتوں اور عناصر کو شخصیت دیکر خدا بنا لیا۔ چنانچہ آسمان "ورن" اور زمین "پرتھوی" ہو گئے۔ دونوں نے آپس میں مجامعت کی۔ بارش جو ہوئی تو وہ آسمان کی منی تھی۔ جو زمین پر گر کر اُس کو حاملہ کرتی تھی۔ چنانچہ سبزہ اُگا یعنی اُس مجامعت کا نتیجہ پیدا ہوا۔ "ورن" باپ ہو گیا۔ اور پرتھوی ماں ہو گئی۔ آگ "اگنی" کے نام سے، ہوا "رُدرا" کے نام سے طوفان "اندرا" کے نام سے سورج "متر" کے نام سے خدا بن گئے۔

ویدوں کے خداؤں کی خوراک دودھ، مکھن، غلہ، بھیڑ، بکری، گائے، بیل، اور گھوڑے کے گوشت تھے۔ ویدوں کے ماننے والے یہ چیزیں قربانیوں میں رکھتے تھے اور وہاں سے یا تو آگ کا دیوتا یعنی اگنی ان اشیاء کو آسمان پر خداؤں تک پہنچا دیتا تھا یا وہ خدا خود مقام قربانی پر نازل ہو کر ایک سبز ہری گھاس کے قطعہ زمین پر بیٹھ کر کھلتے تھے۔ ہر ایک قربانی کی جگہ پر یہ سبز گیاہی قطعہ اس غرض کیلئے خالی رکھا جاتا تھا۔ پینے کے لئے سوما کا عرق ہوتا تھا۔ یہ ایک نشہ آور شے تھی جو ایک پودے سے نکالی جاتی تھی۔

ویدوں کے خداؤں کے رہنے کی جگہ تیسرا آسمان ہے۔ جو وشنو کی سیڑھی کا آخری قدمچہ ہے۔ اُس جگہ بیٹھ کر وہ سب خدا سوما کا عرق پیتے ہیں۔ اور اُس کے نشہ میں مسرور ہو کر خوشی اور بے فکری کی زندگی گزارتے ہیں۔ انسان نے اپنے خداؤں کو بھی شراب پلا دی۔ ویدوں کے زمانہ میں کچھ عرصہ تک اگنی دیوتا یعنی آگ سب سے بڑا دیوتا تھا، کیونکہ وہ ہی قربانیوں کو اپنے ساتھی خداؤں تک پہنچاتا تھا۔ وہ ہی انسان اور دنیا کی زندگی میں نمایاں تھا۔ یہاں ایک مشابہت کا ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے، مسلمانوں کا بھی عقیدہ ہے کہ پہلے زمانہ میں قربانی کے قبول ہونے کی یہ علامت تھی کہ آسمان سے آگ اُترتی تھی اور وہ مقبول شدہ قربانی کو جلا دیتی تھی۔ اگرچہ اگنی بڑا خدا تھا لیکن لوگوں میں بہت ہر دلعزیز اندرا تھا جو بجلی کی کڑک اور طوفان باد و باراں کا خدا تھا۔ وہ ہی مینہ برساتا تھا جو ان لوگوں کے لئے بڑی نعمت تھی۔

وہ سب سے بڑا خدا سمجھا جاتا تھا اور لڑائیوں میں اُس کی کڑک اور گرج کی مدد مانگی جاتی تھی۔ ان لوگوں کا عقیدہ تھا کہ وہ ایسا عظیم الشان خدا ہے کہ ایک دفعہ میں یک صد بیل کھا لیتا تھا اور شراب سے بھری ہوئی جھیلوں کو لپ لپ کر کے ایک گھونٹ میں ختم کر دیتا تھا۔ اُس کا اُٹھتا ہوا مدمقابل کرشنا تھا جو ابھی شہرت میں بچہ ہی تھا اور محض ایک چھوٹے سے قبیلے کرشنا کا مقامی خدا تھا۔ اُس زمانہ میں وشنو کی بھی یا تخت حالت تھی۔ حالانکہ بعد میں تو اُس نے تقریباً سارے ہندوستان پر قبضہ کر لیا۔ اور کرشنا اس کا اوتار سمجھا جانے لگا۔

یونان کے کوہ المپس کے خداؤں کی مانند۔ بلکہ ساری صنم پرست دنیا کے خداؤں کی طرح یہ خدا ہو بالکل خواہشات و نفسانیت اور جسمانیت میں انسانوں کی طرح تھے۔ انسان کی جہالت، خباثت اور خوبو یہ سب ان خداؤں کے اندر داخل کر دی گئی تھی، وہ ہی حسد، رشک، لاعلمی خواہشات نفسانیہ وغیرہ سب ان میں تھے۔ قربانی کے لالچی تھے۔ سوما درخت کا عرق جو ایک قسم کی شراب تھی ان کو بہت پسند تھا۔

تخلیق و تکوین کائنات۔ اس مضمون پر کوئی صاف یا قطعی بیان نہیں ہے۔ قیاسات و توہمات ہیں جن کو سن کر ہنسی آتی ہے۔ اول تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان خداؤں میں سے کس خدا نے دنیا کو پیدا کیا تھا۔ کبھی اگنی خدا کو یہ عزت دی گئی۔ اور صدیوں تک اس کو خالق ارض و سما سمجھ کر اُس کی پوجا کی گئی۔ کبھی اندرا کو کبھی سوما کو اور کبھی پرجاپتی کو خالق سمجھا گیا۔

یہ کائنات کس طرح پیدا ہوئی۔ یہ بھی سننے کے قابل ہے۔ ویدوں کی تعلیم کے مطابق دنیا اسی طرح بنائی گئی جس طرح ایک عمارت بنائی جاتی ہے۔ میٹریل جو اس میں استعمال کیا گیا ہے وہ لکڑی ہے۔ آسمان و زمین لکڑی کے ستونوں پر کھڑے ہیں۔ اس کے بنانے والے یا تو سب خدا مل کر معماروں کی طرح بنانے والے تھے۔ یا کسی خاص خدا نے یہ کام اپنے ذمہ لے لیا تھا۔

رگ وید کے آخری حصہ میں ایک اور نظریہ بھی قائم کیا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ شروع میں ایک بہت عظیم الجثہ دیو تھا۔ یہ نہیں بتایا گیا کہ وہ خود کیوں کر پیدا ہوا یا کب سے تھا۔ تمام خداؤں نے مل کر اسکی قربانی کی یعنی اُس کو ذبح کر ڈالا۔ اور بھینٹ پر چڑھا دیا۔ اُس کا سر تو

آسمان بن گیا۔ اُس کی ناف ہوا بنی اور اُس کے پیر ہماری زمین ہے۔ یہ نہیں بتایا گیا کہ سورج، چاند اور ستارے کس طرح بنے۔ اُس دیو کے دیگر اعضاء سے ہندوستان کی چار ذاتیں پیدا ہوئیں۔ اتھر وید اور اوپانی شد میں اس ہی دیو کو عالمی روح کہا گیا ہے۔

رگ وید کے دو گیتوں میں فلسفیانہ نظریہ بھی بتایا گیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ تمام موجوداتِ عالم (ست) ایک معدوم شے (است) سے بذریعہ ارتقاد پیدا کئے گئے ہیں یعنی عدم سے موجودات ہوئے ہیں۔

ایک اور شبدہ میں چوتھا نظریہ قائم کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ گرمی (Tapas) کے ذریعہ سے سمندر پیدا ہوئے اُس کے بعد خالق Dhata نے چاند، آسمان زمین ہوا اور اتھر پیدا کئے۔

ایک اور شبدہ میں پانچویں تھیوری نظر آتی ہے۔ اس میں بیان کیا گیا ہے کہ آسمان، زمین، اور بڑے بڑے سمندر سونے کے بہت بڑے کرہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اُس کو Haryana garbha (ہریانہ گربھ) کہا گیا ہے۔ اور یہ ہریانہ گربھ ابتداء میں تمام خداؤں سے اوپر ظاہر ہوا تھا۔ معلوم ہوا ہے کہ اُس سے پہلے بھی خدا تھے۔

ان تمام پیدائشی بھجنوں میں ایک بات مشترک ہے۔ وہ یہ کہ سب سے پہلے پانی تھا۔ اور پانی ہی سے یہ ساری چیزیں پیدا ہوئی ہیں۔

ان نظریات کے علاوہ رگ وید میں ایک اور نظریہ بھی قائم کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ اس کائنات کے وجود میں آنے کے بعد سب خدا پیدا ہوئے ہیں۔ اس سے پہلے کیا تھا اور یہ کائنات کیونکر وجود میں آئی کسی کو نہیں معلوم۔ خداؤں کو بھی نہیں معلوم ٹھیک ہے۔ جب خدا محدود ہوا تو وہ جاہل بھی ہو سکتا ہے۔ یہ تماشہ بھی تو دیکھو جن ویدوں میں یہ اٹکل پچو اور ایک دوسرے سے متضاد خیالات و قیاسات ہیں وہ خدا کی تحریر کردہ ہیں۔ وہ ایسا خدا ہے کہ اُس کو نہیں معلوم کہ کائنات کس طرح پیدا ہوئی۔

تخلیق انسان و حیوان - مخلوق کس طرح پیدا ہوئی۔ یہ قصہ بھی سُننے کے قابل ہے۔ جب کوئی زندہ شے نہ تھی تو پیدا کرنے والا خالق تھا۔ وہ قد و قامت میں اتنا بڑا تھا جتنے ایک مرد اور ایک عورت حالت مواصلت میں مل کر

ہوتے ہیں۔ اُس خدا کو تنہائی سے پریشانی ہوئی، غمگین رہتا تھا۔ لہٰذا اُس نے اپنے جسم کے دو ٹکڑے کیئے۔ اب وہ ایک مرد اور ایک عورت علیحدہ علیحدہ ہو گئے۔ اُس خدا نے عورت سے مباشرت کرنی چاہی، مباشرت ہوئی، انسان پیدا ہوئے اب اُس عورت کو خیال آیا کہ یہ مجھ سے کیونکر جماع کر سکتا ہے حالانکہ اُس نے مجھ کو اپنے ہی جسم سے نکالا ہے، اب جو اُس خدا نے اُس سے مباشرت کرنی چاہی تو عورت اُس سے بھاگی۔ بھاگتے بھاگتے گائے بن گئی۔ جنابِ خدا سانڈ بن گئے۔ مباشرت کی۔ گائے بیل پیدا ہوئے۔ اور اُن کی نسل دنیا میں چلی۔ پھر مباشرت کرنی چاہی۔ پھر وہ بھاگی۔ اس دفعہ گھوڑی بن گئی۔ خدا صاحب بھی اُس کے پیچھے بھاگے اور وہ گھوڑا بن گئے۔ مباشرت کی گھوڑوں کی نسل چلی۔ اسی طرح ہر جانور، ہر پرندہ، ہر چوپایا یہاں تک کہ ہر کیڑا پیدا ہوا۔ خدائی خاتون اس نوع کی مادہ بنتی گئی اور خدا صاحب نر بنتے گئے اور مباشرت کرتے رہے۔ اور یہ مختلف انواع کی مخلوق پیدا ہوتی رہی۔ یہاں تک چیونٹی اور گندگی کے کیڑے اسی طرح پیدا ہوئے۔ خدائینی چیونٹی یا گندگی کے کیڑے کی مادہ بنی اور خدا صاحب اُس کے نر بنے۔ آپس میں مباشرت ہوتی رہی اور مخلوق پیدا ہوتی رہی۔ ۳۲؎

یہ نہیں بتایا گیا کہ مادہ خدائینی کے دماغ میں ان ہزارہا مخلوقات کی شکلیں کیونکر آتی رہیں اور وہ ان کی شکلیں اختیار کرتی گئی، یا بغیر مرے ہوئے جنم لیتی گئی۔ اصل خالق تو وہ ہوئی، خدا کا کام تو مزیدار ہی رہا اور بہت آسان۔ اس کو دیکھ کر وہ اس کے نر بنتے رہے اور مزہ لیتے رہے۔ یہ ہے اُن کے خالق ارض وسما کا نقشہ ان کے مذہب میں۔

تخلیق انسان کا ایک اور نظریہ بھی رگ وید (RV.10.10) سے ظاہر ہوتا ہے وہ یہ کہ انسان کے پہلے ماں باپ دو بھائی بہن تھے۔ جو توام پیدا ہوئے تھے۔ بھائی کا نام یاما تھا اور بہن کا نام یامی۔ یامی نے اپنے بھائی کو ورغلایا کہ وہ اس کے ساتھ ہمبستری کرے۔ پہلے تو یاما نے انکار کیا۔ جب یامی نے طعنہ دیا کہ تو نامرد

(32) Brihadaranyaka Upanishad, i. 4.: Hume, R. E.: The Thirteen Principal Upanishads

Will Durant: Our Oriental Heritage, P. 404

معلوم ہوتا ہے تو وہ راضی ہو گیا۔ اُن کے بچے بنی نوع انسان ہیں۔ (۳۲)

مسئلہ تناسخ:۔ ویدوں میں تناسخ ارواح کا عقیدہ نہیں ہے سب سے پہلے اس کا ذکر اپنی شد میں پایا جاتا ہے، یونان کے فلسفہ میں تناسخ ارواح کا عقیدہ بہت پرانا ہے۔ اس سوال کا حل کرنا ہے کہ تناسخ ارواح کا عقیدہ ہندوستان نے یونان سے لیا۔ یا یونان نے ہندوستان سے لیا۔ اُس زمانہ میں تجارتی کاروانوں کی آمدورفت ایک ملک سے دوسرے ملک تک اتنی عام اور ضروری تھی کہ ایک قوم دوسری قوم کے خیالات و عقائد سے متاثر ہوتی رہتی تھی۔ اس عقیدہ کے ہوتے ہوئے جنت و دوزخ کی ضرورت چنداں نہیں رہتی۔ کیونکہ سزا و جزا یہاں کے جنموں ہی میں ہو جاتی ہے۔ ہاں ویدوں کے زمانہ میں جب یہ عقیدہ نہ تھا تو انھوں نے ایک سیدھی سادھی جنت و دوزخ اپنے خیالات کے مطابق بنالی تھی، بری ارواحیں ایک تنگ و تاریک خندق میں ڈال دی جاتی تھیں اور وہاں ہمیشہ رہتی تھیں۔ اچھے اعمالوں والی روحیں آسمان پر خوشی کے فضا میں رہتی تھیں۔ لیکن بعد میں یہ عقیدہ جاتا رہا اور اس کے بدلہ تناسخ کا عقیدہ قائم ہو گیا۔ یہ تبدیلی کیوں ہوئی؟ اس کی بناء پر بحث کی جاسکتی ہے کہ تناسخ ارواح کا عقیدہ ہندوستان نے یونان سے لیا۔

ویدوں کے زمانہ میں مردوں کو جلایا نہیں کرتے تھے۔ بلکہ وہ قبروں میں دفن کردئے جاتے تھے۔ (۳۳)

ویدوں کے بعد کا زمانہ۔ برہمنوں کے مذہب سے بغاوت۔

برہمنوں کا مذہب خداؤں کی کثرت کا معمہ تھا۔ اور برہمنوں نے اُس معمہ کو ایک رازِ مخفی بنا کر اپنے ہی میں رکھنا چاہا۔ خداؤں کی کثرت اور برہمنوں کی رعونت نے ہندوستان کی فضا میں ان کی طرف سے بغاوت پیدا کر دی۔ جس کا آخری نتیجہ بودھ مذہب اور جین مت ہوا، لیکن کچھ عرصہ بعد عوام الناس کا ذہن جو خداؤں کی کثرت سے مرعوب ہو گیا تھا۔ پھر ان کو برہمنوں کی طرف لے آیا۔ ہم آئندہ

---

(33) Our Oriental Heritage, PP. 408, 409.

چل کر بتائیں گے کہ کس طرح بدھ مذہب اور جین مت پھر برہمنوں کے مذہب یعنی ہندو مت میں تبدیل ہو گئے۔ برہمنوں نے آخر کار بودھ مذہب کو بالکل ہندوستان سے نکالدیا اور اُس نے برہما، جاپان، تبت اور افغانستان میں جاکر پناہ لی۔ اب ہم برہمنوں کے موجودہ اس مذہب کا ذکر کرتے ہیں۔ آج کل ہندوستان میں وہ ہی مذہب رائج ہے۔ اگرچہ تعلیم یافتہ ہندو اب اُس سے بھی بدظن ہو چکے ہیں۔

موجودہ ہندو مذہب

ہندو مذہب ایک مذہب نہیں ہے۔ بلکہ اُس کے دامن میں سیکڑوں مذاہب نے آن کر پناہ لی۔ یا بالفاظ دیگر کہہ سکتے ہیں کہ برہمنوں نے اپنی عظمت اور مکرمت قائم رکھنے کے لئے ہر مذہب کو اپنے مذہب میں داخل کر لیا ہے۔ ان تمام مذاہب میں چار عقائد مشترک ہیں۔(۱) ذاتوں کا قیام اور برہمنوں کی رہنمائی اور افسری (۲) گائے کو خدا کا اوتار سمجھ کر اُس کی عظمت اور پرستش کرنا۔ (۳) تناسخ ارواح اور عقیدہ کرم جو آپس میں لازم و ملزوم ہیں۔ (۴) ویدوں کے خداؤں کی بجائے بے شمار اور مختلف دیگر خداؤں کو ماننا اور اُن کی پوجا کرنا۔

جب برہمنوں نے دیکھا کہ بدھ مذہب عوام الناس کے دلوں میں گھر کر چکا ہے تو اُنھوں نے اُس کا مقابلہ کرنے کے لئے وہ ہی تدبیر کی جو مسیحیت نے مذہب متھرا سے مقابلہ کرنے میں کی تھی۔ یعنی مخالف اور رقیب مذہب کے بہت سے وہ تصورات اور رسومات جو عوام الناس کے دلوں میں گھر کر چکے تھے اپنے مذہب میں داخل کر لئے۔ اُنھوں نے دیکھا کہ گوتم بودھ کی محبّت لوگوں کے دلوں سے نکلنی مشکل ہے تو اُنھوں نے گوتم بودھ کو خدائی کا درجہ دے کر اپنے مذہب میں شامل کر لیا اور اُس کے مذہب کی بہت سی رسومات اور تخیلات بھی اپنے مذہب میں داخل کر لئے اور اس طرح ہندوستان سے بودھ مذہب کو نکال دیا۔

ہندو مذہب میں خدا کی طاقت اور قوت کا اظہار اُس کے عضو کے اضافہ سے کیا جاتا ہے۔ مثلاً براہمہ کے چار چہرے، کارتکیا کے چھ چہرے، شیوجی مہاراج کی تین آنکھیں، اندرا کی ایک ہزار آنکھیں۔ اور تقریباً ہر ہر خدا کے چار ہاتھ۔ اس جدید مجمع خدائیگان میں بھی براہمہ کو صدر بنایا گیا۔ لیکن ایسا صدر جس سے ہر ایک اختیار سلب کر لیا گیا ہے۔ اب اُس کو خدائی میں اتنا ہی اختیار ہے جتنا کہ آج کل کے یورپ کے دستوریہ کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے شہنشاہ کو اپنی سلطنت میں ہے۔

ہندو مذہب میں تین بڑے خدا ہیں۔ براہمہ، شیوا اور وشنو۔ ان کو ہی تری مورتی یعنی تین شکلیں کہتے ہیں۔ براہمہ کو خالقیت کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ اور بس۔ انسان کو پیدا کیا اور اب اس کے امور میں اُسے کوئی دخل نہیں۔ وشنو خدائے عشق ہے۔ اور اُس کا سب سے بڑا اوتار کرشنا مہاراج ہیں جو اندھوں اور گونگوں کو اچھا کرتے تھے۔ جذامیوں کی مدد کرتے تھے۔ غریبوں پر مہربانی کرتے تھے اور کبھی کبھی مردوں کو زندہ بھی کر دیتے تھے۔ مہابھارت کی لڑائی میں مارے گئے۔ کوئی کہتا ہے کہ تیر لگا تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ دشمنوں نے درخت پر لٹکا کر پھانسی دی تھی۔ مرنے کے بعد دوزخ میں اُتر گئے۔ وہاں سے آسمان پر چلے گئے۔ اور آخر کار مردوں اور زندوں کے اعمال کا جائزہ لینے کے لئے تشریف لائیں گے۔ اُن کو عورتوں سے بہت عشق تھا۔

وشنو اور شیوجی کے پوجاریوں اور مقلدین کی دو علٰحدہ جماعتیں ہیں۔ بلکہ یہ دو علٰحدہ مذہب ہی ہو گئے ہیں۔ وشنو کے ماننے والوں کی یہ نشانی ہے کہ وہ ہر صبح سرخ گیرو سے اپنے ماتھے پر وشنو کی مثلث نما نشانی یا علامت لگا لیتے ہیں۔ اور شیوجی کے مقلدین اپنے ابرو کے اوپر گئو ماتا کے جلے ہوئے گوبر کی راکھ سے مسطح لکیریں بنا لیتے ہیں یا بازو پر مرد کے عضو تناسل کی شکل کا آلہ باندھتے ہیں یا گردن میں لٹکا لیتے ہیں۔ قدیمی مذاہب میں مرد کی قوت جماع کی اکثر پرستش ہوا کرتی تھی۔ کیونکہ اُن کے خیال میں اس ہی آلہ تناسل سے تو ساری دنیا کا قیام تھا۔ نسوانی خدا کے مندر میں اکثر عورتیں مقرر کر دی جاتی تھیں جن کا مقصد زندگی

اور مذہبی خدمت یہ تھی کہ پوجاریوں کی شہوت کو پورا کریں۔ بائیبل میں ان عورتوں کا ذکر پایا جاتا ہے اور ہندوستان میں بھی ایسی مذہبی عورتیں مندروں کے ساتھ ملحق ہوا کرتی تھیں۔ موہنجو داڑو میں جس کی شمولیت کا شرف صوبہ سندھ کو حاصل ہے شیوجی مہاراج کی اس قسم کی پرستش عام تھی۔ اس جگہ کہیں تو شیوجی کی مورتی تین سروں کے ساتھ ملی ہے۔ اور کہیں محض ایک گول کھڑے پتھر کی شکل میں ہے جس کو مرد کے عضو تناسل کے مشابہ بنایا گیا ہے۔ شیوجی کے اس مذہب کو شکتی پوجا کہا جاتا ہے۔ شکتی کے معنی طاقت اور قوت جماع **Sexual Power** ہیں شیوجی میں مار ڈالنے اور نیست و نابود کرنے کی طاقت بھی تصور کی گئی ہے اس طرح گویا دونوں طاقتیں پیدا کرنا اور مارنا ایک ہی ذات میں مجتمع سمجھی جاتی ہیں۔

شیوجی کی اہلیہ کالی دیوی ہیں۔ جن کے مختلف نام مختلف مقامات پر ہیں۔ کالی، پربتی، اوما، درگا۔ یہ سب ان کے ہی نام ہیں۔ ہندوستان کے بعض مقامات میں خصوصاً بنگال میں اس کی شکتی پوجا ہوتی ہے۔ گذشتہ صدی تک اس کی پوجا نہایت خونخوار شکل میں ہوا کرتی تھی۔ عام طور سے انسانوں کی بھینٹ دی جاتی تھی۔ اس خاتون خدا کی شکل نہایت ڈراونی ہے۔ کوتے جیسے سیاہ عورت منہ کھلا ہوا، جیسے کھانے کو آدمی مانگتی ہے۔ زبان باہر نکلی ہوئی۔ سانپوں کے ہار پہنے ہوئے اور خود انسانوں کی لاشوں پر ناچتی ہوئی، کانوں میں بالیوں کی جگہ مردہ انسانوں کی لاشیں لٹکتی ہوئی گلے میں انسانوں کی کھوپڑیوں کا ہار چہرہ اور چھاتیاں خون میں لتھڑے ہوئے۔ یہ ہے وہ نسوانی خدا جس کی پرستش صدیوں سے قدیم الایام سے ہوتی چلی آئی ہے۔ اس کے چار ہاتھ دکھائے جاتے ہیں۔ دو میں تو تلوار اور انسانوں کا کٹا ہوا سر اور دو ہاتھ پھیلے ہوئے گویا اپنے مقلدین اور پوجاریوں کو اتنی قربانیاں کھانے کے بعد راحت و آسائش عطا کر رہی ہے۔ اس میں ماتا کی طرح رحم اور مہربانی کا مادہ بھی ہے۔

یہ تو ہندو مذہب کے بڑے خدا ہیں۔ ان کے علاوہ تقریباً تین کروڑ خدا ہیں۔ ان میں سے کچھ تو جھوٹوں کے اوصاف اور شکل کے ہیں۔ کچھ فرشتوں کی طرح کے سمجھے گئے ہیں اور کچھ آسمانی اجرام مثلاً سورج چاند اور ستارے ہیں۔

بعض نیک شگون والے ہیں جیسے مچھلی اُن میں سے بہت سے جنگلوں میں بسنے والے جانور یا ہوا میں اُڑنے والے پرندے ہیں۔ مثلاً ہاتھی جو گنیش کے نام سے خدا ہوا۔ اُس کی تصویر مصیبتوں کو ٹالنے والا تعویذ سمجھی گئی ہے۔ بندر اور سانپ اپنی ضرر پہنچانے کی طاقتوں کی وجہ سے خدا سمجھے گئے۔ کالے ناگ کی خاص طور سے پوجا ہوتی ہے۔ ہر سال ہندوستان میں ان سانپوں کی پوجا کے لئے اجتماعات ہوا کرتے ہیں اور لوگ ان کے بلوں کے منہ پر دودھ اور کیلے چڑھاتے ہیں۔ سانپوں کی تعظیم میں بہت سے مندر بنائے گئے ہیں۔ مشرقی میسور میں اب تک ایسے مندر پائے جاتے ہیں۔ اور وہاں سینکڑوں سانپ اور رینگنے والے جانور آن کر جمع ہو گئے ہیں اور اُن کے لئے باقاعدہ پوجاری رکھے گئے ہیں جو اُن کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور کھانا دیتے ہیں۔ اسی طرح مگرمچھ، شیر، مور، طوطے یہاں تک کہ چوہے اور بلیاں خدا سمجھے گئے ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ عزت گؤ ماتا کی ہے۔ بسا اوقات انسان کے دماغ کی کیفیت عقل کی روشنی کی تاب نہیں لاسکتی۔ برہمنوں کے مذہب میں گائے کو ہرگز ذبح نہ کرنا چاہیئے، کسی جانور کو، کیڑے، مکوڑے تک کو ذرا سی بھی تکلیف نہ دینی چاہیئے۔ لیکن بیوہ کو زندہ جلا ڈالنا چاہیئے۔

عام ہندوانی اعتقادات۔ عوام الناس کے اعتقادات کے لئے چند لوگوں نے شاستروں اور شروتیوں کے درمیان پوران لکھے۔ وہ تعداد میں اٹھارہ ہیں اور ان کے لفظی معنی پرانے قصے ہیں۔ پوران تو ہر شخص سمجھتا ہے۔ یہ پورانی باتوں یا اعتقادات کے مجموعے ہیں جن میں کائنات کی ابتداء، اُس کا درجہ بدرجہ ترقی کرنا، پھر فنا ہو جانا، اسی طرح اس سلسلہ کا جاری رہنا خداؤں کا نسب نامہ اور پرانے زمانہ کی تاریخ، یہ سب کچھ ان پورانوں میں ہے۔ خلق یعنی کائنات کی ابتدا کس طرح ہوئی۔ یقینی طور سے تو کسی کو نہیں معلوم۔ پورانے ہم کو بتلاتے ہیں کہ ان کے خالق براہمہ نے ایک انڈا دیا۔ پھر اُس پر خود بیٹھا مرغی کی طرح سے کر بچہ نکلا سو وہ بچہ ہی کائنات ہے۔ غالباً یہ خالق کی غلطی ہے۔ یا اُس کا بہت بڑا مذاق ہے۔ دنیا کے کئی چکر یا دور ہیں۔ ہر ایک دور ایک ہزار مہاجگ یا مہایگ کا ہوتا ہے۔ اور ہر ایک مہاجگ ۴۳۲۰۰۰۰ سال کا ہوتا ہے۔ گویا دنیا کا ایک دورہ ۴۳۲۰۰۰۰۰۰۰ ...

سال یعنی ۴ ارب ۳۲ کروڑ سالوں کا ہوا۔ دنیا کے ایسے کئی دور گزر چکے ہیں۔ اور اسی طرح یہ دور گذرتے رہیں گے۔ دنیا بالکل نیست و نابود نہیں ہوگی، ہر ایک مہایوگ میں چار یوگ یا چار جگ ہوتے ہیں۔ جن میں بنی نوع انسان درجہ بدرجہ تنزل کرتی رہتی ہے۔ موجودہ مہایوگ میں تین یوگ گزر چکے ہیں جن کے ۳،۸۸۸،۸۸۸ سال ہوئے۔ ہم چوتھے جگ میں سے گذر رہے ہیں۔ اس کو کلجگ کہتے ہیں۔ یہ مصیبت کا جگ ہے۔ اس کے ۵۰۳۵ سال گزر چکے ہیں اور ۴۲۶۹۶۵ سال مزید باقی ہیں۔ پورانوں میں اس اعتقاد کو ظاہر کیا گیا ہے کہ کائنات کے ہونے کا کوئی خاص مقصد نہیں ہے۔ ایک مہایوگ کے بعد دنیا کا فنا ہو جانا ایسا ہی ہے۔ جیسا کہ ایک چوہے کا مر جانا اور اس سے زیادہ اس کی اہمیت بھی نہیں۔ اور نہ کوئی ترقی ہے۔ صرف لاتعداد دفعہ دہرایا جاتا ہے۔ انسان کی زندگی بلکہ کل کائنات کی بیقدری اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ برعکس اس کے قرآن شریف کہتا ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لَاعِبِيْنَ - انبیا ۲۱ : ۱۶ دخان ۴۴ : ۳۸

وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا آل عمران ۳ : ۱۹۱

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ص ۳۸ : ۲۷

صاحبانِ علم و عقل پر عیاں ہے کہ ان دونوں مذہبوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ کوئی نسبت ہی نہیں۔

ہندو اعتقاد کے بموجب ان کروڑہا برس تک ارواح نے نہ کچھ کام کیا اور نہ ترقی کی سوائے اس کے کہ ایک جسم سے ہو کر دوسرے جسم میں گزرتی ہیں۔ کیڑے مکوڑوں سے لگا کر انسان تک ہر ایک جاندار ہستی میں سے گزریں اور اسی طرح گزرتی رہیں گی۔ اور پہلے جنم کے تجربہ کو دوسرے جنم میں بھولتی جا رہی ہیں۔ کچھ حاصل بھی نہ ہوا۔ ایک برہمن کی بہت بھوک تھی۔ ہر ایک بھوجن اس کے لئے کم تھا۔ اس نے اس کا یہ سبب بتایا کہ پہلے جنم میں وہ ہاتھی تھا۔ اب کرموں سے انسان ہو گیا۔ گویا قانونِ کرم نے جسم کی شکل تو بدل دی لیکن معدہ بدلنا بھول گیا۔

ہندو اعتقاد ہے کہ تمام زندگی ایک ہے۔ خداؤں سے لگا کر کیڑے مکوڑوں تک وہ ہی ایک زندگی ہے شخصیت یا شخصی علیحدگی کوئی نہیں ہے۔ یہ ایک دھوکہ ہے۔

ساری زندگی ایک ہے۔ جسم مختلف ہیں۔ اور کرم جسموں کو بدلتا رہتا ہے۔ تمام ارواح بھی ایک ہی عظیم روح کے مختلف مظاہر ہیں قسمت بھی کوئی شے نہیں جیسی کرم ہوں گے ویسی شکل یا نوع دیدی جائیگی۔ اور اس کے کرموں کے مطابق واقعات ہوتے رہیں گے۔ معلوم نہیں وہ شکل یا نوع کون دے گا۔

ہندوؤں کے یہاں جنت و دوزخ کا بھی عقیدہ ہے۔ لیکن اُن کا کوئی اثر قانون کرم اور مسئلہ تناسخ پر نہیں پڑتا۔ کیونکہ جنت دوزخ میں روحیں صرف تھوڑے عرصہ کے لئے ٹھہر سکتی ہیں پھر ان کو دوسرا جسم لینا پڑتا ہے۔ اور پھر وہ ہی قوانین اپنا عمل کرنے لگتے ہیں۔ کسی کے خاص بُرے اور خاص اچھے اعمال کی وجہ سے کچھ عرصہ کے لئے اُسے جنت یا دوزخ میں جانا پڑتا ہے لیکن یہ کیا خاص اچھے اعمال ہوئے کہ ان روحوں کو پھر جنت میں سے نکلنا پڑتا ہے۔ ہندوؤں کا خیال ہے کہ سات بہشت ہیں۔ اُن میں ایک تو دنیا ہی میں ہے۔ باقی ایک دوسرے کے اوپر ہیں اسی طرح ان کے خیال میں ۲۱ دوزخ ہیں۔ لیکن ان اعتقادات میں یہ ایک بڑا نقص ہے کہ یہ نہیں بتایا گیا کہ کس جگہ اور کس کے فیصلہ کے مطابق اعمالوں کا امتحان لیا جاتا ہے اور جنت دوزخ کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ بغیر حشر اجساد و میزان عدل کے جنت و دوزخ کا تخیل ممکن نہیں ہو سکتا۔ ہندوؤں میں حشر اجساد بالکل نہیں ہے۔

کائنات کی تمام زندگیوں کو ایک زندگی سمجھنا اور تمام ارواح کو ایک ہی روح سمجھنا ہندو فلسفہ کا وہ عقیدہ ہے جو بظاہر ہیبت سے آدمیوں کو خوشنما معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ذرا سے غور سے اس عقیدہ کی ماہیت معلوم ہو جاتی ہے۔ یہ تو ایک خیال و تصور ہے۔ جس کی کچھ اصلیت نہیں۔ وہ ایک زندگی کیوں کر دائرہ ہست میں آئی۔ وہ زندگی عاقل ہے کہ غیر عاقل۔ اگر غیر عاقل ہے تو اس سے زیادہ عقل والی کون سی ہستی تھی جس نے اُس کو پیدا کیا۔ اگر عاقل ہے تو یہ کیسی عقل ہے کہ پہلے خود ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ اور اب پھر مل کر ایک ہو جائے گی۔ مقصد کیا ہوا۔ نتیجہ کیا نکلا۔ خود بخود ٹکڑے ہو جانا اور پھر خود بخود ایک ہو جانا۔ اس ہی عقیدہ پر بھگوت گیتا کا سارا فلسفہ قائم کیا گیا ہے جس کی تعریف میں تمام ہندو دنیا رطب اللسان ہے۔

بھگوت گیتا کے لفظی معنی بھگوان کا گیت یعنی خدا کی منظوم تقریر۔ دراصل یہ

کرشنا جی مہاراج اور ارجن کا معاملہ ہے اور یہ مہابھارت کے میدان جنگ میں واقع ہوا تھا اس کو سمجھنے کے لئے جنگ مہابھارت کے اسباب وقوع معلوم کرنے ضروری ہیں۔ قصہ تو بہت بڑا ہے۔ ہم مختصر بیان کرتے ہیں۔ پانچ بھائی پانڈو۔ چچازاد بھائی تھے کوروں کے اگرچہ یہ سب ساتھ پلے تھے۔ لیکن پانڈو اور کوروں میں رقابت ہوگئی۔ اور پھر وہ رقابت دشمنی کی حد تک پہنچ گئی۔ ارجن نے ایک خوبصورت دروپدی کو سوئمبر میں جیتا۔ لیکن وہ دروپدی۔ ان پانچوں بھائیوں کی بیوی بنائی گئی۔ اس کے بعد کوروں نے پانڈوں کو جوئے کی بازی میں مدعو کیا۔ یودھشٹر جو پانڈوں میں سب سے بڑا بھائی اور دروپدی کا پانچ خاوندوں میں سے بڑا خاوند تھا جو اکھیلنے لگا سب کچھ ہار گیا۔ یہاں تک کہ دروپدی کو بھی ہار گیا۔ اور آخر کار یہی بڑا سبب مہابھارت کی لڑائی کا ہوا جس میں ایک فریق پانڈو اور دوسرا فریق کورو تھے اور دونوں کے طرفداران بھی شامل ہوگئے۔ لارڈ کرشنا پانڈو کی طرف تھے۔ ارجن نیک آدمی تھا۔ اس نے کرشنا سے کہا کہ فریق مخالف میں ہمارے رشتہ داران اور گورو ہیں۔ میں ان پر ہاتھ اٹھانا نہیں چاہتا۔ کرشنا مہاراج نے اس کو لڑائی پر بہت بحث کرکے آمادہ کیا۔ ان دونوں کا مکالمہ بھگوت گیتا کا متن ہے۔

اگر کرشن مہاراج ایسی ہی عظیم الشان ہستی تھے کہ جیسا بیان کیا جاتا ہے تو پھر یقینی امر ہے کہ بھگوت گیتا میں ان کی مسخ شدہ اور محرف گفتگو ہے کیونکہ ارجن کے اعتراضات کے جو جوابات دیئے گئے ہیں وہ تسلی بخش نہیں ہیں ان کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ قاتل و مقتول دونوں کے جسم میں خدا کی روح ہے جسم کے قتل ہونے یا مرنے سے وہ روح نہیں مرتی۔ وہ بدستور زندہ رہتی ہے لہذا قتل بلکہ موت ایک اہم اور قابل غور چیز نہ رہی۔ وہ روح دوسرے جسم میں چلی جائے گی اور اسی طرح زندہ رہے گی جیسے کہ قتل یا موت سے پہلے تھی۔ اگر اس بحث کو صحیح اور معقول سمجھ کر اس پر عمل کیا جائے تو ساری دنیا میں ایک فساد پیدا ہو جائے۔ کرشنا مہاراج خود اپنے تئیں اس ہی بحث میں کائنات کا خالق اور مدبر کہتے ہیں۔ ــــــ خالق و مدبر سے بعید ہے کہ وہ اتنی سی بات کو نظرانداز کر دے اور معمولی بادشاہوں کی طرح اپنی فوج یا اپنے سرداروں کو لڑائی پر آمادہ کرنے کے لئے ایسی گفتگو کرے۔

دوسری بات جو قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ ارجن کہتا ہے کہ فریق مخالف میں ایسے نیک گرو اور بہترین اخلاق کے لوگ ہیں کہ اگر اُن کو میں نے قتل کر دیا تو اُن کے بعد میری زندگی پر لعنت ہے۔ کرشن مہاراج اس کی تردید نہیں کرتے۔ پھر وہ قتل کرنے کو عمل نیک کیوں کہتے ہیں۔ کیا نیک آدمیوں کو قتل کرنا عمل نیک ہے جس کی وجہ سے جنت ملے گی۔

تیسری بات یہ ہے کہ کرشن مہاراج لڑائی کے اسباب پر تو غور ہی نہیں کرتے۔ یہ فیصلہ ہی نہیں دیتے کہ کون حق پر ہے اور کون ناحق پر ہے۔ فرض کرو کہ فریق مخالف حق پر ہے تو کیا اہل ظلم کا اہل حق کو قتل کرنا بھی عمل نیک ہوا۔

آگے چل کر جہاں کرشن مہاراج نے خدائے واحد کی صفات کو بیان کیا ہے وہ نہایت اعلیٰ کلام ہے۔ اور اس سے بہت اعلیٰ اور خالص وحدانیت کا تخیل پیدا ہوتا ہے۔ لیکن پھر برہمنوں کے خداؤں کا بھی ذکر آجاتا ہے۔ ہمارا یقین ہے کہ بھگوت گیتا اگر کرشن مہاراج کا کلام ہے تو برہمنوں نے اُس کو محرف کر دیا ہے۔ محض بہادری کو جو حق و ناحق کے خیال کے بغیر لوگوں کو قتل کرتی جائے نیک عمل قرار دینا۔ اتنی بڑی ہستی کے شان کے شایاں نہیں ہے۔ اس میں تو ہندوؤں کے چھ فلسفوں میں سے صرف ایک فلسفہ سانکیا کی تائید کی گئی ہے۔

لڑائی کے بعد جب دریودھن کی والدہ میدان میں آکر اپنے بیٹے کی لاش کو دیکھتی ہے تو ایسے الفاظ میں بین کرتی ہے کہ جن کو پڑھ کر بے اختیار آنسو نکل آتے ہیں۔ اور جب ہم خیال کرتے ہیں کہ اس جانگزا غم والم کا باعث ایک وہ ہستی ہے جس کی نسبت خیال کیا جاتا ہے کہ وہ کائنات کا خالق اور مدبر ہے۔ بلکہ اس ہی کتاب میں وہ خود اپنے تئیں یہ ہی کہتا ہے تو پھر اس سارے فلسفہ کی نسبت یہ ہی کہنا پڑتا ہے کہ؎ ایں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ۔

ہندوؤں کے مذہب کا رکن اعظم شو کے لنگ (عضو تناسل) اور اُن کی زوجہ محترمہ کالی کی یونی (اندام نہانی) کی پرستش ہے۔ ایک مورخ کہتا ہے

کہ یہ پرستش نہایت قدیمی زمانہ سے اب تک ہندوؤں کے مذہب کا رکن ہے۔
۳۳ ان دونوں اعضاء مقدسہ کے بڑے لمبے جلوس نکلتے ہیں۔ اور مرد و عورت ان کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں کہ ان میں برائی کیا ہے گاندھی جیسے مہاتما ان کو بے ضرر و بے عیب بتلاتے تھے۔ انھیں ان میں کچھ مخرب اخلاق بات نظر نہیں آتی تھی ۳۴ عریاں تصویریں تو بری اور یہ نمایاں مجسمہ لِنگ دیوی نی بہت عمدہ۔

ہر ایک گھر میں مختلف خدا ہوتے ہیں جن کی پرستش کرنا ہر ہندو کا فرض ہے۔ اپنے ان خداؤں کے لیے کھانا مہیا کرنا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ ان کا خیال ہے کہ اگر ان کو یہ کھانا نہ دیا جائے تو وہ خدا بھوکے مرجائیں گے۔ ان خداؤں کو بھوک سے بچانے کے لیئے انسانوں کی قربانیاں ہوتی رہی ہیں۔ ۱۸۵۴ء تک یہ قربانیاں ہندوستان میں رائج تھیں۔ ان کے یہاں تزکیۂ نفس اور تصفیہ قلب کے لیئے ایک نہایت پوتر (پاک) مکسچر ہے جو بہت شوق سے پیا جاتا ہے۔ یہ گئوماتا کے پانچ چیزوں کا مرکب ہے یعنی دودھ، گھی، دہی، گائے کا پیشاب اور گائے کا گوبر۔ ان پانچوں کو ملاکر یہ لوگ صفائی قلب کے لیئے پیتے ہیں۔

کوئی مسلمان ہے جو اسلام کو چھوڑ کر اس ہندو مذہب کو خوشی سے قبول کریگا۔ سُنا ہے کہ آج کل ہندوستان میں عیسائیوں اور مسلمانوں کی خوب شدھی ہو رہی ہے۔ عقل کی شکست کے بعد ڈنڈا امید ان میں نکلتا ہے اور وہ خوب کارگر ہوتا ہے۔

ہندوستان کے مذہب اور فلسفہ کے بیان متذکرہ بالا کے لیئے یہ کتابیں دیکھو ۳۵

(34) Will Durant: Our Oriental Heritage, P. 519-21

(35) 1. Encyclopedia of Religion and Ethics, Edited by James Hastings, Vol xii.
2. Encyclopedia of Religion and Religions, by Royston Pike.
3 Our Oriental Heritage by will Durant.
4. Popular Hinduism, published at Madras in Papers on Indian Reforms series, 1890
5. Vedic Philosophy by Pt. Gurv Datta Vidhvarti, M. A.
6 Bhagvad-Gita: English Translation by Mrs. Annie Besant, Published by M/S G. A. Natesan & Co., Madras.

آخر میں ہم اس کو ہندوستان ہی کے قول پر ختم کرتے ہیں۔

Yatha devah, tatha bhaktah: As is the god, so is the worshipper.

جیسا خدا ہوتا ہے ویسا ہی اُس کا پرستش کرنے والا ہوتا ہے۔

(۴) الف، ب

زرتشت، اون کا مذہب و فلسفہ اور اُن کے بعد ان کی تعلیم کی تنسیخ و تحریف

زرتشت کس زمانے میں ہوئے ہیں اس میں بہت اختلاف ہے۔ زمانہ حال کے محققین کی رائے کے مطابق وہ ۶۶۰ء ق م پیدا ہوئے اور ۵۹۳ء میں انتقال کیا۔ مغربی ایران کے رہنے والے تھے۔ ان کا پیدائشی مقام شہر رے ہے۔ یہ وہ ہی رے ہے جس کی حکومت کی تمنا میں عمر ابن سعد نے اپنی دین و دنیا دونوں کھوئے۔ اور وہ نہ ملی۔ زرتشت نے اپنے دین کی تبلیغ مشرقی ایران میں کی۔ زیادہ تر یہ شہر بلخ میں رہے۔ ان کے والد کا نام پوراشسپ تھا۔ اور خاندان سپیتما میں سے تھے۔ قوم کے یہ Magus یعنی مجوسی تھے۔ فارسی میں اس کو مغ کہتے ہیں۔ مغان اس کی جمع ہے۔ پیر مغاں آپ نے سُنا ہوگا۔ یہ لوگ شراب بہت پیا کرتے تھے۔ اس ہی لئے فارسی ادبیات میں پیر مغاں کو بادہ فروشی کا عہدہ سپرد کیا گیا۔ مغبچۂ بادہ فروش حافظ شیراز کا بڑا محبوب ہے۔ انگریزی میں Magus کی جمع Magi ہے۔ اور اُس کو Magian بھی کہتے ہیں جس کے معنی جادوگر کے ہوگئے ہیں۔ لفظ Magie (جادو) اس ہی سے نکلا ہے۔ ایران قدیم میں یہ بچارےیوں کی ایک جماعت ہوا کرتی تھی جس نے اپنا پورا اقتدار و تسلط سلطنت ایران کے عروج کے زمانہ تک قائم رکھا۔ ان کے مذہب میں اور زرتشت کے مذہب میں فرق یہ تھا کہ زرتشت نے تمام خداؤں کو چھوڑ کر ایک خدا کا اعتقاد قائم کیا تھا۔ زرتشت کا دعوی تھا کہ خدا نے جس کو وہ اہرمزد کہتے تھے، ان کو خاص طور سے اپنے دین کی تبلیغ کے لئے مبعوث کیا ہے۔

زمانہ مابعد میں Magi کی شہرت اُن کے جادو کی وجہ سے خراب ہوگئی۔ دیکھو Webster بہرصورت اُس زمانہ میں یہ لوگ نجومی، حکیم، جادوگر، بیماریوں کو دور کرنے والے اور لوگوں کے مددگار مشہور تھے۔

زرتشت کی تعلیم کتاب اوستا میں ہے جس کو زرتشتی مذہب کی بائیبل کہہ سکتے ہیں، اس کا وہ حصہ جس کو گتھا کہتے ہیں خود زرتشت کا لکھا ہوا بیان کیا جاتا ہے۔ اُس زمانہ میں جادو کا بڑا زور تھا اور جادوگر نہیں چاہتے تھے کہ یہ نیا مذہب پھیلے۔ لہذا زرتشت کو بہت مشکلیں درپیش آئیں۔ دس سال کے عرصہ میں صرف ایک شخص نے اُن کا دین قبول کیا۔ اور وہ خود اُن کا چچازاد بھائی تھا۔ لیکن جب گشتاسپ بادشاہ نے اُن کا دین قبول کرلیا تو پھر اُس کو ترقی ہونے لگی۔ کلدانی نجومی بھی تھے اور جادوگر بھی۔ لوگوں نے اُن کی ان صفات کو زرتشت کی طرف منسوب کردیا ہے اور کہتے ہیں کہ زرتشت نے ساحری کلدانیوں سے لی تھی۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ ایران کے آریاؤں کو سمیرین (Sumerian) اور سامی (Semilics) وغیرہ اقوام کے خیالات سے واقفیت تھی۔

اوستا میں ہرمز کو خدائے واحد بتایا گیا ہے۔ زرتشت کی تعلیم خالص وحدانیت تھی ہرمز کے علاوہ وہ کسی اور خدا کو نہیں مانتے تھے۔ اوستا میں ہرمز قادر مطلق اور تمام طاقتوں کا مظہر ہے۔ زرتشت نے دعویٰ کیا تھا کہ ان کو ہرمز (اہورامزدا) نے براہ راست اس دین کی تبلیغ کے لئے مبعوث کیا تھا۔ ہم نے جو ذکر اشتباہ کے عنوان کے تحت میں شروع کتاب میں کیا ہے وہ اس جگہ دوبارہ پڑھ لیا جائے۔ اسلام نے زرتشت کے مقلدین کو زرتشت کی قومیت کی نسبت سے مجوس کہتے ہیں۔ اور مجوسیوں کو اہل کتاب کی حدود کے اندر داخل کیا گیا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ موجودہ اوستا میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جو اصول اسلام کے معیار پر ٹھیک نہیں اُترتیں، یہی حالت یہودیوں کی توراۃ اور نصاریٰ کی انجیل کی بھی ہے۔ اور یہی حالت قرآن شریف کی بھی ہوتی اگر حضرت علیؑ نے قرآن نہ جمع کرلیا ہوتا اور حکومت کے جمع قرآن کے وقت حضرت علیؑ نہ ہوتے یا خدا نے اون کو اُس اعلیٰ عدیم المثال ضبطِ نفس اور صبر کی توفیق نہ عطا کی ہوتی جو اون سے ظاہر ہوا۔

اپنے اس تبلیغ دین سے پہلے زرتشت غور و فکر کے لئے لوگوں سے بچ کر پہاڑوں

میں چلے گئے تھے اور وہاں درختوں کے پھلوں پر گزارہ کرتے تھے۔

موت کے بعد آخرت کی زندگی کا اعتقاد بھی اوستا میں پایا جاتا ہے۔ زرتشت کہتے ہیں کہ جنت میں HAURVATAT یعنی خالص اور مکمل خوشی اور Ameretat. یعنی دائمی زندگی بغیر موت کے ہوگی۔ یہ بھی اُن کی تعلیم ہے کہ ایک زمانہ میں دنیا میں حکومت الٰہیہ بھی قائم ہوگی۔ جب سارے عالم میں عدل ہی عدل ہوگا۔ ناانصافی نہ ہوگی، بے چینی نہ ہوگی۔ ایسی حکومت الٰہیہ کا نام اُنھوں نے Xshathra Vairya رکھا ہے۔ یہ خیال ابتداء سے اب تک ہر مذہب میں پایا جاتا ہے۔ یہودیت اور اسلام میں بھی اس خیال کو نہایت صراحت سے بیان کیا ہے۔ مسیحیت میں بھی یہ ہی خیال پایا جاتا ہے۔ تاریخ عالم پر نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا میں ابھی تک ایسی حکومت قائم نہیں ہوئی جس میں عدل دامن عام ہو۔ لیکن ہر مذہب نے خصوصاً اسلام نے اس کا حتمی وعدہ کیا ہے کہ ایسی حکومت دنیا میں ضرور قائم ہوگی۔ اس ضمن میں علامہ مودودی کی مندرجہ ذیل عبارت غور سے پڑھنے کے قابل ہے:۔

"تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اب تک کوئی مجددِ کامل پیدا نہیں ہوا ہے۔ قریب تھا کہ عمر ابن عبد العزیز اس منصب پر فائز ہو جاتے مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ ان کے بعد جتنے مجدد پیدا ہوئے اُن میں سے ہر ایک نے کسی خاص شعبے یا چند شعبوں ہی میں کام کیا۔ مجدد کامل کا مقام ابھی تک خالی ہے۔ مگر عقل چاہتی ہے، فطرت مطالبہ کرتی ہے اور دنیا کے حالات کی رفتار متقاضی ہے کہ ایسا لیڈر پیدا ہو۔ اس دور میں پیدا ہو یا زمانہ کی ہزار گردشوں کے بعد پیدا ہو۔ اسی کا نام الامام المہدی ہے جس کے بارے میں صاف پیشین گوئیاں نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کلام میں موجود ہیں۔"

تجدید و احیائے دین ص ۳۱۔

زرتشت کے پیدا ہونے کے وقت دنیا کی حالت تھی اُس کی تصویر ایک انگریزی مورخ نے اس طرح کھینچی ہے: یہ اُس کا ترجمہ اُردو میں ہے۔ دیکھو

Our Oriental Heritage, Chap. xiii. P. 365

ترجمہ :- جب وہ (زرتشت) ظاہر ہوئے میڈ اور ایرانیوں کے آبا و اجداد میں تو انہوں نے اپنی قوم کو جانوروں، متوفی آبا و اجداد، زمین، اور سورج کی پرستش کرتے ہوئے پایا اور دیکھا کہ اُن لوگوں کے مذہب میں وہ عناصر اور وہ ہی خدا تھے جو ویدکے زمانہ کے ہندوؤں میں پائے جاتے تھے۔ زرتشت سے پہلے کے اس مذہب کے خدا یہ تھے: متھرا، آفتاب کا خدا، عیتا پیدائش اور افزائش کی خدائنی، زمین، ہوما سانڈ کے نمونہ کا خدا، جو مرگیا اور پھر زندہ ہوا اور بنی نوع انسان کو زندگی دوام عطا کرنے کی غرض سے اپنا خون پینے کو دیتا تھا۔ زمانہ قدیم کے ایرانی اُس کی پرستش اس طرح کرتے تھے کہ ہوما گھاس کا نشہ آور عرق پیتے تھے۔ ان خداؤں کی پرستش اور کافرانہ رسوم کو دیکھ کر زرتشت کو بہت غم اور تعجب ہوا۔ اُس نے اُن مجوسی پجاریوں کے خلاف بغاوت کی جوان خداؤں کی پرستش کرتے تھے اور اُن پر قربانیاں چڑھاتے تھے۔ اور اپنے ہمعصر انبیاء عاموس اور یسعیاہ کی سی جرأت کے ساتھ دنیا میں خدائی واحد کا اعلان کیا۔ یہاں اُس خدائی واحد کا نام اہورا مزوا تھا جو نور و سماوات کا خدا تھا اور باقی مفروضہ خدا کچھ نہیں تھے۔ صرف اُس کی صفات کا دوسرا نام تھے۔ آگے چل کر یہ ہی مورخ زرتشت کی کامیابی اور اُن کے بعد اُن کے مذہب کے خراب ہو جانے کو اس طرح بیان کرتا ہے: دیکھو

Our Oriental Heritage, Chap. xiii PP. 366-7

ترجمہ :- زرتشت کے بعد جب یہ مذہب انبیاء کے دائرہ سے نکل کر ملکی سیاست دانوں کے قبضہ میں آیا تو پھر خدائی واحد اہورامزدا کا تخیل ایک شاہنشاہ کا سا ہو گیا۔ لوگوں نے اعتقاد قائم کر لیا کہ وہ دنیا کا خالق اور مدبر ہونے میں بہت سی خداؤں کی مدد کا محتاج ہے اور اُن کو چھوٹے چھوٹے خدا تصور کر لیا گیا جو زرتشت کے زمانہ میں صرف مظاہر قدرت سمجھے جاتے تھے مثلاً آگ، پانی، سورج، چاند ہوا اور مینہ لیکن اس کامیابی کا سہرا محض زرتشت کے سر ہے کہ اُس نے خدا کو ہر ایک شے سے بالا تصور کیا۔ اور اُس کی توصیف و ثنا ایسے الفاظ میں کی جو رفعت و بلندی میں انجیل کی کتاب ایوب کے برابر ہیں۔ مثلاً اُس کی یہ دعا قابل غور ہے۔

اے اہور امزدا میں تجھ سے پوچھتا ہوں، مجھے سچ سچ بتا کہ کس نے سورج اور ستاروں کے راستے اُن کے لئے مقرر کئے ہیں۔ وہ کون ہے جس کے حکم سے چاند گھٹتا بڑھتا ہے۔۔۔۔۔ کون ہے جس نے زمین کو نیچے اور آسمان کو اوپر سنبھالا ہوا ہے اور اُن کو پریشان ہونے سے بچایا ہوا ہے۔ کون بارش اور درختوں کو قائم رکھتا ہے۔ کون ہوا چلاتا ہے۔ اور بادلوں کو سرعت رفتار دیتا ہے۔ کس نے اے اہورا مزدا عقل کو پیدا کیا ہے۔ (وہ تو ہی تو ہے)

اس عقل و ذہن سے انسانی عقل و ذہن مراد نہیں ہے۔ بلکہ الٰہی عقل، یعنی کلمۃ اللہ جس سے اہورا مزدا نے تخلیق کائنات کی ہے، زرتشت نے اہورا مزدا کی سات صفات بیان کی ہیں، نور، عقل، حق، قدرت، خیر، حکمت اور دائمی بقا۔ لیکن اُس کے مقلدین نے جو اصنام پرستی اور کثرت الٰہ کے عقیدہ کے عادی تھے، ان صفات سے علٰحدہ خدا یا ہستیاں سمجھ لیا جن کو وہ امیش سپنتا (سات باقی رہنے والی ہستیاں) کہتے تھے اور جن کی نسبت اُن کا خیال تھا کہ انھوں نے اہورمزدا کی ماتحتی میں دنیا کو پیدا کیا اور اب اُس کا انتظام کر رہے ہیں۔ مسیحیت کی طرح زرتشتی مذہب میں بھی بانیٔ مذہب کی اعلیٰ توحید کی جگہ اُس کے مقلدین کی اصنام پرستی نے لے لی۔

زرتشت کی تعلیم کو James Hastings اس طرح بیان کرتے ہیں:

دیکھو Encyclopedia of Religions and Ethics. P 864

ترجمہ:- جن دو ارواح اولین نے بطور توام اپنے تئیں خواب میں ظاہر کیا تھا وہ دراصل خیال، قول اور عمل کی نیکی اور بدی ہیں اور ان دونوں میں سے عقلمند آدمی نیکی کو پسند کرتے ہیں اور احمق لوگ ایسا نہیں کرتے (یعنی وہ بدی کو اختیار کرتے ہیں) زرتشت کی تعلیم کا یہ نچوڑ ہے۔۔۔۔۔ لیکن موجودہ زرتشتی مذہب تو بین بین کی مصالحت ہے درمیان زرتشتی مذہب اور اُس زمانہ کے اعتقادات کے جو دیگر اقوام میں رائج تھے۔ اب اس ثنانویت سے اخلاقی رنگ توجاتا رہا اور اس اصول کی تاویل ان الفاظ میں اور اس طریقے سے کی جاتی ہے جو دیگر اقوام مثلاً اہل بابل اور آریاؤں میں رائج تھے۔

یعنی یہ کہ نیکی و بدی کے علیحدہ علیحدہ خدا ہو گئے۔ اور اُن کی آپس میں لڑائی ہونے لگی۔ بابل کے نیکی و بدی کے لڑنے والے خدا مردک طیامت نزو اور الیل وغیرہ تھے۔ اور آریاؤں کے یہاں یہ لڑائی طوفانِ باد و باران میں ہوتی تھی جہاں نوزیا آسمان کا خدا بدی کے بڑے اژدہے کو مارتا ہے۔

غلط تاویل کے کرشمے آپ نے دیکھے۔ زرتشت نے تو اتنا ہی کہا تھا کہ انسان کے اندر نیکی و بدی کی دو طاقتیں ہیں۔ اچھے آدمیوں کو چاہئے کہ وہ نیکی کی طاقت کو پسند کریں۔ اُن کے مقلدین نے جن کی عمریں کفر میں گذری تھیں اپنی کفر دوستی کی وجہ سے ان الفاظ کی تاویل اپنے سابقہ ملحدانہ تخئیل کے مطابق کر لی۔ اور نیکی و بدی کے دو خدا بنالئے جن کی دائمی لڑائی ہوتی ہے۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ انجیل بھی ان ہی تخئیلات کے زیر اثر تحریر ہوئی ہے۔ خدا کے بڑے بڑے فرشتے بدی کے اژدہے سے خدا کی طرف سے ہو کر لڑنے نکلتے ہیں اور خوب لڑائی ہوتی ہے۔ دیکھو یوحنا کا مکاشفہ باب ۱۲۔

موجودہ اویستا کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس میں .Magian کے دو اصول لئے گئے ہیں۔

(۱) ایک تو مردوں کو کھلے میدان اور پہاڑیوں کی چوٹیوں پر گیدڑوں کے کھانے کے لئے ڈال دینا۔

(۲) دوسرے نزدیکی رشتہ داروں کی شادی کا جواز۔

اویستا کی قافیہ بندی اور طرز بیان ویدوں کی تحریروں سے ملتے جلتے ہیں۔ اویستا میں یہی کلمۃ اللہ کا تخئیل ہے جو لفظ Vohu Mana سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور یہ وہ ہی ہے جو انجیل میں Logos کے لفظ سے ظاہر کیا گیا ہے۔ جس کے معنی کلمۂ خدا یعنی Word of God ہیں سوریا کے مذہب میں زرتشتی اہورامزدا (ہرمز) کی مشابہت اشوریا کے اسارامزاش Assara Magash میں ہے۔ دونوں کے سات سات فرشتے ہیں۔ اشوریا کے .Agigi اور زرتشت کے Spenta Man..ya .Amesha Spentas ہیں اسی طرح رگ وید میں بھی کہیں کہیں ایک خدا کا ذکر آجاتا ہے جیسا کہ .Max Muller نے بیان کیا ہے۔ وہ اس کی مثال کے لئے

Rig x 121 پیش کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اس میں وحدانیت کا عقیدہ اس صراحت سے بیان کیا ہے کہ اُس کا انکار ناممکن ہے (۳۶)

اس سے ہمارا یہ دعویٰ کہ یہ سب کچھ انبیاء سابقہ کی تعلیم کا اثر ہے بہت اچھی طرح ثابت ہوتا ہے۔ اور اس سے ارتقاءِ تخیل و دماغ انسانی کی تھیوری بھی غلط ثابت ہوتی ہے۔ - - - - - - - - - - - - - - - - -

بہر تقدیر۔ کیونکہ اس ارتقاء کی تھیوری کے مطابق تو وحدانیت کا تخیل حال کی بات ہے۔ اور اویستا اور ویدوں کی وحدانیت تو اس وقت کا ذکر ہے کہ جب دماغ انسانی پتھروں اور درختوں کی الوہیت میں اُلجھا ہوا بیان کیا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اثر انبیاء کی تعلیم کا تھا جن کو خداوند تعالےٰ نے یہ تعلیم دے کر مبعوث کیا تھا۔

(۵) بودھ مذہب۔

دراصل برہمنوں کے بے شمار خداؤں والے مذہب سے ایک بغاوت کی تحریک تھی جس نے بودھ مذہب اور جین مت پیدا کئے۔ گوتم بدھ کے سوانح حیات اس طرح افسانوں میں تبدیل ہو گئے ہیں کہ اُن کا معلوم ہونا بہت مشکل ہے۔ بس اتنا ہی یقین کیا جا سکتا ہے کہ یہ سلطنتِ کپل دست کے بادشاہ کے لڑکے تھے۔ کپل دست ایک چھوٹی سی ریاست ہمالیہ کے دامن میں نیپال کے جنوب میں بنارس سے یک صد میل شمال کی طرف واقع تھی۔ تاریخ پیدائش و موت بھی یقین کے ساتھ نہیں معلوم ہو سکی ہے۔ اور خیال کا اسیر اتفاق معلوم ہوتا ہے کہ یہ ۵۶۳ ق م میں پیدا ہوئے اور ۴۸۳ ق م میں انتقال کیا۔ ان کے ہم عصر ہندوستان میں مہاویر، ایران میں زرتشت۔ چین میں Lao-tze. اور Confucius. سلطنت یہود میں Jeremiah. اور Isaiah II. اور یونان میں فیثاغورث اور ہراقلیس وغیرہ قبل سقراط کے فلاسفر تھے۔

دنیا کے مصائب و آلام نے گوتم بودی کے دل میں خیالات کا سلسلہ شروع کیا۔ اور یہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ (۱) دنیا کی چیزوں میں منہمک ہونا عبث ہے۔

(36) Max Muller's History of Ancient Literature, PP 568 et Seq.

اور (۲) پیدائش یعنی دنیا میں آنا ہی سارے مصائب کا موجب ہوتا ہے۔ انہماک فی الدنیا کے خلاف دوسری حد پر اتنے چلے گئے کہ وہ بھی ان مصائب کا اچھا حل نہ ثابت ہوا۔ ۷ سال تک ہندو یوگی کی سی زندگی گزاری۔ صرف جنگل کی گھاس پر گزارہ تھا۔ اور کچھ عرصہ تک وہ بھی چھوڑ دیا۔ اور صرف گوبر اور لید ہی کھاتے رہے۔ آخر کار کہنے والے لکھتے ہیں کہ صرف ایک چاول ان کی روزانہ خوراک رہ گئی تھی۔ اپنے ڈاڑھی اور سر کے بال نوچ نوچ کر اپنے نفس کو تکلیف اُٹھانے کا عادی بنایا۔ گھٹنوں کھڑے رہتے تھے۔ اور دنوں کانٹوں پر لیٹے رہتے تھے۔ صفائی اور غسل سے عار تھا۔ جسم پر اتنا گرد و غبار ہو جاتا تھا کہ جب کھڑے ہوتے تھے تو مٹی سے بھرا ہوا درخت کا تنہ معلوم ہوتے تھے۔ اکثر وہاں جایا کرتے تھے کہ جہاں مُردوں کی لاشیں میدان میں جانوروں کے کھانے کے لئے رکھ دی جایا کرتی تھیں۔ وہاں سڑتی ہوئی لاشوں میں سوتے تھے۔ یہ تھی خود رہ تپاس کی خود آرائی۔ لیکن پھر جو تپاس نے اُلٹ پلٹا کھایا تو دوسری حد پر چلا گیا۔ اور کھانا جو شروع کیا تو وہ بھی بہت زیادہ اچھا کھانا، اچھی جگہ کھانا، اور بہت زیادہ کھانا۔

بدھ مذہب کی تعلیم اور اُس کے اُصول۔ گوتم بدھ کا طریقہ تبلیغ مذہب یہ تھا کہ اپنے شاگردوں کے ساتھ شہر بشہر پھرتے تھے۔ بعض دفعہ تو ان شاگردوں کی تعداد بارہ سو تک ہو جاتی تھی۔ جہاں جاتے تھے وہاں کے آدمیوں کے ذمہ ان کا کھلانا اور مہمانی کرنا ہوتا تھا۔ بعض دفعہ رنڈیوں کے گھر بھی اسی طرح کھانا کھانے چلے جاتے تھے۔ گانوں کے باہر اپنا خیمہ لگاتے تھے۔ سہ پہر کو دھیان گیان میں مشغول ہوتے تھے اور شام کو تعلیم دیا کرتے تھے۔ ان کا مقولہ تھا کہ زندگی دُکھ ہے۔ یہ دُکھ خواہش کی وجہ سے ہوتا ہے اور عقلمندی یہ ہے کہ اس خواہش کو خاموش کیا جائے۔ پیدا ہونا ہی دُکھ ہے۔ بیماری اور بڑھاپا دکھ ہیں۔ رنج والم، ناامیدی، ہجوم یاس یہ سب دکھ ہیں۔

ان کا فلسفہ یہ تھا۔ دنیا میں رنج والم ہی ہے۔ یہاں کہیں خوشی نہیں۔ کبھی راحت بھی ہوتی ہے تو وہ بھی چند لمحوں کی۔ اور اپنی ناپائیداری کی وجہ سے رنج والم ہی پیدا کرتی ہے۔ رنج و راحت دونوں گزران ہیں، بے معنی ہیں، بے حقیقت

ہیں ۔تمام خواہشات کو یک لخت ترک کر دینا چاہیئے۔ خصوصاً خواہشِ مجامعت نسواں کیونکہ اس سے لوگ پیدا ہوتے ہیں اور اس مصیبت میں گرفتار ہوتے ہیں ۔ اور یہ سلسلہ مصائب و تکالیف کا نا متناہی ہو جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ کی طرح گوتم بدھ بھی عورتوں سے گھبراتے تھے اور ان کو اپنے مذہب میں نہیں داخل کرتے تھے ۔ اُن کا خیال تھا کہ بار بار پیدا تو اس وجہ سے ہوتے ہیں کہ گناہان دھلتے جائیں ۔ ہم ایسی نیک زندگی بلکہ معصوم زندگی رکھیں کہ کوئی گناہ ہی نہ ہو اور پھر دوبارہ پیدا ہونے کا موقعہ ہی نہ ہو یہ ہی نروان ہے ۔ یہ نیک زندگی آٹھ باتوں سے ہوتی ہے ۔ (۱) اعتقادِ صحیح ، نیت صحیحہ ، قولِ صحیح ، فعل صحیح ۔ رہائش صحیح ، کوشش صحیح ، تخئیل صحیح اور صحیح مراقبہ ۔ کسی نے پوچھا کہ صحیح زندگی کس طرح حاصل ہو سکتی ہے تو اُنھوں نے بتایا کہ پانچ باتوں سے یعنی :۔

(۱) کسی جاندار کو نہ مارو۔

(۲) کوئی چیز نہ لو جب تک وہ تمھیں دی نہ جائے۔

(۳) جھوٹ مت بولو۔

(۴) شراب اور دیگر منشی چیزیں نہ بو۔

(۵) زنا مت کرو۔

گوتم بدھ تناسخ ارواح کے بہت یقین کے ساتھ قائل تھے ۔ ان کے فلسفۂ مذہب میں خدا کے لئے جگہ نہیں تھی ۔ جو کچھ تھا صرف کرم (KARMA) تھا ۔ ان کا مذہب بالکل یونانی فلسفہ کی طرح اخلاقانہ تھا (ETHICS) جس میں نہ تو آئندہ کی زندگی تھی ، نہ حساب کتاب تھا ۔ نہ خدا تھا ۔ بلکہ روح بھی نہ تھی وہ روح کی ہستی کے قائل نہ تھے ۔ وہ تو اس کو دماغ کی ایک حالت سمجھتے تھے۔[(۳۷)]

بدھ مذہب پر تنقید ۔ یہ کونسی ذات یا ہستی فیصلہ کرے گی کہ کسی شخص کی زندگی بے گناہ رہی ہے معصوم رہی ہے ۔ اور اب اس کے لئے

(37) Our Oriental Heritage, Chap. XV. (۳۷)

دوبارہ پیدا ہونے کی ضرورت نہیں رہی ہر ایک شخص کا تخیل صحیح و غلط، خیر و شر کے متعلق مختلف ہوتا ہے۔ اور بحث ہر ایک طریقہ سے ہوسکتی ہے۔ کس معیار سے جانچا جائیگا کہ یہ زندگی صحیح رہی ہے اور یہ غلط۔ اچھا۔ بار بار کی پیدائش سے چھٹکارا ہوگیا۔ تو اب کیا ہوگا۔ ظاہر نتیجہ ہے کہ وہ روح نیست و نابود ہو جائے گی شخصیت نہ رہے گی۔ گویا Annihilation ہو جائے گا۔ کیا یہ Annihilation. اچھی شے ہے۔ اس میں کیا جاذبیت ہے۔ بار بار کی پیدائش میں کیا خرابی ہے جو اس نیستی میں نہیں ہے۔ فرق اتنا ہی ہے کہ پیدائش یعنی زندگی میں رنج و آلام ہیں اور نیستی Annihilation. میں نہ رنج ہے اور نہ راحت۔ لیکن یہ خوشی تو نہ ہوئی۔ اگر بار بار کی پیدائش کا بہت نیک کام کرنے کے بعد یہی نتیجہ ہے یعنی مکمل نیستی تو اس پیدا ہونے کا فائدہ کیا ہے۔ کیا یہ فعل عبث ہے۔ یعنی تخلیق انسان فعل عبث ہے۔ تو یہ کس نے کیا۔ کیونکر وقوع میں آیا۔ یہ وہ بات تو نہیں ہے جو دہریئے کہتے ہیں کہ دنیا خود بخود مادہ سے پیدا ہوگئی۔ اگر یہ بات ہوتی تو اس میں نیکی و بدی کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا۔ نیک ہونے سے کیوں نیستی ہو اور بد ہونے سے کیوں بار بار کی پیدائش ہو۔ یہ دہریوں کی Blind forces کا تو کام نہیں ہوسکتا۔ اُن کو نیکی و بدی سے کیا کام۔ اُن کے نزدیک تو دونوں ہی برابر ہیں کیونکہ دونوں مادہ کا نتیجہ ہیں۔ ایسی forces. مثلاً تیز بارش یا تند ہوا میں تو یہ تمیز نہیں ہوسکتی کہ نیک آدمیوں کے گھر کو بچادیں اور بُرے آدمیوں کے گھر کو اُڑا دیں۔ اگر عورتیں ایسی شے ہیں کہ جیسی گوتم بدھ نے خیال کیا تو پھر اُن کے پیدا ہونے یا زندہ رہنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ کیوں نہ اُن کو پیدا ہوتے ہی اس طرح نہ مار دیا جائے جس طرح زہریلے سانپ کو مار دیا جاتا ہے۔

جب روح کی بحث کرنے پر آئے تو اس طرح بحث کرتے ہیں کہ گویا روح کوئی شے ہی نہیں ہے۔ وہ تو ایک دماغی حالت ہے جو اعضاء انسانی سے کام کراتی ہے۔ اگر یہ ہے تو پھر دوبارہ پیدائش کے کیا معنی۔

غرضکہ بودھ مذہب تو برہمنوں کی ضد میں پیدا ہوگیا تھا۔ کثرت الٰہ کی ضد

میں کہہ یا کہ کوئی خدا نہیں ہے پھر خدا کی جگہ کرم کو لاکر بٹھا دیا۔ اس مذہب میں صحیح منطق کی برداشت نہیں ہے۔

بودھ مذہب اور جین مت دونوں برہمنوں کی فتح سمجھنی چاہئے۔ کیونکہ آخر کار یہ دونوں مذہب اپنی ایک نئی قسم کی بت پرستی میں تبدیل ہو گئے۔ ان میں بے شمار بودھ اور جن ہو گئے جن کی پرستش ضروری سمجھی گئی ایک بدھ کی مورتیوں کی پرستش کرنے میں مشغول ہو گیا۔ دوسرا اپنے جنوں کی پرستش میں محو ہو گیا۔

(۶) **جین مت**۔ اس مذہب کے بانی ایک شخص تھے کہ جن کو ان کو مقلدین نے مہاویرا یعنی بہادر اعظم کا لقب دیا تھا۔ مہاویر ۵۹۹ ق م میں پیدا ہوئے اور ۵۲۷ ق م میں زندگی کے خلاف بھوک ہڑتال کر کے مرگئے۔ ان کے والدین ایک ایسے مذہب سے تعلق رکھنے تھے کہ جس میں خودکشی سب سے بڑی نیکی تھی۔ لہذا جب مہاویرا کی عمر ۳۱ سال کی ہوئی تو وہ دونوں بھوکی خودکشی کر کے مرگئے۔ اس واقعہ کا بہت اثر مہاویرا پر ہوا۔ اور جنگلوں میں بالکل ننگے نکل گئے۔ اور مغربی بنگال کے شہروں اور جنگلوں میں اسی طرح کی ۱۲ سال کی گردش کے بعد ان کے چیلے ہونے شروع ہو گئے اور ان کو جن کہنے لگے۔ جن کے معنی فتحیاب یا فاتح کے ہیں۔ اس ہی نسبت سے اس فرقہ نے اپنا نام جینی رکھ لیا۔ اور اُن کو مہاویرا کا لقب دیدیا۔

جین مت کے عقائد۔ دنیا میں مطلق حق نہیں ہے۔ جس کو ہم حق سمجھتے ہیں وہ ایک نقطۂ نگاہ سے ناحق ہو گا۔ ہاتھی اور چھ اندھوں کی کہانی ان کی ہی بنائی ہوئی ہے۔ جس کا ہاتھ ہاتھی کے کانوں پر پڑا تو وہ سمجھا کہ ہاتھی تو ایک موٹا کھبا ہوتا ہے۔ لہذا ہر ایک نظریہ غلط ہے۔ وید بھی بے فائدہ ہیں۔ وہ خدا کی بنائی ہوئی نہیں ہیں۔ دنیا اسی طرح خود بخود ازل سے چلی آئی ہے۔ اور اس میں جو تغیرات ہوتے ہیں وہ خود اس کی اندرونی طاقتوں اور حرکتوں کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ کئی صدیوں کے بعد ایک ایسا شخص بھی آتا ہے جس کو حق مطلق سے آگاہی ہوتی ہے۔ یہ لوگ اگرچہ خدا کو تو نہیں مانتے تھے اور اس کی ہستی کے قائل نہ تھے لیکن ان مقدس جنوں کی پرستش نہایت شوق سے کرتے تھے۔ وہ ہی برہمنوں والی بات آگئی گو گم بدھ کے برعکس یہ روح ہستی اور شخصیت کے قائل تھے۔ یہ بھی عقیدۂ تناسخ ارواح یا

آواگون کے حامی تھے ۔ ہر ایک جن یا پرماتما اپنی نیک زندگی کی وجہ سے صرف کچھ عرصہ کیلئے چند پیدائش کے چکر سے آزاد ہو جاتا ہے لیکن وہ زمانہ گزرنے کے بعد پھر پیدائش کے چکر میں آجاتا ہے ۔

ہر ایک جینی کے لئے پانچ عہد کرنے ضروری ہیں ۔ (۱) کسی جاندار شے کو نہ ہلائے (۲) کبھی جھوٹ نہ بولے (۳) صرف وہی شے لے جو اُس کو دی جائے (۴) عورت سے مطلق مباشرت نہ کرے (۵) ظاہری حواس کی ہر ایک خوشی سے اجتناب کرے جینیوں کے لئے زراعت ممنوع ہے کیونکہ زمین میں ہل چلانے کے وقت چھوٹے چھوٹے کیڑے مرجاتے ہیں ۔ شہد بھی ممنوع ہے کیونکہ وہ شہد کی مکھیوں کی خوراک ہے معلوم نہیں دودھ ان کے لئے کس منطق سے حلال ہو گیا ۔ جینی کے لئے ضروری ہے کہ پانی چھان کر پئے ، منہ پر کپڑا باندھے رہے تاکہ کوئی جانور اندر نہ چلا جائے زمین پر پہلے جھاڑو دے لے پھر چلے ۔ کیونکہ ممکن ہے کہ کوئی کیڑا ہو اور وہ اس کے پیر تلے آجائے ۔ کسی جینی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنے سوا کسی اور کی جان لے ۔ ہاں اپنی جان لینی یعنی خود کشی بہت نیک کام ہے ۔ یہ خودکشی بھوکی رہ کر ہونی چاہئے ۔ اب بھی سنا ہے کہ ان کے بڑے بڑے مہاتما اسی طرح بھوکے رہ کر مرتے ہیں ۔ غالباً مہاتما گاندھی بھی ایسا ہی کرتے لیکن قاتل نے اُنھیں اس نیک کام کرنے کا موقعہ ہی نہ دیا ۔

ہمارے ان مسلمان نوجوانوں کو جو بھوک ہڑتال کے بہت شیدا ہیں معلوم ہونا چاہئے کہ یہ ہندوانی رسم ہے ۔ اور ہندوؤں کے لئے اُن کے خیال کے مطابق جائز ہے ۔ کیونکہ اگر وہ اس میں مر بھی گئے تو بہت بڑی نیکی کر گئے لیکن مسلمان اگر بھوک ہڑتال کے دوران میں مرا تو وہ تو نہ گھر کا رہا اور نہ گھاٹ کا ۔ نیک کام تو ہوا نہیں کیونکہ وہ جینی نہیں اور مسلمان وہ رہا نہیں کیونکہ جینیوں کی طرح مرا ۔

جین مت کے عقائد پر نکتہ چینی ضروری نہیں ۔ کیونکہ وہی تنقید اس پر بھی عائد ہوتی ہے جو بودھ مذہب پر ہم کر چکے ہیں ۔ علاوہ اس کے دو باتیں ہیں ۔ ایک تو یہ کہ اگر بھوک ہڑتال یعنی بھوکی خودکشی فعل مستحسن ہے تو وہ شروع ہی میں کیوں نہ کی جائے ۔ اور اس کی بھی کیا ضرورت ہے ۔ عورت سے مواصلت کرکے بچے نہ پیدا کراؤ ۔ اس طرح جلدی سے خاتمہ ہو جائے گا ۔ اور بھوکی موت کی ضرورت

نہ رہے گی۔

آواگون کے عقیدہ کا یہ منطقی نتیجہ ہے کہ کسی جاندار شے کو نہ مارنا چاہیئے۔ کیوں کہ اس میں اُن کے ہی والدین یا کسی عزیز کی روح نہ ہو۔ لیکن اس عقیدہ والے لوگ دنیا میں محض اپنے مخالف عقیدہ رکھنے والوں کی وجہ سے زندہ ہیں جو موذی جانوروں کو مار دیتے ہیں ورنہ موذی جانوروں کی کثرت ان کو زندہ بھی نہ رہنے دے۔

(۷) فلسفہ چینی۔

چین کا فلسفہ خالص فلسفہ ہے۔ اس میں مذہب کی آمیزش نہیں اس کا سب سے پہلا فلاسفر Yu Tze ہے جو تقریباً ۱۲۰۵ ق م میں تھا۔ اس کا مشہور فلسفیانہ فقرہ یہ ہے کہ جو شخص شہرت کے خیال کو چھوڑ دیتا ہے اس کو کوئی غم نہیں ہوتا۔ چین کے فلسفہ کے دو بنیادی اصول ہیں .Yang اور Yin ان لوگوں نے دنیا کو دو حصّوں میں تقسیم کیا تھا مذکر اور مونث .Yang سے مذکر اور .Yin سے مؤنث مراد لیا جاتا ہے۔ دنیا کی تمام حقیقت کا راز ان دونوں کی وصل اور جدائی میں ہے۔ جدائی سے یہاں مخالفت مراد ہے۔ اس نظامِ ثانویت میں مذکر Yang سے حرارت روشنی اور حیات کے اثباتی، فاعلی، تخلیقی اور آسمانی اثرات مراد ہیں۔ اور .Yin سے ظلمت، سردی، انجماد اور موت کے منفی، مفعولی اور اسفلی اثرات مراد ہیں۔

چھٹی اور پانچویں صدی قبل مسیح میں تمام دنیا میں فلسفہ کا غلبہ تھا۔ ہندوستان، ایران، سلطنت یہودیہ، اور یونان سب میں۔ اُس زمانہ میں فلاسفروں کی کثرت تھی۔ وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ان صدیوں میں تمام دنیا میں لڑائیاں اور بدامنی پھیلی ہوئی تھی اور مصیبت ہی کے زمانہ میں انسان غور و فکر کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ عوام الناس میں بہت سے مقررین پیدا ہو گئے۔ جنھوں نے دیکھا کہ موجودہ مذہب بہت غیر یقینی تھا۔ حکومت بہت ناقص تھی اور اخلاقیات کا کوئی معیار مقرر نہیں تھا۔ اونھوں نے اپنی خیالی سوسائٹی اور خیالی حکومتیں بنانی شروع کر دیں۔ یہ خیالات حکومت کے خلاف بغاوت کے سرچشمے تھے، بیان کیا جاتا ہے کہ خود چین کے بڑے فلاسفر .Confucius نے جبکہ وہ لو (Lu) کی حکومت میں منسٹر جرائم تھا، ایک افسر کو ایسی ہی بغاوت کے جرم میں قتل کی سزا دی تھی۔

ان سب میں بڑا بانی .Teng Shih تھا۔ جس کو بغاوت کے جرم میں چنگ .Cheng کے نواب نے قتل کی سزا دی تھی۔ یہ Confucius کی جوانی کا زمانہ تھا۔ اُس کا جرم یہ تھا کہ وہ اخلاقیات میں نیکی و بدی کا کوئی ذاتی معیار نہیں سمجھتا تھا بلکہ کسی خاص نسبت سے کہہ دیا کہ یہ اچھا ہے اور وہ بُرا ہے۔ اور وہ ایسی بحث کرتا تھا کہ جس کا جواب دینا مشکل ہوتا تھا۔ ایسا ذہین تھا کہ ایک دن ایک شے کو وہ اچھا ثابت کر سکتا تھا اور دوسرے دن اُسی چیز کو بُرا ثابت کر دیتا تھا۔ اور وہ اپنی بحث کی فیس لیتا تھا۔ اُس کا زمانہ ۵۰۰ ق م تھا۔ اُس کی بحث کا بہت اچھا نمونہ ایک قصہ سے ملتا ہے۔ تنگ شی کے شہر کا ایک دولت مند وائی .Wei دریا میں گر کر مرگیا۔ اور اُس کی لاش ایک شخص کے ہاتھ لگ گئی۔ جس نے اُس کے ورثاء سے لاش دینے کے بدلہ بہت سا روپیہ مانگا، اُن خاندان والوں نے تنگ شی سے مشورہ کیا۔ اُس نے کہا کہ ابھی ٹھہر جاؤ کیونکہ کوئی اور خاندان اُسے اس لاش کے عوض کچھ روپیہ نہ دیگا۔ جب اُس شخص کو خبر لگی تو وہ بہت گھبرایا اور وہ برائے مشورہ تنگ شی کے پاس آیا۔ اُس نے صلاح دی کہ ابھی ٹھہر جاؤ۔ کیونکہ اُن لوگوں کو یہ لاش کہیں اور سے تو مل ہی نہیں سکتی۔ ان لوگوں کا طرزِ عمل بعینہ وہ ہی تھا جو یونان کے .Sophists کا تھا۔ یہ مشابہت اتفاقاً نہ تھی۔ بلکہ سلسلہ تجارت اور دیگر آمد و رفت سے ایک جگہ کے خیالات دوسری جگہ قافلوں کے ساتھ چلے جاتے تھے۔

زمانۂ حال کی پوسٹر بازی کا بھی حال سنئے کہ اس کی ابتداء کب اور کیوں کر ہوئی۔ اس ہی چینی سوفسٹ تنگ شیھ نے گورنمنٹ کی پالیسی کی نکتہ چینی کے لئے پمفلٹ نکلوائی۔ وزیر اعظم نے حکم دیا کہ ان کو منظر عام پر چسپاں نہ کیا جائے۔ تنگ شی نے اس پوسٹر بازی کو تقریر بازی سے تبدیل کر دیا۔ اپنے پوسٹر زبانی تقریروں میں سنانے لگا۔ وزیر اعظم نے اس کو بھی منع کیا تو اُس نے اپنے پوسٹر یا پمفلٹ دوسرے اسباب کے ساتھ چُپکے سے رکھنے شروع کر دئے۔ وزیر اعظم نے اس ذہن بانی کا خاتمہ تنگ شی کی گردن کاٹ کے کر دیا۔

اس کے بعد Confucius کے زمانہ سے پہلے کا سب سے بڑا فلاسفر

Lao-tze. تھا۔ یہ غالباً ۶۰۴ ق م میں پیدا ہوا اور ۵۱۷ ق م میں مرگیا۔ یہ بھی اپنے زمانہ کے سیاست دانوں کی بدمعاشیوں اور دغابازیوں سے تنگ آگیا تھا۔ یہ "چو" Chou. کی شاہی کتب خانہ کا داروغہ تھا۔ اس عہدے کو چھوڑ کر وہ بخوشی خود جلاوطن ہوگیا کیونکہ اُس کو حاکمان ملک کی یہ دغابازیاں پسند نہ تھیں۔ ہم تو دنیا کے موجودہ زمانہ کی سیاست بازی سے نالاں ہیں۔ دیکھئے۔ سیاستدانوں کی بدمعاشیاں بھی کتنی پرانی ہیں۔ تاریخ میں کوئی نئی بات نہیں ہوتی سب کچھ جواب ہو رہا ہے۔ پہلے بھی ہو چکا ہے۔ یہ تو محض ہماری ماضی پرستی اور حال دشمنی کا اثر ہے کہ جو کچھ خرابی آج ہم دیکھ رہے ہیں وہ سب زمانۂ حال کی روش کے سر تھوپ رہے ہیں۔ جب دنیا میں شیطان ہوئے تو شیطنت جاری ہوگئی اور وہ کونسا زمانہ تھا جب دنیا شیطانوں سے خالی تھی۔ کبھی دب گئے۔ کبھی اُبھر آئے۔ دنیا میں تو یہی آنکھ مچولی ہوتی رہی ہے۔ اور سیاست دانوں کی بدمعاشیاں تو ان کے ساتھ ہی پیدا ہوئی ہیں۔ جب سے دنیا میں دنیا والی سیاستدانی شروع ہوئی ہے تب سے ہی یہ سیاسی بدمعاشیاں شروع ہوگئیں۔ جن بڑے آدمیوں نے اُس کی مخالفت کی وہ مشہور ہوگئے۔ اور چھوٹے آدمی" بدستور سابق "رو دھو کر چپکے ہوگئے"۔ خیر یہ لوڈزو Lao-tze جب قریۂ پہنچا تو وہاں کے آدمیوں نے اس کو اپنی رہنمائی کے لئے کتاب لکھنے کو کہا۔ اُس نے کتاب لکھی جس کا ذکر ہم ابھی کرتے ہیں۔ Lao-tze. تو لقب ہے۔ جس کے معنی ہیں پورانا اُستاد۔ اس کا نام تو Li بیان کیا جاتا ہے۔ جس کے معنی بیر کے ہیں۔ یہ تو ابھی شبہ ہے کہ وہ کتاب کس کی لکھی ہوئی ہے۔ بہر صورت وہ دو حصوں پر منقسم ہے۔ Tao. اور Te. اور اس کا نام ہے Tao-Te-Ching یعنی کتاب صراط مستقیم۔ Te. کے معنی راستے کے ہیں اور راستہ نیچر کا قرار دیا گیا ہے۔ Tao. چین کے فلسفہ کا نام ہے۔ لہٰذا اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ڈو فلسفہ کے مطابق طریقۂ رہائش یہ لکھا تو جاتا ہے Tao. لیکن پڑھا جاتا ہے Dou.۔ یہ کتاب نہایت دلچسپ ہے اور چین کی بہت بڑی آبادی اس کو آج تک اپنا ضابطۂ مذہب و زندگی سمجھتی ہے۔ اس فلسفہ کی چند باتیں یہ ہیں۔

خیال محض ایک اوپری غیر ضروری شے ہے۔ صرف بحث کے لئے اُس کی

ضرورت ہوتی ہے یوں تو اس کے نقصانات بہ نسبت اُس کے فوائد کے بہت زیادہ ہیں۔ طریقہ یعنی طریقہ زندگی یہ ہے کہ ذہن و قوت غور (.Intellect) اور اُن کے تمام لوازمات کو یکسر چھوڑ دیا جائے۔ اور گوشہ عزلت کی سادہ اور پرسکون دہقانوں کی سی زندگی مناظر قدرت کے درمیان گزارنی چاہیئے۔ علم نیکی نہیں ہے۔ بلکہ جتنی تعلیم بڑھی ہے اُس کے ساتھ ساتھ بدمعاش بڑھ گئے ہیں۔ علم عقل نہیں ہے۔ کیونکہ دانشمند سے کوئی شے اتنی دور نہیں ہے جتنی ہوشیاری سب سے بدترین حکومت وہ ہے جس میں فلاسفر حکمران ہوں۔ دیکھیئے افلاطون کے فلسفہ ہیں اور اُس فلسفہ .Taoism میں بعد المشرقین ہے۔ افلاطون کہتا ہے کہ بہترین حکومت وہ ہے جس میں فلاسفر حکمران ہوں۔ اور دونوں اپنے اپنے نقطۂ نگاہ سے ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ اگر فلاسفران نیکی اور عدل کرنا چاہیں تو بہترین کر سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ اس کو سمجھتے ہیں اور اگر علماء و فلاسفران اپنے علم کو بدی میں استعمال کریں تو بدترین ہو سکتے ہیں۔ اسلام کا فلسفہ کتنا صحیح ہے جس پر کوئی اعتراض ہی نہیں ہو سکتا۔ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقَاکُمْ۔ خدا سے ڈرنے والے ہی بہترین حکمران ہوتے ہیں۔ خدا سے وہ ہی ڈرے گا جس کے پاس علم ہوگا یعنی جو عالم ہوگا اور چونکہ خدا سے ڈرتا ہے لہذا اپنے علم کو نیکی اور عدل ہی کی طرف استعمال کریگا۔

بہرصورت، .Tao-Te-Ching اور .Taoism کا فلسفہ بھی بہت غور کے قابل ہے۔ ان کے غور سے بے جا علم اور مفید جہالت کی خصوصیات اچھی طرح معلوم ہوتی ہیں۔ وہ فلسفہ یہ ہے:۔

سیدھا سادا حکمران ہر ایک جگہ دخل در معقولات کرنے کے بجائے رعایا کو اپنا طرز عمل خود تیار و مرتب کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ جب حکومت کی طرف سے بے جا مداخلت اور اوامر نواہی نہیں ہوتے تو رعایا کی قدرتی اقتصادی اور اخلاقی قوتیں اپنا عمل کرتی ہیں۔ اُن کی نہایت زبردست خواہشیں دو ہوتی ہیں۔ رزق اور محبّت۔ ان دونوں ہیتّوں کے ساتھ رعایا کی گاڑی سیدھے سادے راستہ پر چلتی ہے۔ بہت کم ایجادیں ہوں گی۔ یہ ایجادیں ہی بہت مضر ہوتی ہیں۔ یہ دولت مند کی دولت اور بارسوخ آدمی کے رسوخ میں اضافہ کر دیتی ہیں

اگر علم نہ ہوگا تو کتابیں، وکلاء، اور .Industrialism نہ ہوں گے اور لوگوں کی راحت اور ان کا امن محفوظ رہے گا۔ حکومت میں بہت زیادہ امتناعی احکام سے لوگوں کی غربت بڑھ جاتی ہے۔ لوگوں کے پاس جتنے زیادہ ذرائع نفع حاصل کرنے کے ہوں گے۔ اتنی ہی زیادہ بے چینی اور بدامنی ملک میں ہوگی۔ جتنی زیادہ مکارانہ ہوشیاری ہوگی اتنے ہی زیادہ ذرائع لوگوں کو لوٹنے کے ہوں گے۔ جتنا زیادہ قانون ہوگا اتنے ہی زیادہ چور ڈاکو اور ملزم بڑھیں گے۔ اس کے بعد وہ ایک دانشمند کا طریقہ حکومت بیان کرتا ہے اور دانشمند کے منہ سے کہلاتا ہے۔ کہ میں لوگوں کو پرانے زمانے کے سادہ طریقۂ زندگی کی طرف لوٹاؤں گا۔ انھیں چاہیئے کہ اپنے سادہ کھانے کو بہت میٹھا اور مزہ دار سمجھیں، اپنی سیدھی سادی پوشاک کو بہت خوبصورت سمجھیں۔ اپنے غربت کے جھونپڑوں کو جاء امن خیال کریں اور اپنی روز مرّہ کی زندگی ہی کو خوشی کا ذریعہ بنائیں۔ اگر میری ریاست کے بہت نزدیک کہ وہاں کے کتوں اور مرغوں کی آوازیں ہم تک آتی ہیں، کوئی ریاست ہو تب بھی میں اپنے رعایا کو وہ مرتے مرجائیں ہیں اس نزدیک کی ریاست کے لوگوں سے ملنے نہ دوں گا۔

دیکھیئے عقل میں کتنی دوربینی ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ حال کی ساری خرابیوں کو وہ دانشمند اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ کچھ عقل کی بھی دوربینی تھی کچھ یہ بھی تھا کہ ایک سے ہی زمانہ دنیا پر کئی دفعہ آئے ہیں۔ اُس دانشمند کا زمانہ بھی ایسا ہی ہوگا، جیسا کہ ہم احمقوں کا زمانہ ہے۔ زمانہ حال کی مصائب اور فتنوں کے اسباب صرف چار ہیں۔ (۱) عام تعلیم جو چھوٹے گدھوں کو بڑا گدھا بنا رہی ہے۔ (۲) وسعت سلطنت۔ اتنی بڑی سلطنت ایک بادشاہ یا قوم کے پاس ہوتی ہے کہ انتظام درست نہیں رہتا۔ (۳) .Industrialism جس نے زراعت کی زمینوں پر قبضہ کر کے انسان کی خوراک کو بہت کم کر دیا ہے اور جس کی مشینوں کے استعمال سے لاکھوں آدمی بے کار ہو رہے ہیں اور جس کی وجہ سے انسانوں میں انسانی ہمدردی کی جگہ حیوانی خودغرضی نے لے لی ہے۔ اور (۴) جمہوریت بے معنی جس نے لوگوں کے رنج و راحت کی باگ ڈور خودغرض احمقوں کے ہاتھ میں دیدی ہے۔

یہ دانشمند کہتا ہے :- نیچر میں تمام چیزیں خاموشی سے اپنا کام کر رہی ہیں اور اپنا کام ختم کر کے اپنے اصلیت کی طرف چلی جاتی ہیں جہاں سے آئی تھیں۔ نہ ان کو دولت کی خواہش ہے اور نہ شہرت کی ضرورت ہے اپنے اصلیت کی طرف واپس جانے کا یہ مطلب ہے کہ سکون میں ہو جاتی ہیں۔ یہ سکون کیا ہے۔ ان کے فرض و مقصد کا پورا ہو جانا۔ سکون یعنی ایک قسم کا دانشمند ان ختم عمل نیچر کے کاموں میں مداخلت نہ کرنا۔ یہ ہے ایک عقلمند آدمی کی علامت۔

دیکھئے یہ چینی دانشمند آئمہ علیہ السلام کی تعلیم سے کتنا نزدیک ہو گیا ہے وہ کہتا ہے :- اگر تم کسی سے جھگڑا نہ کرو گے تو کوئی تم سے جھگڑا نہ کریگا۔ اگر کوئی تکلیف بھی پہنچائے تو تم اُس سے نیکی کرو۔ جو اچھے ہیں میں اُن سے اچھا ہوں جو بُرے ہیں اُن سے بھی میں اچھا ہوں۔ لہذا سب کو اچھا ہو جانا چاہیئے۔ جو مخلص اور راست باز ہیں میں بھی ان سے مخلص اور راست باز ہوں۔ اور جو مجھ سے مخلص اور راست باز نہیں ہیں میں اُن سے بھی مخلص اور راست باز ہوں۔ نرم اور نازک ترین شئے دنیا میں سخت ترین شئے کو توڑ ڈالتی ہے۔ دنیا میں پانی سے زیادہ کوئی نرم شئے نہیں ہے۔ لیکن سخت ترین چٹانوں کو پانی کاٹ ڈالتا ہے۔

ان حکماء قدیم کی باتیں سُن کر ہم قرآن شریف کی تصدیق کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وَمَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا خَلَا فِيهَا نَذِيْرٌ۔ اس پر تفصیل سے گفتگو ہم آئندہ چل کر یں گے۔

Lao-tze نے نیچر پر بڑا زور دیا ہے نیچر کا طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اور اسلام بھی دینِ فطرت ہے۔ لیکن اس چینی دانشمند نے حیوانوں اور درختوں اور پتھروں کی نیچر کو لیا ہے۔ اور قرآن شریف انسان کی فطرت صحیحہ کو معیار ٹھہراتا ہے۔ چینی فلاسفر کی غلطی عیاں ہے۔ جو چیز نیچر میں واقع ہے، وہ نیچرل ہے۔ بدی بھی انسان ہی کرتا ہے اور بہت خوشی سے کرتا ہے۔ اگر نیچر پر انحصار کرتا ہے تو عام انسان بجائے عدل و انصاف کے ظلم و خود غرضی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ اپنے دشمنوں کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ نہ کہ اُن پہ رحم۔ انسان کے ایثار انکسار کے بہت کم امکانات ہیں۔ غرور و پندار بہت آسان ہے۔ انسان کا اصلی و نیچرل

پیشہ تو شکار کرنا اور قتل کرنا ہے۔ زراعت تو اس کے لیئے نیچرل نہیں ان ساری باتوں کو کرنا چاہیے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ تہذیب کو چھوڑ کر اُسی طرح "بدستورِ سابق" جنگلوں میں عریاں پھرنا شروع کر دینا چاہیئے۔ اس ہی وجہ سے اسلام نے انسان کی فطرت صحیحہ کو معیار ٹھہرایا ہے۔

کون فیوشی اس۔ Confucius.

یہ چین کا بلکہ دنیا کا بہت بڑا فلاسفر۔ موضع کوفو .Ch'ufu میں جو سلطنت .Lu (موجودہ صوبہ .Shantung) میں ہے ۵۵۱ ؁ ق م میں جب کہ اُس کا باپ ستر برس کی عمر کا تھا اور ماں سترہ برس کی عمر کی تھی۔ اپنے باپ کے بستر پر پیدا ہوا۔ اُس کا سنہ فوتیدگی ۴۷۸ ؁ ق م بیان کیا جاتا ہے اب سے ایک سو سال پہلے چین میں اس کی اولاد گیارہ ہزار تھی۔ اس کا شہر پیدائش سارے کا سارا اس کی اولاد سے آباد ہے۔ اگرچہ اس کا صرف ایک ہی لڑکا ہوا تھا۔

جب کون فیوشی اس تین برس کا تھا تو اس کا باپ مرگیا۔ جب ۱۹ سال کی عمر ہوئی تو اس نے شادی کرلی۔ چار سال کے بعد اپنی بیوی کو طلاق دے دیا۔ اور اس کے بعد کوئی شادی نہیں کی۔ بہت چھوٹی عمر سے اس کو دنیا کے طوفان میں پڑنا پڑا تا کہ اپنی والدہ کے لیئے قوت لایموت حاصل کرے۔ ۲۲ سال کی عمر میں اس نے پیشہ مدرسی اختیار کرلیا۔ اور اپنے ہی گھر کو مدرسہ قرار دے کر بچوں کو وہاں پڑھاتا تھا۔ اور کچھ فیس اُن سے لیتا تھا۔ اُس نے مصیبت اور غربت کے اُس اسکول میں تعلیم حاصل کی جس کے بغیر انسان انسان نہیں بنتا۔ اور غور و فکر کی قوت و اہلیت ہی پیدا نہیں ہوتی۔

اس کی تعلیم سقراط کی طرح زبانی ہوا کرتی تھی۔ کچھ شاگرد اس کے ساتھ رہنے لگے تھے۔ ایک دفعہ تو ایسے شاگرد ستر ہوگئے تھے۔ جس طرح ہندوستان میں ہندو گرو کے ساتھ اُس کے چیلے رہتے تھے Confucius۔ شہرت اور عزت اور سرکاری ملازمت کو بہت پسند کرتا تھا۔ لیکن صرف نیک بادشاہوں اور

حکمرانوں کی ملازمت کرنا چاہتا تھا۔ کئی دفعہ اُس نے اُن نوابوں کی ملازمت کرنے سے انکار کر دیا جن کی حکومت اچھی نہ تھی۔ اُس کا مقولہ تھا کہ ظالم حکومت ایک خونخوار چیتے سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ آخر کار اس کو موقعہ ملا۔ اور اس کو شہر Chung-tu. کا چیف مجسٹریٹ بنا دیا گیا۔ چینی روایات ناقل ہیں کہ وہاں ایمانداری کا دور ہو گیا۔ اگر گلی میں سونا رکھا ہوا کوئی بھول جائے تو وہیں پڑا رہتا تھا کوئی اُسے ہاتھ نہیں لگاتا تھا۔ Lu. کے حاکم نے اُس کو ترقی دے کر سپرنٹنڈنٹ پبلک ورکس مقرر کر دیا۔ وہاں بھی اُس نے اصلاحات کیں۔ پھر ترقی ہو کر وزیر جرائم ہو گیا اُس کا نام سنتے ہی حکومت میں جرم معدوم ہو گیا۔ لوگوں میں وفاداری و ایمانداری آ گئی اور عورتوں کی عصمت و فرماں برداری و ایمانداری عام ہو گئی۔ دوسری حکومتوں سے آن کر لوگ یہاں آباد ہو گئے اور کنفوشی اس لوگوں کا محبوب ہو گیا۔ یہ چاہتا تھا کہ حاکم لو (Lu.) کبھی کوئی ایسی بات نہ کرے جو بری ہو۔ اس کا اصرار تھا کہ اچھی حکومت کا اصول ہی ایک ہے اور وہ یہ کہ حاکم خود اپنے عمل سے اچھی مثال لوگوں کے سامنے پیش کرے۔

آخر کار اُس نے اپنے عہدہ سے استعفا دیدیا۔ اور اب یہ مع اپنے شاگردوں کی جماعت کے ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ میں پھرنے لگے۔ اس امید پر کہ شاید کسی صوبہ میں اُس کو حکومت کرنے کا موقعہ ملے۔ آخر کار ۶۹ کی عمر میں جب نواب یاڈیوک گائی (Gae) شہر Lu کی حکومت پر قابض ہوا تو اُس نے کنفوشی اس کو اپنے شہر میں واپس بلا لیا۔ پانچ سال جو اس کی زندگی کے باقی رہ گئے تھے وہ اپنے وطن میں عزت سے گزرے۔ اکثر مدیران حکومت اس سے صلاح و مشورہ کیا کرتے تھے اور یہ سادگی کے ساتھ زندگی بسر کرتا تھا۔ یہ بہتر یا تہتر سال کی عمر میں مر گیا۔

کنفوشی اس کا فلسفہ۔ اس کے چند بڑے عمدہ مقولے تھے۔

(۱) ظالم حکومت چیتے سے زیادہ خطرناک ہے۔

(۲) اچھی حکومت کا ایک ہی گر ہے اور وہ یہ کہ بادشاہ خود اپنے عمل

سے رعایا کے لئے اچھی مثالیں قائم کرے۔ یہ وہی عربی مقولہ الناس علیٰ دین ملوکھم دوسرے الفاظ میں ہے۔

(۳) وہ کہتا تھا کہ میں نے کوئی آدمی نہیں دیکھا جو نیکی کا ایسا ہی عاشق ہو جیسا حسن کا۔ غالباً اُس کا مطلب حُسن ظاہری سے ہو۔ ورنہ نیکی خود ایک حُسن ہے۔ نیکی کیا ہے؟ کسی شے کا اپنے موقعہ اور محل ہونا، بدی کیا ہے؟ کسی شے کا غیر موزوں موقعہ اور محل پر ہونا سعدی کا شعر اس کی تشریح کرتا ہے:۔

نکوئی با بداں کردن چنانست که بدکردن بجائے نیک مرداں

اور پھر ظاہری حسن کا تو کوئی معیار نہیں۔ وہ مستقل شے نہیں ہے۔ ایک شخص کا تصور حُسن دوسرے کے تصور حُسن سے مختلف ہو سکتا ہے بلکہ ہوتا ہے۔ حُسن تو ایک شخصی معاملہ .Subjective ہے۔

(۴) کنفوشس اس نے اخلاقیات اور عمل نیک پر بہت زور دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سارے کردار کی بنیاد خلوص پر ہے۔ بلند کردار آدمی کی نشانی خلوص ہے۔ وہ پہلے کام کر کے دکھاتا ہے پھر بولتا ہے۔ لیکن جب بولتا ہے تو اپنے اعمال کے مطابق اور ان کی نسبت سے بولتا ہے۔ تیر اندازی میں انسانِ اعلیٰ کے عمل کی مثال ملتی ہے۔ جب نشانہ خطا کرتا ہے تو تیرا انداز یہ دیکھتا ہے کہ میں نے کیا غلطی کی۔ اسی طرح انسان اعلیٰ اپنی ناکامیابی کے اسباب اپنے اندر تلاش کرتا ہے۔ برخلاف اس کے انسانِ ادنیٰ اپنی غلطی کے اسباب دوسروں میں دیکھتا ہے۔

(۵) انسان اعلیٰ کے کردار کی علامت اس کی حدوں سے اُبلتی ہوئی ہمدردی ہے۔ دوسرے لوگوں کی نیکیوں اور قابلیتوں سے اُس کو غصہ (حسد) نہیں آتا۔ بلکہ خود اُن سے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب وہ اپنے سے کمتر انسان کو دیکھتا ہے تو وہ اپنے اوپر نظر ڈالتا ہے، اور دیکھتا ہے کہ جو برائیاں دوسروں میں نظر آتی ہیں مجھ میں تو نہیں۔ کیونکہ بہت سے ایسے نقائص ہیں جو دوسروں میں ہیں اور ہم میں بھی ہیں۔ .Confucius کے فلسفہ کا نچوڑ ان دو پیراگراف میں ہے۔

قدما جب چاہتے تھے کہ ساری سلطنت میں نیکی پھیل جائے تو سب سے پہلے اپنی ریاست کو درست کرتے تھے۔ ریاست کو درست کرنے سے پہلے اپنے خاندانوں کو درست کرتے تھے خاندانوں کو درست کرنے سے پہلے وہ خود اپنے تئیں درست کرتے تھے۔ اپنے تئیں درست کرنے سے پہلے وہ اپنے دلوں کو درست کرتے تھے۔ اپنے دلوں کو درست کرنے کے لئے وہ پہلے اپنے خیالات میں خلوص پیدا کرتے تھے۔ اپنے خیالات میں خلوص پیدا کرنے سے پہلے وہ اپنا علم بڑھاتے تھے اور اشیاء کے علم بڑھانے کیلئے اشیاء کی ماہیئت کی تحقیقات میں مصروف ہو جاتے تھے۔

جب اشیاء کی ماہیئت معلوم ہوگئی تو پھر علم مکمل ہو جاتا ہے، جب علم مکمل ہو جاتا ہے تو ان کے خیالات میں بھی خلوص پیدا ہو جاتا ہے، خیالات کے بعد دل میں بھی خلوص آجاتا ہے اور جب دل درست ہو جاتا ہے تو خود وہ درست ہو جاتے ہیں۔ جب وہ درست ہو جاتے ہیں تو اُن کا خاندان درست ہو جاتا ہے، جب اُن کے خاندان درست ہو جاتے ہیں تو اُن کی ریاست درست ہو جاتی ہے۔ اور جب ریاستیں درست ہوئیں تو ساری سلطنت درست ہو جاتی ہے۔

انسان اعلیٰ ان باتوں کا خیال رکھتا ہے

(۱) اُس کی آنکھیں صفائی سے دیکھیں۔

(۲) اُس کے چہرے سے نشان مہر و الفت نمایاں ہو۔

(۳) اُس کا رویہ باعزت ہو۔

(۴) گفتگو میں خلوص ہو۔

(۵) معاملات میں ہوشیاری ہو۔

(۶) جن امور میں شک ہو وہ دوسروں سے سوال کرے۔

(۷) جب اُس کو غصّہ آئے تو وہ خیال کرے کہ اس غصہ کا نتیجہ کیا ہوگا اور اُس کے لئے کیا مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔

(۸) جب وہ نفع حاصل کرنے کا خیال کرے تو سب سے پہلے حق و نیکی کا خیال کرے یعنی نفع اس طرح حاصل کیا جائے کہ حق و نیکی کا پہلو قائم رہے۔

کنفوشی اس کا فلسفہ زیادہ تر سیاسی امور سے تعلق رکھتا ہے۔

اس کی سیاست کا یہ بڑا جوہر ہے کہ حکومت کے اُصول و طرز و مقصد کو عوام الناس کے خاندان کے افراد سے شروع کرتا ہے۔ چنانچہ جب یہ کہتا ہے کہ حکومت کے لئے اطاعت اور اخلاقیات کی ضرورت ہے تو یہ خاندان سے شروع کرتا ہے۔ اور اطاعت کو والدین کی اطاعت سے شروع کرتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ لڑکے کو اپنے باپ کی اطاعت کس طرح کرنی چاہئے۔ یہاں اسلام سے تقابل ضروری ہے، اور ہم اُس کے موقع پر کریں گے۔

اُس کا دوسرا اصولِ سیاست جو انگریزی کتابوں میں درج ہے اور وہیں سے میں نقل کر رہا ہوں۔ کیونکہ چینی زبان پر مجھ کو عبور نہیں یہ ہے کہ سیاسی حکومت کے اصل خطا کنندگان عوام الناس ہیں۔ کیونکہ کوئی گورنمنٹ جس کو عوام الناس کا اعتماد نہیں ہے۔ قائم نہیں رہ سکتی۔ غالباً اس کا مطلب وہی ہے جو دوسرے جملہ میں ظاہر کیا گیا ہے کہ کوئی حکومت بغیر عوام الناس کی حمایت کے قائم نہیں رہ سکتی لہذا حکمرانوں کو چاہیئے کہ عوام الناس کا اعتماد حاصل کریں۔ وہ محبت کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے۔ اور محبت اُس وقت پیدا ہوتی ہے کہ جب حکام عوام الناس کی بہبودی کے کام کریں۔ یہاں تک تو ٹھیک ہے لیکن کنفوشی اس پر نہیں کہہ سکتا کہ حکومت کے عطا کرنے والے عوام الناس ہیں کیونکہ وہ کہہ چکا ہے کہ حکمراں فلاسفران اور دانشمندان ہونے چاہئیں۔ لہذا عوام الناس ان کے انتخاب کرنے سے عاجز ہیں۔ کیونکہ جو علم یا ہنر خود ان میں نہیں ہے وہ دوسروں میں اوس علم یا ہنر کے درجے کیونکر معلوم کر سکتے ہیں۔ اور بغیر درجے معلوم کئے ہوئے انتخاب ناممکن ہے۔ یہ بہت اغلب ہے کہ کنفوشی اُس کا وہی مطلب ہو جو ہم نے اوپر لکھا ہے اور جملہ ان الفاظ میں ترجمہ کرنے والے کے دماغ کا نتیجہ ہو۔ انگریزی کا جملہ یہ ہے:۔

The people are the actual and proper source of political sovereignty, for any government that does not retain their confidence sooner or later fails.

لفظ retain ظاہر کر رہا ہے کہ پہلے اور اصلی قیام حکومت کے بعد کی حالت یہ فلاسفر بیان کر رہا ہے۔ اور اس ہی لفظ کے لحاظ سے **Source.**

کے معنی لینے چاہئیں پہلے اور اصلی .Source سے منشاء نہیں ہے۔ دوران حکومت کا ذکر ہے۔ گویہ ہر لمحہ حکومت کو ایک .Source کی ضرورت رہتی ہے۔ جیسے ہم کہیں کہ انسان کی زندگی کا .Source ہوا ہے تو مطلب لیا جائے گا کہ جس وقت بھی ہوا نہ ہوگی زندگی منقطع ہو جائے گی۔ اصل میں غالباً اسی طرح ہو لیکن مترجم نے مبہم اور ذومعنی بنا دیا۔

عمدہ حکومت کی شرائط میں سے اول درجہ خلوص کو دیتا ہے اور خلوص عمل سے ظاہر ہوتا ہے۔ حکمران کا عمل نظیر پیش کرتا ہے۔ لہٰذا وہ نظیر عمل نیک ہو جو چھن چھن کر عوام الناس تک پہنچے اور وہ بھی اپنا طرز عمل اس ہی نمونہ پر مرتب کریں۔

دوسری بات حکام ماتحت کا انتخاب ہے۔ یہ عقلمندی سے ہونا چاہیئے۔ اور اس کی بنیاد ایمانداری اور دیانتداری پر ہونی چاہیئے یعنی صرف نیک اور دیانتدار آدمیوں کو عہدوں پر مقرر کرنا چاہیئے۔

جہاں تک ہو سکے بیرونی ممالک سے تعلقات نہ رکھیں اور اپنی سلطنت کو غیروں کی اشیاء خوردنی و پوشیدنی اور ضروری کا محتاج نہ بنائیں۔

خوش خلقی اور حسن سلوک کو اختیار کرنا ضروری ہے۔ ہم آخر کار وہ ہی ہو جاتے ہیں۔ یعنی ویسا ہی بن جاتے ہیں جیسی ہماری عادت خوش خلق اور حسن سلوک کرتے کرتے پیدا ہو جاتی ہے۔

موسیقی بھی حکمرانوں کے لئے ضروری ہے۔ کیونکہ اس سے سخاوت و مہربانی کی طرف میلان ہوتا ہے۔ اسلام کا نظریہ اس کے خلاف ہے۔ وہ ہم آیندہ چل کر بیان کریں گے۔

جہاں تک حسن عمل اور حسن سخن کا تعلق ہے دنیائے قدیم میں کنفوشی اس کو بہت اعلیٰ درجہ حاصل ہے۔ یونان کا کوئی فلاسفر، خواہ افلاطون ہی کیوں کیوں نہ ہو، کنفوشی اس کے درجہ تک نہیں پہنچتا۔ یونانیوں نے جو کچھ سیکھا وہ کنفوشی اس ہی کے فلسفہ سے سیکھا ہے۔

باب ششم

غیر اسلامی فلسفے

(فلسفۂ یونان)

بگرداں جام و از ہنگامۂ افرنگ کمتر گوئے ہزاراں کارواں بگذشت ازیں ویرانہ پے در پے

اہل یورپ کا خیال اب تک یہ رہا ہے کہ دنیا میں فلسفہ کی ابتدا یونان سے ہوئی ہے لیکن اب وہ خیال بدلنا پڑا، کیونکہ جدید تحقیق نے ثابت کر دیا کہ یونان نے اپنا فلسفہ ایشیا والوں سے لیا ہے۔ دراصل فلسفہ تو بنی نوع انسان کے ساتھ اُس کی ابتدا ہی سے رہا ہے۔ جب انسان سن شعور کو پہنچ جاتا ہے اور سوچنے کے قابل ہوتا ہے تو اُس کا فلسفہ شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ اُس کا فلسفہ اس کے اپنے لئے ہوتا ہے بعض طاقتور دماغ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ اپنے سواء دوسروں کے لئے بھی سوچتے ہیں یا یوں کہو کہ اپنے ماحول کے علاوہ ہر ممکن ماحول پر غور کر کے اپنی قوم یا اپنے ملک کے لئے فلسفہ مرتب کر لیتے ہیں۔ اور پھر وہ ہی تمام دنیا کیلئے فلسفہ مقرر ہو جاتا ہے۔ ہمارا مطلب اس ہی قسم کے فلسفہ سے ہے۔

حضرت عیسیٰ سے قبل چھٹی اور پانچویں صدیاں ایسی گزری ہیں کہ تقریباً اُس وقت کے ہر بڑے ملک میں فلاسفران کی ایک جماعت پیدا ہو گئی تھی۔ اور سب بڑے بڑے فلاسفران جن کے نام اور واقعات اور تخیلات ہم تک پہنچی ہیں۔ ان ہی صدیوں میں ہوئے۔ چین میں کنفوشئی اس، ہندوستان میں اپانیشد جو ۸۰۰ اور ۵۰۰ ق م کے درمیان مرتب ہوئے، یونان میں تالیس، ایران میں زرتشت یہ سب تقریباً اُس ہی زمانہ میں یا اُس کے ارد گرد گزرے ہیں۔ لیکن فلسفہ اس سے بہت پہلے سے تھا جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں۔ یہ کہنا واقعہ کے خلاف نہ ہوگا کہ انبیاء سابقہ کی تعلیم نے بنی نوع انسان کو غور و خوض کرنا

سکھایا۔ ان کی تعلیم دجلہ اور فرات کی وادیوں سے شروع ہو کر تجارت کے قافلوں کے ساتھ ایک طرف تو سیریا اور کنعان ہوتی ہوئی مصر میں پہنچی اور دوسری طرف ایران و ہندوستان ہوتی ہوئی چین تک پہنچی۔ وہ اس ہی تعلیم کا اثر ہے کہ باوجود ان کے محض دنیاوی فلسفہ ہونے کے اخلاقیات کی صورت میں اس تعلیم سے متاثر ہوتے رہے۔ اور کبھی کبھی کسی نہ کسی تعلق سے خدا کا بھی ذکر آہی جاتا ہے اس کو تفصیل سے ہم علیحدہ بیان کریں گے۔ مغربی تہذیب اس طرف بھی گئی ہے کہ انسان محض جانوروں اور کیڑوں کی طرح ایک جانور ہے۔ اتفاق سے اس کا دماغ ایسا ہو گیا کہ ترقی کر سکتا تھا جسم اس کا جانوروں کے جسم سے ارتقاء کے ذریعہ سے بنا ہے۔ مذہب کا تخیل رفتہ رفتہ دریاؤں اور درختوں کی خدائی سے ہٹ کر اب وحدانیت کی طرف پہنچا ہے۔ اسلام کا فلسفہ اس کے خلاف کہتا ہے جس نے انسان کو فرشتوں سے سجدہ کرایا۔ وہ کب مان سکتا تھا کہ انسان بھی ایک کیڑے کی طرح ہے۔ جس نے انسان کو اس دنیا میں آنے سے پہلے اشیاء کے اسماء بتا دئے تھے۔ اور مخلوق سے اپنے رب ہونے کا اقرار لے لیا تھا۔ اُس کا اسلام کب مانے گا کہ یہ مذہب بذریعہ ارتقاء محض انسان کی کوشش سے یہاں تک پہنچا ہے۔ اس کی بحث کے لئے بھی ہم نے علیحدہ باب مقرر کر لیا ہے۔

اب یونان کے فلسفہ کا ذکر کرتے ہیں۔

دہریت کچھ ہی کہے۔ فلسفہ کچھ ہی خیال کرے عقل سلیم کو اس حقیقت کے تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ اس کائنات کا کوئی مدبر و منتظم صاحب عقل وحکمت ہے جس کے انتظام میں بنی نوع انسان کی تعلیم و تربیت بھی منجملہ دیگر امور کے شامل ہے۔ اور یہ نظام اپنے مقررشدہ راستوں پر چل رہا ہے۔ انسان کے ماحول کی پیچیدگیاں اور دشواریاں اور اُس کی عقل کی محدودیت اس امر کی مقتضی تھیں کہ وہ مدبر و منتظم اعلیٰ اپنے مخصوص بندوں کو اپنی طرف سے علم دے کر انسان کی تعلیم و تربیت کے لئے بھیجتا رہتا۔ چنانچہ انبیاء آتے رہے۔ اور جاتے رہے۔ اس تعلیم کی نشر و اشاعت کے لئے ایسے اسباب بھی مقرر

ہونے ضروری تھے کہ جو بڑی بڑی جماعتوں کو آپس میں ملنے کے لئے مجبور کریں۔ ان اسباب میں سے تجارت ونقل مکانی جو بڑے پیمانہ پر ہو ضروری تھے۔ یہ امر بدیہیات تاریخیہ میں سے ہے کہ انسان کی تہذیب وجموعی ترقی کے اسباب میں سے تجارت اور تحریکاتِ نقل مکانی کو بڑا دخل ہے، دنیا کے ہر ملک، ہر براعظم کی تاریخ سے عیاں ہے، کہ دنیا میں نہایت بڑے پیمانہ پر بڑی بڑی جماعتوں اور اقوام کے ایسی حرکاتِ نقل مکانی ہوتی رہی ہیں جنھوں نے تاریخ پر بڑا اثر ڈالا ہے۔ یہ ایسی عیاں بات ہے کہ یہاں مثالیں بنا کر سمجھانے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو اب تک جاری ہیں۔ انھوں نے دوسرا نام اختیار کر لیا ہے۔ اب اس کو تحریک نوآبادیات کہتے ہیں جس کو انگریزی میں .Colonisation کہا جاتا ہے۔ اس حرکت نقل مکانی یا .Colonisation کے بہت سے اسباب ہوتے ہیں جن کا تذکرہ یہاں غیر ضروری ہے۔ اس کے فوائد بھی بہت ہوتے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ دو یا کئی تہذیبوں کے ملنے سے ایک جدید اور بہتر تہذیب پیدا ہوتی ہے۔ نئی آنے والی قوم اپنے سابقہ تجربات سے فائدہ اٹھا کر نئی جگہ ایک نئی زندگی شروع کرتی ہے۔

ایسی ہی ایک بڑی حرکت یونان کے شمال سے شروع ہوئی جہاں Dorian قوم نے حملہ کر کے قبضہ کر لیا اور یہ یونانی وہاں سے آزادی کی تلاش میں غلامی سے بچکر بھاگے اور چاروں طرف پھیل گئے اور اپنی ان نوآبادیات میں بس کر انھوں نے وہ تہذیب پیدا کی جس کو .Greek Civilisation کہتے ہیں اور جس نے نہایت قلیل عرصہ میں تمام دنیا پر قبضہ کر لیا ان میں سے ایک جماعت ایشیائی کوچک کے مغربی ساحل پر کنارے آباد ہو گئی۔ یونانیوں نے کبھی اپنی نسل کو خالص رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ لہٰذا مقامی عورتوں سے دل کھول کر شادیاں کیں۔ اور مردوں کو غلام بنا لیا۔ جس غلامی سے خود بچ کر بھاگے تھے اُس ہی غلامی کا پھندا دوسروں کے گلے میں ڈالتے ہوئے انہیں کچھ جھجک نہ آئی۔ موجودہ مغربی تہذیب اس ہی سبق کو اپنے ہر طرزِ عمل میں دُہرا رہی ہے۔ اور اپنا نام تہذیب رکھتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ اُن کو اولمپس کے خداؤں سے بھی دلچسپی نہیں رہی ہے۔ کیونکہ جہاں وہ گئے اولمپس جیسے ہی خدا شہوت سے

مست، اغوا، زنا، ڈاکہ اور چوری کے عادی اون کو ملے - اور مقامی خدا مفید بھی ہو سکتے تھے۔ دور کے خداؤں کو کیا پڑی تھی کہ ان کی حفاظت کرتے۔ لہذا اُنہوں نے ایشیائی کوچک کے مروجہ خداؤں کو اپنا خدا بنالیا نتیجہ یہ ہوا کہ زمین بھی ایشیائی، ہوا بھی ایشیائی، عورتیں بھی ایشیائی اور خدا بھی ایشیائی عبادت کے رسم و رواج اور معاشرت کے قواعد بھی ایشیائی اُس وقت تک یونان کا کوئی فلسفہ تو اپنا تھا ہی نہیں۔ فلسفہ بھی وہ ریلا جو چین، ہندوستان، ایران سے تجارت کے قافلوں کے ساتھ لگا چلا آیا تھا۔ اب ان میں سوائے یونانی نام کے اور کیا رہ گیا تھا۔ لہذا جب ملطہ Miletus کے فلاسفران نے اپنی تعلیم فلسفہ شروع کی تو وہ بالکل ایشیائی تھے۔ اُن کی مادری زبان بھی مقامی تھی اگرچہ یونانی زبان وہ اچھی طرح جانتے تھے۔

تاریخ فلسفہ میں یونان کے پہلے تین فلاسفران یعنی (۱) Thales ثالیس (۲) Amaximander انگزیمنڈر اور (۳) Anaximenes انگزیمینس اپنے وطن Ionia کی نسبت سے فلاسفرانِ آیونیا Ionia کہلاتے ہیں اور ان کا فلسفہ اؤنین فلسفہ Ionian Philosophy کہلاتا ہے۔

آؤنین فلسفہ - وہاں نہ تو کوئی پہلی اور پورانی مذہبی کتاب تھی اور نہ کوئی پادریوں کی حکومت، لہذا انسان کے قیاس کے لئے کوئی حد و قید نہ تھی - اور یہ فلسفہ بالکل دنیاوی فلسفہ ہوگیا جو اپنے تئیں قیود مذہب اور صنم پرستی سے آزاد سمجھتا تھا - یونانی فلسفہ کی یہ خاصیت آخر تک رہی - لیکن پھر بھی اس تخیل انسانی کی سابقہ تاریخ اور روایات تھیں۔ ایشیائی کوچک کوئی نیا ملک تو نہ تھا۔ مصری عقل اور مصری نظام پروہتی کی روایات یہاں پہنچی ہوئی تھیں۔ موبدان ایران اور برہمنی دانشمندان ہندوستان کے خیالات سے آگاہ تھے کلدانیوں کی نجومیت کا بھی بہت اثر تھا۔ یونان کے صنمی تخیلات بھی یونان کے تاجروں کے ساتھ آتے رہتے تھے۔ ان سب عناصر نے مل کر دہ فلسفہ پیدا کیا جس کو Ionian Philosophy کہتے ہیں اور جس نے یونان کے فلسفہ کی ابتدا کی۔ کیا یہ کہنا عین مطابق واقعہ نہیں ہے کہ انبیاء جو اُس ہی زمانہ میں اور اُس

ملک کے ہی نزدیک اپنی تعلیم کی صلائے عام دے رہے تھے۔ اس فلسفہ پر اپنا پرتو اور اثر ڈال رہے تھے اگرچہ یہ فلسفہ اُن کی رقابت اور مخالفت میں مرتب کیا گیا تھا۔ لیکن پھر بھی بغیر ارادہ کے اُس شے کا اثر پڑ ہی جاتا ہے جس کی مخالفت کی جائے۔ مخالفت میں، اس لاگ، اس رقابت میں بھی ایک قسم کا لگاؤ نظر آہی جاتا ہے۔ غالب نے خوب کہا ہے کہ ؎

جب نہ ہووے کچھ تو دھوکہ کھائیو کیا
لاگ بھی ہووے تو ہم سمجھیں لگاؤ

اس وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ اس محض دنیاوی فلسفہ میں بھی خدا کا تذکرہ کسی نہ کسی صورت میں آہی جاتا ہے۔

یونانی فلسفہ کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ شروع ہی سے اس فلسفہ میں دو رنگوں کی لہریں نظر آتی ہیں ایک تو نیچیر پرستی اور دوسرے توہم پرستی جس نے مذہبی انداز حاصل کر لیا تھا۔ مقدم الذکر کے معلمین (۱) ثالیس Thales. (۲) انگزیمنڈر Amaximander. (۳) زنوفینز Xenophanes (۴) پروطاغورس Protagoras (۵) ہپوکریقیطز Hippocrates (۶) ڈیمقراطیس Democritus سے (۷) اپی کیورس (Epicurus) اور (۸) لکریشیاس Lucretius. تک تھے۔ موخر الذکر کے اُستاد (۱) فیثاغورث Pyhtagoras (۲) پارمنیڈیز Parmenides (۳) ہرقلائیطس Heracleitus (۴) افلاطون (۵) Plato اور کلنتھیز Cleanthes. (۶) پلوٹینس Plotious (۷) سینٹ پال St. Paul تھے۔ کبھی کبھی بڑے وسیع النظر فلاسفران مثلاً سقراط، ارسطو اور مارکس آریلیس Marcus Aurelius نے ان دونوں شاخوں کو ملانا چاہا لیکن ان میں بھی غالب خیال اور مقصد واحد صرف اپنی عقل کی پیروی تھی۔ نتیجہ نکلا کہ یونانی فلسفہ کی بنیاد اور اس کی آخری انتہا محض عقل انسانی ہے جہاں تک عقل انسانی جا سکتی ہے۔ وہیں تک یہ فلسفہ گیا ہے۔ اور وہاں آن کر ٹھہر گیا ہے۔

یونانی فلسفہ تین حصوں میں تقسیم ہو سکتا ہے۔ (۱) قبل سقراط (۲) سوفسطائیوں سے ارسطو تک اور (۳) بعد سقراط ان تینوں کا خاکہ ہم جدول کی صورت میں لکھتے ہیں۔ پھر اس کی مختصر تشریح کر دیں گے۔

(۱) فلسفہ قبل سقراط

آؤنی یا ملطہ کا فرقہ — فیثاغورث — ایلیائی جماعت — ہیراقلیتس — امپیڈوکلیز — فلسفہ جوہر — انکساغورث

تھالیس — انکسامینڈر — انکسامینس

زنوفانیز — پارمینڈیز — زینو

(۲) سوفسطائیوں سے ارسطو تک

سوفسطائی — سقراط — افلاطون — ارسطو

(۳) ارسطو کے بعد

رواقی — حکماء لذیتہ — حکماء لاادریت — افلاطونیت جدید

آؤنی یا ملطہ کا فرقہ Ionics. اب ہم آؤنی فرقہ سے شروع کرتے ہیں پہلے ملطہ کا بیان ضروری ہے۔

ملطیہ Miletus. تقریباً سنہ ق م میں یونان کے صوبہ Attica سے یونانیوں کا ایک قبیلہ جس کو Ionians کہتے تھے۔ ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل کے اُس خطہ میں آباد ہوگیا جس کو اُن کی نسبت سے Ionia کہنے لگے۔ اس میں بارہ بڑے شہر تھے، جن کا سب سے جنوبی شہر ملطہ Miletus تھا۔ وہاں اُس زمانہ میں وہ ہی تہذیب تھی جو اُس کے نزدیک کے جزائر میں پائی جاتی تھی۔ یہ لوگ اپنے ساتھ عورتیں نہیں لائے۔ اُنھوں نے عورتوں کے حصول کا یہ آسان انتظام کیا کہ وہاں کے سب مردوں کو قتل کر دیا۔ اور اُن کی بیوگان سے شادی کرلی۔ اُس زمانہ میں یہاں ہر ایک شہر کی حکومت علٰحدہ ہوا کرتی تھی، ملطہ کی پہلی حکومت تو بادشاہی تھی جو لڑائی میں فوج کے جنرل اور کمانڈر ہوا کرتے تھے۔ پھر امراء کی حکومت

ہوگئی۔ جو زمین کے مالکان تھے۔ اس کے بعد ڈکٹیٹر شپ قائم ہوگئی جو متوسط طبقہ کے ہاتھ میں تھی۔ چھٹی صدی قبل عیسٰی کے شروع میں یہاں ایک ڈکٹیٹر (Thrasybulus.) حکمران تھا۔ اُس زمانہ میں یہ شہر ترقی کے عروج پر تھا۔ دولت کی فراوانی نے علم ادب، فلسفہ اور ہنر کو ترقی دی۔ شہر میں کپڑا بُننے کی بہت سی ملز تھیں، اندرون شہر سے اون آتا تھا۔ اور یہاں آن کر اُس کا کپڑا بُنا جاتا تھا، یہاں کے سوداگروں نے مصر، اٹلی اور بحر اسود میں اپنی کولونیاں قائم کر رکھی تھیں۔ صرف ملطہ کی ایسی ۸۰ کولونیاں تھیں تمام یونان میں ملطہ کی دولت اور عیش و عشرت ضرب المثل تھی۔

ملطہ کی یہ حالت تھی کہ اُس وقت یہاں سائنس اور فلسفہ کی ابتدا ہوئی۔ تجارت کا دار المقام ہونے کی وجہ سے تمام دنیا کے خیالات معتقدات اور رسوم و رواج یہاں آن کر ملتے تھے۔ خود اہل ملطہ دنیا کے دور دور مقامات میں جاتے تھے اور مصر، بابل، فینیقیا کی تہذیبوں کے زیر اثر تھے۔ کیا اندریں صورت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے واقف تھے اور کچھ نہ کچھ اُس سے اُن کے فلسفہ پر اثر بھی پڑا ہوا تھا۔ یہ تو چھٹی صدی عیسوی کی بات ہے۔ انبیاء علیہم السلام تو عرصہ سے اپنی تعلیم دنیا میں پھیلا رہے تھے۔ مصر، کنعان، بابل وغیرہ سب جگہ اُن کی تعلیم اور ان کے خیالات پھیل چکے تھے۔ بابل میں بنو اسرائیل بہت عرصہ تک رہے۔ اُس حالت کو بائبل میں Babylonian Captivity. کہا گیا ہے۔ ہندوستان و ایران تک کے خیالات، تو ملطہ میں پہنچ جائیں تو کیا وہ تعلیم ان کے دائرہ علم سے باہر رہی ہوگی۔ یہ جو ہم اوپر یونانی فلسفہ کی دو شاخوں کا ذکر کر چکے ہیں جن میں سے ایک مذہبی تھی وہ ان انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کی مسخ شدہ صورت ہوگی۔

ثالیس (Thales)

ثالیس تقریباً ۶۴۰ ق م میں غالباً بمقام ملطہ پیدا ہوا۔ اور ۵۵۰ ق م میں مر گیا۔ اس کے والدین فینیقیا کے باشندے تھے اور اس کی تعلیم زیادہ تر مصر

اور مشرق قریب کی تھی۔ یہ خود تجارت میں مشغول تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ اپنے علم نجوم کے ذریعہ سے اُس نے معلوم کر لیا کہ اُس سال بہت زیتون ہوگا۔ لہٰذا اس نے تمام تیل کے کارخانہ کم کرایہ پر لے لئے۔ اور جب تیل کا موسم ہوا تو زیادہ کرایہ پر وہ ہی کارخانے لوگوں کو دیدیئے۔ شہر کی سیاست میں بھی حصہ لیتا تھا۔ اُس کے زمانہ میں شہر کا حاکم .Thrasybuius تھا اُس کو اُس نے صلاح دی کہ تمام آؤنیا کی ریاستوں کی ایک فیڈریشن قائم کی جائے تاکہ .Lydia اور ایران سے حفاظت کر سکیں۔ مصر سے علم جیومیٹری اور بابل سے علم ہیئت سیکھا اور یونان میں رائج کیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ جب یہ مصر میں تھا تو اہرام مصری کی اونچائی اس نے اس طرح معلوم کی کہ جب انسان کا سایہ زمین پر انسان کے قد کے برابر ہوتا تھا تب ہی وہ اہرام کا سایہ جو زمین پر پڑتا تھا ناپ لیتا تھا۔ اس طرح اُن کی اونچائی معلوم کر لی۔ آؤنیا میں آن کر جیومیٹری کے بہت سی مسائل کو رائج کیا۔ جن کو بعد میں اقلیدس نے جمع کر لیا۔ اُس زمانہ میں سورج گرہن کی پیشین گوئی اُس کے وقوع سے پہلے کر لینا بڑی تعجب کی بات تھی۔ تمام آؤنیا میں اس کی دھوم مچ گئی جب اُس نے پہلے ہی سے ۲۸ مئی ۵۸۵ء ق م کے سورج گرہن کی پیشین گوئی کر دی۔

ثالیس کا فلسفہ ۔ اُس زمانہ میں تخلیق عالم کا مسئلہ زیر تحقیقات تھا کہ یہ تمام کائنات کس طرح بنی۔ چونکہ انبیاء علیہم السلام کی یہ تعلیم کہ تمام کائنات کا بنانے والا خدا قادر مطلق ہے۔ ان فلاسفروں کی عقل سے باہر تھی کیونکہ یہ خدا کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ لہٰذا ان کو تلاش ہوئی کہ سب سے پہلے کائنات کی کیا صورت تھی۔ اُس کو ہی یہ حقیقتِ اوّل کہتے تھے۔ ثالیس نے کہا کہ حقیقت اوّل پانی ہے اُس کے نزدیک دنیا ایک نصف دائرہ کی شکل میں ہے۔ اور یہ ایک بہت بڑے پھیلائے آب پر قائم ہے۔ اُس کا عقیدہ تھا کہ سب سے پہلے پانی ہی تھا اور آخر میں آن کر بھی سب کچھ پانی ہو جائے گا اور سوائے پانی کے کچھ نہ ہوگا۔ کیا یہ اثر یونان کے اس اعتقاد کا تو نہیں ہے کہ زمین کے گرداگرد نیچے اوپر پانی ہے اور اُس پانی کا خدا .Oceanus ہے جو سب خداؤں کا باپ ہے۔ لہٰذا پانی حقیقتِ

اوّل ہوگیا۔ تالیس کا خیال ہے کہ دنیا کے ہر ذرہ میں زندگی ہے۔ مادہ اور زندگی، ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہیں کہ علیحدہ نہیں ہو سکتے۔ اور یہ کہ ایک غیر فانی روح نباتات میں، معدنیات میں، حیوانات میں اور انسانوں میں ہے۔ یہ روح اپنی شکلیں بدلتی رہتی ہے لیکن فانی نہیں ہے کبھی۔ اس کو فنا نہیں ہے۔ وہ اکثر کہتا رہتا تھا کہ زندہ اور مردہ میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ زندگی اور موت ایک ہی شے ہے۔ کیا اس میں انبیاء کی تعلیم کا بگڑا ہوا نتیجہ ہے۔ اسلام میں روح بہت حد تک غیر فانی ہے لیکن قیامت کے دن سب ارواح یہاں تک کہ ملائکہ بھی مرجائیں گے۔ چونکہ تالیس نے قیامت پر اعتقاد رکھنا مناسب نہ سمجھا لہٰذا اس حصہ تعلیم کو نکال دیا۔ اسلام میں ہے۔ یسبح للہ مافی السموات وما فی الارض۔ ان من شیء الا یسبح بحمدہ۔ اپنی سمجھ کے مطابق تالیس نے کہدیا کہ ان سب میں روح ہے۔ روح کا شکلیں یعنی ابدان بدلنا۔ کیا یہ تناسخ کا مسئلہ دوسرے الفاظ میں نہیں ہے لیکن اسلام اس کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ تاکید سے کہتا ہے کہ روحیں اپنے ہی ابدان سابقہ میں قیامت کے روز جائیں گی۔

چند سوالات اور اس کے جوابات نہایت دلچسپ ہیں۔

سوال:۔ دنیا میں سب سے زیادہ مشکل کیا ہے؟ **جواب**:۔ اپنا جاننا

سوال:۔ سب سے آسان کیا ہے؟ **جواب**:۔ دوسروں کو نصیحت کرنا۔

سوال:۔ خدا کیا ہے؟ **جواب**:۔ وہ جسکی نہ ابتدا ہے اور نہ انتہا۔

سوال:۔ انسان کس طرح نیکی اور عدل کی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

جواب:۔ وہ ہم خود کبھی نہ کریں جو دوسروں میں معیوب سمجھتے ہیں۔

یہ جوابات نہایت عمدہ ہیں اور اسلام سے بہت نزدیک۔ ایسے ہی خیالات اور ارشادات کی وجہ سے یونان نے تالیس کو دنیا کے سات حکماء اور دانشمندوں میں سے ایک حکیم اور ان سب سے بڑا دانشمند شمار کیا ہے۔ ہم کو اس کی دانشمندی کا اعتراف ہے۔ لیکن حکیم اسلام حضرت علی ابن ابی طالب کے خیالات اور ارشادات اگر دنیا کو معلوم ہوجائیں تو وہ ان ساتوں دانشمندوں کو بھول جائے۔ آپ کے نہج البلاغہ کے ارشادات خصوصاً آخری حصہ میں جو آپ کے مقولے درج ہیں

وہ دنیاوی دانشمندی اور مذہبی معرفت کے امتزاج کا بہترین نمونہ ہیں دنیا اور عقبیٰ کا یہ اتحاد دنیا کا کوئی فلاسفر پیش نہیں کر سکا۔ دنیاوی دانشمندی کو اپنی عقل کے مطابق اونھوں نے بہت دور تک پہنچایا لیکن اس عقل کی انتہا اور ٹھہر جانے کے مقام کو نہ سمجھنے کی وجہ سے جب وہ آگے بڑھے تو انھوں نے اپنی عقل کو انگریزی کے اس مقولے کے مطابق کہ Extremes meet حماقت میں تبدیل کر دیا۔ برخلاف اس کے جناب امیر علیہ السلام کی دانشمندی آخر تک دانشمندی رہی کیونکہ جب وہ عقل انسانی کی انتہا تک پہنچ گئے تو فوراً عقل الٰہیہ سے مدد لینی شروع کر دی۔

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ تالیس نے اتھنز میں آن کر تعلیم کا دائرہ وسیع کیا اور لوگوں میں اپنے فلسفہ کی اشاعت کی۔ اور وہیں اس کے بعد کے دونوں ملطی فلاسفران ہیں جن کا ذکر آگے آتا ہے۔

انکزیمینڈر Anaximander

پیدائش ۶۱۱ء ق م۔ فوتیدگی ۵۴۹ء ق م

یہ تالیس کا شاگرد تھا۔ یہ تعجب کی بات ہے کہ اس کا فلسفہ ہربرٹ سپنسر Herbert Spencer سے ملتا ہے۔ انکزیمنڈر کہتا ہے کہ سب سے پہلے ایک غیر محدود عظیم الشان اجتماع مادہ تھا جس کی کوئی خاصیت نہ تھی لیکن خود بخود اپنی اندر کی طاقتوں کی ذریعہ سے اُس نے کائنات کی مختلف شکلیں اختیار کر لیں۔ یہ حرکت اور جان رکھنے والا۔ قدیمی اجتماع مادہ ہی خدا ہے۔ اس بغیر خاصیت کے مادہ سے مختلف دنیائیں کائنات کی پیدا ہوئیں۔ اور یہ سب کائنات کی شکلیں بڑھتی ہیں مرتی ہیں اور پھر اُس ہی اپنی اوّل شکل میں رجوع ہو جاتی ہیں۔ اس ہی میں ان تمام اختلافات کے شکلیں موجود تھیں جو بعد میں اس طرح نمایاں ہو گئیں مثلاً گرم، سرد، تر اور خشک سیال اور منجمد وغیرہ۔

زمین کی نسبت اس کا خیال تھا کہ یہ اسطوانی شکل Cylindrical کی کائنات کے مرکز میں لٹکی ہوئی ہے اور اپنی جگہ میں ہر طرف سے مساوی فاصلہ ہونے کی وجہ سے قائم ہے آفتاب ماہتاب اور باقی سیارے اور ستارے

زمین کے گرد چکر لگا رہے ہیں۔ اس کے خیال میں ابتدا میں زمین محض پانی تھی۔ باہر کی گرمی نے اُس کے کچھ حصے کو توسکھا کر زمین بنا دیا۔ کچھ پانی کا حصہ بھاپ بن کر بادل میں تبدیل ہو گیا اور اس طرح جو گرمی کا اختلاف پیدا ہوا اُس سے ہوائیں حرکت میں آئیں، زمین پر جو جاندار نظر آتے ہیں وہ سب ابتدا میں مچھلیاں تھیں اور جب زمین خشک ہوئی تو اُنھوں نے موجودہ شکلیں اختیار کر لیں۔ انسان بھی پہلے پہلے مچھلی ہی تھا۔ (آج کل کے سائنس کی بھی تحقیق یہی ہے) کیونکہ موجودہ صورت میں ہی وہ ابتداء میں ہوتا تو وہ اپنا رزق بھی حاصل نہ کر سکتا اور یوں ہی ختم ہو جاتا۔

انگزیمینیز Anaximenes.

پیدائش ۵۸۸ ق م - فوتیدگی ۵۲۴ ق م

یہ کہتا ہے کہ سب چیزیں یعنی ساری کائنات ہوا سے پیدا ہوئی ہیں۔ ہوا میں حرکت ذاتی ہے۔ اور وہ ہر وقت حرکت میں رہتی ہے۔ اور اس حرکت ہی کی وجہ سے ساری کائنات پیدا ہو گئی۔ گرمی سے ہوا لطیف ہو کر اوپر اُٹھی اور آگ بن گئی۔ ستارے وہ ہی آگ ہیں۔ سردی سے یہ ہی ہوا کثیف و منجمد ہو کر پہلے پانی بنی۔ پھر مٹی۔ پھر چٹان۔ زمانہ گزرتے گزرتے پھر یہ سب چیزیں ہوا بن جائیں گی۔

ان تینوں حکماء نے مادہ کو قدیم تصور کیا ہے۔ اور اُس مادہ نے کسی نہ کسی طرح یہ صورتیں اختیار کر لیں۔ لیکن یہ نہ بتایا کہ مادہ، ہوا ہو، یا پانی، یا آگ، کس طرح وجود میں آیا۔ کس نے ان کو پیدا کیا اور ان میں یہ خاصیتیں کیونکر آگئیں۔

فیثاغورث اور اس کے مقلدین۔

یونانی میں اس کو Pyhtagoras کہتے ہیں جس کے معنی ہیں پیشینگوئی کرنے والا۔

پیدائش ۵۸۰ ق م اور ۵۷۰ ق م کے درمیان بمقام ساموس Samos درمیانی عمر میں بمقام Crotona جنوبی اطالیہ میں رہائش اختیار کرلی۔ جب ۵۰ سال کی عمر ہوئی تو دانشمندی کی تلاش میں دنیا کا سفر اختیار کیا۔ عرب، شام، فینیقیا، کلدیہ۔ ہند اور فرانس تک گیا۔ جب واپس Samos پہنچا تو وہاں کے حکمران سے اختلاف ہونے کی وجہ سے Crotona میں آن کر مستقل رہائش اختیار کی۔ اور وہاں اپنا فلسفہ کا سکول کھول دیا جس میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں کو تعلیم کی اجازت تھی دنیا میں یہ پہلا سکول تھا جہاں اس طرح آگ پانی کا ساتھ ہوا۔ لیکن آج کل کے لڑکے اور لڑکیوں کے یکجائی مدرسہ میں اور اس میں یہ فرق تھا کہ لڑکیاں لڑکوں سے بالکل علیحدہ رکھی جاتی تھیں اور اُن کو زیادہ تر خانگی امور کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس فیثاغورثی جماعت کے لئے قاعدے بہت سخت تھے۔ گوشت، انڈا اور لوبیئے کے بیج ممنوع تھے۔ ہر ایک جانور کے مارنے کی ممانعت تھی۔ کسی شخص کو تکلیف پہنچانی اور ہرے درخت کو کاٹنا بھی ممنوع تھا۔ ہنسنا بھی ممنوع تھا۔ دن کے اختتام پر ہر ایک طالب علم اپنے دل میں سوچتا تھا کہ دن بھر میں اُس نے کیا کیا جو اُسے نہ کرنا چاہیئے تھا۔ شراب کی ممانعت نہ تھی۔ لیکن مشورہ یہ تھا کہ شراب کی بجائے پانی پینا چاہیئے۔ اس سکول میں داخل ہونے کے بعد امیدوار کو پانچ سال تک خاموشی اختیار کرنی پڑتی تھی۔ اپنے جسم کو پاک وصاف رکھنا ہوتا تھا۔ اپنے اوپر قابو رکھنا اور ہر ایک زیادتی سے پرہیز کرنا ضروری تھا۔ دل و دماغ کی صفائی کا ذریعہ سائنس کی تعلیم کو قرار دیا گیا تھا۔ مدرسہ میں ریاضی کو سب پر فوقیت تھی۔ جب فیثا غورث نے جیومیٹری کی ۲ شکلیں حل کیں تو اس خوشی میں اپنے خداؤں کے سامنے ایک صد جانوروں کی قربانی کی۔ وہ شکلیں یہ تھیں مثلث کے تینوں زاویوں کا مجموعہ دو زاویہ قائمہ کے برابر ہوتا ہے یعنی ۱۸۰ درجہ ہوتا ہے اور مثلث زاویہ

قائمہ کے وتر کا مربع اُس کے باقی دونوں اضلاع کے مربعوں کے مجموعہ کے برابر ہوتا ہے۔

فیثاغورث موجودہ علم ہیئت کا موجد ہے۔ وہ پہلا شخص ہے جس نے زمین کو گول بتایا۔ دیگر تفصیلات کی یہاں ضرورت نہیں۔

فیثاغورث کا فلسفہ۔ ثالیس اور ملطہ کے دیگر فلاسفروں نے حقیقت کو مادہ میں تلاش کیا تھا لیکن فیثاغورث کہتا ہے کہ حقیقت اوّل تعداد Number. ہے۔ اُس کا خیال تھا کہ تعداد اور اُس کا تناسب ہر جگہ پایا جاتا ہے۔ ہر ایک چیز کی بنیاد اس کے حصّوں کے آپس کی تعداد و تناسب پر ہے۔

دنیا صرف تعداد پر قائم ہے اور اسی سے بنائی گئی ہے۔ تمام نمبر ایک سے شروع ہوتے ہیں۔ لہٰذا اکائی یا وحدانیت ہی تمام عالم کی روح ہے۔ نمبر کی تقسیم طاق و جفت میں ہوتی ہے۔ دنیا اور یہ سب عالم مختلف جوڑوں کا مجموعہ ہیں۔ اور ان کی خاص صفت یہ ہے کہ یہ یا تو جفت سے مرکب ہیں یا طاق سے۔ جفت کو انھوں نے غیر محدود سمجھا ہے۔ کیونکہ وہ ہمیشہ دو سے تقسیم ہو سکتا ہے اور اُس کی انتہا نہیں ہے۔ طاق کسی سے تقسیم نہیں ہو سکتا لہٰذا وہ محدود ہے۔ نتیجہ نکلا کہ عالم دو ہی ہیں یا جفت یا طاق۔ ان پر ہی عالم کا قیام ہے۔ اس جماعت نے اس طرح متضاد امور یا عناصر مقرر کئے جن سے تمام عالم مرکب ہے۔

(۱) محدود و غیر محدود (۲) طاق و جفت (۳) ایک اور ایک سے زائد (۴) راست و چپ (۵) مذکر و مؤنث (۶) سکون و حرکت۔ (۷) مستقیم و منحنی (۸) نور و ظلمت (۹) خیر و شر (۱۰) مربع و مستطیل۔

انھوں نے ان نمبروں کے صفات و خواص و اثرات بھی بیان کئیں۔ ہر ایک نمبر کو ایک خاص صفت کے ساتھ منسوب کر دیا مثلاً ۱ نقطہ ہے۔ ۲ خط ہے، ۳ سطح ہے: ۴ منجمد شے ہے ۵ جسمانی طاقت ہے وغیرہ وغیرہ۔ اور حروف کو بھی نمبروں کی طرف منسوب کیا اس سلسلہ میں حروف

ابجد کے خواص و تعداد پر غور کرنا دلچسپی سے خالی نہیں - ان کا خیال تھا کہ تمام کائنات جس میں سورج بھی شامل ہے - ایک ہی آتشی مرکز کے اردگرد چکر لگا رہے ہیں - ہم کو یہ آتشی مرکز نظر نہیں آتا - کیونکہ زمین کا رخ جس پر آبادی ہے، اس مرکز نار کی طرف نہیں ہے۔

روح کے تین حصے ہیں :- (۱) احساس (۲) وجدان یا ادراک بلا واسطۂ احساسِ ظاہریہ اور (۳) عقل یا نفسِ ناطقہ - احساس کا مقام دل ہے اور باقی دو حصوں کا مقام دماغ ہے۔

فیثاغورث تناسخ ارواح کا بڑا سختی سے قائل تھا - اُس کا خیال تھا کہ مرنے کے بعد تو فوراً انسان کی روح مقام موتی یعنی Hades میں چلی جاتی ہے - اور پھر کچھ تصفیہ کے بعد زمین پر آن کر ایک جدید جسم میں چلی جاتی ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح قائم رہتا ہے جب تک مکمل نیک زندگی سے اس کو ختم نہ کیا جائے - اپنے پہلے جنم کی باتیں بھی بتایا کرتا تھا - کہتا تھا کہ ایک سابقہ جنم میں وہ رنڈی تھا - ایک اور جنم میں وہ جنگ ٹرائے کا بہادر Euphorbus تھا - اور اپنے وہاں کے کارنامے اب تک اُسے یاد ہیں اور ایک مندر میں جو اسلحہ رکھے ہوئے تھے اُس نے شناخت کیا کہ یہ ہی اسلحہ اُس زمانہ میں اُس کے زیر استعمال تھے - ایک دفعہ ایک کُتے کو جو چلاتے ہوئے سُنا تو وہ دوڑ کر اُس کے بچانے کے لئے گیا اور کہا کہ اُس کی آواز کو میں شناخت کرتا ہوں - یہ میرے ایک دوست کی آواز ہے جو مرچکا ہے۔ شاعر تو ایسے وہمی خیالات کے شکار ہوا ہی کرتے ہیں معلوم ہوا کہ یہ مرض حکما تک بھی پہنچ جاتا ہے۔

پرانے زمانہ کے تبادلہ خیالات کا اندازہ جس نے چھٹی صدی ق م کی تمام دنیا یعنی یونان، افریقہ اور ایشیا کو ایک کیا ہوا تھا - اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تناسخ کا عقیدہ ایک ہی وقت میں ہندوستان، یونان اور جنوبی اٹلی میں عام تھا - یونان میں جو Orphic مذہب تھا اُس کی بنیاد اس ہی عقیدہ پر تھی تو کیا انبیاء علیہم السلام کی تعلیم جو اس سے بھی بہت پہلے سے رائج تھی اور جس کے اثر کو موجودہ یورپ صرف عیسائیت تک محدود کرتی ہے

دنیائے ماضیہ کے سارے فلسفہ پر اثر انداز نہ تھی۔ ضرور تھی۔

ہندو تناسخ نے افلاطون کے فلسفہ پر کافی اثر ڈالا تھا۔ فیثاغورث کے فلسفہ کے مطابق انسان کی زندگی کا مقصد محض اس سلسلہ پیدائش سے نجات پانا تھا۔ یہ نیکی ہی کے ذریعہ سے ہو سکتا تھا۔ نیکی کیا ہے، جو انسان کی روح اور خدا کے ساتھ ہم آہنگی رکھے۔ بسا اوقات یہ اتحاد، یہ ہم آہنگی عقل، فراست سے حاصل ہوئی ہے۔ فیثاغورث نے موسیقی کو ایک بہت بڑا ذریعہ مانا ہے۔ یعنی وہ نیکی کی تعریف میں آتا ہے، موسیقی بھی اس بحث کے حساب سے نیکی ہوئی۔ نتیجہ نکلا کہ ان کی رائے کے مطابق انسان گا بجا لے تو بس نیک ہو گیا۔ آج کل اسلامی ممالک میں بھی موسیقی کو بہت اچھا سمجھا جاتا ہے۔ یورپ میں تو موسیقی تمام نیکیوں کا مجموعہ سمجھی جاتی ہے۔ یہ مغربی تہذیب کا اثر ہے فلسفۂ اسلام میں موسیقی کو ممنوع قرار دیا ہے۔ یہ دونوں فلسفے ایک دوسرے سے مخالف اور متضاد ہوئے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کونسا فلسفہ درست ہے مسلمان کو تو قطعاً اس میں کچھ شک و شبہ ہی نہیں ہونا چاہئے۔ جس کو اسلام نے اُس کے لئے ممنوع قرار دیا وہ ممنوع ہے۔ صرف دہریوں اور مشککیں کے لئے ہم کچھ لکھتے ہیں۔ موسیقی کے ضرر رساں پہلو یہ ہیں۔

(۱) یہ لہو و لعب میں شامل ہے۔ اور لہو و لعب تضیع اوقات ہے۔ انسان کی زندگی اتنی کم ہے اور اُسے دنیا میں اتنا کرنا ہوتا ہے کہ اس طرح وقت کو ضائع کرنا نقصان دہ ہے۔ موسیقی کے سیکھنے میں اور اس کو ہنر کے درجہ تک پہنچاتے ہیں بڑا وقت صرف ہوتا ہے۔

(۲) اس سے انسان کی صحت پر اچھا اثر نہیں ہوتا۔

(۳) موسیقی سے انسان کے جذبات میں ہیجان پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ ہیجان اتنا تیز ہوتا ہے کہ وہ انسان کی عقل، غور و فکر کے قابو سے باہر ہو جاتا ہے اور چونکہ انسانوں کی اکثریت کی طبیعت بدی کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اور بدی کی طرف جانا اُس کے لئے آسان ہوتا ہے لہذا جس طرح سیلاب والے دریا کا رُخ نشیب کی طرف تیزی سے ہو جاتا ہے اسی طرح اس ہیجانِ جذبات کا رُخ بدی کی طرف ہو جاتا

ہے۔ انسان کی فطرت بدی کی طرف اسی طرح مائل ہے جس طرح پانی کی فطرت نشیب کی طرف۔

(۴) ممکن ہے کہ قوالی کے "حال" کا حوالہ دیا جائے۔ بسا اوقات تو یہ حال بناوٹی ہوتے ہیں۔ اور ان کے بناوٹی ہونے کے بہت سے قصے مشہور ہیں۔ دوم یہ کہ یہ حال بھی اُن شعروں پر آتے ہیں یا بلائے جاتے ہیں جن میں عاشقی و معشوقی کی چاشنی ہو خداوند تعالےٰ کو زلفیں اور حسین چہرہ اور نازک ادائیں دے کر اُس سے محبت کی جاتی ہے۔ خدا کے لئے زلف و حسن و ادا کی کیا ضرورت ہے۔ چونکہ قرآن شریف میں تاکید ہے کہ خدا سے محبت کرو۔ تو یہ لوگ محبت نہیں کر سکتے۔ جب تک زلف و حسن کا ذریعہ نہ اختیار کریں اور معلوم نہیں دل میں نرگس کے حسین چہرہ اور کالی کالی زلف پریشان کا خیال ہوتا ہے ایسے شعر سُن کر اُچھلنے کودنے لگتے ہیں۔ یہ ہوئی خدا کی پرستش اور رسول کی منقبت۔ یا تو یہ لوگ سمجھتے نہیں یا سمجھنے سے عمداً پہلوتہی کرتے ہیں کہ محبت کا جزوِ اعظم اطاعت ہے اور خدا و رسول سے محبت کرنے کے یہ معنی ہیں کہ اُن کے احکام کی اطاعت ہر حال میں اور دلی خوشی اور آمادگی کے ساتھ کی جائے۔ دماغ کو اُچھلنے کودنے کی طرف زبردستی مائل کر کے اُچھلنا کودنا یہ محبت کا مظاہرہ نہیں ہے۔ بلکہ اس سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُن کے دماغ پر سے عقل کی حکومت اُٹھ گئی ہے اور وہ ہیجانِ جذبات کے زیرِ اثر آ گئے ہیں۔ قوالی کے حال ہمارے دعوی کی دلیل ہیں۔ نہ کہ اُس کے مخالف۔

فیثاغورث کی سیاست وہ ہی تھی جس کو بعد میں افلاطون نے اختیار کیا تھا۔ اس کی جماعت امراء کی اشتمالی حکومت کا نمونہ تیار کرتی تھی۔ عورت اور مرد کا ساتھ ساتھ تعلیم پانا، اپنے سارے مال و متاع کو جماعت کے تصرف میں دیدینا اور ایک ہی طرح کے اخلاقیات پیدا کرنا اور پھر اپنے افراد کو حکومت کے لئے پیش کرنا یہ اُس کی خصوصیات تھیں۔ اُس کے شاگرد اس جوش و خروش کے ساتھ امراء کی پارٹی کا ساتھ دیتے تھے کہ کروٹونا Crotona کی جمہوری حکومت اُن کے خلاف ہوگئی۔ اون کے گھر کو جلا دیا جس سے بہت فیثاغورثی جل گئے اور

آخر کار جلاوطن کر دئے گئے۔ فیثا غورث کو بھی قتل کر دیا گیا۔ دوسری روایت یہ ہے کہ وہ ایک اور شہر میں بھاگ گیا اور وہاں HUNGER STRIKE بھوک ہڑتال) کر کے مر گیا۔

ایلیاتی حکماء the Eleatics

ان کو ایلیاتی اس وجہ سے کہتے ہیں کہ ان کا مکتبِ فلسفہ جنوبی اٹلی کے شہر .Elea میں واقع تھا۔ اس فلسفہ کا بانی زنوفینز (.Xenophanes) تھا۔ اس کا نقطۂ خیال زیادہ تر مذہبی تھا۔ لہذا کہہ سکتے ہیں کہ اس فلسفہ کا اصلی بانی .Parmenides تھا۔ زنوفینز ۵۷۰ ق م میں بمقام کولوفن (COLOPHEN) جو ساحل ایشیائی کوچک پر واقع ہے۔ پیدا ہوا تھا۔ ۵۱۰ ق م کے قریب .Elea میں آیا اور وہاں اپنا فلسفہ کا سکول جاری کیا۔ سب سے پہلا یہ شخص ہے جس نے فلسفہ اور مذہب کا تنازعہ شروع کیا۔

اس نے یونانی عوام الناس کے مذہب کو بہت برا بھلا کہا۔ اُس نے کہا کہ ان لوگوں نے اپنے خداؤں کو اپنی شکل پر تصور کر کے اپنے سارے عیوب اُن کے حوالہ کر دئے ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ کئی خدا نہیں ہو سکتے۔ یہ نہایت نامعقول اعتقاد ہے کہ خدا ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کرتے ہیں اور آپس میں لڑائیاں لڑتے ہیں جیساکہ یونانی مذہبی قصوں میں بیان کیا گیا ہے ان کی طرف دھوکہ بازی، زنا، چوری اور مکاری جیسے جرائم کی نسبت دینا احمقانہ تخیل ہے۔ خداؤں کی ایک ابتدا ماننا اور ان کا پیدا ہونا فضول اعتقاد ہے۔ ان اعتقادات کا ذمہ دار ہومر (Homer) اور ہیسی اوڈ (Hesiod) شاعروں کو ٹھہراتا ہے۔ کہتا ہے کہ خدا در اصل ایک ہے جس کی نہ ابتداء ہے اور نہ انتہا ہے۔ اور یہ خدا کسی صفت میں بھی انسانوں کی طرح نہیں ہے۔ اس کا کوئی جسم نہیں۔ اس کی ساری ذات دیکھتی ہے۔ ساری ذات سنتی ہے، بغیر کسی تکلف کے وہ تمام عالم پر حکومت کرتا ہے اور اس کا نظام قائم رکھتا ہے۔ اس کو ان امور میں کوئی زحمت نہیں ہوتی۔ خدا تغیر و تبدل سے بالاتر ہے اس میں

تغیّر و تبدل نہیں ہوتا۔ اس کا تجزیہ نہیں ہو سکتا، جذبات و احساسات سے بری ہے۔ (۳۸) دیکھئے یہ فلسفہ اسلام سے کتنا نزدیک ہے۔ کیا اب بھی کوئی شبہ باقی رہتا ہے کہ اس فلسفہ پر انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کا اثر نہیں ہے۔ نہیں۔ یہ فلسفہ بالکل اُن کی تعلیم کا نتیجہ ہے۔

وہ کہتا ہے کہ دنیا میں تغیر و تبدل ہے۔ وہ ہر لمحہ بدلتی رہتی ہے۔ لیکن یہ تمام حدوث اور چیزوں کی کثرت اور ان کا ایک دوسرے سے جُداگانہ ہونا عارضی باتیں ہیں ان کی تہ میں ایک تغیر و تبدل سے بالاتر وحدت ہے۔ اور یہ ہی خداوند تعالےٰ کی اصلی صفت ہے۔

اس فلسفہ کی بنیاد پر پارمینڈیز نے وحدانیت کا تخیل قائم کیا۔ اس پر ہی افلاطون نے اپنے فلسفہ کی بناء رکھی۔ اور یہ ہی آگے چل کر یورپ کا وہ تصولتی فلسفہ Philosophy of Idealism. ہوگیا جس کی لڑائی آج تک مادیت Materialism سے جاری ہے۔

پارمینڈیز (Parmenides)

یہ فلاسفر ۵۱۴ ق م بمقام ایلیا (Elea) پیدا ہوا۔ اس کا فلسفہ اس کی ایک ناصحانہ مثنوی کی صورت میں ہے۔ جس کا حصّہ اوّل راہِ حقیقت اور حصّہ دوم راہِ قیاس کے نام سے مشہور ہیں۔ راہِ حقیقت میں حق معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور راہِ قیاس میں قیاس سے بحث ہے جو محض حواس پر مبنی ہے۔ اس کے فلسفہ کا نچوڑ یہ ہے :-

دنیا حادث ہے۔ بدلتی رہتی ہے۔ ایک ایک لمحہ میں اس میں تغیر و تبدل ہوتا رہتا ہے۔ لیکن حق کی صفت یہ ہے کہ وہ کبھی متغیر نہ ہو۔ حادث نہ ہو۔ قدیم و مستقل ہو۔ لہذا یہ دنیا حقیقت نہیں ہے۔ دنیا بدلنے والی، غیر حقیقی محض فریبِ نظر ہے۔ نیستی ہے۔ حقیقت ہی ہستی ہے۔ لہذا تمام عالم کی ابتدا ہستی ہے۔ ہستی کی حقیقت وہ یہ بتاتا ہے کہ اس میں تغیر نہیں ہے۔

(۳۸) (38) C. Bakewell Source Book in Ancient Philosophy.

فنا ہونے والی نہیں ہے۔ ہستی کے علاوہ سب نیستی ہے۔ نیستی ہیں سے ہستی پیدا نہیں ہوسکتی۔ ہستی کے لئے نہ ماضی ہے۔ نہ حال ہے، نہ مستقبل ہے، وہ ہمیشہ ہے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ تقسیم نہیں ہوسکتا۔ وہ قدیم ہے غیر متحرک ہے۔ کیونکہ حرکت تو فضا ہی میں ہوسکتی ہے۔ اگر فضا ایک موجود شے ہے تو یہ ہستی ہے۔ ہستی کی نسبت یہ کہنا کہ یہ فضا میں حرکت کرتی ہے گویا یہ کہنا ہے کہ ہستی ہستی میں حرکت کرتی ہے، جس کے یہ معنی ہوئے کہ وہ ساکن ہے۔ اور اگر فضا نیستی ہے، کچھ نہیں ہے تو پھر حرکت بھی نہیں ہے، ہستی ناقابل تقسیم کل ہے اس میں کہیں خلا نہیں۔ ہستی اور ہستی کے مابین کہیں فصل نہیں ہے۔ اس میں نہ تو خواہشات ہیں اور نہ جذبات، نہ حاجات۔ ہستی صرف ایک ہے۔ قدیم، غیر متحرک اور مسلسل جس میں نہ تبدیلی ہے اور نہ تغیر ہے۔ لامحدود ہے۔ اور بے ہمتا ہے۔ اس کی صرف یہ ہی صفت ہے کہ وہ ہے۔ اور اس کی کوئی صفت نہیں۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ یہ صفت رکھتا ہے اور یہ صفت نہیں رکھتا سوائے "ہونے" کے اور کوئی صفت ہی نہیں ہے۔ جو انسانی احساس اور ادراک سے محسوس و مفہوم ہوسکے وہ حقیقت نہیں ہے۔ جو محض عقل سے معلوم ہوسکے وہ حقیقت ہے۔ جو حس سے معلوم ہوسکے وہ حقیقت نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حقیقت محض عقل میں ہے یعنی عقل ہی سے اس کا ادراک ہوسکتا ہے۔ احساس کی محسوس دنیا میں حق نہیں ہے۔ ادراکِ حق میں عقل اور حس کو علحدہ کرنے والا یہ پہلا شخص ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہستی کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔

Not being cannot be; there is no void; the One fills every nook and cranny of the world; and is forever at rest.

ترجمہ: نیستی کچھ نہیں ہے۔ اس کی موجودگی ناممکن ہے۔ کائنات میں کوئی خلا نہیں ہے۔ وہ ذات واحد کائنات کے ہر ایک خلا کو پُر کئے ہوئے ہے اور خود ہمیشہ غیر متحرک ہے۔

اس طرح پارمینڈیز افلاطون کی تصوریت اور سقراط کی وحدانیت کا پیشرو ہے۔

آگے چل کر دوسرے حصہ میں وہ کہتا ہے کہ ہستی کا مقام فضا میں ہے محدود ہے۔ اندریں صورت ظاہر ہوا کہ وہ مادہ ہے کیونکہ جو چیز مکان رکھتی ہے وہ محدود ہے اور مادہ ہے ہستی کی شکل اُس نے کرہ کی سی بتائی ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ دوسرا حصہ پہلے حصہ سے متناقض ہے۔ اس طرح پارمینڈیز کا فلسفہ مادیت بھی ہے اور تصوریت بھی ہے۔ یہ موجودہ فلسفہ کی زبان میں کہا جاسکتا ہے۔ ورنہ امر واقعہ وہ ہے جو ہم نے اوپر بیان کیا کہ ایک فلسفہ دوسرے کی تردید کرتا ہے۔

پارمینڈیز کے دو جانشین ایمپیڈوکلیز (Empedocles.) اور دیمقراطیس Democritus. ہیں جنھوں نے اُس کے فلسفۂ مادیت کو لیا ہے۔ ایک فلاسفر مورخ نے خوب کہا ہے کہ تصوریت احساسات اور جذبات کے خلاف بغاوت ہے۔ اور مادیت روح کے خلاف بغاوت ہے۔ تصوریت سوائے محسوس دنیا کے ہر ایک شے کی تشریح کرتی ہے اور مادیت ہر ایک شے کی تشریح کرتی ہے۔ سوائے حیات انسانی کے[39] اور یہی فلسفۂ اسلام کی برتری ہے کہ دونوں کی صحیح تشریح کرتا ہے۔ اسلام کے نزدیک کامل انسان وہ ہے جس میں کمالِ جسم اور کمالِ روح کا امتزاج و انتصال صحیح مناسبت میں ہو۔

فلسفۂ یونان نے بھی اس نقص کو دور کرنے کی کوشش کی لیکن ہمارے ناظرین خود معلوم کرلیں گے کہ وہ اس کوشش میں ناکامیاب ہوگئے ہیں۔ سوائے اسلام کے کسی اور مذہب کا مروجہ فلسفہ اس میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ انگزاغورس Anaxagoras. نے اپنے خیال میں اس قیاس سے اس نقص کو دور کیا کہ حقیقت اوّل ایک عالمی دماغ ہے۔ اور ایمپیڈوکلیز Empedocles. نے قیاس کیا کہ خود اس مادی دنیا اور اُس کی اشیاء میں اندرونی طاقت ہے جو

۳۹ (39) Toynbee : A Study of History
Will Durant : Story of Civilisation

بذریعہ ارتقاء نشو ونما کر رہی ہے۔ لیکن ان دونوں قیاسوں میں سے ایک قیاس بھی حیاۃ انسانی کے عنصر اعظم۔ظلم۔کی وجہ ہست و بود اور اُس کے آخری انجام اور اُس کے مداوا کی تشریح نہیں کرتا۔ اور یہ بہت بڑا نقص ہے۔ بغیر اس کے حیاۃ انسانی ناکمل ہے اور جتنی جلدی اُس کو خودکشی سے ختم کر دیا جائے بہتر ہے۔ ہمارے خیال میں ان دونوں قیاسوں کی عملی حد خودکشی ہونا چاہیئے۔ اور یونان نے بہت عرصہ تک اُس پر عمل بھی کیا۔

ایران و یونان کی کشمکشِ عظیم میں بڑی جنگوں میں سے ایک جنگ میرا تھن Marathon تھی۔ اُس ہی سال ۴۹۰ قم میں ایمپیڈو میکیز پیدا ہوا تھا۔ یہ بھی مسئلۂ تناسخ اور آواگون ارواح کا بہت ہی زیادہ معتقد تھا۔ اور اپنے شاعرانہ تخئیل کی مدد سے اُس نے اعلان کیا کہ میں پچھلے جنموں میں ایک نوجوان، پھر ایک کنواری لڑکی اور ایک پھولدار جھاڑی تھا۔ میں پرندہ بھی رہا ہوں اور کسی جنم میں مچھلی بھی تھا جب میں گہرے سمندروں میں تیرتا پھرتا تھا۔ غیر الہامی دماغوں نے اپنے خیال میں دنیا کی خیر و شر اور رنج و راحت کی تقسیم کا مسئلہ آواگون کو بہترین حل تصور کیا تھا۔ ایک فارسی شاعر جو اسلام کی کنہ کو نہیں پہنچا تھا کہتا ہے ؎

ہفصد و ہفتاد قالب دیدہ ام ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام

لیکن اگر نظر غور سے دیکھا جائے تو مسئلہ تناسخ یا آواگون ارواح کوئی قابلِ تسلیم حل نہیں پیش کر سکتا۔ محض بار بار کی پیدائش کبھی انسان کی صورت میں کبھی کیڑے کی صورت میں اور کبھی سبزہ کی حالت میں نہ تو مقصد اصلاح کو پورا کر سکتی ہے اور نہ تخئیل سزا کو کیونکہ دونوں ناممکن ہیں جب پہلے جنم کی یاد اور اُس کے اچھے اور بُرے کاموں کا احساس نہ ہو۔ اور یہ قدرت کے اُس مسلمہ سنت کے خلاف ہے جس میں بدستور ترقی و نشو ونما کا مستقل عمل جاری ہے ترقی معکوس اس عمل و اصول کے بالکل خلاف ہے۔ بندر سے انسان بننا تو شاید سمجھ میں آبھی جائے انسان سے بندر بننا تو سنت رائجہ

کے بالکل خلاف ہے۔

اپنے اس اعتقاد کے مطابق ایمپیڈ وکلیز نے گوشت خوری اور آدم خوری کو ایک ہی سطح پر رکھا تھا اور گوشت خوری کی قطعاً ممانعت کی تھی، اُس کا خیال تھا کہ دنیا میں آنے سے پہلے تمام لوگ خدا تھے۔ لیکن اپنی آسمانی رہائش اپنے گناہوں کی وجہ سے کھو دی۔

کیا یہ انبیاؑ کی تعلیم کی آواز بازگشت نہیں ہے جنھوں نے انسان کی اصلی حالت اور مقصد اور ان کے گناہوں کی پاداش سے آگاہ کیا۔ حضرت آدم کی پیدائش، اور اُن کی لغزش اور اُس کے نتیجہ کی خبروں نے ان حکماء کی توجہ ادھر دلائی۔ اور اُس کو اپنے فلسفہ میں داخل کیا۔ فارسی کے شعراء کی شاعری پر بھی اس کا اثر ہوا ہے ؎

اے کہ بودی در حریم لامکاں	چوں جدا گشتی بگو راز نہاں
پاک بودی در حریم کبریا	از چہ پیدا شد ترا حرص و ہوا

اگرچہ یہ بالکل ایمپیڈ وکلیز کا فلسفہ تو نہیں ہے لیکن اُس کا اثر ظاہر ہے وہ کہتا تھا کہ مجھے اب تک اپنی خدائی حالت یاد ہے بلکہ اب بھی میں خدا ہوں افسوس کرتا تھا کہ کیسی اچھی جائے قدس میں سے گر کر مجھ کو ان فانی انسانوں میں رہنا پڑا۔ اپنی خدائی ابتدا کے اعتقاد کے بموجب وہ سنہری یا سونے کی کھڑاویں استعمال کرتا تھا۔ گیروے سرخ Purple کپڑے پہنتا تھا اور اپنے سر پر پھولوں یا سبز پتیوں کا تاج رکھتا تھا۔ عوام الناس سے تو کہتا تھا کہ میں اپولو خدا Apollo کا دوست ہوں۔ لیکن تنہائی میں اپنے خاص دوستوں سے کہتا تھا کہ میں خدا ہوں۔ سحر کا عامل تھا فوق العادت طاقتوں کا دعویٰ کرتا تھا۔ اور انسانوں کی قسمتِ آیندہ کے علم کا دعویدار تھا۔ اپنی پھونکوں سے مریضوں کا علاج کرتا تھا۔ وہ طبیب بھی تھا۔ انجینیر بھی تھا اور مقرر بھی تھا۔ شاعر بھی تھا۔ شہری سیاست میں بھی حصہ لیتا تھا۔ اُس نے تمام چیزوں کو چار عناصر پر منقسم کیا تھا، آب، خاک، باد اور آتش۔ ان چاروں عناصر پر دو طاقتیں اپنا عمل کر رہی ہیں:۔

قوت کشش اور قوت دفع۔ بالفاظ دیگر محبت و نفرت۔ آگے چل کر وہ بیان کرتا ہے ہے کہ ان دونوں قوتوں سے کس طرح تمام کائنات پیدا ہوئی۔ یہاں اُس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ جو اس کے فلسفہ کی تفصیلات معلوم کرنا چاہتا ہے۔ اُسے چاہئے کہ مندرجہ ذیل دو کتابیں ضرور پڑھے۔

1-DIOGENES LAERTIUS LINES AND OPINIONS OF THE EMINENT PHILOSOPERS "EMPEDOCLES" LONDON 1853.

2-J.A. SYMONDS: STUDIES. OF THE GREEK POETS, LONDON, 1920

زینو (Zeno)

اس نام کے دو فلاسفر ہیں۔ یہاں ہم اُس کا ذکر کر رہے ہیں جو ایلیا کا باشندہ تھا۔ اس کا وہ ہی فلسفہ ہے جو پارمینڈیز کا تھا۔ اُس نے کثرت اور حرکت کے خلاف بہت بحث کی ہے۔ جس کا اعادہ یہاں غیر ضروری ہے۔ یہ بھی یہی کہتا ہے کہ ہستی محض ایک ہے۔ اُس میں کثرت نہیں ہے اور نہ حرکت ہے۔ دنیا محض فریب نظر ہے۔ یہ نہ حقیقت ہے اور نہ ہستی۔ ۴۷۰ء ق م کے قریب گزرا ہے۔

ہیرا قلیطس Heracleitus.

پیدائش ۵۳۵ء ق م۔ فوتیدگی ۴۷۵ء ق م۔ پارمینڈیز کا ہمعصر۔ زینو سے عمر میں بڑا۔ یہ Ionia کے شہر Ephesus. کا باشندہ تھا۔ یہ شہر اتھنز کے شرن آرکھیوں نے ۱۰۰۰ء ق م میں بسایا تھا۔ اس میں آرٹمیس Artemis. دیوی کا بہت بڑا مندر تھا جو دنیا کے ہفت عجائبات میں سے ایک ہے۔ اس شہر کی تین بڑی مشہور چیزیں تھیں۔ شعراء، فلاسفران اور خواتین۔ اس کے ایک فلاسفر Hipponax. کا ایک مقولہ آج کل کی یورپ کے لئے سبق آموز ہے۔ وہ کہتا ہے کہ عورت اپنے خاوند کے لئے صرف دو دن خوشی کے لاتی ہے۔ ایک تو شادی کا پہلا دن۔ اور دوسرا عورت کی زندگی کا آخری دن جب اُس کا خاوند اُس کو دفن

کر کے اطمینان کا سانس لیتا ہے۔ انگریزی کا فقرہ مختصر ہے۔

Woman brings two days of happiness to a man—one when he marries her, the other when he buries her.

ہیراقلیطس لوگوں میں شامل ہونے کو پسند نہیں کرتا تھا۔ اور پہاڑوں اور جنگلوں میں رہتا تھا۔ اس کا فلسفہ ہے کہ ہر ایک شے تغیر پذیر ہے کسی میں دوام نہیں، ہستی بھی نیستی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ زندگی ایک کشمکش کا نام ہے۔ ہر ایک شے کی ضد موجود ہے۔ تمام اشیاء آگ سے بنی ہیں اور پھر آگ ہی میں تبدیل ہو جائیں گی۔ دنیا میں شر بھی ضروری ہے۔ ہر ایک لمحہ میں تبدیلی ہے۔ کسی شے کو قرار نہیں۔ بت پرستی حماقت ہے۔ پتھر بھی کہیں خدا ہو سکتے ہیں۔ حقیقت ایک ہے۔ کثرت ہی میں وحدت ہے۔ وہ حقیقت آگ ہے۔ لیکن وہ آگ کو روح و خدا سمجھتا ہے۔ استعارہ کے طور پر آگ کہا ہے۔ بعض جگہ معمولی آگ بھی کہتا ہے۔ یہ دنیا نہ خدا نے بنائی ہے۔ اور نہ انسان نے ہمیشہ سے ہے۔ قدیم ہے۔ اور ہمیشہ رہے گی۔ لازوال ہے۔ موت اور زندگی ایک ہی شے ہے۔ ان میں کچھ فرق نہیں۔ عاقبت نہیں ہے۔ حیاۃ بعد ممات نہیں ہے موت کے اسباب بیرونی ہوتے ہیں۔ اگر ان اسباب کو روک دیا جائے تو موت کبھی واقع نہ ہو۔ ہر ایک شے میں ایک کشمکش ہے۔ اگر کشمکش نہ ہو تو وہ شے معدوم ہو جائے۔

ایک فلاسفر مورخ کہتا ہے کہ ہیراقلیطس کا فلسفہ مسیحیت پر اثر پذیر ہوا ہے۔ اور مسیحیت نے بہت سے نظریہ اُس کے فلسفہ سے لئے ہیں۔ آج تک یورپ کے فلاسفروں کے خیالات پر اثر پذیر ہے ۴۰۔ ہمارا خیال ہے کہ خود ہیراقلیطس نے اپنے نظریات انبیاء علیہم السلام کی تعلیم سے اثر پذیر ہو کر قائم کئے ہیں۔ وحدت کو مانتا ہے۔ تغیر کو مانتا ہے۔ بت پرستی کو حماقت کہتا ہے۔ موت محض ایک انتقال ہے۔ اگر بیرونی اسباب نہ ہوں تو یہ ظاہری موت بھی واقع نہ ہو۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کو دنیا اب تک نہ سمجھی اور خداوند تعالے کے چند برگزیدہ بندوں کی طفیل

(40) Will Durant : The Life of Greece Chap. vi. P. 147　　۴۰

عمر پر جو خداوند تعالٰے نے اُن کو عطا کی ہے اعتراض کیا جاتا ہے۔ اگر رنج و غم کے اسباب جو انسان کے اندر کیڑوں کی طرح گھُن لگا رہے ہیں، فضا کی آلودگیاں اور غبار جو ہوا کے ساتھ مل کر انسان کے اندر جاتی ہیں، موسم کا ایک لخت تغیر و تبدل اور دیگر ایسے امور یعنی عمر انسانی کو قطع کرنے والے اسباب کسی خاص خطہ زمین سے کسی خاص آدمی کے لئے دور کر دئے جائیں تو پھر مشیت خداوندی کے علاوہ کون سی چیز ہے جو انسان کی عمر منقطع کر دے جو صنعت الٰہی کا بہترین اور نادر ترین نمونہ ہے اور جس کی نسبت خود صانع حکیم فرمائے کہ خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔ مصنوع کی مضبوطی اور پائداری ہی صانع کی حکمت کی دلیل ہوا کرتی ہے۔

امپیڈوکلیز Empedocles.

پیدائش ۴۹۵ء ق م۔ فوتیدگی ۴۳۵ء ق م

اس کا مختصر تذکرہ ہم ابھی کر چکے ہیں۔ اس نے پارمینڈیز کے فلسفہ مادیت کے حصّہ کو لیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ مادہ قدیم ہے۔ غیر فانی ہے۔ اس کی نہ ابتداء ہے اور نہ انتہا، یہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ یہ اس کے فلسفہ کا بنیادی اصول ہے۔ تناسخ ارواح کا بھی قائل تھا۔ مادہ کی قدامت اور بقاء کا فلسفہ اُس کے جانشینان انکزاگورس اور سالمین یعنی فلاسفۂ جوہر فرد Atomists کا بھی تھا۔ امپیڈوکلیز پہلا شخص ہے جس نے تمام مادہ کو چار عناصر میں تقسیم کیا یعنی آب و خاک و آتش و باد۔ اس کی رائے میں مادہ بالکل مردہ اور بے حس شے ہے۔ اس میں کوئی حرکت نہیں ہے۔ لہذا مادہ پر عمل کرنے والی دو بیرونی طاقتیں ہیں جن کا نام اُس نے HARMONY اور DISCORD یعنی میل و نزاع یا انجذاب و انقطاع رکھا تھا۔

سالمین یا فلاسفہ جوہر فرد (Atomists)

اس فلسفہ، نظریہ جوہریت کا بانی لیوسی پس LEUCIPUS تھا۔

تاریخ پیدائش و موت کا علم نہیں۔ غالباً ایمپیڈوکلیز کا ہم عصر تھا اور اس ہی کے فلسفہ یعنی قدامت و بقاء مادہ (ازلیت و ابدیت مادہ) پر اس نے اپنا نظریہ قائم کیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ اگر مادہ کا آخری تجزیہ کیا جائے تو وہ ذرہ یا (ATOM) رہ جائے گا جو آگے تقسیم نہ ہو سکے گا۔ اور وہ ہی غیر فانی ہے (موجودہ سائنس طبیعیات نے اس نظریہ کو غلط ثابت کیا ہے) ان فلاسفہ کا خیال ہے کہ مادہ کے چار عناصر نہیں ہیں۔ بلکہ ایک ہی عنصر ہے جو مختلف شکلیں اسباب کی وجہ سے اختیار کرتا رہتا ہے ان میں سے اصلی سبب یہ ہے کہ بعض ایٹم چھوٹے اور بعض بڑے ہوتے ہیں۔ اُن کے شکل و قد کے اختلاف کی وجہ سے مادہ کی شکلوں میں فرق ہوتا ہے۔ اور ان کی ترتیب اور مقام کے اختلاف کی وجہ سے مادہ کی خاصیتوں میں فرق ہوتا ہے۔ یہ مشکوک امر ہے کہ آیا (LEUCIP US \ اور Democritus جس نے لیوسی پس کے فلسفہ کی تائید کی تھی ایٹم کے باوزن ہونے کے قائل تھے یا نہیں۔ یہ یقینی امر ہے کہ اُن کے بعد کے آنے والے حکماء یعنی EPIC UREANS ایٹم کے باوزن ہونے کے قائل تھے۔

ان فلاسفہ کے خیال کے مطابق ایٹم ایک حد میں محدود ہیں اور ایک دوسرے سے جدا ہیں یعنی دو ایٹم کے درمیان خلا ہے۔ اس خلاء میں وہ ایٹم حرکت کرتے رہتے ہیں۔ اب گویا دو حقیقتیں ہوگئیں۔ ایک ایٹم اور دوسرے خلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ حرکت کیونکر پیدا ہوئی۔ اس کا تسلی بخش جواب نہیں دے سکے ہیں۔ جو فلاسفہ ایٹم کے باوزن ہونے کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ حرکت ایٹم کی وزن کی وجہ سے ہوئی جو ہمیشہ اوپر سے نیچے اپنے وزن کی وجہ سے گرتے ہیں اور حرکت پیدا کرتے ہیں۔ لیکن یہ بحث ناقص ہے۔ فضا میں اوپر نیچے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اگر وہ گرتے ہیں یا حرکت کرتے ہیں تو قوت کشش ہی کی وجہ سے کر سکتے ہیں۔ اور پھر یہ سوال ہوگا کہ قوت کشش کیوں کر پیدا ہوئی۔ پہلے ذرات مل کر حرکت کر کے بہت سے کرہ جات بنائیں تو کشش پیدا ہو۔ غرضکہ حرکت اوّل کا وہ مسئلہ ہے جو ابھی تک سائنس اور فلسفہ حل نہیں کر سکے ہیں۔ حرکت اولین کا سبب اوّل نہ ثابت ہونے کی وجہ سے ان فلاسفۂ جوہریت کا نظریہ تخلیق

کائنات جو ذرات کے اوپر سے نیچے گر گر آپس میں ملنے کے نظریہ پر منحصر ہے، غلط ثابت ہوتا ہے۔

اس ہی زمانہ میں انکزاغورث (Auaxagoras) اپنا فلسفہ شائع کرنے میں مشغول تھا۔ اُس نے کہا کہ حرکت اوّلین پیدا کرنے والا ایک ذہن کل یا عقل کل تھی۔ دیکھئے اسپر انبیاء کی تعلیم کا اثر اچھی طرح نمایاں ہے۔ عقل کل (حکیم مطلق) نے کہا کن فیکون۔ مادہ مع اپنی حرکت کے پیدا ہو گیا۔ لیکن ڈیمو قراطیس Democritus کہتا ہے کہ یہ غلط ہے عقل کل یا ذہن کل کچھ نہیں ہے۔ بلکہ تمام مدرکات یا مظاہر قدرت اندھی مشینی کے پُرزوں کی طرح چل رہے ہیں۔

کہتا ہے کہ نہ خدا ہے اور نہ مذہب ہے۔ مظاہر قدرت سے انسان کے دل میں ڈر پیدا ہوا اور اُس نے مذہب کا تخیل سامنے کھڑا کر دیا لیکن تعجب ہے کہ وہ خدا کو تو نہیں مانتا کیونکہ وہ دکھائی نہیں دیتا۔ لیکن یہ مانتا ہے کہ تمام فضا انسانی شکل کی مخلوق یعنی جن، پری، دیو، بھوت سے بھری ہوئی ہے۔ وہ انسان سے زیادہ طاقت ور اور قوی ہیکل ہیں۔ اُس کے گمان میں خداؤں کا اعتقاد اس طرح پیدا ہوا کہ ان جنات اور بھوتوں کی شکلوں کا عکس جو فضا کے ایٹم پر پڑا تو وہ انسان کو محسوس ہونے لگے۔ اور اُس نے سمجھا کہ یہ خدا ہیں۔

روح کے متعلق ان فلاسفروں کے خیالات یہ ہیں کہ آگ کے ایٹم گول اور ہموار ہیں۔ روح بھی ایسے ہی ایٹموں سے مرکب ہے۔ روح دراصل ایک زیادہ صاف، خالص اور نفیس آگ ہے۔ جب موت واقع ہوتی ہے تو یہ تمام ایٹم بکھر جاتے ہیں۔ ان کے خیال میں موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے۔ اس نظریہ کے مطابق انسان کی زندگی اور گندگی کے کیڑے کی زندگی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ لیکن اسلام انسان کی زندگی کی بڑی قدر کرتا ہے۔

انکزاغورث

انکزاغورث ایشیائی کوچک کے شہر کلیزومینی (Clazomenae) میں تقریباً ۵۰۰ ق م میں پیدا ہوا تھا۔ صاحب جائداد تھا لیکن علم کے شوق میں شہر بشہر سفر کرتا رہا اور آخر کار ایتھنز میں اپنے فلسفہ کا مدرسہ کھولا۔ انکزاغورث

پہلا شخص ہے جس نے یونان میں فلسفہ جاری کیا۔ اس سے پہلے انھنز میں فلسفہ کا نام نہ تھا۔ انکزا غورث نے اپنے درس کے دوران میں خیال ظاہر کیا کہ سورج ایک آتشی پتھر ہے۔ اور چاند مٹی کا ہے۔ وہاں کے لوگ چاند، سورج اور ستاروں کو خدا جانتے تھے۔ لہٰذا اُنھوں نے انکزا غورث کے خلاف الحاد اور توہین خدایگان کا مقدمہ دائر کیا۔ اس کو سزا بھی ہوگئی۔ لیکن یہ وہاں سے بھاگ گیا۔ غالباً اس کی اس نجات میں اُس کے دوست Pe eles. کا ہاتھ ہو جو اُس زمانہ میں یونان کا بہت بڑا سیاسی رہنما تھا۔

انکزا غورث کے فلسفہ کے بنیادی اصول وہ ہی ہیں جو ایمپیڈوکلیز اور نظام جوہر فرد یعنی Atomists کے تھے۔ یعنی یہ کہ مادہ قدیم ہے اس کو کسی نے پیدا نہیں کیا۔ یہ کبھی معدوم نہیں ہوگا۔ دنیا کی ہر ایک شئے زندہ اور بے جان مختلف ذرات .Atoms کے مختلف طریقوں میں ملنے سے وجود میں آتی ہے۔ دنیا کی کوئی شے معدوم نہ ہوگی اور نہ اس کی کسی شئے کی ابتدا تھی۔ لیکن ان میں ایک فرق تھا۔ حکماء جوہر ہیں .Atomists نے تو کہا تھا کہ مادہ ایک ہی قسم کا تھا۔ ہر ایک شے کے ذرات کے اختلاف قدوقامت و ہیئت کی وجہ سے مادہ کی مختلف انواع اور شکلیں نظر آتی ہیں۔ ایمپیڈوکلیز نے کہا تھا کہ چار عناصر ہیں۔ لیکن انکزا غورث کا خیال تھا کہ مادہ کی ہر ایک نوع ابتداء ہی سے مختلف ہے یعنی ہر نوع بذات خود قدیم ہے۔ مثلاً ہڈی، بال، مٹی، لکڑی، سونا یہ سب اپنے اختلاف کے ساتھ شروع ہی سے ہیں، دوسرا اختلاف ان میں یہ تھا کہ انکزا غورث تو کہتا تھا کہ وہ اپنی آخری حد تک قابل تقسیم ہے۔ وہ دنیا کی ابتداء اس طرح بتاتا ہے کہ شروع میں ہر قسم کے ذرات فضا میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور فضا لامحدود تھی۔ دنیا اس طرح بنی کہ ایک ہی قسم کے ذرات آپس میں ملنے لگے۔ سونے کے ذرات آپس میں ملنے لگے۔ سونے کے ذرات نے مل کر سونا بنایا۔ لکڑی کے ذرات نے مل کر لکڑی بنائی وغیرہ وغیرہ۔ لیکن چونکہ مادہ اپنی آخری حد تک قابل تقسیم ہے۔ اُس کے تقسیم ہونے کی کوئی حد ہی نہیں۔ لہٰذا وہ ذرات آپس میں غیر محدود درجہ تک مل گئے۔ پھر جُدا ہونے کا

عمل شروع ہوا جو اب تک جاری ہے۔ اس کے تکمیل تک پہنچنے میں بہت عرصہ لگے گا۔ ایک ہی قسم کے خالص مادہ میں بھی دوسری قسم کے کچھ نہ کچھ ذرات ملے ہوئے ہیں۔ سونا اس وجہ سے سونا کہلاتا ہے کہ اس میں سونے کے ذرات کی اکثریت ہے۔

انکزاغورث کے سامنے بھی یہ سوال پیدا ہوا کہ پہلے حرکت کا سبب یا موجب کیا تھا۔ اس کے متقدمین نے اس کا صاف تسلی بخش جواب نہیں دیا تھا۔ لیکن جو کچھ بھی سبب حرکت اولین انھوں نے بیان کیا تھا وہ مادی تھا انکزاغورث نے مادی وجہ حرکت کو قابل قبول نہیں سمجھا۔ اس نے کہا کہ وہ سبب یا طاقت جسمانی نہیں ہے۔ بلکہ وہ محض ایک عقل کل یا ذہن کل ہے۔ جس نے یہ حرکت پیدا کی، جس سے دنیا ظہور میں آئی۔ اس نے اس عقل کل INTELLIGENCE کا نام NOUS رکھا۔ اس نے دیکھا کہ دنیا میں ایک نظام ہے۔ ایک ترتیب ہے، خوبصورتی ہے، مقصد ہے اور نتیجہ نکالا کہ یہ سب کائنات اور اس کا نظام اندھی طاقت و حرکت سے پیدا نہیں ہو سکتے۔ ان سب کا ترتیب دینے والا اور انتظام کرنے والا ایک صاحب عقل ذہن ہے، اندھی طاقتیں ایک بے ترتیب، گڈمڈ پریشان اجتماع ذرات پر عمل کر کے یہ حسن و نظام نہیں پیدا کر سکتیں۔ جو نظام و حسن پیدا کر سکتا ہے وہ ذہن و فہم ہی ہو سکتا ہے۔ وہ NOUS ہے اور تمام دنیا پر اس کا قابو ہے۔

یہ نوس NOUS یا عقل کل کیا ہے۔ اس کی کیا صفات ہیں۔ بہت عرصہ تک یہ امر متنازعہ رہا کہ آیا انکزاغورث NOUS کو صاحب جسم سمجھتا ہے یا بغیر جسم کا۔ اب تقریباً اس پر اتفاق ہے کہ انکزاغورث کے نزدیک NOUS بغیر جسم کے ہے۔ یہ وہ ہے جس نے تمام زندہ جاندار جانوروں، آدمیوں، کیڑوں یہاں تک کہ درختوں میں ایک روح پھونکی ہوئی ہے۔ یا ان میں مثل روح کے سمایا ہوا ہے۔ NOUS تو ایک ہی نوع کا ہے۔ لیکن ان چیزوں میں اس کے درجے ہیں۔ آدمیوں میں سب سے بڑا NOUS ہے۔ یہ NOUS بھی ایک قسم کا خیالی مفروضہ ہے۔ چونکہ حسن و ترتیب و نظام عالم کی اس کو کوئی اور

وجہ نہیں معلوم ہو سکی، لہذا اُس نے یہ خیالی تصور پیدا کر لیا۔ اُن حکماء کے نزدیک دنیا کے ظلم اور اُن کی جزا و سزا یا تو قابل توجہ نہ تھے یا اُن کے فلسفہ کے حدود میں نہیں آتے تھے۔ لہذا اُنھوں نے غور ہی نہ کیا کہ دنیا کے بنانے والے کی صفات میں ایک صفت اس ظلم کی جزا و سزا دینی بھی ہوتی چاہیے۔ انگزاغورث کا NOUS بھی اس صفت سے عاری ہے۔

انگزاغورث کے NOUS میں صفت خالقیت بھی نہیں ہے۔ اُس کا صرف یہ کام تھا کہ پہلی حرکت تمام عالم کو دیدی جو پہلے سے موجود تھا، یعنی مادہ کے ذرات جو قدیم تھے ان کو ترتیب دی اور یہ دنیا اس طرح بن گئی۔ یہ NOUS دنیا کا پیدا کرنے والا نہیں ہے۔ اور اُس کے موجودہ نظام میں بھی اُس کو کوئی دخل نہیں ہے۔ انگزاغورس کے نزدیک NOUS بالکل واحد، خالص ہے۔ مادہ کا کوئی جزو اس میں شامل نہیں۔ یہاں یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ اگر دونوں یعنی مادہ اور NOUS قدیم ہیں اور مادہ اس سے پہلے کا نہیں ہے تو شروع ہی میں اِن ذرّات میں یہ بے ترتیبی کیوں ہوئی کہ بعد میں اس کو ترتیب دینے کی ضرورت ہوئی۔

نوس نے یہ حرکت کس طرح دی۔ پہلے خضا میں تمام ذرات ATOMS بے ترتیبی سے پھیلے ہوئے تھے۔ اُس کے درمیان میں NOUS نے ایک چکر پیدا کیا۔ اُس چکر نے حرکت دی۔ مادہ کے ذرّات کی وہ ہی حالت ہوئی جو خاک کے ذرّات کی بگولے میں ہوتی ہے۔ ایک بگولا پیدا ہو گیا۔ ایک ایک قسم کے ذرات آپس میں ملنے لگے۔ سونے کے سونے سے، لکڑی کے لکڑی سے۔ نوس نے تو درمیانی یا مرکزی حرکت دی جس سے وہ بگولا پیدا ہوا۔ باقی سارا کام اس چکر یا بگولے نے کیا۔ پہلے گرم، خشک اور ہلکے ذرات علیحدہ ہوئے۔ اُن سے اوپر کی ہوا بنی، اُس کے بعد سرد، تر، سیاہ اور کثیف ذرّات علیحدہ ہوئے اُن سے نیچے کی ہوا بنی۔ اور اُس چکر کی وجہ سے یہ کثیف ہوا مرکز کی طرف گئی اور اُس سے زمین پیدا ہوئی۔ اس ہی چکر کی وجہ سے بڑے بڑے پتھر زمین میں سے ٹوٹے اور وہ چاند، سورج

اور ستارے بن گئے - اور تیز حرکت کی وجہ سے اُن میں روشنی پیدا ہو گئی - چاند زمین میں سے بنا ہے اور وہ سورج کی روشنی سے عکس لیتا ہے - انگزاغورث پہلا شخص ہے جو چاند کی روشنی کی وجہ بتاتا ہے ۔ اسی طرح اُس نے گرہن کا بھی اصلی سبب صحیح بتایا ہے - اُس کا یہ بھی خیال تھا کہ ہمارے دنیا کے علاوہ اور بھی دنیا ہیں جن کے چاند اور سورج علحدہ ہیں - ان میں انسان آباد ہیں ۔ سورج اتنا بڑا ہے جتنا کہ یونان کا ایک صوبہ PELOPONNESE ہے -

اگرچہ Nous کو بغیر جسم کے تصور کیا گیا ہے، لیکن یہ بھی کہا گیا ہے کہ وہ ایک جگہ میں ہے اور ایک خاص جگہ گھیرتا ہے - گویا مادیت کا کچھ نہ کچھ تخئیل اس Nous میں باقی ہے - افلاطون اور ارسطو نے اس کا تخئیل بالکل مادہ سے علحدہ کیا ہے -

انگزاغورث نے مادہ اور نوس کو اس طرح علحدہ کر کے اور اُن دونوں کو قدامت دے کر بے معنی ثانویت پیدا کر دی - دوسری غلطی اُس کی یہ ہے کہ در اصل آخر کار اُس نے بھی اپنے متقدمین کے مشینی نظام ہی کو اختیار کر لیا - نوس نے ایک درمیانی حرکت دی - اور پھر مشین کے پرزوں کی طرح سب کچھ بننے لگا - نوس کا تو بس صرف یہ ہی ایک فعل تھا -

قرآن شریف میں اس مشینی تخئیل کی تردید اس طرح کی گئی ہے -

"یَمْحُو اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ ج وَ عِنْدَہٗ اُمُّ الْکِتَابِ - الرعد ۱۳: ۳۹

مسلمانوں کے وہ فرقے (اور ان کی اکثریت ہے) جو اس فلسفۂ یونان سے متاثر ہیں اور اُس کو حق سمجھتے ہیں اپنے خدا کو بھی ایسا ہی مجبور محض سمجھتے ہیں اور اپنے اس فاسد خیال و عقیدہ کو مخمل کا جامہ پہنا کر اس طرح بحث کرتے ہیں کہ کیا زمانۂ ابتدا یعنی ازل میں خدا سے کچھ غلطی ہو گئی تھی جو اب اُس کو مٹا کر اور اُس میں تبدیلی کر کے اُس غلطی کی درستی کر رہا ہے وہ یہ نہیں سوچتے کہ جب خداوند تعالےٰ نے انسان کو قول و فعل کی آزادی

عطا فرمائی جس کی وجہ سے سزا و جزا مقرر کی تو اُس صورت میں کئی احکام شروط ہی ہو سکتے تھے کہ اگر انسان ایسا کرے گا تو یہ ہوگا اور ویسا کرے گا تو وہ ہوگا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ ہر انسان کا فعل روز ازل ہی سے خدا کے علم میں تھا اور اُس کے مطابق ام الکتاب میں درج ہوا تو پھر عقیدہ سزا و جزا بے معنی ہو جاتا ہے جو اسلام کا مابہ الامتیاز ہے اور پھر یہ اُس FATALISM پر منتج ہوتا ہے جو حکماء عالم میں بدنام ہے اور لیس للانسان الا ما سعی کا فرمان بے معنی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اُس صورت میں تو سعی بیکار ہو گئی۔ اور انسان کے افعال کو اپنے علم میں محدود کرنے کے یہ معنی ہوئے کہ اب وہ اس کے سوا کچھ کر ہی نہیں سکتا۔

سوفسطائی حکماء یونان (SOPHISTS)

سوفسطائی جماعت حکماء دراصل اُس معنی میں فلاسفر نہ تھے۔ جس معنی میں سقراط، افلاطون اور ارسطو بیان کئے جاتے ہیں۔ اُنھوں نے کوئی اپنا علیحدہ فلسفہ جاری نہیں کیا۔ وہ تو منطقیوں کی ایک پیشہ ور جماعت تھی جس نے اپنے ماحول کا اچھی طرح مطالعہ کر کے اپنے زمانہ کی ضروریات اور ذہنیات کو معلوم کر لیا تھا اور لوگوں کو اس زمانہ کی کشمکش کے لئے تیار کرتے تھے۔ اپنی اس تعلیم کی فیس لے کر اپنا گزارہ کرتے تھے۔ سب سے پہلی یہ ہی جماعت تھی جس نے عقل سکھانے کی اُجرت لی۔ چونکہ وہ لوگوں کو زمانہ کی ضروریات سے آگاہ کرتے تھے اور اُن سے مقابلہ کرنے کا طریقہ سکھاتے تھے۔ لہذا اُنھوں نے ہر طبقہ میں بہت رسوخ حاصل کر لیا تھا۔ دراصل وہ اپنے زمانہ کی آواز تھے۔ اور اس کے نمائندہ تھے۔ گویا وہ ایک آئینہ تھے جس میں اُس زمانہ کا عکس اُترا ہوا تھا۔ لہذا اُن کے حالات کا علم اُس زمانہ کے مطالعہ کے لئے ضروری ہے۔ اور اُن کے بھی حالات کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا جب تک اُن کے زمانہ سے واقفیت تامہ نہ ہو۔ ایک اور بات بھی ہے۔ یونان کے اُس زمانہ میں اور آج کل کے زمانہ میں بہت مشابہت ہے خصوصاً ہندوستان اور پاکستان میں۔ اپنے

زمانہ کے حالات و ضروریات سے مجبور ہو کر جو اصول زندگی سوفسطائیوں نے قائم کئے تھے وہ ہی آج کل کارفرما ہیں اور یہ بھی ظاہر ہے کہ آخری نتیجہ اب بھی وہ ہی ہوگا جو یونان کے اُس زمانہ کا ہوا۔ لہٰذا ہر نقطہ نظر سے سوفسطائیوں کے حالات کا مطالعہ اور ان کی عقلیات کا موازنہ ہمارے لئے بہت ضروری ہے۔

سوفسطائیوں کا زمانہ۔ سوفسطائیوں کا زمانہ پانچویں صدی قبل مسیح کا زمانہ تھا۔ اُن میں کئی مشہور آدمی ہوئے ہیں جن میں سے ان تین کی شہرت بہت زیادہ ہے۔

(۱) **پروطاغورث** Protagoras سنہ ۴۸۰ تا ۴۱۱ ق م

(۲) **غورجیاث** Gorgias. سنہ ۴۸۵ تا ۳۸۰ ق م

(۳) **ہپپیاس** Hippias. اس کی تاریخ پیدائش و موت نہیں معلوم لیکن ان ہی متذکرہ بالا اشخاص کا ہمعصر تھا۔

یونان میں یہ وہ زمانہ تھا جب طویل کشمکش کے بعد امرائیت مغلوب ہو گئی اور جمہوریت کا دور شروع ہوا۔ ہر جگہ اور ہر ادارہ میں جمہوریت نمایاں تھی اور پرانے آثار امرائیت کے مٹائے جا رہے تھے۔ اتھنز میں جمہوریت کا نمائندہ Pericles برسر حکومت آ گیا تھا۔ یہ انکزاغورث حکیم کا بہت بڑا دوست تھا۔ اور اُس کی تعلیم کے زیر اثر اُس نے امرائیت کے ساتھ پرانے مذہب کی حکومت کو بھی ختم کر دیا تھا۔ وہ مذہب تو تھا ہی اس قابل کہ نیست و نابود کر دیا جائے۔ بلکہ اگر جاری ہی نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ انسان کا ہر ایک فعل خواہ کیسا ہی مذموم اور مجہول ہو اُس مذہب کے خداؤں کے طرز عمل کے مقابلہ میں مستحسن نظر آتا تھا۔ یونان کے خدا بھی تو انسانی غنڈوں کے نمونے تھے۔ لیکن بُری سے بُری چیز کا کچھ فائدہ ضرور ہوتا ہے۔ اُس مذہب کا یہ فائدہ تھا کہ انسان کے ذہن اور عمل پر کسی کا ڈر تو تھا۔ اُس مذہب کے خدا کیسے ہی لغو اور فضول تھے بہرصورت اُن کا ڈر تو تھا۔ اُس مذہب کو تو معدوم کر دیا گیا لیکن اُس کی جگہ کوئی

اور شے قائم نہ ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یونانی شتر بے مہار ہو گئے۔ کسی کا ڈر نہ رہا حکومت تو تھی۔ لیکن جمہوریت کی وجہ سے لوگوں کو حکومت کا ڈر نہ تھا۔ بلکہ حکومت کو لوگوں کا ڈر تھا۔ ہر شخص خودسر اور خود رائی ہو گیا۔ اپنے سے زیادہ کسی کو کوئی نہیں سمجھتا تھا۔ آجکل کی طرح نہایت بری قسم کا **Individualism** پھیل گیا کسی تعلیم یافتہ شخص کو الہامی پشینگوئی، شگونِ نیک و بد اور معجزوں پر یقین نہیں رہا حکیمانہ عقل کے مطابق یہ سب امور بے معنی تھے۔ لیکن عوام الناس پر جو ان کا اثر تھا اور اُن کے افعال پر جو حدود تھیں اُن کا نتیجہ تو اچھا تھا۔ اب نکتہ چینی، تخریبی تخئیل اور ہر ایک نظریۂ سابقہ سے بدگمانی عام ہو گئی ہر ایک جگہ تخریب پھیل گئی تعمیر کہیں نہ ہوئی۔ اگر یہ فقرہ صحیح اُردو ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ذہنی اوباشی اور آوارہ گردی عام ہو گئی جس نے عملی اوباشی اور آوارہ گردی کو رائج کر دیا۔ جن باتوں کو اُن کے آباؤ اجداد نے عزت و توقیر کی نگاہ سے دیکھا تھا ان کو یہ لوگ توہین و تحقیر کی نظر سے دیکھنے لگے۔ رواج، اخلاق اور قانون کی بندشوں کو ان لوگوں نے سمجھا کہ انسان کی آزادی عمل پر یہ ناجائز حدود ہیں۔ اور انسان کو آزادیٔ عمل کا کامل حق حاصل ہے۔ اندریں صورت حرص و آز، لالچ، خود غرضی، خودسری اور ضدیت کا نام آزادی رکھا گیا۔ اور وہ علانیہ اور عام طور سے رائج ہو گئے۔ سوفسطائیوں کی تعلیم جس کا ذکر آگے آتا ہے اس ہی حالت کا آئینہ تھی اور بالکل اُس کے مطابق تھی۔ یونان کی اس حالت کو پڑھنے والا سمجھے گا کہ وہ ہندوستان کے حالات پڑھ رہا ہے۔ یہ تو اُس وقت کی حالت ہے کہ جب یونان میں جمہوریت کامل تھی۔ اور اب تو ایک چون چون کے مُربّہ کی ڈبیا کا نام جمہوریت رکھ لیا ہے اور ناریل والے بندر کی طرح سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔ کہ جو کچھ ہے یہ ہے۔ لوگوں کو بیوقوف بنا کر اپنا کام بنانے والے لوگ بنا ہی رہے ہیں یونان کے یہ حالات اُس کی جمہوری حکومت کے پیدا کردہ تھے۔ اس جمہوری حکومت کے نظام میں حکومت کی جماعت لوگوں سے خائف رہتی تھی اور نہ اُس کا مقصدِ اوّلین عمدہ اور منصفانہ حکومت کرنا نہ ہوتا تھا بلکہ بارسوخ آدمیوں کے خوش کرنے کو اپنی حکومت اور اپنے اثر کا مقصد سمجھتے تھے۔ اس جمہوری طرزِ حکومت کا یہ نتیجہ ہوا کہ تمام لوگوں میں طمع، لالچ، عہدوں کی خواہش، ناجائز طریقوں سے روپیہ حاصل کرنے کی کوشش، خود غرضی، خودسری، حرص، تملق اور خوشامد کے جذبات پھیل گئے اور ایک ابتری پیدا ہو گئی۔

یہ تھے وہ حالات جن کے زیر نظر سوفسطائیوں نے اپنا طرز عمل، طرز تعلیم اور مجموعہ عقلیات مقرر کیا تھا۔

روپیہ کی قدر و قیمت کو اپنی عزّت و آبرو سے زیادہ سمجھنا اُن کی زندگی کا پہلا اصول تھا۔ اُس زمانہ میں حق و صداقت کی قدر و قیمت نہیں تھی اور نہ اُس کی پرواہ کی جاتی تھی۔ دنیاوی وجاہت اور غلبہ ان لوگوں کا مطمع نظر تھا۔ لہذا سوفسطائی بھی حق و صداقت کے لئے بحث نہیں کرتے تھے۔ بلکہ حق کو ناحق اور ناحق کو حق ثابت کرنا اون کا کام ہوتا تھا، اور وہ فخر کرتے تھے کہ ہم کالے کو سفید اور سفید کو کالا ثابت کر سکتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُس ہی زمانہ کی یادگار ہے کہ آج کل وکلاء میں اس صفت کو علانیہ ممدوح سمجھا جاتا ہے۔

سوفسطائیوں کا سب سے بڑا کام لوگوں کو سیاسی زندگی کے لئے تیار کرنا تھا۔ اور اُس کے لئے ضرورت تھی کہ آدمی خوب بول سکے، جواب فوراً دے سکے حق و ناحق کی پرواہ نہ کرے۔ اپنے مخالف کو الفاظ کے ہیر پھیر سے، گفتگو میں اُلجھن پیدا کر کے، اُس کو الفاظ کے جال میں پھانس کر غرض کسی طرح مغلوب کر دے وہ ہی کامیاب سیاست دان مدبر و منتظم سمجھا جاتا تھا اور اُس کو ہی آگے بڑھنے کے زیادہ مواقع ملتے تھے۔ لہذا یہ صفات اس جماعت نے بدرجہ اتم حاصل کر لی تھیں اور لوگوں کو اس ہنر میں تعلیم دیتے تھے۔ اگر اُس زمانہ کے مدبروں کی تقاریر کا نمونہ اور حق سے روگردانی کا ہنر اس زمانہ میں کوئی دیکھنا چاہے تو کسی ملک کے پارلیمنٹ کے اجلاس کے دوران میں جا کر دیکھ لے اور اگر عقلِ انسانی کی حماقت کا آخری درجہ معائنہ کرنا ہے تو ان ہی مدبروں کو یہ کہتا ہوا سُن لے کہ ہم دنیا کے مہذب ترین زمانہ کی ترقی یافتہ قوم کے افراد ہیں۔

سب سے پہلا سوفسطائی پروطاغورث Protagoras تھا جو تقریباً ۴۸۰ قبل مسیح قام میں پیدا ہوا اور ۴۱۰ قبل مسیح قام میں دریا میں ڈوب کر مر گیا۔ اس کا مشہور فقرہ یہ ہے:۔ Man is the measure of all things یعنی انسان ہی تمام اشیاء کی حقائق کا معیار ہے۔ سوفسطائیوں نے اپنے طرز عمل اور اپنے عقائد و اصول کو اس ہی کلیہ پر مبنی کیا تھا۔ اور امر واقعہ یہ ہے کہ یہ کلیہ ہی تمام برائیوں کی جڑ ہے یہ کہتے تھے کہ حق و صداقت کچھ نہیں۔ ان کا معیار کچھ نہیں۔ جس کو میں حق و صداقت سمجھتا ہوں وہ ہی

حق وصداقت ہے۔

بعد کے آنے والے سوفسطائیوں نے پروطاغورث کے اس کلیہ کو سیاسیات اور اخلاقیات پر حاوی کر کے عجیب نتیجے نکالے۔ وہ کہتے ہیں کہ چونکہ کوئی حقیقت اپنی ذات سے حقیقت نہیں ہے اور جو بات یا شے کسی فرد کو حق اور صداقت معلوم ہو اُس کے لئے وہ ہی حق اور صداقت ہے۔ لہٰذا اخلاقیات کا بھی کوئی معیار اور عالمگیر ضابطہ نہیں ہے۔ جو فعل، خصلت، عادت یا صفت کسی شخص کو اچھی معلوم ہو وہ ہی اس کے لئے اچھی ہے اور اُسکو اُسپر عمل کرنا چاہیئے۔ گویا اخلاقیات کو اُنھوں نے ہر ایک شخص کے جذبات کے تابع کر دیا۔ جو میں حق سمجھتا ہوں وہ میرے لئے حق ہے۔ جو تم حق سمجھتے ہو وہ تمھارے لئے حق ہے۔ اگرچہ دونوں آپس میں متضاد ہوں گویا حق کا کوئی اٹل معیار نہیں ہے۔ اور حق متضاد بھی ہو سکتا ہے۔

اسی طرح سیاسیات میں اُنھوں نے عجیب اصول قائم کئے۔ وہ کہتے ہیں کہ اچھا اور بُرا قانون کوئی شے نہیں۔ عدل و انصاف کچھ نہیں۔ عدل وہ ہی ہے جو طاقتور کی طاقت کر سکے یا اکثریت کی رائے ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ قانون دراصل کمزور آدمیوں کی ایجاد ہے جنھوں نے اس طرح چالاکی سے طاقتور آدمیوں کو اپنے قابو میں کر کے اُنھیں ان کے حق سے محروم کرنا چاہا اور جو ثمرات ان کو اُن کی طاقت کی وجہ سے مل سکتے تھے۔ ان سے ان کو محروم کر دیا۔ طاقت ہی کا قانون ہے جو قدرت میں رائج ہے لہٰذا اگر کوئی طاقتور آدمی قانون کی خلاف ورزی کامیابی کے ساتھ کرتا ہے تو یہ اُس کے لئے جائز ہے۔ اسی طرح اُنھوں نے کہا کہ خدا کا تخیل کسی چالاک مدبر کی ایجاد ہے جس کے ذریعہ سے اُس نے عوام الناس کو اپنے قابو میں کرنا چاہا۔ لیکن اس کا کیا جواب ہے کہ ہر ملک میں ہر طبقہ میں ہر زمانہ میں خدا کا تخیل پایا جاتا ہے تو کیا سب جگہ یہ اُسی ایک چالاک مدبر کی ایجاد ہے۔

بنی نوع انسان کی تاریخ میں ایسے بہت سے زمانے آئے ہیں اس کو زمانہ حال کی زبان میں روشنی کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ ایسے تخریب کے زمانہ عام طور سے زمانۂ تعمیر کے بعد ہی آتے ہیں۔ جب تعمیری عنصر اپنا عمل کر چکتا ہے تو پھر اُس کے بعد یہ "روشنی" کا زمانہ آتا ہے۔ دراصل یہ اُس تعمیر کے خلاف بغاوت ہوتی ہے۔

تعمیری زمانے کے نئے خیالات جب انسانوں کے دماغ سے پرانے تخئیلات اور توہمات کو دور کرتے ہیں تو پھر وہ عوام الناس میں ایک تخریبی تحریک کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ عوام الناس میں انکار، شبہ، اور بداعتقادی کے عناصر پیدا ہو جاتے ہیں، اور پھر ہر ایک فرد انسان ہی کو حق سمجھ لیا جاتا ہے اور جو اُس کا اپنا قیاس ہوتا ہے وہ حق شمار کیا جاتا ہے۔ ایسا ہی ایک "روشنی" کا زمانہ جناب رسول خدا کے بعد عرب میں آیا جس سے فائدہ اٹھا کر خلافتِ اولی کی تشکیل ہوئی۔ اور پہلے تعمیری زمانہ کے خیالات و اصول کو تخریبی صورت میں بدل دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب جو اخلاقیات، سیاسیات اور الٰہیات کا مجموعہ مرتب ہوا وہ پہلے تعمیری زمانہ کے اخلاقیات، سیاسیات اور الٰہیات سے بالکل مختلف بلکہ بعض صورتوں میں متضاد تھا۔

ایسا ہی "روشنی" کا زمانہ ہمارا موجودہ عصر ہے۔ ایک انگریز مفکر سوفسطائیوں کے فلسفہ اور اُن کے زمانہ کی حالات لکھنے کے بعد کہتا ہے:۔

(یہ انگریزی عبارت کا ترجمہ ہے (۴۱) اصل کے لئے دیکھو ضمیمہ A

ترجمہ:۔ انگلستان اور فرانس میں شروع اٹھارھویں صدی عیسوی کا زمانہ ایسی ہی روشنی کا زمانہ تھا۔ اور وہ زمانہ بھی جس میں سے ہم اب گزر رہے ہیں ایسی روشنی کا زمانہ ہے۔ پرانے راسخ شدہ عقائد و آراء کو شک و شبہات کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور ہر طرف تخریب ہے۔ تمام پرانے قائم شدہ آئین و رواج اور اداروں مثلاً نکاح، خاندان، حکومت اور مقرر شدہ قوانین پر تخریبی نکتہ چینی کی جاتی ہے۔ یہ موجودہ تخریبی زمانہ انیسوی صدی کے زمانہ کے بعد آیا ہے جو تعمیری غور و فکر اور سائنس کے نشوونما اور عروج کا نہایت اہم اور جلیل القدر زمانہ تھا۔ موجودہ زمانہ نے Protagoras کے فلسفہ کے نمونہ پر اپنا ایک علیحدہ فلسفہ قائم کیا ہے جس کو یہ لوگ PRAGMATISM کہتے ہیں۔ یعنی حق وہ ہے جس پر عمل کر کے انسان کے اغراض و مقاصد کو فائدہ پہنچے۔ اگر PRAGMATISM انفرادی خودی کو معیارِ حق نہیں سمجھتا تو کم سے کم وہ انسانی خودی کو تو معیارِ حق قرار دیتا ہے (جناب اقبال اس خودی کے بہترین

(40) Will Durant: The Life of Greece Chap. vi. P. 147

(41) A Critical History of Greek Philosophy by W. T. Stace, P. 121

اُستاد ہیں) لہٰذا اس زمانہ میں حق کو ایک حقیقت بذاتِ خود نہیں سمجھا جاتا ہے جس کی پیروی تمام بنی نوع انسان کو کرنی چاہیئے۔ بلکہ برعکس اس کے حق کو بنی نوع انسان کی خواہشات و مقاصد کے مطابق ہونا چاہیئے۔ اب تو وہ ہی اعتقاد حق سمجھا جاتا ہے، جس سے دنیاوی نفع ہو اور جو زیرِ عمل آن کر اس منفعت کو پورا کرے۔ لیکن چونکہ جو اعتقاد ایک زمانہ یا ایک ملک میں مفید ہوتا ہے وہ دوسرے زمانہ یا دوسرے ملک میں مفید نہیں ہو سکتا۔ جو اعتقاد آج مفید ہے وہ کل مفید نہ ہوگا، لہٰذا نتیجہ نکلا کہ حق بذاتِ خود انسانی مفاد سے علیحدہ نہیں۔ پروطاغورث نے تو حق کو انسانی جذبات پر منحصر رکھا۔ لیکن آج کل وہ انسان کے ارادہ یا مرضی پر منحصر رکھا جاتا ہے۔ ان دونوں نظریوں کے مطابق انسان کے اندر کی مستقل و دائمی شے یعنی عقل صحیح پر حق و اخلاقیات کی بنیاد نہیں رکھی گئی۔ بلکہ اُن کی بنیاد انسان کے خاص انفرادی عنصر پر رکھی گئی۔ (ترجمہ ختم)

اس مصنف کی تحریر نہایت عاقلانہ مطابق صحیح منطق کے ہے۔ لہٰذا ہم چند مزید اقتباسات اس کی کتاب سے پیش کرتے ہیں۔ آگے چل کر یہ فلاسفر لکھتا ہے۔ یہ اُس کی انگریزی تحریر کا اُردو ترجمہ ہے (اصل کے لئے دیکھو ضمیمہ B)

ترجمہ:۔ سوفسطائیوں کے اچھے اور بُرے اصولوں کی نہایت عمدہ مثالیں زمانۂ حال کا مذہب پروٹسٹنٹ اور زمانۂ حال کی جمہوریت ہیں۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ مذہب پروٹسٹنٹ انسان کے اُس حق پر مبنی ہے جو اُس کو اپنی قوتِ فیصلہ استعمال کرنے کا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ انسان کا ذاتی حق ہے کہ وہ اپنی قوتِ فیصلہ استعمال کرے۔ اگر اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ ہر ایک شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ امورِ مذہبی میں اپنے وہم و قیاس کو قانون سمجھنے کا حق رکھتا ہے تو پھر یہ تو نہایت خراب قسم کا پروٹسٹنٹ مذہب ہے۔ اب جمہوریت کو لو دراصل یہ سیاسی پروٹسٹینزم ہے جمہوریت کے تمام تخیلات اور اصول پروٹسٹنٹ ریفارمیشن کے براہِ راست نتائج ہیں۔ اور اُس ہی سے ماخوذ ہیں۔ جمہوریت کا اصول ہے کہ کوئی صاحبِ عقل و فہم شخص اس بات پر نہیں مجبور کیا جا سکتا کہ وہ اُس قانون کی اطاعت کرے جس میں اُس کے عقل و فہم کی رضامندی نہیں ہے۔ لیکن جس قانون کو وہ ماننے کے لئے تیار ہے وہ بھی تو اُس عقل انسانی

کے مطابق ہو جو بنی نوعِ انسان میں ودیعتِ دوام ہے ۔۔۔۔ ۔ اگر ہر ایک شخص کی من مانی ضد اور اُس کے وہم و خواہشات، پسندیدگی کو قانون کا درجہ دیدیا گیا تو پھر جمہوریت فتنہ و فساد اور خطرناک انقلاب میں تبدیل ہوجاتی ہے۔

یہ سمجھ لینا کہ سوفسطائیوں کے اصول و عقائد اب محض مردہ پورانے فرسودہ خیالات اور سابقہ تمدن کی نشانیاں ہیں جو محض مورخین کے لئے دلچسپ ہوسکتے ہیں ہمارے کسی مطلب کے نہیں تو یہ غلطی ہے۔ برخلاف اس کے زمانۂ حال کے تخیلات و عقائد جو رائج ہیں وہ سب قطعاً سوفسطائیوں کے خیالات اور میلانات سے بھرے پڑے ہیں۔ آجکل اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ انسان کو اپنی مضبوط رائے اور عقائد رکھنے چاہئیں بعض لوگ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ اس سے کچھ غرض نہیں کہ اس کے عقائد کیا ہیں۔ لیکن جو عقائد وہ رکھے ان پر مضبوطی اور سختی کے ساتھ جما رہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ جو شخص مضبوط عقائد رکھتا ہے وہ زیادہ دلچسپ ہے بہ نسبت اُس شخص کے جو کوئی رائے ہی نہیں رکھتا ۔۔۔۔۔ لیکن محض عقاید رکھنے پر زور دینا غلط ہے۔ آخر کار، آخری معیار قدر یہ ہونی چاہئے کہ جو عقائد ایک آدمی رکھتا ہے وہ صحیح ہیں یا غلط ہیں۔ حق کا ایک اپنا مستقل معیار ہونا چاہئے۔ اس امر کو بھول جانا اور صرف مضبوط رایوں کا راگ گانا گویا کہ ان کی مضبوطی ہی ایک خوبی ہے سوفسطائیوں کی غلطی میں پڑجانا ہے۔

ایک اور عام مقولہ یہ ہے کہ ہر ایک شخص کو اپنی رائے رکھنے کا حق ہے۔ یہاں تک تو صحیح ہے کہ ہر ایک شخص کو اپنی عقل استعمال کرنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن بسا اوقات اس کے غلط معنی لئے جاتے ہیں۔ اگر ایک شخص صریحاً خلاف عقل رائے یا اعتقاد رکھتا ہے اور بحث کا کوئی پہلو اُس کے لئے نہیں رہتا اور جو نظریہ وہ اختیار کرتا ہے اُس پر وہ قائم نہیں رہ سکتا اور اس سے اس کو ہٹنا پڑتا ہے اور اب اُس کے پاس کوئی ہتھیار نہیں رہتا اور وہ مجبور ہوجاتا ہے کہ اپنی غلطی کو تسلیم کرے تو ایسا شخص اس متذکرۂ بالا مقولہ کی آڑ لینے لگتا ہے کہ بہر صورت تم جس طرح جی چاہے بحث کرو مجھے تو اپنی رائے رکھنے کا حق اور اختیار ہے۔ لیکن ہم اُس کے اِس دعوی کو کبھی نہیں مان سکتے۔ کسی شخص کو غلط رائے رکھنے کا اختیار

نہیں ہے۔ غلط رایوں کا کوئی حق نہیں ہو سکتا۔ تمہیں کوئی رائے رکھنے کا حق نہیں ہے جب تک کہ وہ معقول یعنی عقل انسانی کے مطابق نہ ہو تم یہ حق صرف اپنے توہمات اور نامعقول خواہشات کے لئے نہیں طلب کر سکتے ہو۔ ایسا کرنا گویا سوفسطائیوں کی غلطی میں پڑنا ہے۔ (دیکھو (۴۲))

یہ اقتباسات بڑے غور و فکر کے مستحق ہیں کیونکہ جو کچھ ان میں کہا گیا ہے وہ دنیا کی تاریخ کے مطالعہ اور بنی نوع انسان کی فطرتِ دائمی پر مبنی ہے۔ ہر ایک ترقی و عروج کے زمانہ کے بعد ایک جھوٹا روشنی کا زمانہ بھی آتا ہے۔ انبیا و مرسلین کے بعد جھوٹے نبیوں کا آنا اور اصلی ہنی بال، قیصر اور نپولین کے بعد نقالی ہنی بال، قیصر و نپولین کا آنا ضروری ہے۔ سوفسطائیوں کا سا زمانہ اکثر دنیا میں آتا رہا ہے اور آتا رہے گا۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ جناب رسولخدا کے زمانہ کے بعد جو زمانہ آیا وہ بھی ایسی جھوٹی روشنی کا زمانہ تھا۔ پچھلے زمانہ کی نکتہ چینی اور محض اپنے قیاس و توہمات پر انحصار و اعتماد کامل۔ ایسے زمانہ کی یہ دو خصوصیات ہیں۔

سوفسطائیوں کے فلسفہ سے متاثر ہو کر اور اس کے نمونہ کو دیکھ کر زمانۂ حال نے مذہب و سیاست میں اپنی آسانی کے لئے چند غلط اصول بنا لئے ہیں جن کا ذکر ان اقتباسات میں کیا گیا ہے اور ان پر نہایت عمدہ تنقید کی گئی ہے۔

ان ہی اصول سے ایک اور گمراہ کن کلیہ بھی نکالا گیا ہے کہ جو کچھ ہے ہماری خودی ہے۔ سر محمد اقبال کے اس فلسفۂ خودی پر ہم نے مقدمہ کتاب ہذا میں بحث کی ہے۔

سقراط: پیدائش سنہ ۴۷۰ق م یا ۴۶۸ق م۔ خودکشی بحکم سلطنت ۳۹۹ق م خاندانی پیشہ بت سازی تھا اور کچھ دن سقراط نے بھی بت سازی میں گزارے اس کا وہ زمانہ تھا کہ جب ایران میں سلطنت ہخامنش اپنے پورے عروج پر تھی۔ کوروش اعظم Cyrus the Great کا زمانہ ۵۵۸ق م سے ۵۲۹ق م تک تھا۔

(42) Ibid. P. 370.

اس کا ذکر تعریف کے ساتھ بائیبل کے عہد عتیق میں بھی ہے جہاں اُس کو خدا کا خاص آدمی کہا گیا ہے۔ اُس کے بعد اُس کا لڑکا کمبوجیا تخت نشین ہوا جس نے ۵۲۱ء ق م میں خودکشی کر لی۔ اُس کے بادی گارڈ کا افسر دارائے اعظم اوّل تخت نشین ہوا جس نے ۴۸۵ء ق م تک سلطنت کی۔ اس وقت ایران کی سلطنت اپنے عروج پر تھی۔ اور اس کی یونان سے جنگ رہتی تھی۔ ان کا مذہب زرتشتی تھا، ہندوستان میں بدھ مذہب اور جین مت کا زور تھا۔ شام و مصر و عرب اور اُس خطۂ زمین میں جس کو اب عراق کہتے ہیں عرصہ سے حضرت ابراہیم اور دیگر انبیاء سابقہ کی تعلیم عام تھی۔ یونان کے ان تین بڑے حکماء، سقراط، افلاطون اور ارسطو کا زمانہ ۴۷۰ء ق م سے ۳۲۲ء ق م تک تھا۔ تجارت اور جنگہائے دوامی کی وجہ سے یونان، ایران، ہندوستان شام و مصر میں ارتباط اور تبادلۂ خیالات عام تھا۔ اندریں صورت یہ قیاس یقین کی صورت اختیار کر لیتا ہے کہ دنیائے ماضیہ کے مذاہب اور نظریات فلسفہ پر حضرت ابراہیم اور انبیائے بنی اسرائیل کے خیالات کا اثر بہت پڑا ہے۔ مورخین اور محققین کی ایک جماعت جس کا نہایت نامور نمائندہ زمانۂ قدیم کا مذہبی مورخ Philo ہے اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ یونانی فلسفہ کی خوبیاں انبیائے بنی اسرائیل کی تعلیم کی مرہون منت ہیں۔ یقیناً افلاطون اور ارسطو حضرت موسیٰ کی تعلیم کے پیرو تھے اور انھوں نے اپنے فلسفہ کی خوبیاں بائیبل کے عہد عتیق کے مطالعہ سے حاصل کی ہیں (۴۳)

سقراط سوفسطائیوں کے آخری زمانہ میں ہوا ہے۔ اُن کی نظریات اور ان کے فلسفہ کا اثر سقراط پر بہت زیادہ تھا۔ اُس نے انسان کے عقل و ذہن پر اتنا زور دیا کہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ بھی سوفسطائیوں کے عقیدہ Man is the measure of all things کا قائل تھا۔ بعض مورخین اتنا زیادہ کرتے ہیں کہ انسان سے مراد اُس بنی نوع انسان کے مستقل اور دائمی عقل و ذہن سے لی تھی جسمیں کبھی تغیر نہیں ہوتا نہ کہ افراد کے عقل اور ذہن سے جو ہر وقت تغیر پذیر ہوتا ہے۔ اور جس کا کوئی

(43) Ibid P. 370 (۴۳)

معیار نہیں ہوتا۔ لیکن یہ امر واقعہ ہونے کے بجائے خوش عقیدگی زیادہ ہے اُس کے ہمعصر اُس کو سوفسطائی کہتے تھے۔ (۴۴)

عقل انسانی کو اس کے آخری درجہ کمال پر پہنچانا سقراط کے فلسفہ کا مقصد اور منتہائی نظر تھا۔ اُس کا روز کا معمول تھا کہ بازار میں جاکر لوگوں کے ساتھ بحث کرتا تھا۔ دوران گفتگو میں اُن سے سوال کرتا تھا لیکن یہ سوال ایسے ہوتے تھے جن سے اُن کی نظریات کی نکتہ چینی ہوتی تھی۔ اور پھر آخر کار اپنے اُس نظریہ پر ختم کر دیتا تھا جو وہ ثابت کرنا چاہتا تھا۔ سقراط کا یقین تھا کہ ایک غیبی آواز اُس کے روزانہ افعال کی رہنمائی کرتی رہتی ہے پہلے ہی سے اُس کے مجوزہ کام کے نیک و بد نتائج سے آگاہ کر دیتی ہے۔

سقراط سے پہلے کے حکماء دنیا کی ابتدا اور حقیقت اول کی ماہیت پر بحث کرتے تھے۔ سقراط نے اس طرف کبھی غور نہیں کیا۔ اُس نے خیال کیا کہ یہ امور کبھی معلوم نہیں ہو سکتے، بلکہ انسان کی زندگی اور موت اور اُس کے مقصد حیات کو اپنے فلسفہ کا خاص موضوع بنایا ہے۔ علم پر زور بہت دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ نیکی و بدی کچھ نہیں۔ نیکی علم ہے اور بدی جہالت ہے۔ سوفسطائیوں نے علم کی بنا محسوسات یعنی **Perceptions** پر رکھی ہے۔ سقراط نے علم کی بنا عقل **Reason** یا **Concepts** پر رکھی ہے لیکن اس فلسفہ کے رو سے نیکی کی تعریف بے معنی ہو جاتی ہے اُس کے قول کے مطابق نیکی کیا ہے۔ علم ہے کس شے کا؟ نیکی کا۔ تو گویا نیکی کی تعریف یہ ہوئی کہ نیکی علم ہے نیکی کا۔ سقراط کے اس فلسفہ پر ارسطو نے بہت اچھی تنقید کی ہے۔ وہ کہتا ہے۔ کہ سقراط یہ بھول گیا کہ انسان کے افعال صرف عقل ہی پر مبنی نہیں ہوتے۔ لیکن دراصل انسانوں کی اکثریت کے افعال کے محرک ان کے جذبات ہوتے ہیں سقراط کہتا ہے کہ نیکی اس وجہ سے نیکی نہیں ہے کہ خداؤں نے کوئی معیار مقرر کر کے اُسے نیکی تصور کیا ہے۔ بلکہ اُس کے خدا نیکی کو نیکی اس وجہ سے

(۴۴)

(44) 1. The Life of Greece by Will Durant. P. 373

2 History of Philosophy by Alfred Weber, PP. 45, 46

سمجھتے ہیں کہ وہ دراصل نیکی ہے۔ یہ تخیئل مذہبی نہیں ہے بلکہ منفعت پر مبنی ہے۔ Utilitarian امر واقعہ یہ ہے کہ اُس کا نیکی کا تصور بھی اُس زمانہ کے معیار کے مطابق تھا اُس زمانہ میں یونان میں Homo-Sexuality (مردوں کا آپس میں مجامعت کرنا) زیادہ رائج تھا۔ اور سقراط بھی لڑکوں اور رنڈیوں کے عشق میں آلودہ رہتا تھا۔ چنانچہ ایک خوبصورت نوجوان سے اُس کا عشق اس ہی قسم کا تھا۔ Concepts وہ لوگوں کو سکھاتا تھا کہ لڑکوں اور رنڈیوں کا رجحان کس طرح اپنی طرف کیا جا سکتا ہے اور کس طرح عشق میں اُن سے کامیابی ہو سکتی ہے (۴۴ء) یہ تھی اُس کی نیکی جس کا شہرہ اتنا بڑھا ہوا ہے۔ اُس کا عقیدہ تھا کہ سب سے بڑی نیکی خوشی وراحت ہے۔ اور اس کے حاصل کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ علم ہے (۴۵)

سقراط واقعی بہت بڑا فلاسفر تھا لیکن اپنے بعض متقدمین سے کم تھا۔ مگر اس کی شہرت کو اُس کی موت نے زیادہ کر دیا۔ (۴۶)

سقراط جمہوریت کے بہت خلاف تھا۔ وہ کہتا تھا کہ جمہوری حکومت جاہلوں کی جماعت ہے جس کو جاہل منتخب کرتے ہیں۔ یہ لوگ نہ رعایا کی مدد کریں اور نہ اُن کی رہنمائی کریں۔ اور نہ ہی اُن میں رہنمائی اور مدد کی اہلیت ہوتی ہے۔ یہ ایک ذلیل توہم ہے کہ کثرت وتعداد سے عقل پیدا ہو جاتی ہے۔ بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ایک انبوہ میں لوگ نہایت ظالم اور احمق ہوتے ہیں علیحدہ علیحدہ تو کچھ سوچ سمجھ بھی لیں۔ لیکن انبوہ تو محض احمقوں کا گروہ ہوتا ہے۔ کیا یہ شرمناک بات نہیں ہے کہ ملک پر وہ لوگ حکومت کریں جنھیں محض زبان چلانی آتی ہے۔ اور جو کانسی کے برتن کی طرح ہیں کہ جب اُس پر چوٹ پڑتی ہے تو وہ بولے جاتا ہے اور بولتا رہتا ہے جب تک اُس پہ ہاتھ رکھ کر اُسے بند نہ کریں۔ قوم اور ملک اُسی وقت طاقتور ہو سکتے ہیں کہ جب سب سے زیادہ علم اور عقل والے لوگ حکومت کریں۔ اور جمہوریت میں یہ

(44a) The Life of Greece by Will Durant, PP. 364, 366.

(45) Ibid. P. 372

(46) 1. History of Philosophy by A. Weber, P. 49

2. Life of Greece P. 364

ناممکن ہے۔ اپنی روزانہ کی بحث میں بھی بارسوخ لوگوں کے عیوب ظاہر کیا کرتا تھا۔ اس ہی زمانہ میں جمہوری حکومت کے خلاف امراء نے ایک انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کی اہل حکومت سمجھے کہ اس میں سقراط کا ہاتھ ہے کئی بارسوخ آدمی مثلاً Anytus Aristophanes اور Meletus اُس کے خلاف ہو گئے اور انھوں نے مصمم ارادہ کرلیا کہ اُسکی جان لی جائے۔ سقراط کی عمر کا سترواں سال تھا کہ اُس پر تین الزامات لگا کر مقدمہ چلایا گیا۔ (۱) سقراط۔ ملک کے خداؤں کی توہین کرتا ہے (۲) اُس نے اپنے علٰحدہ خدا قائم کرلئے ہیں۔ (۳) ملک کے نوجوانوں کو اپنے بزرگوں سے منحرف کر دیا ہے اور ان کے اخلاق خراب کر دئے ہیں۔ دراصل یہ بہانہ ہی تھا۔ مقدمہ قائم ہوا۔ وہ ہی لوگ جج تھے جو سقراط کے دشمن تھے۔ سنہ ۳۹۹ ق م میں ان جاہلوں کے ایک زہر کے پیالہ نے ایتھنز کے بہترین آدمی کا چراغ حیات ہمیشہ کے لئے گل کر کے جمہوریت کے عیوب کو اچھی طرح نمایاں کر دیا۔ تاریخ عالم کے ہر زمانہ میں یہ کلیہ ثابت ہوتا رہا ہے کہ جاہلوں کو عقل سکھانا اپنے تئیں خطرے میں ڈالنا ہے۔ یہ کلیہ انبیاء، آئمہ اور حکماء سب کے لئے ہے۔

ان الزامات میں سے ایک الزام سقراط کے مذہب سے متعلق ہے۔ لہذا یہ سوال بھی دلچسپ ہے کہ سقراط کا مذہب کیا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ موحد تھا۔ اگر موحد کے وہ ہی معنی لئے جائیں جو آج کل ہیں تو یہ خیال قطعاً غلط ہے۔

اگرچہ سقراط کو موت کی سزا دینے میں ایک یہ بھی بہانہ تھا کہ وہ مذہب کے خلاف ہے لیکن وہ اپنے شہر کے خداؤں کی حمد کرتا تھا۔ مذہبی رسوم میں شامل ہوتا تھا اور کبھی ایسا لفظ نہیں کہا کہ جس سے خدایگان شہر کی توہین ہو۔ اتنا ضرور ہے کہ وہ کہتا تھا کہ ہمیں خداؤں کا علم نہیں ہے۔ اس موت کے بعد زندگی ہے یا نہیں۔ ڈلفی (.Delphi) کے بعد پیشینگوئی کا بہت قائل تھا۔ اس کا فلسفہ محض اخلاقیات تھا۔ الہٰیات سے تعلق نہ تھا۔ الہٰیات پر غور بھی نہیں کرنا چاہتا تھا کبھی کبھی ایسے کلمات کہتا تھا جن سے ترشح ہوتا تھا کہ وہ ایک بہت بڑے خدا کو مانتا ہے۔ لیکن دیگر خداؤں کی بھی عزت کرتا تھا اور ان کا معتقد تھا۔ کہہ سکتے ہیں کہ لا الٰہ کا قائل نہ تھا، اگرچہ الا اللہ کہہ لیتا تھا۔ چونکہ تبرا نہیں کرتا تھا لہذا تولا مکمل نہ تھا۔

سقراط نے خود کوئی کتاب نہیں لکھی۔ اس کی ساری تعلیم زبانی تھی۔ اس کے حالات اُس کے دو شاگردوں افلاطون اور زنوفن .Xenophanes کی تحریرات سے معلوم ہوئے لیکن وہ تحریرات خالص تاریخ نہیں ہیں۔ ایک مورخ کہتا ہے کہ افلاطون کی تحریر تو محض خیالی ڈراما ہے اور زنوفن کی تحریر سقراط کے متعلق محض تاریخی ناول ہے۔ خود سقراط کہا کرتا تھا کہ افلاطون میرے متعلق بہت غلط باتیں لکھ رہا ہے (۴۷) معلوم ہوتا ہے کہ سقراط کی شہرت و عظمت کو اُس کے بعد کے بہت بعید زمانہ کے لکھنے والوں نے اپنے تخیلات کو کام میں لا کر بہت بڑھا دیا ہے۔ ورنہ اُس کے زمانہ کے لوگ اور اُس کے نزدیکی زمانہ کے اُسے جاننے والے لوگ جب اُس کی حالات اور افعال لوگوں کے حافظہ میں تازہ تھے اُس کی نسبت کچھ اچھے خیال نہیں رکھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اُس کی تعلیم کچھ نہ تھی۔ وہ تو محض ایک جاہل عیاش بدکار شخص تھا۔ (۴۸) در اصل اُس کی موت کے واقعہ نے اسے ہر دلعزیز بنا دیا۔ بات تو یہ ہی ہے کہ ؎

من اش کردہ ام رستم داستاں   وگرنہ یلے بود در سیستاں

فلسفۂ کلبیہ

سقراط اور اس کے شاگرد افلاطون کے درمیان فلسفۂ کلبیہ کا ذکر ضروری ہے جس کو سقراط کے ایک دوسرے شاگرد .Antisthenes نے مرتب کیا تھا۔ اور وہ ہی اس فلسفہ کا بانی ہے۔ اس فلسفہ کا بیان اس وجہ سے بھی ضروری ہے کہ اہلِ علم و عقل پر اچھی طرح عیاں ہو جائے کہ جب انسان خداوند تعالےٰ کے بھیجے ہوئے انبیاء کی تعلیم سے انحراف کر کے اپنی عقل پر بھروسہ کرتے ہیں اور اپنے قیاس کے مطابق نظریات بناتے ہیں تو انسانیت کے درجہ سے گر کر حیوانوں میں جا ملتے ہیں۔ یہ بڑے سے بڑے فلاسفر اور حکماء کی حالت ہوتی ہے۔ اس فرقہ کے بانی .Antisthenes نے اس فلسفہ کے اصول سقراط سے اخذ کئے تھے جس کے درس میں وہ روزانہ صبح پانچ میل کی مسافت پیدل طے کر کے جایا کرتا تھا۔ غالباً سقراط کے اُس درس میں یہ موجود تھا جس میں ایک سائل کے متعدد

(47) The Life of Greece P. 364

(48) Ibid.

سوالات پر سقراط نے ان اصول و خیالات کا اظہار کیا جن پر اپنے فلسفہ کلبیہ کو (ANTISTHENES) نے پیش کیا تھا۔ یعنی جسمانی ضروریات کو ان کی کمتر ین ضروری حد تک رکھنا یہ اس فلسفہ کا اصول ہے۔ ANTISTHENES (444) (365 B.C.) نہایت فقیرانہ پھٹا پرانا لباس پہنتا تھا جس پر سقراط نے اس طرح نکتہ چینی کہ اس گدڑی کے سوراخوں میں سے مجھے تکبرانہ انداز نظر آتا ہے۔ سقراط کا مطلب یہ تھا کہ اس نے فقط دکھاوے کے لئے یہ لباس اختیار کیا ہے اور اس کو اپنی درویشانہ طرز رہائش پر تکبیر ہے۔ سقراط کے مرنے پر اس نے اپنا علٰحدہ درس دینا اختیار کیا اور اپنی درسگاہ Gymnasium Cynosarges. میں مقرر کی۔ Cynosarges. کے معنی Dog fish. کے ہیں۔ غالباً اس جگہ کی نسبت سے یا زیادہ ممکن یہ ہے کہ ان کی تند مزاجی اور ترش خوئی کی وجہ سے ان کو CYNICS کہتے لگے۔ یہ شخص غربت زدہ مزدوروں کا لباس پہنتا تھا۔ اس کے طلبا و غریب ہوا کرتے تھے اور یہ فیس نہیں لیتا تھا۔ اور جو شاگرد سختیاں برداشت کرنے کے لئے تیار نہ ہوتا تھا یا غربت کو پسند نہیں کرتا تھا وہ نکال دیا جاتا۔ اس کا شاگرد رشید دقیانوس Diogenes. تھا جو نہایت ہی پھٹے پورانے کپڑے پہنا کرتا تھا۔ اس ہی نسبت سے غالباً اردو میں دقیانوسی کا لفظ پورانے اور پھٹے ہوئے کپڑوں کے لئے استعمال ہونے لگا ہے۔ اس نے اپنے استاد کے عقائد کو تمام یونان میں مشہور کر دیا۔ یہ شخص غالباً ۴۱۲ ق م میں پیدا ہوا اور ۳۲۳ ق م میں مر گیا یا شاید اس نے خودکشی کر لی۔

اس فلسفہ کی تشریح دقیانوس کی زندگی اور اس کے مقولوں سے بہت اچھی طرح ہوتی ہے۔ اس کی ابتدائی زندگی یہ تھی کہ شہر کے گلی کوچوں میں بھیک مانگتا پھرتا تھا۔ اور بھیک پر ہی گذارہ تھا۔ جب اس کو اس فلسفہ کے اصول معلوم ہوئے کہ یہ افلاس اور اس طرح بھیک پر گزارہ کرنا بھی نیکی اور عقل ہے تو اس نے بڑی خوشی سے اس کو اختیار کر لیا۔ فقیروں کا لباس پہنکر فقیروں کی جھولی اور ڈنڈا لے لیا۔ اور بھیک مانگتا پھرتا تھا۔ کچھ عرصہ تک اس نے ایک مٹکے میں اپنا گھر بنالیا اور اتھنز میں Cybele دیوی کے مندر کے

احاطہ میں رہنے لگا۔ جانوروں کی طرح رہنا اس کا مقصد حیات تھا۔ زمین پر سوتا تھا، اور جو مل جاتا تھا وہ کھالیتا تھا۔ اور کتوں اور جانوروں کی طرح سب لوگوں کے سامنے ہی پیشاب و پاخانہ کرتا تھا اور سب کے سامنے بغیر کسی جھجک کے عورتوں سے مجامعت کرتا تھا۔ وہ عورتیں بھی غالباً اس ہی نیچری فرقے کی ہوں گی۔ کبھی کبھی ہاتھ میں چراغ لے کر ڈھونڈھتا پھرتا تھا اور کہتا تھا کہ آدمی کو تلاش کر رہا ہوں۔ کبھی کبھی مذاق بھی کرلیتا تھا۔ ایک دفعہ ایک رنڈی کے لڑکے کو ایک انبوہ میں لوگوں پر پتھر پھینکتے ہوئے دیکھا تو اُس سے کہا کہ دیکھو اس میں کوئی شخص ایسا باپ بھی ہوگا اُس کو نہ پتھر لگ جائے۔ ان نوجوانوں کو سخت نفرت کی نگاہ سے دیکھتا تھا کہ جو عورتوں کی طرح بنتے اور سنورتے تھے اور اپنے بال بناتے تھے۔ ایسے ہی ایک نوجوان کو دیکھ کر اُس نے کہا بتاؤ تو سہی تم مرد ہو یا عورت۔ معلوم ہوتا ہے کہ حال نے ماضی کا جنم لے لیا ہے۔ آج کل کالج کے لڑکوں میں خصوصاً اس کالج کے طلبہ میں جہاں لڑکے اور لڑکیاں مل کر پڑھتے ہیں یہ شناخت کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ لڑکا کون ہے اور لڑکی کون ہے۔ لڑکے تو لڑکیوں کی طرح بال بناتے ہیں اور لڑکیاں لڑکوں کی طرح بال کٹواتی ہیں اور ملا لوگ چلاتے ہی رہ جاتے ہیں کہ قیامت نزدیک آگئی۔ صور اسرافیل کے لئے تیار ہو جاؤ۔

دقیانوس یونان کے شہر کورنتھ میں رہنے لگا تھا۔ اُس کا اور سکندر کا قصہ تو مشہور ہے جس پر سکندر نے کہا تھا کہ اگر میں سکندر اعظم نہ ہوتا تو دقیانوس ہونا پسند کرتا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ اُس زمانہ میں یونان میں دو ہی آدمی سب سے زیادہ مشہور تھے۔ ایک سکندر، دوسرے دقیانوس۔ ان دونوں کے ستارے بھی ایسے ملے تھے کہ دونوں ایک ہی دن ۳۲۳ ق م میں مرگئے۔ سکندر بابل میں ۳۳ سال کی عمر میں اور دقیانوس کورنتھ Corinth میں نوّے اور یک صد سال کے درمیان کی عمر میں۔

فلسفہ کلبیہ نہایت سیدھا سادا تھا۔ سوائے مطالعۂ نیچر کے اُنھوں نے دیگر تمام علوم کو بے فائدہ سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ نیچر کا مطالعہ بھی دنیا کی تشریح کرنے کی غرض سے نہیں کیونکہ وہ ناممکن ہے۔ بلکہ اُس سے عقل اور طرزِ رہائش سیکھنے کے لئے۔ وہ کہتے تھے کہ انسان کی زندگی کا مقصد محض خوشی حاصل

کرنا ہے۔ اصلی خوشی تلاش کرنے سے نہیں ملتی۔ بلکہ نیچر کے مطابق سادہ زندگی قدرتی طریقہ پر بسر کرنے سے ملتی ہے جس میں باہر کی چیزوں مثلاً دولت، عمدہ لباس، اچھی خوراک سے مدد نہ لی جائے۔ بغیر اشیائے عیش وعشرت کے سیدھی سادی نیک زندگی ہی سے قناعت ملتی ہے۔ دولت سے اطمینان ضائع ہوجاتا ہے اور وہ خواہشیں جن میں حسد کی آمیزش ہو روح کو برباد کردیتی ہیں۔ دقیانوس کہتا تھا کہ خداؤں نے تو انسان کے لئے آسان زندگی مقرر کی تھی لیکن خود انسان نے عیش وعشرت کے اسباب کی خواہش سے اوسے بگاڑ دیا۔ اگرچہ خداؤں کا ذکر آمدسخن کر لیا ورنہ کلبیہ جماعت کو ان خداؤں پر اور ان کے مذہب پر مطلقاً یقین نہ تھا۔ نیکی کیا ہے۔ اس کا جواب یہ دیتے تھے کہ اتنا کھانا اور اتنی چیزیں رکھنی جو صرف ضرور ہوں اور کسی کو نقصان نہ دینا اور تکلیف نہ پہنچانا یہ نیکی ہے۔ تمام خواہشات میں سے یہ لوگ عورتوں کی خواہش کو جائز تصور کرتے تھے لیکن شادی نکاح کے خلاف تھے۔ ہاں رنڈیوں کو پسند کرتے تھے۔

دقیانوس عورتوں اور مردوں کی آزاد عشقبازی اور عورتوں کی اشتراکیت کا حامی تھا۔ یہ وہی کمیونزم تھا جو آج کل بھی کہیں کہیں جاری ہوگیا ہے اور اس کے عام ہوتے کے سامان نظر آتے ہیں۔ عورتوں کے ساتھ مباشرت اور مجامعت کرنے کی خواہش کو قدرتی اور جائز تصور کرتے تھے جس طرح وہ بھوک کو جائز گنتے تھے۔ لہذا اُنھوں نے نتیجہ نکالا کہ جس طرح لوگوں کے سامنے کھانا کھاتے ہوئے شرم نہیں آتی اسی طرح لوگوں کے سامنے عورتوں سے مجامعت کرتے ہوئے بھی نہیں شرمانا چاہیئے۔ چنانچہ وہ یہ فعل نیک وجائز تمام لوگوں کے سامنے عین بازار میں کیا کرتے تھے۔

موجودہ زمانہ کا منطق بھی اسی طرف جارہا ہے اور وہ دن بھی دور نہیں، جب یہ نیک ومبارک فعل بھی لندن کے ہائڈ پارک کی طرح دنیا کے تمام کوچہ وبازار میں عام ہوجائے گا اور علانیہ کیا جائے گا۔ بلکہ یہ فیشن ہوگی۔ ایسا کرنے والے مرد وعورت ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ کہلائیں گے۔ اور اس فعل کو شرم وحیا سے پوشیدہ کرنے والے اگلے وقتوں کے جاہل لوگ سمجھے جائیں گے۔ اس کا منطق تو بالکل صاف اور عیاں ہے۔ لیکن اس فلسفہ کی معقولیت بالکل

پنہاں ہے۔ یوں تو خوشی کے ہر ایک قسم و نوع کو رد کرنا اور اعلان کرنا کہ جسمانی راحت و خوشی ایک بہت بڑی بدی ہے یہاں تک کہ ذہنی اور دماغی خوشی جو فلسفہ و علم سے حاصل ہوتی ہے اُس کو بھی بُرا بتانا۔ اور ساتھ ہی عورتوں کے جسم سے جو مرد کو خوشی حاصل ہوتی ہے اُس میں اتنی افراط کرنی کہ کوچہ و بازار میں اس فعل کو علانیہ کرنا ؏ ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند۔ غرضکہ تہذیب و انسانیت کو چھوڑ کر عریاں نیچر اور حیوانیت کی طرف جانا ان کا اصول تھا۔ انفرادی آزادی اور عظمت کا نظریہ جو سوفسطائیوں اور سقراط نے قائم کیا تھا اُس کو ان کلبیوں یعنی کتوں نے زیر عمل لاکر دکھا دیا۔ جس کی جرأت سقراط اور سوفسطائیوں کو نہ ہوئی وہ انھوں نے عیاں کر دی۔

ان لوگوں نے انفرادی اور شخصی آزادی کو اُس کے منطق کے آخری حد تک پہنچا دیا اور اصول قائم کیا کہ خودکشی جائز ہی نہیں بلکہ مستحسن ہے کیونکہ دنیا کے مصائب و آلام اس طرح ہی دور ہو سکتے ہیں۔ اور تو کچھ امید باقی نہیں۔ معلوم نہیں خوشی و راحت سے احتراز کرنے کا اُصول دل سے تھا یا فقط زبانی کیونکہ عورت کے جسم سے جو خوشی مرد کو حاصل ہوتی ہے اُس کے تو یہ لوگ بڑے شوق سے گرویدہ تھے۔ غالباً اُس کو انھوں نے نیچر کے اصولوں پر جائز سمجھا تھا۔

نیچر کی طرف پھر واپس چلنے کا کلبی فلسفہ اُس بڑی تحریک کا ایک حصہ تھا جو پانچویں صدی قبل مسیح کے اتھنز میں اُس زمانہ کی مصائب و آلام اور دقتوں سے بھری ہوئی تہذیب کے خلاف ردّ عمل کے طور پر پیدا ہوئی تھی۔ ایک انگریزی مورخ Will Durant کہتا ہے کہ آج کل کی تحریک عریانی جو یورپ میں عام ہوتی جا رہی ہے اُس ہی کلبی فلسفہ کا نتیجہ ہے اور ان ہی اسباب سے پیدا ہوئی ہے۔ یعنی تہذیب کے مصائب و مظالم و آلام جو آج کل بھی اُس زمانہ کے اتھنز کی طرح رائج اور حاوی ہیں۔ اُس کا موجب ہے۔ زمانہ حال کی تحریک عریانی Nudism. کے چند رسالے جن میں اس کا فلسفہ اور مرد و عورت کی عریاں تصاویر ہیں۔ خوش قسمتی یا بدقسمتی سے اس خاکسار کے پاس موجود ہیں، ان لوگوں کا خیال ہے کہ تہذیب اور قانون جن میں انسان کے آزاد عمل پر ہر جگہ بندشیں اور قیود ہیں،

خلاف نیچر ہیں، نیچر میں لباس نہیں ہوتا لہذا ننگا رہنا چاہیے، نیچر میں آگ سے خوراک نہیں پکائی جاتی لہذا دقیانوس کچا گوشت کھایا کرتا تھا۔

دقیانوس کے شاگردوں .Stilpo اور .Crates نے اس کا فلسفہ تمام یونانی دنیا میں پھیلایا اور اُس کے ہی اصول کی بنا پر آگے چل کر Stoicism نے جنم لیا۔ تیسری صدی قبل مسیح میں یہ کلبی فرقہ بطور ایک فلسفی جماعت کے تو ختم ہوگیا۔ لیکن اس کا اثر یہودیت اور مسیحیت پر بہت ہوا۔ یہودیت کا فرقہ .Essanes اس کا براہ راست نتیجہ تھا۔ مسیحیت کا بہت بڑا رہنما John the Baptist اس فرقہ ہی کا ایک ممبر تھا۔

رہبانیت اور دیر کی زندگی اس کا نتیجہ ہے۔ یہ لوگ عورت و مرد کی مباشرت و مجامعت کو نیچر کے مطابق سمجھتے تھے۔ غالباً اس ہی اصول کو مدنظر رکھ کر مسیحیت کے سالانہ میلے جن میں مرد مونک Monk و رعورتیں Nun شامل ہوتے تھے۔ اور پھر بارہ بجے رات کو چراغ گل کر دیا جاتا تھا۔ اُس وقت یہ لوگ نیچر کے اس فعل میں بلا تمیز رشتہ اور عمر کے مشغول ہو جاتے تھے۔ اس فلسفہ کا نتیجہ تھے۔ ان میلوں کا ذکر گبن نے اپنی تاریخ زوال سلطنت روما میں بہت اچھی طرح کیا ہے۔

اس کلبی فلسفے کے یہ تمام حالات ہم نے مندرجہ ذیل کتابوں سے لئے ہیں۔ (۴۹)

لذاتی فلسفہ Cyrenaic School سقراط کے فلسفے سے بہت سے فلسفے پیدا ہوئے۔ (CYNIC) کا تو ذکر ہم کر چکے ہیں۔ لذاتی فلسفہ Cyrenaic School اُس کے دوسرے شاگرد Aristippus نے سقراط کے اس نظریہ کی پیروی میں کہ انسان کا مقصد حیات خوشی و راحت ہونا چاہیے۔ لذاتی فلسفہ کی بنا ڈالی۔ یہ شخص افریقہ کے ساحل کے شہر Cyrene کا باشندہ تھا، یہ بھی سقراط کا شاگرد تھا

(49) Life of Greece, PP. 503 to 509 The Story of Philosophy P. 57 Encyclopedia of Ethics & Religions, A Critical History of Greek Philosophy by W. T. Stace, P.159. "But the Cynics, to show their indifference, flouted public opinion and gave frequent and disgusting exhibitions of indecency".

اور اس کی موت کے بعد مختلف شہروں کا سفر کرنے کے بعد اپنے شہر Cyrene میں مستقل اقامت اختیار کی اور وہاں اپنا فلسفہ کا یہ سکول قائم کیا۔ اس کا فلسفہ یہ تھا۔

جو کچھ ہم کرتے ہیں وہ خوشی کی امید یا تکلیف کے خوف کی وجہ سے کرتے ہیں۔ جب ہم اپنے دوستوں پر روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ فوج کے سرداروں کے حکم پر اپنی جان دیتے ہیں وہ بھی اس ہی اصول پر مبنی ہوتا ہے۔ لہذا یہ یقینی ہے کہ خوشی ہی اصلی اور آخری نیکی ہے۔ اور تمام علم و فلسفہ اور تمام نیکیوں کی خوبی کا معیار اس ہی تناسب سے ہے کہ وہ ہم کو کس قدر لذت و حظ پہنچاتی ہیں۔ عقلمندی یہ نہیں ہے کہ ہم حق و صداقت کو تلاش کریں۔ بلکہ عقلمندی یہ ہے کہ ہم ان چیزوں کو تلاش کریں جو ہم کو لذت اور حظ پہنچاتی ہیں۔ بہترین حظ و لذائذ اخلاقیات یا علم میں نہیں ملتے۔ بلکہ جسمانی اور اور نفسانی حظ سے حاصل ہوتے ہیں۔ لہذا عقلمند آدمی وہ ہے جو جسمانی حظ و لذت کو حاصل کرے۔ موجودہ لذت کو آئندہ کی امید میں نہ کھونا چاہئے۔ ہمارے لئے تو صرف حال ہی ہے۔ مستقبل کچھ نہیں۔ زندگی کا ہنر یہ ہے کہ ہم ہر ایک لذت کو حاصل کریں جو ہم کو مل سکے اور جو موجودہ لمحہ میں لذت مل سکے اُس کو حاصل کریں فلسفہ کا کام یہ ہے کہ ہم کو لذات کی طرف لے جائے۔ نہ کہ لذات کو ترک کرنے کی ہدایت کرے۔

ارسٹی پس Aristippus اپنے نظریات پر پورا پورا عمل کرتا تھا۔ ہر طریقہ سے روپیہ حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ حکام کی خوشامد بہت کرتا تھا۔ ایک شخص نے اس کو بُرا بھلا کہا کہ حاکم شہر Dionysius. کے قدموں پر کیوں گرتا ہے۔ اُس نے جواب دیا کہ اگر حاکم کے کان پیروں میں لگے ہوں تو میں کیا کروں۔ یہ میرا قصور تو نہیں۔ اس طرح روپیہ حاصل کرکے وہ اچھی پوشاک، اچھی خوراک اور حسین عورتوں اور رنڈیوں پر خرچ کرتا تھا۔ ایک شخص نے اس کو ملامت کی کہ تو رنڈی کے ساتھ کیوں رہتا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ مجھے اس میں کوئی اعتراض نہیں ہے کہ اُس مکان میں رہوں یا اُس جہاز میں سفر کروں جس میں مجھ سے پہلے اور لوگ بھی رہ چکے ہیں یا سفر کر چکے ہیں۔ اُسکی رنڈی معشوقہ نے کہا کہ مجھے تمہارا حمل ہے اس نے کہا کہ اگر تم خار دار جھاڑیوں میں سے گزرو تو تم کیونکر کہہ سکتی ہو کہ کونسا کانٹا تمہیں چبھا ہے۔

یہ فلاسفر غالباً ۴۳۵ ق م میں پیدا ہوا اور ۳۵۶ ق م میں مرگیا۔ ایسے فلسفے

ہیں جن پر مغربی تہذیب کا کاخ خوشنما کھڑا ہوا ہے۔ مغربی تہذیب ہی پر کیا منحصر ہے۔
ماضی و حال کے بادشاہوں کا بھی یہ ہی فلسفہ تھا

ٹولمی ثانی، شاہ مصر PTOLEMY II PHILADELPHUS

(309 B.C. To 247 B.C.) کا یہ ہی فلسفہ تھا اور اس فلسفہ کو اختیار کر کے اس پر اُس نے پورا عمل کیا تھا۔ ہر ایک خوشی و لذت جو اُس کو حاصل ہو سکتی تھی وہ لیتا تھا۔ بہت خوراک کھاتا تھا۔ بہت سی رنڈیاں رکھ چھوڑی تھیں۔ اپنی بیوی کو طلاق دیدیا تھا اور آخر کار اپنی بہن سے شادی کر لی۔

رواقی یا لذاتیہ حکماء۔ کلبی اور لذاتی حکماء کا ذکر تو ارسطو کے بعد ہونا چاہئے تھا، کیونکہ یہ سب فلسفے مابعد ارسطو کے کہلاتے ہیں۔ ان تینوں حکماء یعنی سقراط۔ افلاطون اور ارسطو کی تعلیمات سے ان فلسفوں کا تعلق ہے۔ لیکن ہم نے سلسلہ قائم رکھنے کے لئے سقراط کے بعد ہی کلبی فلسفہ کا ذکر کیا ہے کیونکہ یہ فلسفہ براہ راست سقراط کی تعلیم کا نتیجہ ہے اور اس کے شاگردوں ہی نے اس کی بنا ڈالی ہے۔ اسی طرح لذاتی فلسفہ بھی اُس کے شاگردنے جاری کیا اور اُس کی تعلیم پر مبنی ہے۔ اور اب جو ہم Epicurus. کا ذکر کر رہے ہیں تو اُس کا لذاتی فلسفہ بالکل وہ ہی تھا جو سقراط کے شاگرد Aristophanes. نے جاری کیا تھا۔ اُس کو ہم نے Cyrenaic School. کے نام سے موسوم کیا ہے۔ دراصل یہ فلسفے سقراط کی تعلیم سے نکلے ہیں۔ افلاطون یا ارسطو سے ان کا زیادہ تعلق نہیں ہے۔ ہم اپنے ناظرین سے اس عام ترتیب و تجویز سے تجاوز کرنے کی معافی چاہتے ہیں۔

Epicurus. یہ حکیم ۳۴۲ ق م میں بمقام Samos پیدا ہوا تھا۔ یہ شہر اس ہی نام کے جزیرہ کا دارالسلطنت ہے۔ اور یہ Samos جزیرہ بحر الجین میں ایشیائی کوچک کے ساحل کے پاس ہے۔ ۲۷۰ ق م میں پتھری کے مرض میں بمقام LAMPSACUS مرگیا۔ یہ شہر ایشیائی کوچک کے شمال میں طول البلد 6°27 عرض البلد 40°4 پر واقع تھا۔ یہ حکیم بھی لذتوں کا دلدادہ تھا۔ اور اُس کے فلسفہ کی بنیاد حظ نفس اور لذت جسم پر تھی۔ موجودہ لذتوں کا حاصل کرنا، عمدہ خوراک کھانا، اور نفیس پوشاک پہننا اور عورتوں اور قحباؤں سے بہرہ اندوز ہونا

اوران سے لذت اٹھانا اس کی زندگی کے مقاصد اور اس کے عمل کے عناصر تھے۔ ہر قسم کے مرد و عورت اس کے شاگردوں میں داخل تھے۔ ایک قحبہ بازاری LEONTIUM اس کی شاگرد تھی۔ جس سے اُس نے شادی بھی کر لی تھی۔ کسی نہ کسی طریقے سے روپیہ کمانا اس کا ہنر تھا۔ اور عورتوں کی لذت میں محصور رہنا اس کا وطیرہ تھا، مذہب سے اس کو نفرت تھی۔ یونان کے اُس زمانہ کے خداؤں کے تخیل کے علاوہ اس کو الٰہیات کا علم نہ تھا۔ کہتا تھا کہ ان اولمپس کے خداؤں نے نہ دنیا بنائی اور نہ اُس کی حفاظت کرتے ہیں۔ وہ بہت دور رہتے ہیں۔ ان کو اپنے ہی عیش و عشرت سے فرصت نہیں ہوتی۔ یہ کہتا تھا کہ ہماری جیسی بہت سی دنیائیں ہیں۔ لیکن ہم کو ان پر غور نہ کرنا چاہیے۔ انسان اسی طرح بذریعہ ارتقا جانوروں میں سے پیدا ہو گیا ہے۔ سب کچھ مادہ ہی ہے۔ نفس و روح بھی مادہ ہیں۔ لیکن انسان کا ارادہ آزاد ہے۔ اگر ہمارا ارادہ آزاد نہ ہوتا تو ہماری زندگی بے معنی تھی۔ فلسفہ کا کام دنیا کی تخلیق و حالت پر غور کرنا نہیں ہے۔ کیونکہ کل کو جزو نہیں معلوم کر سکتا۔ سادہ زندگی بسر کرنا اور دنیا کی جسمانی لذات اور خط میں مشغول رہنا ہی ہمارا مقصد حیات ہے۔ اس کا یہ فلسفہ بظاہر ایسا دلآویز تھا کہ بہت جلد یونان میں پھیل گیا۔ ایک انگریز مورخ کہتا ہے کہ۔

Epicureanism was publicly denounced and privately accepted in wide circles throughout Hellas (50)

یعنی اس فلسفہ کو لوگ بظاہر تو بُرا کہتے تھے لیکن پرائیویٹ طور پر تمام یونانی دنیا کے حلقوں نے اس کو قبول کر لیا تھا۔ اور اس کی پیروی کرتے تھے۔ سسرو کے زمانہ میں روم میں یہ لوگ بہت تھے۔ یہاں تک کہ قیصر کانسٹنٹائن Constantine. کے زمانہ میں بھی اُن کی کثرت تھی۔ یہ بادشاہ ۲۷۲ء عیسوی میں پیدا ہوا۔ اور ۳۳۷ء عیسوی میں مر گیا۔ اُس زمانہ کا کیا ذکر ہے۔ آج بھی عیسائی و مسلم و یہودی اور ایشیائی دنیا میں اس ہی فلسفہ کی حکومت ہے۔ بات وہ ہی ہے کہ زبان سے انکاری ہیں۔ دل سے اُس کے فدائی ہیں۔

(50) The Life of Greece, P. 649

اس کے سب سے زیادہ محبوب اور مشہور شاگرد METRODORUS نے اس کے فلسفہ کو ان چند الفاظ میں بیان کیا ہے۔

All good things have reference to the belly.

یعنی دنیا کی تمام عمدہ اور نیک چیزیں آخر کار پیٹ سے تعلق رکھتی ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کی تمام خوشیاں، اس کے تمام فلسفے اور تمام نیکیاں جسمانی لذت پر منتہی ہوتی ہیں۔

اس ہی فلسفہ پر .Marx کا Materialism اور .Engels کا Communism زمانہ حال میں تیار ہوا ہے۔ اور اس پیٹ کے ہی مسئلہ پر دنیا میں اس کا اقتدار مبنی ہے۔

Stoicism رواقی حکماء کا فلسفہ ۔ رواقی فلسفہ

انسان کا پیٹ یعنی اس کے خواہشات نفسانی اور دنیا کے مصائب و آلام یہی وہ دو مسائل ہیں۔ جن کا حل کرنا تمام دینی اور لادینی فلسفوں کا مقصد رہا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ انسان کی خواہشات نفسانی ہی دنیا کے تمام مصائب و آلام کی ذمہ دار ہیں۔ دنیا کے تمام مصائب و آلام نتیجہ ہیں اس ظلم کا جو ایک انسان دوسرے انسان پر کرتا ہے۔ اور وہ ظلم پھر ظالم ہی کے گلے میں آن کر پڑتا ہے اور اس طرح یہ مصائب و آلام مرکب ہوتے جاتے ہیں یہاں تک کہ تمام دنیا ان ہی مصائب و آلام سے بھر گئی ہے۔ اور اب دنیا میں دو ہی چیزیں نظر آتی ہیں۔ مصائب و آلام اور ظلم۔ اور یہ ظلم نتیجہ ہے انسان کی خواہشات نفسی کا۔ ان تمام لادینی فلسفوں نے اصلی وجہ پر تو غور نہیں کیا مصائب دنیا سے گھبرا گئے اور راہِ فرار ڈھونڈھنے لگے۔ دنیا جیسی بنائی گئی ہے وہ بری نہیں ہے نہایت اچھی جگہ ہے۔ لیکن انسان نے اس کو بگاڑ دیا ہے۔ ان حکماء نے دنیا کے مصائب کو مدنظر رکھ کر دو مختلف اور متضاد نظریئے قائم کئے۔ ان فرقوں کے بانیوں نے جن کا ذکر ہم نے ابھی کیا ہے اس طرح بحث کی کہ مصائب و آلام سے تو چھٹکارا نہیں لہذا جتنی بھی زندگی ہے اس میں اپنی جسمانی لذات کو اپنا مطمح نظر بنالو۔ رواقی حکماء

نے جن کا ذکر ہم اب کریں گے ان مصائب کو مدنظر رکھ کر یہ نتیجہ نکالا کہ ان سے چھٹکارا تو ہو نہیں سکتا۔ اور دنیا کی جو بھی خوشی یا لذت ہے۔ اس میں پائیدگی نہیں وہ بہت جلد گزر جاتی ہے۔ لہٰذا اس زندگی کو جتنی جلدی ختم کر سکیں وہ اچھا ہے۔ اُنھوں نے نتیجہ نکالا کہ خودکشی بہت ممدوح و معقول فعل ہے۔ لیکن ان دونوں نظریات میں سے کوئی دنیا کے مصائب و آلام کا حل نہیں پیش کرتا۔ بلکہ دونوں ان سے گریز کرتے ہیں۔ ان کا اصلی حل محض اسلام نے کیا ہے جس کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے۔

رواقی فلسفہ کا بانی زینو .Zeno جزیرہ قبرص کا باشندہ آدھا یونانی آدھا فنیقی تھا۔ بطور تاجر کے زندگی بسر کی اور بہت دولت جمع کی۔ لیکن یکایک اس کا سارا دنیا کا اثاثہ ایک جہاز میں ڈوب گیا۔ اور یہ خود ۳۱۴ ق م میں اتھنز میں آیا جب اس کے پاس ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ اس مصیبت نے اس کی نظروں میں دنیا کی حقیقت کو عریاں کردیا۔ اور دنیا کے مصائب ہی اس کی فلسفہ کے بنیاد ہوئے۔ دنیا کی طرف سے دل برداشتگی اور دنیا کو ہیچ سمجھنا اس کے فلسفہ کا خاصہ ہے۔ اتھنز میں آن کر اُس نے فلسفہ کو تلاش کیا۔ کچھ دنوں تک کلبی حکیم .Crates کی تعلیم میں رہا۔ جو گداگری سے اپنی ضروریات زندگی بہم پہنچاتا تھا۔ ایک عورت .Hipparehia اُس پر عاشق ہوگئی۔ اور ان دونوں نے اپنی اس آزاد باہمی زندگی کی اشاعت اور اس کا افتتاح برسرِ بازار انبوہ کثیر کے سامنے آپس میں مجامعت کر کے کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد .Zeno نے .Crates کو چھوڑ دیا کیونکہ اُس نے دیکھا کہ مسئلہ زندگی کا یہ اچھا حل نہیں ہے۔ پھر دتیانوس کے دوسرے شاگرد .Stilpo سے فلسفہ پڑھتا رہا۔ ۳۰۱ ق م میں اُس نے اپنا علٰحدہ درس ایک جگہ Stoa Poceile (مختلف رنگوں کی دہلیز) میں جاری کیا۔ چونکہ زینو نے مصائب دنیا کو اٹل و دوامی اور لذائذ کو وقتی اور ناقص پایا، عاقبت کی سزا و جزا اور موت کے بعد زندگی کا قائل نہ تھا لہٰذا اُس نے وہ ہی کیا جو ہر اُس شخص کو کرنا چاہئے جو محض دنیا ہی کو اپنی زندگی کا منتہا سمجھتا ہے یعنی خودکشی ۲۶۰ء میں جب اُس کی عمر ستر سال کی تھی زینو نے خودکشی کرلی۔ لیکن دیوانہ بکار خویش ہوشیار۔ یہ خودکشی ستر سال میں کی۔ جب قدرتی موت ایک دو ہی قدم پرے تھی۔ دتیانوس نے نوے سال کی عمر میں خودکشی کی اور .Antisthenes نے ۱۱۱ سال کی عمر میں .Cyrene کے

ایک کلبی فلاسفر Hegesias. نے مصر میں خودکشی کی اتنی تلقین کی کہ سینکڑوں احمق اُس مدح خودکشی سے متاثر ہو کر زندگی کو کھو بیٹھے۔ یہاں تک کہ بادشاہ مصر PTOLEMY II نے اس کو جلا وطن کر دیا۔ لیکن خود خودکشی نہ کی۔ دوسروں کو بیوقوف بنانے کا ہنر بھی بہت پُرانا ہے۔

رواقی فلسفہ کے اصول۔ دنیا اور انسان دونوں بالکل مادی ہیں۔ لیکن ان کی ماہیت میں کچھ نہ کچھ مادہ سے علاوہ بھی خاصیت ہے۔ یہاں تک کہ نیکی، بدی، جذبات روح، خدا، ستارے، یہ سب مادی ہیں۔ لیکن مادہ میں خود اندر سے ایک طاقت ہے۔ اور اُس طاقت ہی کی وجہ سے یہ گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔ یہ طاقت گرمی یا آگ کی شکل میں ہے۔ تمام کائنات بڑھتی ہے اور پھر خود بخود آگ کے زور سے جل کر تباہ ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی دور اس پر آتے رہتے ہیں۔ برباد ہونے کے بعد پھر بڑھنی شروع ہوتی ہے۔ علل و نتائج کا سلسلہ تمام کائنات پر حاوی ہے۔ تمام واقعات، تمام ارادے، ارادوں کے نتائج وغیرہ یہ سب شروع ہی سے مقرر ہو چکے ہیں اور اب اُس ازلی ترکیب کے مطابق واقع ہوتے رہتے ہیں۔ اگر اس سلسلہ میں ذرا سا بھی اختلاف ہو تو دنیا برباد ہو جائے۔

Stoics. یعنی رواقی حکماء نے اپنے زمانہ کے قومی مذہب کو اخلاقیات کے قیام کیلئے ضروری سمجھا۔ اور اس کے مختلف طاقتوں کے خداؤں، بھوتوں، اور پیشینگوئیوں کے اعتقاد میں ہارج نہیں ہوئے۔ بلکہ ان کو توہمات کے حدود میں سے نکال کر فلسفہ کے احاطہ میں یہ کہکر داخل کر لیا کہ یہ سب تمثالی اور مجازی ہیں بعینہ وہ ہی طریقہ جو مسیحی پادریوں نے بائیبل کے بعید از عقل بیانات کو تمثالی اور مجازی کہہ کر اعتراض کو ٹالا ہے۔ اور جس طرح قرآن شریف کے ہمدرد شارحین جو مغرب کی لادینیت میں سرشار ہیں یا یونان کے فلسفہ سے اپنے ذہن کو آزاد نہیں کر سکتے جنت و دوزخ کی تشریح مجازی رنگ میں کرتے ہیں۔ کلدانی جوتش کو وہ صحیح سمجھتے تھے اور اُن کا خیال تھا کہ انسانی اور دنیاوی معاملات و واقعات ستاروں کی حرکت سے تشکیل پاتے ہیں۔ اور اثر لیتے ہیں۔

* فلسفہ دین اور لادین کے درمیان دونوں کو ملانے والا ایک سلسلہ یا

پُل تھا۔ اور اُس نے لوگوں کے دماغوں کو مسیحیت کی تعلیم قبول کرنے کے لئے تیار کر دیا۔ تھا۔ انکی تعلیم تھی کہ عالم و نظام عالم، زندگی، روح اور مقدر کا تعلق کسی نہ کسی طرح خدا سے ہے۔ اور اخلاقیات کو بھی خدا کی مرضی کے مطابق انسان نے مرتب کر لیا ہے۔ انسان کی طرح خدا بھی زندہ مادہ ہے۔ دنیا اُس کا جسم ہے۔ اور دنیا کا قانون و نظام خدا کا ذہن و مشیت ہیں۔ تمام کائنات ایک بہت بڑا جسم حیوانی ہے جس کی روح پھونکنے والا نفس خدا ہے۔ خدا ہی اس کا ذہن ہے۔ اس کو چلانے والی آگ ہے۔ ان کے بعض بعض حکمانے تو ایک بغیر جسم کے خدا کا بھی تخئیل کیا ہے جو دنیا کا انتظام اور اُس کی رہنمائی عقل کے ساتھ کر رہا ہے۔ اور تمام اشیاء کو نیک آدمیوں کے فائدہ کے لئے مقرر کر دیا ہے۔

بات تو اُنہوں نے ٹھیک کہی لیکن نیک کی شرط لگا کر اُس کو خلاف واقعہ بنا دیا۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ تمام دنیا کی تمام اشیاء خدا کے تمام بندوں کے لئے یکساں ہیں۔ اس میں نیک و بد کی تمیز نہیں۔ ہوا، پانی، مٹی، آگ سب کو یکساں فائدہ پہنچا رہے ہیں جنھوں نے ہوائی جہاز بنا کر ہوا پر قبضہ کر لیا ہے۔ آب دوز کشتیاں بنا کر پانی کو مغلوب کر لیا ہے۔ ادویات میں ایزادی کی ہے۔ کیا وہ سب نیک بندے تھے۔ اگر یہ صرف نیک بندوں کے لئے ہوتا تو خدا کے انصاف پر حرف آتا۔ قرآن شریف نے اس مسئلہ کو کس عمدگی سے حل کیا ہے۔ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا۔ ۳: ۳۹۔ جو کچھ زمین میں ہے وہ سب تمہارے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ کوئی اگر یہ کہے کہ سورج، اور سیاروں ستاروں سے بھی تو انسان کو فائدہ پہنچتا ہے۔ یہ تو ٹھیک ہے کہ فائدہ پہنچتا ہے لیکن ان اجرام فلکی کی ان چیزوں مثلاً حرکت اور شعاعوں سے فائدہ پہنچتا ہے جو اس دنیا میں آجاتے ہیں۔

ہم یہ پہلے بھی کہہ چکے ہیں اور اب پھر دوہراتے ہیں کہ دنیائے قدیم کے تمام فلسفے اب بھی مغربی تہذیب پر اثر ڈال رہے ہیں مسلمانوں کی حکومت کے زمانہ میں اُن پر بھی اثر ڈالا تھا۔ اس فلسفہ رواقیہ Stoicism. کا نمائندہ زمانہ حال میں Schopenhaur. (1788 تا 1860) تھا۔ اُس نے فرانس کا انقلاب اور نپولین کی صبر آزما لڑائیاں اور مایوس کن فتنہ فساد دیکھے تھے۔ اس کے باپ نے

خودکشی کرلی تھی۔ اُس کی دادی پاگل ہوگئی۔ اُس کی والدہ نے ہیملٹ کی ماں کی طرح آزادانہ زندگی گزاری تھی۔ اندریں حالات اس کا Stoicism اور Pessimism. (قنوطیت) کی دامن میں پناہ لینا بالکل قدرتی امر تھا۔ دراصل فلسفہ انسان کے اپنے ہی تجربوں کا نچوڑ ہوا کرتا ہے۔ کسی شخص کے فلسفہ سے تم بتا سکتے ہو کہ آیا اُس نے خوشیوں اور راحتوں کی گود میں پرورش پائی ہے یا مصائب و آلام نے اُس کے جھولے کو جھلایا ہے۔

Sceptics. (حکماءِ لاادریت) ان کا بھی تقریباً وہ ہی زمانہ تھا جو لذتیہ اور رواقی حکماء کا تھا۔ انہوں نے بھی دنیا کو اس ہی رخ سے دیکھا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ کسی شے کا صحیح علم حاصل کرنا ناممکن ہے۔ حق یعنی اصلیت تک پہنچنے سے ناامید ہونا یہ ہی فلسفۂ لاادریت ہے۔ دنیا کے مصائب سے بچنے کے لئے یہ ہی نظریہ قائم ہوسکتا تھا۔

اس فلسفہ کا بانی پرو Pyrrho. تھا۔ جو تقریباً ۳۶۰ سنہ ق م میں پیدا ہوا تھا اور ۲۷۵ سنہ ق م میں مرگیا۔ اس کا قول ہے کہ انسان کے سامنے تین سوالات پیدا ہوسکتے ہیں۔ (۱) اشیاء کی اصلیت کیا ہے اور اُن کی آپس کی ترکیب و تنظیم کیا ہے۔ (۲) ہمارا ان اشیاء سے کیا تعلق ہے۔ (۳) ہمارا طرزِ عمل ان کے متعلق کیا ہونا چاہئے۔ ان سوالات کے جو جواب اُس نے دئے وہ اس فلسفہ کے تین اصول ہیں۔

(۱) یقین ناممکن ہے (۲) عقلمند آدمی ان کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ نہ دے گا۔ اور وہ حق کی بجائے امن و اطمینان کو تلاش کرے گا (۳) چونکہ تمام نظریئے غلط ہیں لہٰذا بہتر یہ ہے کہ انسان اپنے شہر یا ملک اور اپنے زمانہ کے مروجہ توصعات اور رسومات کو قبول کرکے لوگوں کے ساتھ ہولے۔ اور حق کے متعلق کہہ دے کہ مجھے نہیں معلوم کہ کیا حق ہے اور کیا ناحق۔

اس فلسفہ کا یہ نتیجہ نکلا کہ بذاتِ خود کوئی شے نہ حق ہے اور نہ ناحق ہے اسی طرح نہ کچھ نیکی ہے اور نہ بدی ہے۔ صرف رائے رواج یا قانون اُس کو اچھا کہہ دے یا بُرا کہہ دے۔ لیکن یہ حقیقت یا اصلیت نہ ہوئی۔

اس بحث کا یہ بھی نتیجہ نکلا کہ یہ فلاسفر مختلف اعمال یا افعال میں سے کسی ایک کو ترجیح نہ دیگا۔ لہٰذا کوئی فعل یا عمل نہ کرے گا۔ کسی ایک کام کو کرنا اور دوسرے اُس سے مختلف کام کو نہ کرنا یہ ہے کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح دی۔ اور چونکہ حقیقت معلوم نہیں لہٰذا

کسی کو ترجیح نہ دی جاسکے گی۔ انسان کا ہر ایک فعل اُس کے یقین اور اعتقاد پر مبنی ہوتا ہے اور ان حکماء کے نظریہ کے مطابق یقین یا اعتقاد محض ایک دھوکہ ہے۔ لہذا لاادریت کا فلاسفر بے حس بت بن کر بیٹھا رہے گا اور اپنے دل کو اپنے ہی خیال میں اس طرح تسلی دے گا کہ میری کوئی خواہش ہی نہیں۔ خواہش کے ہونے سے رنج ہوتا ہے۔ لہذا میں اس رنج سے دور رہتا ہوں۔ اور مجھے پورا اطمینان قلب حاصل ہے۔ اس نظریہ کا مطلقاً خلاف فطرت انسانی ہونا ظاہر ہے۔ اور اس طرح اگر برے کام کرنے سے بچ گیا تو اچھے کام کرنے کی بھی فضیلت نہ حاصل ہوئی۔

افلاطون ۔ ہم اپنے بیان میں ذرا آگے بڑھ گئے۔ افلاطون اور ارسطو کا ذکر باقی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ۔

(۱) STOICS (رواقی) (۲) Epicureans (لذتیہ)

(۳) Sceptics (حکماء لاادریت) (۴) Neo-Platonists. (افلاطونیت جدید)

یہ سب فرقے ارسطو کے بعد کے یونانی حکماء کی جماعت میں آتے ہیں۔ لیکن ہم نے تینوں اول الذکر فرقوں کا ذکر پہلے اس وجہ سے کر لیا کہ یہ تقریباً براہ راست سقراط کے فلسفے سے ماخوذ تھے اور زیادہ تر اس کی ہی تشریح پر مبنی تھے۔ افلاطونیت جدید کا ذکر ہم بعد میں کریں گے۔

افلاطون اتھنز کے خاندان امراء میں سے تھا۔ ۴۲۷ ق م میں پیدا ہوا اور ۳۴۷ ق م میں مر گیا۔ سقراط کا شاگرد تھا جس کی عمر کے آخری دس سالوں میں اُس کے ساتھ رہا۔ افلاطون ہی کی کیا خصوصیت ہے ہر ایک غور و فکر کرنے والے انسان کے لئے اُس کی زندگی کا ہر لمحہ ایک نیا سبق پڑھاتا ہے۔ مگر افلاطون کی زندگی میں دو ایسے عظیم الشان واقعات ہوئے جنھوں نے انسانی زندگی کے ہر ایک پہلو کو افلاطون کے سامنے نمایاں کر کے رکھ دیا۔ ایک تو اُس کے شفیق اور محبوب اُستاد سقراط کے خلاف جو مقدمہ ہوا تھا اُس کی حاسدانہ ابتداء اور ظالمانہ انتہاء۔ اور دوسرے اُس وقت کی تمام معلوم شدہ دنیا کا سفر۔ اول الذکر نے جمہوریت کے تمام عیوب اور فطرتِ انسانی کی کمزوریوں کو عیاں کر دیا۔ اور ساتھ ہی اُس بلندی کو بھی واضح کر دیا۔ جہاں تک عقل و حکمت کے ذریعہ سے فطرت انسانی پہنچ سکتی ہے۔ فطرتِ انسانی کی کمزوریوں کو اُس نے سقراط کے مستغیثوں اور اُس کے مقدمے کے ججوں کی صورت میں دیکھا۔ اور اس کے فلسفیانہ

ارتفاع کو سقراط کے چہرے میں معائنہ کیا۔ جس طرح دنیا نے کفر کی اصرار کو ابوجہل کی شکل میں اور اسلام کے انوار وارتفاع کو حضرت علی کے چہرہ میں پایا۔ اور جناب رسولخدا نے یہ فرماکر لوگوں کی توجہ ادھر دلائی کہ النظر الی وجہ علی عبادۃ ۔ موخرالذکر یعنی سیاحتِ عالم نے افلاطون کو فطرتِ انسانی کی مختلف حالتوں اور نیز نیرنگیوں سے آگاہ کیا۔ اور نیز دنیا کے تمام مذاہب اور طرقِ فلسفہ پر غور کرنے اور اُن سے علم حاصل کرنے کا موقعہ دیا۔ اور غالبًا یہ ہی اُس سیاحت کا مقصد تھا۔ اس بارہ تیرہ سال کے عرصہ میں اُس وقت کی ساری مہذب دنیا سے عقل وتجربہ کی دولت سمیٹ لایا۔ ہر ایک دیر ومندر میں بیٹھ کر ان کے فلسفہ اور مذہب کی روشنی میں انسان، خالق، موت وحیات کے نکات پر غور کیا۔ بنواسرائیل کے انبیاء کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے .Judea میں گیا۔ اور اس تعلیم کا اثر اُس کے فلسفہ پر بہت ہوا۔ کفر کی لن ترانیاں سننے کے لئے گنگا کے کنارے دھونی رماکے بیٹھا۔ افلاطون شاعر بھی تھا اور فلاسفر بھی۔ عقل وعشق کا ایسا اجتماع ایک شخص میں شاذونادر ہی ہوتا ہے۔ افلاطون کے فلسفہ میں ہر دل کے لئے جو جاذبیت ہے وہ اس ہی اجتماع کا نتیجہ ہے۔

افلاطون کا فلسفہ: یہ تو ہونا ہی چاہیے تھا کہ افلاطون نے اپنا فلسفہ اپنے پیشرو حکماء کے خیالات وتصورات سے اخذ کیا۔ لیکن اس کے فلسفہ پر کلبیت یعنی .Cynicism کا بہت بڑا اثر تھا۔ اور اس کی ساری تعلیم کا رجحان اُسی طرف تھا اپنی تحریرات میں خصوصًا ریپبلک میں کمیونزم کے تصورات کی تائید کرتا ہے اور اُن کو بنظرِ استحسان دیکھتا ہے۔ چنانچہ جب اپنی خیالی .Republic کے فلاسفر حکمراں تجویز کرتا ہے تو اُس تجویز میں بالکل کمیونزم کا نقشہ نظر آتا ہے۔ اُس کی تجویز ہے کہ ان حکمرانوں کی نہ کچھ اپنی جائداد ہو، نہ مال ہو، نہ آمدنی ہو اور نہ کوئی بیوی ہو۔ اُن کی زندگی بہت سیدھی سادی ہو۔ اور یہ سب ضروریات زندگی پبلک فنڈ اور پبلک کی طرف سے اُن کو مہیا ہونی چاہئیں۔ ان کے لئے یہ سب مال مشترک ہو اور عورتیں بھی مشترک ہونی چاہئیں۔ یہ ہی وہ کمیونزم ہے جس نے روس سے نکل کر تمام دنیا پر قبضہ کرلیا ہے اور اب دنیا نے اُس کو عملی جامہ پہنا کر پھیلایا ہے۔

سقراط کی موت یا خودکشی ۳۹۹ ق م میں ہوئی۔ اُس کے بعد ہی افلاطون

اپنی سیاحت پر باہر چلا گیا۔ اور آخر کار ۳۸۶ ق م اتھنز میں واپس آگیا۔ وہاں اپنا سکول درختوں کے ایک سبز جھنڈ میں قائم کر لیا۔

مقامی خدا .Academius کے نام پر اس جھنڈ کا نام .Academia تھا افلاطون نے یہاں اپنا مدرسہ یا مکتب کھولا جو برابر نو صد برس تک اتھنز کا علمی مرکز رہا اور آخر کار ۵۲۹ء میں رومن قیصر JUSTINIAN کے زمانہ میں یہ بند کر دیا گیا۔ اس کے نام کی وجہ سے افلاطون اور اس کے ساتھی .Academic Philosophers کہلاتے تھے اور اس ہی جگہ نے یورپ کو ایک لفظ .Academy دیا جو یورپ کی تمام زبانوں میں رائج ہے۔

ابتدا میں یہ ایکاڈیمی ایک مذہبی برادری تھی جس کا مقصد یونان کی مؤنث خدائیوں .Muses کی پرستش تھی۔ یونان کی لغت خدائیگان میں یہ مونث خدا تھے، جن کا مشغلہ راگ ورنگ تھا لیکن بعد کے تخئیل میں ان کو ہر سائنس و شاعری اور ہنر کے مؤنث خدا مانا گیا تھا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس زمانہ میں کہ جب صنم پرستی کا زور تھا۔ ہر ملک میں ہر ایک کام کو، ہر ایک تحریک کو ہر ایک جگہ کو کسی نہ کسی خدا سے نسبت دیجاتی تھی۔ عرب میں بھی یہی دستور تھا۔ یہ خیال یا تو انبیاء علیہم السلام کی اس تعلیم کا اثر تھا کہ انسان اور اُس کا ہر فعل خدا کے احکام و مشیت کا تابع ہے یا غالباً ان لوگوں نے سوچا کہ جب تک ان امور کو براہِ راست کسی خدا سے منسوب نہ کریں گے تو لوگ انکی طرف اپنی پوری توجہ نہ دیں گے۔

اس مدرسہ میں عورتیں بھی داخل کی جاتی تھیں۔ اور شاہ ڈایونی سی اس ثانی Dionysius II کی طرف سے اس مدرسہ کو سالانہ عطیہ ملتا تھا۔ اور وہاں کے امراء بھی بذریعہ وصیت اس کے لئے ترکہ چھوڑتے تھے۔ اس زمانہ میں اس مدرسہ کے طلباء کا نقشہ ان ہجو آمیز الفاظ میں کھینچا گیا تھا کہ ہاتھ میں چھڑی لباس میں نزاکت۔ یونیورسٹی کا جبہ پہنے ہوئے تکبرانہ چال سے چلتے تھے۔

تعلیم بذریعہ مکالمہ Dialogues دی جاتی تھی۔ افلاطون کے مکالمے Dialogues بہت مشہور ہیں۔

سقراط کا فلسفہ بغیر افلاطون کی تشریحات کے اور افلاطون کا فلسفہ بغیر ارسطو کی تنقید کے ایسا ہے جیسا بے نمک کا سالن۔ افلاطون کی شاعرانہ طبیعت نے

اُس کے فلسفہ میں وہ چاشنی پیدا کردی ہے جس کی لذت پر ہر ایک اہل علم مفتون ہے۔ صرف افلاطون ہی کی طبیعت کائنات کی اصل و نقل تمثالی صورت میں پیدا کر سکتی تھی۔

افلاطون کے فلسفہ میں دو امور نہایت اہم ہیں ایک تو اس کا تخیلِ حقیقت اور اصلیت اور دوسرا اُس کا نظریۂ سیاست۔

اُس کا تخیلِ حقیقت اور اصلیت یہ ہے کہ جس دنیا میں ہم رہتے ہیں وہ حقیقی اور اصلی نہیں ہے۔ یعنی اُس میں نہ حقیقت ہے اور نہ اصلیت۔ بلکہ حقیقی دنیا اس سے علٰحدہ ہے۔ حقیقی دنیا وہ ہے جس میں ہماری روح اس جسم میں آنے سے پہلے رہتی تھی۔ اُس حقیقی دنیا میں اِس دنیا کے محسوسات کے ہیاکل Forms. Ideas رہتے ہیں۔

ہیاکل یا Ideas سے افلاطون کا مطلب یہ ہے۔ انفرادی چیزوں سے حقیقت نہیں معلوم ہوتی۔ بلکہ ایک ہی نوع کی اشیاء میں جو خاصیتیں مشترک ہیں۔ وہ حقیقت کو بتاتی ہیں۔ مثلاً جب آدمی کہا تو ہمارے دماغ میں وہ سب تخیّل پیدا ہو جائیگا جو تمام آدمیوں میں مشترک ہے۔ میز، کُتّا، مثلث، آدمی وغیرہ یہ سب فنا ہونے والی چیزیں ہیں۔ لیکن ان کے ساتھ جو خیالات والبستہ ہیں وہ باقی رہیں گے۔ ہم ایک میز کو دیکھتے ہیں۔ ایک کُتّے کو دیکھتے ہیں۔ ان کا علم ہمارے احساس کے ذریعہ سے آتا ہے۔ لیکن یہ سب فانی ہیں۔ مر جانے والے ہیں، ضائع ہونے والے ہیں لیکن میز، مثلث، مربع مستطیل، کتا، آدمی، بلّی وغیرہ وغیرہ کے انواع کے متعلق جو ہمارے ذہن میں تصورات ہیں وہ باقی رہیں۔ اور وہ ہی ہیاکل یا Ideas. ہیں۔ وہ حقیقی ہیں۔ وہ چیزیں جن کو دیکھ کر یا جن کی وجہ سے وہ تصور پیدا ہوا وہ نقلی ہیں۔ ضائع ہونے والی ہیں۔

افلاطون کے فلسفہ کے مطابق دنیا کی کسی چیز کی حقیقت ہم کو معلوم نہیں۔ ہم کو تو ان کا وہ اثر معلوم ہوتا ہے جو ہمارے حواس خمسہ پر ہوتا ہے۔ مثلاً نیم گرم پانی کو برف و باران میں سے آیا ہوا شخص گرم بتائے گا۔ اور اُس ہی پانی کو حمام میں سے نکلا ہوا شخص ٹھنڈا کہے گا۔ خرگوش کو ہاتھی بہت چھوٹا جانور سمجھے گا لیکن اُسی خرگوش کو چیونٹی بہت بڑا سمجھے گی۔ ایک ہی تصویر کو ایک آدمی اچھا اور دوسرا بُرا سمجھتا

ہے ایک ہی عورت کو ایک آدمی حسین اور دوسرا بدصورت سمجھتا ہے کسی ملک میں سروقد، پتلی کمر اور چھوٹے پیٹ کو حسن کے لوازمات میں سے سمجھا گیا ہے۔ افریقہ میں یہ بدصورتی ہے۔ بلکہ وہاں بڑے پیٹ والی گڈ مڈالی عورت خوبصورت سمجھی جاتی ہے۔ افلاطون کہتا ہے کہ ہمیں نہیں معلوم ہو سکتا ہے کہ حقیقت کیا ہے آپ سے سوال کیا جائے کہ حسن یا خوبصورتی کیا ہے۔ آپ کہیں گے فلاں عورت خوبصورت ہے گلاب کا پھول خوبصورت ہے۔ لیکن یہ تو خوبصورت چیزیں ہیں۔ دراصل حسن یا خوبصورتی کیا ہے۔ اسی طرح انصاف، نیکی، رحم، وزن، سفیدی وغیرہ کی نسبت کہا جا سکتا ہے۔ جو خیال حسن، نیکی، انسان، ہاتھی، گھوڑے وغیرہ کا ہے وہ ہی افلاطون کا Ideas. یا Forms. ہے۔ اس نظریہ کا ہی ضمنی نتیجہ ہے کہ حقیقی علم اس دنیا کے محسوسات سے حاصل نہیں ہوتا۔ بلکہ خرد یا عقل — Intelleet, Reason. کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اس طرح افلاطون نے اپنے سے پہلے سب فلاسفروں کی تردید کر دی جو کہتے چلے آئے تھے کہ علم فقط دنیا کی محسوس اشیاء سے حاصل ہوتا ہے۔

ایسے ہی ہیاکل سے افلاطون کی حقیقی دنیا آباد ہے۔ ہماری دنیا کی چیزیں اس وجہ سے بھی غیر حقیقی اور مجازی ہیں کہ ان میں ہر دم، ہر لحظہ، ہر لمحہ تغیر واقع ہوتا رہتا ہے۔ اور حقیقت تغیر سے بالاتر ہے۔ ان ہیاکل کا علم حاصل کرنا ہماری زندگی کا مقصد ہونا چاہیئے۔ تاکہ ہماری روح اس دنیا سے دوسری اور حقیقی دنیا میں Ideas. / Forms. یا ہیاکل کی صحبت میں چلی جائے۔ افلاطون کہتا ہے کہ موجودہ جسم میں آنے سے پہلے روح اس ہی حقیقی دنیا میں ہیاکل کی صحبت میں رہتی تھی۔ لیکن اب وہاں سے گر پڑی ہے، جب روح اس عالم بالا یا حقیقی دنیا سے گر پڑتی ہے تو کسی جسم میں چلی جاتی ہے لہذا اب وہ ان Forms. یا ہیاکل کو اچھی طرح تو نہیں دیکھ سکتی۔ لیکن چونکہ ایک دفعہ دیکھا ہوا ہے اور کچھ نہ کچھ اس کی شکل آنکھوں میں سما گئی ہے۔ اس وجہ سے یہ موجودہ شکلیں دیکھ کر اس کا پچھلا تجربہ اسے مدد دیتا ہے۔ اور کبھی کبھی ان ہیاکل کی دھندلی سی شکلیں اس کو نظر آ جاتی ہیں اور وہ ان مادی اشیاء میں روحانی جھلک

دیکھ لیتی ہے۔ افلاطون کی حقیقت و مجاز نے مسلمانوں میں بھی بہت سے فرقے پیدا کر دئے ہیں۔

افلاطون کے اس فلسفہ کی رو سے علم طبیعیات و کیمسٹری علم ہیئت اور علم ریاضی وغیرہ سب بے معنی ہو گئے۔ کیونکہ وہ سب علوم محسوسات پر مبنی ہیں اور افلاطون محسوسات کو ذریعہ علم و حقیقت نہیں سمجھتا۔ اُس کے یہاں تو محض شاعری اور تصورات ہیں۔ علاوہ اس کے ان خیالی مفروضات اور ذہنی تصورات کی دنیا کو اصلی دنیا کہنا اور جس دنیا میں ہم رہتے ہیں اور جس کو ہم محسوس کرتے ہیں اُس کو اس خیالی دنیا کا نقلی اور غیر حقیقی عکس کہنا کوئی معقول بات تو نہیں ہے ایسی ہی افلاطون کی جنت ہے۔ تمام ارواح کا ان ذہنی تصورات میں رہنا افلاطون کے نزدیک ان ارواح کی خوشی کی معراج ہے۔ اگر انسان محض اپنے ذہن پر بھروسہ کریگا تو یہی نتیجہ ہوگا۔ فرانس کے فلاسفر روسو .Rousseau (۱۷۱۲ء تا ۱۷۷۸ء) نے سچ کہا ہے کہ۔

If reason is against religion, so much the worse for Reason.

اگر عقل مذہب کے خلاف چلتی ہے تو وہ عقل بربادی کی طرف جا رہی ہے

افلاطون کے فلسفہ کا دوسرا اہم نظریہ سیاست ہے جو اُس نے کچھ تو مصر کے طرز حکومت سے اخذ کیا اور کچھ جاہلوں کی اُس جمہوریت کا مطالعہ کر کے مرتب کیا جس نے سقراط جیسے فلاسفر کو زندہ رہنے کے قابل نہ سمجھا مصر میں تو اُس نے دیکھا کہ حکومت ایک خاص جماعت کے ہاتھ میں ہے جو صدیوں کے تجربہ سے بہتر جہانبانی سے اچھی طرح واقف ہو گئے ہیں۔ اپنے اتھنز کے جاہلوں کی جمہوریت پر جو اُس نے غور کیا تو نتیجہ نکالا کہ محض جہال کی رایوں سے جو حکمران منتخب ہوں گے وہ بھی جاہل ہی ہوں گے۔

حکمرانوں کے تقرر و انتخاب کا طریقہ افلاطون کے نزدیک جمہوریت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہر ایک کو حکومت کرنے کا مساوی حق ہے۔ بلکہ اُس کے

معنی یہ ہیں کہ ہر ایک کو ہنر جہانبانی سیکھنے کے مساوی مواقع اور حقوق ہیں۔ جمہوریت مدرسہ میں ہونی چاہئے نہ کہ گورنمنٹ ہاؤس میں۔ حکومت کے عہدے رایوں کے فریب یا خفیہ سازش کی ریشہ دوانیوں سے تقسیم نہ ہونے چاہئیں۔ بلکہ ان لوگوں کو ملنے چاہئیں جنھوں نے اپنے تئیں اس کے قابل ثابت کر دیا ہے۔ کسی شخص کو کوئی عہدہ بغیر خاص سابقہ تعلیم کے نہ ملنا چاہئے۔ غرضکہ ملک کا نظامِ حکومت بہترین آدمیوں کے ہاتھ میں ہونا چاہئے۔ حکومت کرنے کی اہلیت رکھنے والوں کی ایک خاص جماعت ہونی چاہئے۔ ان حکمرانوں کا نام افلاطون نے گارڈین یعنی محافظین رکھا ہے۔ اُن کو ہنر جہانبانی کی تعلیم بچپن ہی سے ملنی چاہئے۔ وہ زمانہ ایسا ہے کہ جب ہر تعلیم اپنا دوامی اثر چھوڑ جاتی ہے اگر بچپن میں مخالف یا غلط خیالات نے اُن کے دماغ پر اثر کر لیا ہے تو اُس پہلی تعلیم کا اثر کبھی زائل نہ ہوگا۔ ان کے بچوں کے لئے علٰحدہ مدرسے ہونے چاہئیں اور اُن کو عوام الناس کے بچوں کے ساتھ نہ ملنا چاہئے۔

جائداد، اولاد اور عورت ایسی چیزیں ہیں کہ جن کی وجہ سے لوگوں کو برائی کی طرف راغب ہونا پڑتا ہے۔ اس برائی سے بچانے کے لئے افلاطون نے ایک طریقہ کمیونزم ایجاد کیا جو مندرجہ ذیل تجاویز پر مبنی تھا۔

۱۔ ان امیدواران حکومت کے لئے نہ کوئی گھر ہونا چاہئے اور نہ گھر والیاں۔

۲۔ ان سے بچے لینے کا طریقہ وہ ہی ہے جو حیوانات کے ہسپتالوں میں آج کل رائج ہے۔ ان سب کی مشترکہ عورتیں ہونی چاہئیں۔ آج ایک عورت کو ایک امیدوار حکومت کے سامنے پیش کر کے اُس کا نطفہ لے لیا۔ کل دوسری عورت کو دوسرے امیدوار حکومت کے سامنے اسی طرح پیش کر کے اُس کا نطفہ جمع کر لیا اور پھر جو عورت جس کے سامنے آجائے۔ یہ نہ ہونا چاہئے کہ ایک ہی عورت ایک ہی مرد کے سامنے بار بار آئے۔ ورنہ خرابیاں پیدا ہوں گی اور نطفہ ضائع جائے گا۔ مشترکہ عورتیں، مشترکہ مرد۔ نسلی کمیونزم مکمل ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ کوئی شخص یہ نہ کہہ سکے گا کہ فلاں میرا بچہ ہے۔ اور کوئی عورت نہ کہہ سکے گی کہ میں فلاں بچے کی ماں ہوں۔ کیونکہ سارے بچے حکومت کے ہوں گے۔

۳۔ حکومت ان بچوں کی پرورش کرے اور تعلیم کرے۔

۴۔ غرضکہ ان امیدواران حکومت کی نہ تو کوئی اولاد ہو، نہ بیوی ہو اور نہ جائداد ہو لہذا بے تعلق ہو جائیں گے۔

۵۔ یہ سب چیزیں اُن کے لئے قوم مہیا کرے اور وہ بھی ایک معین مقدار میں، اور اشتراک کی صورت میں۔

۶۔ یہ سب سختیاں اُن کو وطن کی خاطر برداشت کرنی چاہئیں۔

یہ سب طریقے فطرت صحیح اور عقل سلیم کے خلاف ہیں۔ گھر کی تعلیم، خاندان کی حکومت کا تجربہ، سب ان کے لئے مفقود ہوگیا۔ انسان کا اصلی اور دوامی کیرکٹر گھر میں بنتا ہے۔ یہ سب جانتے ہیں اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں۔ خاندان میں وہ صحیح طرزِ حکومت زیر عمل آتی ہے جو نہ کتابوں سے اور نہ ملکی سیاست سے حاصل ہو۔ مدرسہ کی تعلیم مصنوعی تعلیم ہے۔ گھر اور خاندان کی تعلیم اصلی اور قدرتی ہے۔ اتنی بڑی قدرت کی مہیا کی ہوئی درسگاہ کو مفقود کرنا اور اُس کے بجائے مصنوعی درسگاہ کو مقرر کرنا افلاطون کی اُن بڑی غلطیوں میں سے ایک غلطی ہے جس نے اُس کے اِس فلسفہ کو بالکل نکمّا بنا دیا۔ برخلاف اس کے اسلام کی تعلیم ملاحظہ ہو۔ جناب رسولِ خدا فرماتے ہیں:۔

۱۔ النکاح من سُنّتی ومن رغب عن سنّتی فلیس منّی۔

۲۔ النکاح من سنن المرسلین

۳۔ خیر متاع الدنیا المراۃ الصالحۃ

۴۔ کلکم راعٍ وکلکم مسئول عن رعیّۃ

یعنی

۱۔ نکاح میری سنت ہے اور جو میری سنّت کو ترک کرے گا وہ میری اُمت میں نہیں ہے۔

۲۔ نکاح انبیاء و مرسلین کی سنّت ہے۔

۳۔ دنیا کی سب سے بہترین دولت زوجۂ صالحہ ہے۔

۴۔ تم سب (اپنے خاندانوں کے) محافظ اور حاکم ہو، اور قیامت کے دن تم سے

رعیت کی نسبت باز پرس کی جائے گی۔

محبت۔ رحم، عدل، ہمدردی، صبر، ایثار، استقلال، دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دینا، دوسروں سے بغیر لوث اور امید کے محبت کرنی اور ان کو راہ راست دکھانی، مختلف طبائع وعادات میں انتظام اور عدل کرنا یہ سب کچھ گھر میں ہی سیکھ سکتے ہیں۔ مدرسہ میں ان کی تعلیم ہوئی بھی تو محض کتابی ہوگی۔

علاوہ اس کے یہ بھی دیکھنا ہے کہ افلاطون کی تجاویز ملکی وسیاسی حکمران جماعت کو کیا سکھاتی ہیں۔ وہ بے رحمی، بے حیائی اور بے غیرتی کا سبق دیتی ہیں حالانکہ حیاء رحم وغیرت ہی وہ صفات ہیں جو انسان کو حیوان مطلق سے ممیز کرتی ہیں۔ یہ فطرت انسانی ہے کہ اپنی عورت کو دوسرے سے تعلق کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ جانوروں تک میں یہ حمیت وغیرت پائی جاتی ہے۔ ہاں جانوروں میں سور ہی ایک فلاسفر ہے جو سمجھتا ہے کہ اس میں میرا کیا بگڑتا ہے۔ اور انتظار کرتا ہے کہ جب اس کا ساتھی فارغ ہوجائے تو یہ اپنا فلسفیانہ عمل شروع کرے۔ حکمران جماعت کو انسان کے طبقے سے گرا کر سور کی سطح پر لانا افلاطون کی اس تجویز کا نتیجہ ہے۔ اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ عورت کی غیور وخوددار فطرت کو مٹا کر اس کی جگہ رنڈیوں کی کمینہ خصلت پیدا کرنا ہے۔ برعکس اس کے اسلام کا فلسفہ بھی ملاحظہ ہو۔

جناب رسول خدا فرماتے ہیں۔

۱۔ اَلْحَیَاءُ مِنَ الْاِیْمَانِ۔

۲۔ اِنَّ لِکُلِّ دِیْنٍ خُلُقًا وَخُلُقُ الْاِسْلَامِ الْحَیَاءُ۔

۳۔ اَلْحَیَاءُ خَیْرٌ کُلُّہٗ۔

۴۔ مَا کَانَ الْحَیَاءُ فِیْ شَیْءٍ قَطُّ اِلَّا زَانَہٗ

۵۔ اَلْحَیَاءُ مِنْ سُنَنِ الْمُرْسَلِیْنَ۔

یعنی

۱۔ حیاء ایمان کا حصہ ہے۔

۲۔ ہر ایک مذہب کی ایک فطرت وخصلت ہوتی ہے۔ اسلام کی فطرت حیا ہے۔

۳۔ حیا ساری کی ساری خیر ہے، نیکی ہے۔

۴۔ جہاں جہاں اور جس میں حیا ہوگی اُس کو زینت دیگی۔

۵۔ انبیاء و رسل اولین کی سُنّت حیا ہے۔

حیا اور غیرت تو صریحاً و عملاً و یقیناً گئی، رحم کی خصلت بھی ان افلاطونی حکمرانوں میں نہ رہے گی۔ ان کی طبیعت پر خود غرضی اور محض خود غرضی حکومت کرے گی۔

ایک اور بڑا نقص اس تجویز میں ہے وہ یہ کہ ان حکمرانوں کو بیوی، بچوں، اقربا اور جائداد کا تو تجربہ نہ ہوگا اور جب اُن کے سامنے ان تعلقات کے مقدمات آئیں گے تو جو وہ فیصلہ کریں گے یقیناً غلط ہوگا۔ جس شخص کو کسی بات کا تجربہ و علم نہ ہو وہ کیا تو اُس بات کو سمجھے گا اور کیا اُس کے تنازعات فیصلہ کرے گا۔ جس پیچیدہ اور خطرناک راستہ پر کوئی چلا ہی نہیں تو اُس راستہ کے خطروں کا کیا علم ہوگا۔ کہاں خندق ہے۔ کہاں گڑھا ہے۔ کس موڑ پر کونسا درندہ بیٹھا ہوا ہے۔ کہاں وہ راستہ ناہموار ہے۔ یہاں یہ اعتراض درست نہ ہوگا کہ بدی سے بچنے کے لئے بھی بدی کا تجربہ کرنا ضروری ہے کیونکہ (۱) الہامی مذاہب خود بتا رہے ہیں کہ کیا کیا بدی ہے۔ (۲) بدی کا علم خداوند تعالےٰ نے انسان کی فطرت میں ودیعت کردیا ہے۔ نفس انسانی کے متعلق ارشاد ہے:۔ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا۔ اور یہاں ہم اپنے ناظرین کو اُن فلاسفران کی بحث کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ جن کو Intuitionists; کہتے ہیں۔

ایک اور خرابی بھی اس تجویز میں ہے۔ وہ یہ کہ افلاطون ملک کے اوپر افراد کی ہستی کو بالکل نیست و نابود کردیتا ہے۔ وہ امیدوارانِ حکومت یہ سب قربانیاں کیوں کریں اور تکالیف کیوں اُٹھائیں؟ جواب ہے ملک کی خاطر۔ ملک ہر ایک فرد کو کیا دیگا؟ جواب ہے: کچھ نہیں۔ صرف خود موٹا تازہ ہو جائے گا۔ یہ بحث سیاسی مدبران کو جچتی ہے جو حب وطن کا سبق پڑھا کر لوگوں کو اپنی اطاعت پر آمادہ کرتے ہیں۔ اور اپنے لشکروں میں بھرتی ہونے کی ترغیب دیتے ہیں تاکہ اُن کی حکومت قائم رہے۔ ایک فلاسفر اور حکیم کے منہ سے یہ بات اچھی نہیں لگتی۔ برعکس اس کے اسلام کوئی قربانی کسی فرد سے بغیر اُس کو اُس کا عوض دیتے ہوئے نہیں مانگتا۔ اس کی تفصیل اور تشریح اپنی جگہ پر آئے گی۔

افلاطون کے اصولِ حکومت

جہاں تک اصول کا تعلق ہے افلاطون کے اصولِ حکومت و حکمرانی نہایت عمدہ ہیں اور مطابق فطرت و عقل سلیم ہیں۔ اور اسلام کے اصول حکمرانی کے موافق ہیں۔

۱۔ عدل کی صفت حکمران کی فطرت کا خمیر ہونی چاہیئے۔

۲۔ حکمرانوں کو ذاتی مفاد یا امید نفع حکومت کے ساتھ وابستہ نہ ہو۔

۳۔ حکمرانوں کا بے لوث اور بے غرض ہونا چاہیئے۔

۴۔ حکمران کسی صورت اور کسی حالت میں دولت مند اور بارسوخ آدمیوں کے محتاج نہ ہونے چاہئیں۔

۵۔ ایثار و صبر اُن کے لئے بہترین صفات ہیں۔

۶۔ حکمران ایک ہی خاندان سے ہوں تاکہ عمدہ صفات بذریعہ توارث اُن کو ملیں۔

۷۔ توارث خصائل کے بعد بچپن کی تعلیم ہے۔ ان امیدوارانِ حکومت کو شروع ہی سے اچھی تعلیم ملنی چاہیئے۔ نیک صحبت میں رکھے جائیں۔ ان کی صحبت خود اُن کے ہی خاندان کے بچوں کے ساتھ ہو۔ باہر کے بچوں سے ان کو بچایا جائے۔

یہ تمام اصول اسلام کی حکومت و خلافت ہی کے ہیں۔ چنانچہ جناب رسول خدا نے اس ہی وجہ سے اپنے ولیعہد حکومت یعنی حضرت علیؑ کو بچپن ہی سے اپنے زیر نگرانی رکھا اور اسلام کی تعلیم دی۔ کفر کی ہوا سے بچایا۔

ارسطو ARISTOTLE

پیدائش ۳۸۴ ق م۔ توفیدگی ۳۲۲ ق م

مقام پیدائش: Thrace (تھریس) کے ساحل کا یونانی شہر Stagirus

ارسطو کا باپ مقدونیہ Macedonia کے بادشاہ .Amyntas II (سکندر اعظم کا دادا) کا درباری حکیم تھا۔ سترہ سال کی عمر میں ارسطو کو افلاطون کی Academy میں برائے تعلیم بھیجا۔ افلاطون کے مرنے تک وہاں سے نکل آیا۔ افلاطون کے مرنے کے بعد ۳۴۷ ق م میں بمقام Assus (شمالی ایشیائے کوچک) چلا گیا اور

اور وہاں کے بادشاہ کی لڑکی Pythias; سے ۳۴۴ ق م میں شادی کی کچھ عرصہ کے بعد اس کی بیوی مرگئی۔ اور ارسطو ایک رنڈی Herpyllis کے ساتھ رہنے لگا۔ ۳۴۳ ق م میں مقدونیا کے فلپ نے اپنے بیٹے سکندر کا اس کو استاد مقرر کردیا۔ جن فرائض کو اس نے ۳۴۰ ق م تک انجام دیا۔ ۳۳۵ ق م میں یہ اتھنز واپس آگیا۔ اور وہاں سبز درختوں کے جھنڈ میں جو چند عمارات تھیں اور چرواہوں کے خدا Apllo Lyceus کے نام پر وقف تھیں ارسطو نے اپنا مدرسہ کھلا جو اس نسبت سے Lyceum کہلایا جانے لگا۔

ارسطو ازمنہ ماضیہ کا سب سے بڑا طبیب اور سائنس داں تھا۔ اس نے بہت نظریۂ علم الحیات Biology میں قائم کئے جو اب تک قائم ہیں۔ اس نے ایک نہایت اہم اصول قائم کیا جو بعد میں ہربرٹ سپنسر نے بھی معلوم کیا یا جس کی تائید کی وہ نظریہ یہ ہے کہ جسم کی ترکیب و ساخت کی پیچیدگی اور بچوں کی تعداد میں نسبت معکوس ہے یعنی اگر جسم زیادہ پیچیدہ ہے تو بچے کم ہوں گے۔ چوہوں سوروں کے بچے زیادہ ہوتے ہیں انسان کا جسم چونکہ بہت زیادہ پیچیدہ ہے لہذا اس کے بچے کم ہوتے ہیں۔ شیر۔ ہاتھی وغیرہ کا جسم ان سے زیادہ پیچیدہ ہے اور انسان سے کم پیچیدہ ہے۔ لہذا ان کے بچے بلی، چوہوں کتوں سے کم ہوتے ہیں۔ لیکن ہوتے تو ہر سال ہیں۔ انسان سے زیادہ ہوئے یہ ایک نظریہ ہے۔ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بالکل ٹھیک ہے۔

فلپ کے بعد سکندر اعظم نے جو اس کا شاگرد تھا اس کے مدرسہ کو بہت مالی مدد دی اس کے شاگردوں اور مقلدین کو Peripatetics (مشائین) کہتے تھے کیونکہ ارسطو کی عادت تھی کہ ٹہلتے ٹہلتے لکچر دیتا تھا۔

ارسطو کو اس کی علمی تحقیقات میں سکندر کی طرف سے بہت مدد ملی۔ اول تو سکندر نے اپنے شکاریوں، باغبانوں اور مچھیروں کو حکم دیا کہ ارسطو کو حیوانات، نباتات وغیرہ میں سے جس کی بھی ضرورت ہو وہ اسے مہیا کردیں۔ اس طرح ارسطو کی خدمت میں کئی ہزار آدمی تھے جو یونان و ایشیا میں سے ہر ایک جانور اور پھولوں کے نمونے مہیا کرتے تھے، اس طرح ارسطو نے ایک نہایت وسیع چڑیا گھر Zoological Garden

بنالیا جو دنیا کا پہلا چڑیا گھر تھا۔ پھر ان علوم کی ضروریات اور لوازمات مہیا کرنے کے لیے سکندر اعظم نے ;Talents 800 دیے جو آج کل کے دس لاکھ پونڈ کے برابر ہوتے ہیں۔

ارسطو کا سب سے نمایاں طرۂ امتیاز یہ ہے کہ اُس نے ایک نیا سائنس یعنی منطق خود اپنے غور و فکر سے ایجاد کیا جب کہ اُس سے پہلے کوئی اس کی لئے نظیر نہ تھی۔ طب، علم الحیات، اور طبیعیات میں بھی ارسطو نے یونانی دنیا کو راستہ دکھا دیا اور بہت تحقیقات کیں۔

ارسطو کو طب سے زیادہ لگاؤ تھا۔ اُس زمانہ کی طب کا نظریہ یہ تھا کہ انسان کا جسم چار عناصر سے مرکب ہے۔ آتش، آب، خاک، باد۔ ان چاروں عناصر کے اعتدال کا نام صحت اور ان کے تناسب میں فرق کا نام مرض ہے اور بالکل ہی تناسب قائم نہ رہنا موت ہے۔ بقول شاعر ع موت کیا ہے ان ہی اجزاء کا پریشاں ہونا۔ ارسطو نے اپنے فلسفہ کو بھی اس ہی اصول پر قائم کیا اور کہا کہ خیر الامور اوسطہا۔ متضاد خواہشوں کے درمیانی حصّہ کا نام اوسط ہے۔ مثلاً ایک بہادرانہ فعل وہ ہوگا جو بزدلی اور ناعاقبت اندیشانہ جرأت کے درمیان ہے۔ بخل و اسراف کے درمیان سخاوت ہے۔ مناسب انکسار وہ ہے جو ذلیل عاجزی اور خود پسندانہ تکبر کے درمیان ہے۔ لہذا ارسطو کے نزدیک کردار کی بہتری اس میں ہے کہ انسان اُس عمل کو اختیار کرے جو دو حدوں کی اوسط ہے۔

روح اور خدا۔ ان فلاسفروں کی کیا روح اور ان کا کیا خدا۔ جدھر خیال دوڑ گیا وہ ہی روح اور جدھر قیاس ٹھہر گیا وہ ہی خدا۔ ارسطو نے روح کی تعریف یہ کی ہے کہ ہر ایک نشو و نما پانے والے جسم کی اصلیت و حقیقتِ خالص کا نام روح ہے۔ ارسطو کے نزدیک روح جسم کے اندر نہیں رہتی اور نہ وہ جسم کا حصّہ یا اضافہ ہے۔ یہ تو ایک علیحدہ شے جسم کے ساتھ ساتھ ہے۔ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہی جسم ہے۔ یعنی جسم کی نشو و نما اور خود بخود نما ہو جانے والی طاقت کا نام روح ہے۔ جسم میں جو کارکن طاقتیں ہیں اُن کے مجموعہ کا نام روح ہے۔ اُس کو جسم سے وہ ہی نسبت ہے جو بصارت کو آنکھ سے ہے۔ لیکن یہ جسم کا وہ کارکنِ اعظم ہے جو جسم پر پورا قبضہ رکھتا ہے۔ اُس کا ہی قابو خواہشات پر ہے۔ وہ ہی اعضائے جسم پر

حکومت کرتا ہے۔ قصہ مختصر یہ تمام اجسام روح کے اعضا ہیں۔

روح کے تین حصے یاد رہے ہیں نامیہ، حسّیہ اور عقلیہ۔ نباتات میں صرف نامیہ روح ہے۔ جانوروں میں حسّیہ اور نامیہ روح ہے۔ اور انسانوں میں روح کے تینوں درجے ہیں: نامیہ، حسّیہ اور عقلیہ۔ اس عقلیہ روح کے بھی ارسطو نے دو درجے رکھے ہیں ایک انفعالی عقلیہ یعنی Passive Rational; یہ اعلےٰ قسم کے جانوروں میں ہوتی ہے، مثلاً بندر، گھوڑا، کتا، ہاتھی۔ دوسری عملی عقلیہ یعنی Active Rational; جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ استقراء کے ذریعہ سے نتائج نکال لیتا ہے اور جدید اختراع بھی کر سکتا ہے اور یہ قابلیت اختراع ہی ہے جو کائنات کی روح ہے۔ انسان میں اُس کا محض ایک حصہ ہے۔ اور یہ قابلیت کبھی نہیں مرتی۔ لیکن یہ بقا محض لاشخصی (Impersonal;) ہے۔ جو باقی رہتی ہے۔ فنا نہیں ہوتی وہ یہ طاقت ہے نہ کہ شخصیت۔ اُس طاقت کی تعریف نہیں کی۔ ایسی طاقت جو شخصیت سے علٰحدہ ہو۔ شخص نو نمو، حس، عقل کا مجموعہ ہے وہ مَر جاتا ہے۔ اور اُس کو بقا صرف لاشخصی حاصل ہوتی ہے۔ ان فلسفیوں کی یہ معمہ سازی تو کوئی لاشخصیت ہی سمجھے۔ ہماری سمجھ میں تو نہیں آتی۔ طاقت کو جسم سے الگ کر کے اُس کو کائنات کی روح کہنا ہمارے نزدیک تو ایک معمہ بازی ہے بجلی ہی کی قسم کی کوئی طاقت ہوئی۔ لیکن پھر اُس میں فہم وذکا کہاں سے آیا جو کائنات کا انتظام کرتا ہے۔ فلسفیوں کا یہ بے معنی خدا ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ ہم نے تو یہ ایک انگریزی کتاب سے ترجمہ کر دیا ہے۔ لیکن وہ انگریز مصنف بھی کہتا ہے کہ میں نہیں سمجھا۔ (۵۱)

خدا کے متعلق ارسطو یہ کہتا ہے کہ جس طرح روح جسم کی ایک شکل ہے اُسی طرح خدا دنیا کی روح یا شکل ہے یعنی دنیا کی اندرونی طاقتوں اور کاموں کی ایک شکل تمام اسباب ایک اوّل سبب الاسباب کی طرف راجع ہوتے ہیں۔ اور وہ مسبب الاسباب کسی سبب کا نتیجہ نہیں ہے۔ کائنات کی تمام حرکتیں اُس اوّل محرّک کی طرف راجع ہوتی ہیں۔ ہم کو چاہئیے کہ حرکت اور طاقت

(۵۱) (51) The Life of Greece, PP. 531-32 and the foot-note.

کا اوّل سرچشمہ معلوم کریں اور وہ ہی سرچشمہ خدا ہے۔ خدا تمام حرکتوں کا موجب اور تمام مقاصد کا آخری مقصد ہے۔ جس طرح سے کہ درخت اپنی اندرونی طاقت اور ماہیت سے روشنی کی طرف آتا ہے اسی طرح تمام دنیا کی تمام اندرونی اور ذاتی طاقت اور قوتوں کا مجموعہ خدا ہے۔ خدا اس دنیا کا پیدا کرنے والا نہیں ہے بلکہ اس دنیا کی طاقت اور قوت ہے۔ ارسطو کہتا ہے کہ خدا ایک پاکیزہ خیال ہے، عاقل اور فہیم روح ہے۔ یہ ہے ارسطو کا خدا۔ ایسے خدا کو لوگوں کے امور سے کیا تعلق۔ اور جزا و سزا و عدل و عاقبت سے کیا کام۔

ارسطو کے بعد کے یونانی حکماء

ان کو چار جماعتوں میں تقسیم کیا گیا ہے (۱) Stoics; (رواقی) (۲) Epicureans; (لذتیہ) (۳) Sceptics; (حکماء لاادریت) (۴) Neo-Platonists; (افلاطونیت جدید) ان میں سے ہم اوّل تین کا ذکر کر چکے ہیں۔ اب افلاطونیتِ جدید کا ذکر کرتے ہیں۔

NEO-PLATONISTS; یعنی افلاطونیت جدید

افلاطونیت جدید کا اصلی بانی :Plotinus ہے جو مصر کے شہر Lycopolis; میں ۲۰۵ء میں پیدا ہوا۔ ۲۴۵ء میں روم میں آیا جہاں اُس نے اپنا علیحدہ مدرسہ کھولا۔ ۲۷۰ء میں مر گیا۔ افلاطونیت جدید دراصل ملحدانہ یونانی فلسفہ کی آخری لڑائی ہے جو اُس نے خدا اور عیسائیت کے خلاف کی۔

It. (Neo-Platonism) is a survival of the Pagan Spirit in Christian times. [In it the old Pagan spirit struggles desperately against its younger antagonist, and finally succumbs.

A Critical History of Greek Philosophy by W. T. Stace, P. 369.

ترجمہ:۔ عیسائیت کے زمانہ میں کفر کی روح نے افلاطونیتِ جدید کا جسم

اختیار کر لیا تھا۔ افلاطونیت جدید میں پورانے کفر کی روح اپنے نئے نو عمر مد مقابل (مسیحیت) کے خلاف اپنی پوری کوشش کرتی ہے اور آخر کار مغلوب ہو کر مر جاتی ہے۔

آخر کار افلاطونیت جدید مر تو گئی لیکن مسیحیت کو بھی مسخ کر گئی اس کو تفصیل سے ہم علیحدہ باب میں بیان کریں گے۔ اس بگاڑ کی وجہ یہ ہوئی کہ مسیحیت نے ارسطو کی تعلیم کو غلط سمجھا یا عمداً اس کی تعلیم کو اپنی مسیحیت کے موافق ثابت کر کے اپنی مذہب کی عظمت بڑھانی چاہی۔ مسیحیت ارسطو کو اپنا فلاسفر مان چکی تھی۔ اب افلاطونیت جدید نے ثابت کر دیا کہ افلاطون کا فلسفہ فنا و بقا و روح مسیحیت کے نظریہ سے بہت مختلف ہے۔ لہذا مسیحیت خود اپنی نظروں میں گر گئی۔

یہ تو غلط ہے کہ ہر ایک جزئیات میں تاریخ اپنے تئیں دوہراتی ہے لیکن تاریخ کی بنیاد فطرت انسانی پر ہے۔ اور فطرت انسانی ابتدائی آفرینش سے اب تک باوجود سینکڑوں فلسفیوں اور ہزاروں نبیوں کے ویسی ہی ہے جیسی کہ پہلے تھی۔ لہذا ہر زمانہ میں جب تقریباً ایک سے واقعات اس فطرت انسانی کے سامنے برائے عمل اپنے تئیں پیش کرتے ہیں تو اس فطرت کا عمل اُن پر ویسا ہی ہوتا ہے جیسے ایسے ہی سابقہ اجتماع واقعات پر پہلے ہو چکا ہے۔ اس محدود طریقے میں کہہ سکتے ہیں کہ تاریخ اپنے تئیں دُہراتی ہے۔ افلاطونیت جدید اور مسیحیت میں کیسی مشابہت ہے۔ تحریک بنو امیہ اور اور اسلام سے۔ بنو امیہ کی تحریک جو جناب معاویہ کے زمانہ میں بالکل عیاں ہو گئی وہ ہی کفر کی آخری کوشش اسلام کے خلاف تھی۔ اور اگرچہ اصلی کفر کربلا کے میدان میں ہمیشہ کے لئے شکست کھا کر مر گیا۔ لیکن مسلمانوں کی اکثریت کے مذہب کو اس تحریک کفر نے اسی طرح مسخ کر دیا جس طرح افلاطونیت جدید نے مسیحیت کو مسخ کیا تھا اور Phoenix کی طرح اُس کی جلی ہوئی راکھ سے اسلام کا طاقتور دشمن منافقت کی شکل میں نمایاں ہو کر اصلی اسلام سے ہمیشہ بر سر پیکار رہا۔

Plotinus; نے افلاطون کے فلسفہ کا یہ خیال لیا کہ دنیا کا پیدا کرنے والا ایک ہے۔ اور وہ دنیا بلکہ کائنات سے اتنا اعلیٰ و ارفع ہے کہ دنیا سے اور دنیا کے آدمیوں سے اُس کا کوئی تعلق نہیں۔ قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا تھا اور ہوا کہ ایسے ارفع و اعلیٰ اور بے تعلق ہستی نے دنیا کو کس طرح پیدا کیا۔ PLOTINOS نے خیالی نظریہ قائم کیا

کہ اُس بے تعلق ہستی سے ایک اور ہستی نکلی جس کا نام اُس نے Nous رکھا۔ اس Nous: میں سے روح عالم نکلی اور عالم وجود میں آیا۔ اُس کا کوئی ثبوت نہیں ہے یہ تو محض ایک شاعرانہ تخیّل ہے۔ عقلاً بھی یہ حقیقت نہیں ہو سکتی۔ یونانی فلسفہ کی یہ صریح ناکامیابی ہے کہ عقل پر اُس کا سارا دارو مدار تھا اور عقل سے وہ اس معمہ کو حل نہیں کر سکا یہ سوال کہ مادہ کس طرح پیدا ہوا۔ عقل کے لئے ناقابل حل معمہ رہا۔ اُس کو اس طرح شاعرانہ تخیّل سے حل کرنا صریح اقبالِ شکست ہے۔ اس کے بعد مذہب شروع ہوتا ہے۔

ایک تھوڑے سے وقفہ کے بعد جب کہ خدا و روح کو ماننا فلسفہ کے لئے ضروری تھا یورپ کا فلسفہ پھر دہریت کی طرف چلا گیا۔

یہ امر واقعہ ہے کہ زمانہ حال میں یورپ نے کوئی نیا فلسفہ جاری نہیں کیا۔ بلکہ وہ ہی پورانے یونانی فلسفہ کو ذرا حاشیہ آرائی سے بیان کر دیا ہے۔ فلسفہ کی بنیاد عقل پر ہے اور عقل انسانی ویسی ہی ہے جیسی پہلے تھی۔

آج کل بھی یورپ اور امریکہ کی یونیورسٹیوں میں وہ ہی پرانا افلاطون اور ارسطو کا فلسفہ بڑے شوق سے پڑھا جاتا ہے اور بہت عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ زمانۂ ماضی میں اور اب بھی عقل انسانی نے بہت کوشش کی اتنی کہ اب اس سے زیادہ کوشش نہیں ہو سکتی لیکن پھر بھی وہ حق کو نہ پا سکی (۵۲) اس زمانہ کے فلاسفر کے قلم سے یہ بہت بڑا اقبال ناکامیابی ہے۔ اس سے ہی مذہب کی ضرورت ثابت ہوتی ہے۔ افلاطون کے فلسفہ کے بڑے حصّہ کو مسیحیت نے اپنے میں لے لیا ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسیحیت محض افلاطون کے فلسفہ اور دیگر ملحدانہ تخیّلات مثلاً ;Orphism کا دوسرا نام ہے (۵۳) اس کی تفصیل ہم بعد میں کریں گے۔ اُنیسویں صدی بیسویں کے علم الحیات (;Biology) میں ارسطو کے بہت سے

(52) The Life of Greece. Chap. xxi. P. 513
(53) Ibid P. 523;

نظریات کی پیروی کی گئی ہے (۵۴ش) مندرجہ ذیل جدول سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمانۂ حال کے کس کس فلاسفر نے اپنے فلسفہ کی بنیاد ماضی کے کس فلاسفر کے فلسفہ کے اوپر رکھی ہے۔ (۵۵ش)

زمانۂ حال کا فلاسفر	ماضی کا وہ فلاسفر جس کے فلسفہ کی مطابقت اُس نے کی۔
Galileo	Thales
Hobbes	Democritus
Encyclopedists	Sophists
Voltaire	Protagoras
Spencer;	Aristotle
Anatole France	Epicurus
Pascal	Pyrrho
Hume	Arcesilus
Kant	Carneades
Schopenhauer	Zeno
Bergosan	Plotinus

اندریں صورت ہم اس مضمون کو یہیں ختم کرتے ہیں۔ زمانۂ حال کے فلاسفروں کا ذکر کر کے ماضی کے فلسفہ کو دُہرانا نہیں چاہتے۔

(۵۴ش) (54) Ibid P. 529

(۵۵ش) (55) Ibid P. 659.

باب ہفتم

غیر اسلامی فلسفے

(مذہب یونان)

یونان کو اُس کی تہذیب اور اُس کا مذہب ہمسایہ جزیرہ قریطہ نے دیا ہے لہذا پہلے اُس کا بیان ضروری ہوا۔

جزیرۂ قریطہ کے باشندوں کا مذہب

ہم نے جزیرۂ قریطہ کی تہذیب اور اُس کے مذہب کو اس وجہ سے منتخب کیا ہے کہ یہ یورپ کی سب سے پہلی تہذیب ہے۔ اور تجارت کے ساتھ ساتھ یہ تہذیب سارے یورپ پر مسلط ہو گئی۔ پہلے خیال کیا جاتا تھا کہ یونان کو قوم ڈورین Dorians. نے فتح کر کے اپنی تہذیب اور اپنی آبادی دی۔ لیکن بیسویں صدی عیسوی کے شروع میں جو آثار قدیمہ کے انکشافات ہوئے اُنھوں نے اس خیال کو قطعاً غلط ثابت کر دیا اور اب یہ امر مسلمہ ہے کہ اہل قریطہ نے یونان اور اُس کے ملحقہ ملکوں کو فتح کر کے اپنی تہذیب اپنی آبادی اور اپنا مذہب یونان کو دیا۔ اور پھر یہ تہذیب و مذہب تمام یورپ میں پھیل گئی۔

جزیرہ قریطہ بحر متوسط میں ایک طرف تو مصر اور یونان کے درمیان واقعہ ہے اور دوسری طرف اطالیہ اور ایشیائے کوچک کی ساحلی قوم کے ملک فینیقیا کے درمیان ہے۔ تجارت کی رو سے یہ بہت اچھا مقام تھا۔ چنانچہ تجارت بہت پھیلی۔ یہاں بہت عیش و عشرت اور اُس کے لوازمات بڑھ گئے۔ کوئی بدی اور بد اخلاقی نہ تھی جو یہاں نہ ہو۔ اُس کی تہذیب کو Minoan. تہذیب کہتے ہیں۔

چونکہ قریطہ دونوں کے درمیان تھا لہذا اس کی تہذیب بھی ایشیا اور مصر کا مخلوط

نمونہ ہے۔ قومیت کے لحاظ سے تو یہ لوگ ایشیائی کوچک سے آن کر آباد ہوئے تھے۔ لیکن زندگی کی ضروریات اور آرائش مصر سے لی گئی تھیں۔ اس تہذیب کا زمانہ Neolithic یعنی متاخر حجری سے ملا ہوا تھا۔ قریطہ کے خود اندرون ملک میں زندگی کے سامان کی اشیاء زیادہ نہ تھیں۔ اور آج کل کے انگلستان کی طرح اس کی زندگی بیرونی تجارت پر منحصر تھی۔ اور اس تجارت کی وجہ سے انگلستان کی طرح یہ ملک بہت دولت مند ہو گیا تھا۔ اور دولت اپنے ساتھ وہی عیش و عشرت کے سامان لائی جو دنیا کے ہر ملک اور ہر حصہ میں بربادی اور ہلاکت کا باعث ہوئے ہیں۔ قرآن شریف کی بیان کردہ سنت اٹل ہے کہ دولت مند آدمی اور امراء ہی اپنی اعمال کی وجہ سے باعث ہلاکت ہوتے ہیں۔ وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا۔ بنی اسرائیل ۱۷: ۱۶

یعنی ہم کو جب کبھی (اُس کے اعمال کی وجہ سے) کسی بستی کا ویران کرنا منظور ہوتا ہے تو ہم وہاں دولت مند لوگ بڑھا دیتے ہیں۔ وہ لوگ فسق و فجور کرنے لگتے ہیں تب وہ بستی عذاب کی مستحق ہو جاتی ہے۔ اور ہم اُس کو اچھی طرح برباد کر دیتے ہیں۔ امرنا کے معنی ہم نے بڑھایا کے ہیں یعنی زیادہ کیے۔ چنانچہ اس بستی پر تین دفعہ عذاب الیم آیا۔ لوگ نہ سنبھلے تو آخر میں یعنی تیسری دفع ایسا عذاب آیا کہ صفحہ ہستی سے نابود ہو گئی۔ اور اب آثار قدیمہ سے اُس کی گزشتہ ثروت کا پتہ چلتا ہے۔ اس بربادی ہی کے لحاظ سے اس تہذیب کے تین زمانہ مقرر کئے گئے ہیں۔

اس کا دارالسلطنت شہر نوسس Cnossus تھا۔ جہاں بہت بڑا قلعہ بھی تھا جس کے آثار اب تک ملتے ہیں ۱۹۰۰ء میں ڈاکٹر آرتھر الوینز Dr. Arthur Evans نے یہاں بڑے پیمانہ پر کھدائی کر کے حالات کا انکشاف کیا۔ اس تہذیب کے تین زمانے یہ ہیں:۔

(۱) سب سے پہلی قریط کی تہذیب تقریباً ۴۰۰۰ ق م تا ۳۰۰۰ ق م۔ ۳۰۰۰ ق م تا ۲۶۰۰ ق م، ۲۶۰۰ ق م تا ۲۳۵۰ ق م۔ گویا اس کے بھی تین حصے ہوئے۔

(۲) قریطہ کی تہذیب کا زمانہ وسطی ۲۳۵۰ ق م تا ۲۱۰۰ ق م۔

۲۱۰۰ ق م تا ۱۹۵۰ ق م۔ محلات کے بننے کا یہ آغاز کا زمانہ تھا۔

۱۹۵۰ ق م تا ۱۶۰۰ ق م۔ اس کے بھی تین حصے ہوئے۔

۱۹۰۰ ق م میں سب سے پہلی تباہی آئی۔

(۳) آخری زمانہ، تہذیب قریطہ ۱۵۰۰ ق م تا ۱۴۰۰ ق م اور ۱۴۰۰ ق م تا ۱۲۰۰ ق م۔

دوسری مرتبہ عذاب الٰہی نازل ہوا۔ یہ ۱۴۵۰ ق م تا ۱۴۰۰ ق م کا زمانہ تھا۔ اور تیسری دفعہ ۱۲۰۰ ق م میں تو یہ ملک ایسا برباد ہوا کہ کھنڈرات میں تبدیل ہوگیا۔

اکتشافات ارضی سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عذاب دو شکلوں میں آیا یعنی زلزلے اور آگ۔ اور اُس وقت آیا کہ جب یہاں کی آبادی گمراہی اور ظلم کرنے کی عادی ہوگئی تھی، ایک امریکن مورخ کہتا ہے کہ زلزلہ نے تمام محلات کو گرا کر زمین کے برابر کر دیا۔ یہاں کے ظلموں اور گمراہی کی حالت کو ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے:۔

یہ تباہی جب ہوئی Accumulated oppressions of Centuries کہ جب صدیوں کے مظالم اکٹھے ہوگئے تھے۔ سب سے پہلے تو Cnossus اور اس کا قلعہ برباد ہوا۔ پھر زلزلہ نے Phaestus کے شہر اور قلعہ کو برباد کیا۔ شہر Hagia Triada جل کر خاک سیاہ ہوگیا۔ یہ ۱۴۵۰ ق م کی بات ہے۔ ان شہروں میں اور دیگر شہروں میں امرا کے گھر بالکل نیست و نابود ہوگئے۔ ۱۴۰۰ ق م کے قریب شہر اور قلعہ Cnossus پھر تباہ ہوگئے۔ اس دفعہ غالباً بہت بڑی آگ نے ان کو تباہ کیا۔ اُسی زمانہ میں زلزلہ سے Gournic; Pseira Zakro; اور Palaikastro کے شہر برباد ہوئے۔

مورخ لکھتا ہے کہ یہ شہر اوپر سے نیچے اُلٹے دبے ہوئے نکلے ہیں۔ اور یہ عذاب ایسی بے خبری میں یکایک آیا کہ لوگ بازاروں میں معاملات کر رہے تھے اور گھروں میں عیش و عشرت کے دور چل رہے تھے کہ یکایک عذاب

الٰہی نے آدبوچا۔ اُس کے الفاظ یہ ہیں:۔

In any case, the catstrophe was sudden; the workshops of artists and artisans give every indication of having been in full activity when death arrived. About the same time, Gournia, Pseira, Zakro, and Palaikastro were levelled to the ground. (The Life af Greece by Will Durant PP. 21, 22.)

ترجمہ:۔ بہرحال بلائے ناگہانی (عذاب الٰہی) بالکل اچانک بے خبری میں آئی۔ دوکانداروں اور کاریگروں کی جو دُکانیں (دبی ہوئی برآمد ہوئیں) ہیں اُن میں قطعی اور یقینی علامات پائے جاتے ہیں کہ وہ اپنے کاموں میں مشغول تھے کہ یکایک موت نے اُن کو آدبوچا۔ اُسی وقت گورنیا، ساترا، ذکرو اور پیلیکاسٹرو کے شہر بھی زلزلہ سے منہدم ہوکر زمین کے برابر ہوگئے۔

ان حالات کی مطابقت بلکہ پیشین گوئی قرآن شریف سے سنئے۔ جو حالات اب جاکر ۱۹۰۰ء میں بڑی کھدائی کے بعد معلوم ہوئے ہیں اُن کی پیشنگوئی ساتویں صدی عیسوی کے نازل شدہ قرآن میں اس طرح بیان ہوئی ہے اس تباہی و بربادی کا اصلی باعث معلوم کیجئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اور بھی ایسے کئی قریے ہوں جو اس طرح برباد کردیے گئے۔

(۱) وَمَكَرُوا مَكْرًا وَّمَكَرْنَا مَكْرًا وَّهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ۞ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ مَكْرِهِمْ اَنَّا دَمَّرْنَاهُمْ وَقَوْمَهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۞ فَتِلْكَ بُيُوْتُهُمْ خَاوِيَةً بِمَا ظَلَمُوْا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۞ النمل ۲۷: ۵۰، ۵۱، ۵۲

(۲) فَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ فَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ وَّقَصْرٍ مَّشِيْدٍ ۞ الحج ۲۲: ۴۵

(۳) فَاَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِيْنَ ۞ فَجَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ ۞ الحجر ۱۵: ۷۳، ۷۴

(۴) قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا

كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ - آل عمران ۳ : ۱۳۷

ترجمہ :- (۱) ان لوگوں نے مکر کی تدبیر کی ہم نے بھی ان کے مکر کو توڑنے کی تدبیر کی، اور (ہماری تدبیر کی) اُن کو خبر بھی نہ ہوئی تو (اے رسول) تم دیکھو اُنکی تدبیر کا کیا انجام ہوا۔ ہم نے اُن کو اور اُن کی ساری قوم کو ہلاک کر ڈالا۔ اب یہ اُنکے گھر ہیں کہ ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ویران پڑے ہیں۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ اس واقعہ میں جاننے والے لوگوں کے لئے بڑی عبرت ہے۔

(۲) کتنی بستیاں ہیں کہ ہم نے اُنھیں برباد کردیا کیونکہ وہ سرکش تھیں۔ اب وہ اپنی چھتوں پر منہدم پڑی ہیں۔ کتنے کنوئیں بیکار ہو گئے اور کتنے مضبوط بڑے بڑے اونچے محل ویران ہو گئے۔

(۳) سورج نکلتے نکلتے ان کو بڑے زور کی آواز چنگھاڑنے نے ڈالا پھر ہم نے اسی بستی کو اُلٹ کر اوپر کو نیچے کر دیا۔ اور ان پر پتھروں کے مینہ برسائے۔

(۴) تم سے پہلے بہتیرے واقعات گزر چکے ہیں۔ پس ذرا روئی زمین پر چل پھر کر تو دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا۔

مذہب - اب ہم اُن کے مذہب کا ذکر کرتے ہیں۔

اُن کے خدا وہ ہی تھے جو اُنھوں نے یونان کو دئے تھے۔ وہ ہی آپس کا زنا اور چوری اور دھوکہ بازی، تقریباً ۱۲۵۰ سنہ ق م میں کریٹ (قرلیطہ) کا بادشاہ Minos; تھا۔ اُس کی بہت سی بیویاں تھیں۔ لیکن ہر ایک سے سانپ اور بچھو پیدا ہوا کرتے تھے۔ کسی ترکیب سے اُس کی بیوی .Pasiphae کے یہاں اصلی آدمی کے بچے ہوئے۔ اُن میں سے دو لڑکیاں Phaedra اور حسین Ariadne; تھیں Minos; نے کسی طرح ایک خدا کو ناراض کر دیا۔ اُس خدا کا نام Poseidon; تھا۔ اُس نے اپنا انتقام اس طرح لیا کہ اس بادشاہ کی بیوی :Pasiphae کے اندر یہ شہوت پیدا کر دی کہ وہ خدائی سانڈ سے جماع کرائے۔ چنانچہ اس کا انتظام کیا گیا۔ دونوں کی مباشرت ہوئی۔ اور اس مباشرت سے ملکہ نے ایک لڑکا Minotaur; جنا جس کا جسم آدھا آدمی کا اور آدھا بیل کا تھا جس کی خوراک زندہ انسان ہوا کرتی تھی۔

اہلِ کریٹ بہت مذہبی آدمی مشہور تھے - وہ پہاڑوں، غاروں، پتھروں، درختوں، ستونوں، بکریوں، سانپوں، سانڈوں اور فاختہ کی پرستش کرتے تھے - تھا نتین (۳) کی پوجا بھی کرتے تھے - اُن کا خیال تھا کہ تمام ہوا اچھی اور بُری روحوں سے بھری ہوئی ہے - اور یہ ہی عقیدہ اُنھوں نے یونان کو دیا - یونانیوں کا بھی عقیدہ تھا کہ جنگل میں خوبصورت پریاں اور بھوت رہتے ہیں - اور خوبصورت اور حسین مونث خدائیاں پہاڑوں اور دریاؤں میں آباد ہیں - اگرچہ اہلِ کریٹ خود انسان کے اعضاءِ تناسل کی پرستش نہیں کرتے تھے لیکن سانپ اور سانڈ کی قوت "جماع" کی تعظیم کرتے تھے - اور تعجب بھی کرتے تھے اور ایسی خدائنی کو مانتے تھے جو ماں کی طرح مہربان تھی اور اُس کے بڑے بڑے پستان اور موٹے موٹے کولھے تھے سانپ اور دیگر رینگنے والے جانور اُس کے بازوں اور پستانوں میں لپٹے ہوئے ہیں - اُس کے بالوں کی لڑوں میں بھی سانپ گندھے ہوئے ہیں اور اُس کے سر پر بھی سانپ لپٹے ہوئے ہیں - یہ خدائنی شہوت سے ہر وقت بھری رہتی ہے - اور چونکہ بچے جنتی ہے لہذا اُس کی پیدا کرنے کی قوت کی وہ پرستش کرتے تھے - کبھی کبھی وہ اپنے بچہ Velchanos; کو گود میں لئے ہوئے ہوتی ہے جو ایک پہاڑی غار میں پیدا ہوا تھا ایسی خدائنی کا تخیل اُس زمانہ کی ہر ایک ملک میں پایا جاتا ہے - مثلاً مصر میں Isis; Horus; بابل، سمیر و آغاد میں Ishtar; اور Tammuz یونان اور روم میں Aphrodite; Attis; Cybele; اور Adonis; اہلِ کریٹ نے اس عورت کے بچہ Velchanos; کو بھی خدائی درجہ دیا - اور اُس کو بارش اور پانی کا نر سمجھا گیا - اہلِ کریٹ کے مذہب میں پانی کو وہ ہی درجہ حاصل تھا جو حکیم تالیس نے دیا تھا یعنی حقیقت اوّل سمجھا تھا - اہلِ کریٹ کے اعتقاد کے بموجب اُن کا خدا Velchanos; مر گیا - مر کر قبر میں سے زندہ ہو کر پھر نکلا اور اہلِ کریٹ کے پروہت اُس کے دوبارہ زندہ ہونے کی رسم کو نہایت خوشی و اہتمام کے ساتھ مناتے ہیں - پرانے زمانہ کے مذاہب کے اعتقاد میں خدا کا مر کر قبر میں سے نکل کر زندہ ہونا رائج تھا - چنانچہ مذہب متھرا، اور مذہب عیسوی میں یہ اعتقاد پائے جاتے ہیں - حضرت عیسیٰ کے مُردہ جسم کو عیسائیوں کے اعتقاد کے بموجب قبر میں ڈال دیا گیا - دوسرے دن وہ

قبر میں سے زندہ ہو کر نکلے۔ اہل کریٹ کا اعتقاد ہے کہ اس خدا نے سانڈ میں جنم لیا۔ اور یہ ایسا ہی سانڈ تھا جس نے Minos بادشاہ کی بیوی Pasiphae; سے جماع یا زنا کیا تھا۔

اُن خداؤں کی خاطر و مدارات کے لئے وہ بہت قربانیاں کرتے تھے۔ اور اُن کے دل کو نرم کرنے کے لئے اُن سے بہت التجائیں کیا کرتے تھے۔ اور یہ رسوم قربانی و التجا عام طور سے خواتین پروہت کیا کرتی تھیں۔ بعض دفعہ سرکاری حکام ان فرائض کو انجام دیتے تھے۔ بھوتوں کو دفع کرنے کے لئے خوشبو جلاتے ہیں۔ خداؤں کی غفلت دور کر کے ان کی توجہ اپنی طرف کرنے کے لئے باجا بجاتے ہیں اور اُن کو خوش کرنے کیلئے بانسری بجاتے ہیں۔ درختوں میں پانی دیتے وقت کچھ رسوم کرتے ہیں تاکہ پانی کا خدا خوش ہو کر اُن میں سبزی اور فراوانی عطا کرے۔ زنانی پروہتیں بالکل ننگی ہو کر درختوں کے پکے پھل جھاڑتی تھیں۔ ایک بڑا جلوس خدائینی کے اعزاز میں نکلتا ہے۔ جس میں خدائینی کو پالکی میں بٹھا کر عورتیں گاتی اور ناچتی ہوئی چلتی ہیں۔ ان کا کوئی مندر تو نہیں ہوتا۔ لیکن پہاڑوں کے غاروں اور درختوں کے جھنڈ ہی کو مندر کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور وہاں اپنے خداؤں کو رکھتے ہیں۔ چند چیزیں جن کو وہ مقدس سمجھتے ہیں وہاں رکھی جاتی ہیں اور اُن کی پرستش کی جاتی ہے مثلاً سپر، صلیب جن کی تصویریں وہ ایک سانڈ کے ماتھے پر کاٹ کر یا داغ دیکر بناتے ہیں۔

اجداد پرستی بھی ان میں پائی جاتی ہے۔ مُردوں کو یہ بڑے مٹی کے تابوت یا مٹکوں میں بند کر کے دفن کر دیتے ہیں۔ ان کو ڈر ہے کہ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو یہ مُردے شاید واپس آ جائیں اور ہم کو نقصان پہنچائیں۔ اُن مردوں کو زمین کے اندر مشغول رکھنے کے لئے اُن کے ساتھ کچھ غذا، آرائش اور سنگبار کا سامان رکھ دیتے ہیں۔ مٹی کی عورتیں بنا کر بھی رکھ دیتے ہیں تاکہ یہ عورتیں اُن کو خوش رکھیں۔ بعض دفعہ اصلی خوراک کی بجائے مٹی کے جانور رکھ دیتے ہیں۔ اگر بادشاہ یا امیر کا مُردہ ہوتا ہے تو اُس کے جواہرات و قیمتی پتھر بھی رکھ دیتے ہیں۔ شطرنج کے کھلاڑی کے ساتھ شطرنج اور گویئے کے ساتھ مٹی کا ساز و سامان موسیقی بنا کر رکھ دیا جاتا ہے۔

اُس شخص کے مُردے کے ساتھ جو سمندر کا شائق تھا ایک مٹی کی کشتی بھی رکھ دی جاتی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ اُن ارواح کو جن کو یہ لوگ اس طرح پاک و صاف کر دیتے ہیں۔ اُن کے خدا Velchanos کا لڑکا Rhadamanthus جنت میں امن اور وہ خوشی دے گا جو ان کو اس دنیا میں نہ مل سکی۔ یہ اعتقادات مصریوں کے اعتقادات کے مشابہ ہیں۔ ان حالات کے لیئے دیکھو (۵۶)

(۴) یونان کا مذہب :-

ان مذاہب کے مطالعہ سے ایک بات بہت اچھی طرح نمایاں ہوتی ہے۔ وہ یہ کہ الکفر ملۃ واحدۃ۔ یہ سب مذاہب ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ بلکہ اُس ذات کا تخیل جس کو یہ خدائی کا درجہ دیتے ہیں ایک ہی اندازہ پر مبنی ہے۔ اگرچہ ہر ایک ملک میں یہ تخیل علیحدہ آزادانہ طور سے قائم ہوا ہے۔ لیکن چونکہ وہ سبب جس نے اس مذہب کو تقویت دی، یعنی ڈر، وہ سب میں مشترک تھا، وہ چیز جس نے یہ ڈر پیدا کیا (یعنی اندھیرا، مناظر قدرت اور اتفاقات) سب جگہ ایک سے تھے اور وہ شئے جس میں یہ ڈر پیدا ہوا یعنی دماغ انسانی: وہ بھی ایک تھا۔ لہذا وہ مذہب جو ان سب سے مل کر پیدا ہوا وہ بھی تقریباً ہر جگہ ایک ہی ہوا۔ ہاں ہر ملک میں کچھ کچھ واقعات علیحدہ تھے لہذا چند جزئیات میں اختلاف ہوا۔

ان تمام مذاہب کو ایک ہی قالب میں ڈھالنے والا ایک اور سبب بھی تھا۔ اور وہ سبب باہمی ارتباط بذریعہ سیاحت و تجارت تھا۔ اس صنم پرستی کا ابتدائی گھر مصر معلوم ہوتا ہے۔ مصر سے شام کا شوریا اور بابل، سمیر، آغاز میں ایک طرف اور کریٹ میں دوسری طرف یہ طوفان گیا۔ بابل کی طرف سے ہندوستان میں اور کریٹ کے ذریعہ سے یونان و فرنگستان میں پھیلا۔ اس طرح ساری دنیا کے

(56) Encyclopedia of Religions and Ethics; Bury's History of Greece, Chap. 1, Sec. 2; Will Durant's Life of Greece, Chapt. 1; The Cambridge Ancient History.

کفر کا منبع مصر ہوا۔ اور جب خداوند تعالےٰ نے اپنے انبیاء خصوصاً ابراہیمؑ، یوسفؑ اور موسیٰ علیہم السلام کو مصر میں ہدایت کے لئے بھیجا تو گویا تمام دنیا کے کفر کو ہدایت کا پیغام دیا گیا۔ اور ان سب کے فلسفے اور مذاہب میں جو اسلام سے ملتے جلتے تصورات کہیں کہیں پائے جاتے ہیں وہ اس ہی ہدایت کا اثر ہے۔ بادشاہ کو خدا تصور کرنا خاص طور سے مصر کی ایجاد معلوم ہوتی ہے اور اس ہی تخئیل کو نیست و نابود کرنے کے لئے حضرت موسیٰ فرعونِ مصر کی طرف بھیجے گئے۔

یونان کے مذہب میں دو باتیں بہت نمایاں ہیں۔ ایک تو خداؤں کی کثرت اور دوسرے اُن کے پرستاروں کی اطاعت۔ ہر ایک خاندان کا علیٰحدہ خدا ہوا کرتا تھا اور اُس کا بُت بھی خاندان میں رہتا تھا۔ اُس خدا کے نام پر ہر گھر میں ہمیشہ آگ جلتی رہتی تھی۔ کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں بجھتی تھی۔ اُس کے پرستار اپنے ہر کھانے سے پہلے اُس بت کے آگے کھانا اور شراب رکھتے تھے۔ گویا وہ اپنے خدا کے ساتھ کھانا کھاتے تھے۔ یہ ایک (مقدس شرکت) Holy Communion; تھی۔ اس مذہب کا یہ خاص اور اہم رُکن تھا۔ اس ہی سے نمونہ لے کر عیسائیت میں (شرکت عشائی ربانی) Holy Communion; اور Last Supper; کی رسوم گئی ہیں۔ کم سے کم تخئیل وہ ہی ہے۔ اس آتش فروزاں کے سامنے پیدائش، شادی اور موت کی رسوم ادا کی جاتی تھیں۔

اس خاندانی نمونہ ہی پر ہر برادری، قبیلہ اور شہر کا اپنا علیٰحدہ خدا ہوا کرتا تھا۔ مثلاً اتھنز شہر کے چند خدا تھے۔ اون کی پرستش عین شہر کے بیچوں بیچ اور نیز وہاں کے سب سے اونچے مقام پر ہوا کرتی تھی۔ اُس پرستش کی شرکت ہر یونانی کی علامت اور اُس کا حق ہوا کرتی تھی۔ اور جو یونانی شہری حقوق کا خواہش مند ہوا کرتا تھا اُس کے لئے اس پرستش میں شریک ہونا ایک لازمی شرط تھی۔ یونان میں شہری حکومتیں ہوا کرتی تھیں۔ اور اکثر یہ شہری آپس میں برسر پیکار رہا کرتے تھے۔ یہ لوگ جب لڑائی کے لئے نکلتے تھے تو ان کی فوجوں کے آگے آگے ان کے خداؤں کے بُت بھی جاتے تھے۔ ان کی کوئی اہم تجویز یا پالیسی بغیر خدا کے مشورہ کے نہیں ہوتی تھی۔ اور خدا کا مشورہ فال کے ذریعہ سے معلوم کیا جاتا تھا۔ اب یہ خدا کا فرض تھا کہ ان کی فوجوں کے آگے وہ

ان کی طرف سے لڑتے۔ شہر آپس میں کیا لڑتے تھے بلکہ اُن کے خدا آپس میں لڑتے تھے۔ اور شکست و فتح شہر یا شہر کے باشندوں کی نہیں بلکہ اُس کے خداؤں کی سمجھی جاتی تھی۔ ہر شہر کے ٹاؤن ہال میں دائمی آگ فروزاں رہتی تھی۔ خاندان کا باپ خاندانی خدا کی پرستش کا ذمہ دار ہوتا تھا اور وہی رسوم ادا کرتا تھا۔ اسی طرح شہری خداؤں کی پرستش کا ذمہ دار شہر کا حاکم۔ یعنی چیف مجسٹریٹ ہوا کرتا تھا۔ وہ شہر کا High Priest; سمجھا جاتا تھا۔ اور رسوم کی ادائیگی کا سردار ہوا کرتا تھا۔

خداؤں کی کثرت کی ایک تو یہ وجہ ہوئی کہ خاندان لاتعداد تھے۔ دوسرے ہر بات، ہر واقعہ، ہر تغیر کا ایک خدا علحٰدہ ہوا کرتا تھا۔ زمین آسمان کی ہر قوت اور عمل کے لئے علحٰدہ خدا ہوتے تھے، آسمان کے لئے باد و باراں، برق، اور برف، چاند اور ستاروں کے لئے علحٰدہ علحٰدہ خدا ہوتے تھے۔ دریاؤں، جنگلوں، سمندروں اور درختوں کے علحٰدہ خدا ہوتے تھے اور بہت سے ہوتے تھے۔ یہاں تک کہ رنج و غم و خوشی، راحت، غصہ، حسد، محبت، نفرت کے مختلف خدا ہوتے تھے۔ ہر ایک پیشہ و صنعت کے خدا علحٰدہ تھے۔ ان خداؤں کو اس یقین کے ساتھ خدا سمجھا جاتا تھا کہ کوئی کام، کوئی ارادہ کوئی فعل بغیر خدا کے نام لئے ہوئے اور اُس کی طرف منسوب کئے ہوئے نہیں کیا جاتا تھا۔ جب تو کہا گیا ہے کہ کفار اپنے جھوٹے خداؤں کی اتنی اطاعت کرتے ہیں کہ مسلمان اپنے سچے خدا کی اتنی اطاعت نہیں کرتے۔ ان سب خداؤں کو شخصیت اور انسان کی شکل دی گئی تھی، اور انسان کی طرح کے اعضاء اور عادات اُن کی طرف منسوب کئے گئے تھے۔ یہ خدا اتنے ہوئے کہ ان کا گننا ایسا ہی ناممکن تھا کہ جیسا قطرہ ہائے باران کا۔ اب ان کے علاوہ ہزاروں، جن، پریاں، بھوت، پریت ہوئے جن کی پرستش کرنی ضروری تھی۔ ان کے اندرونی خوف نے تخئیل کے ذریعہ سے ایسی شکلوں اور عادت والی عورتیں اور مرد پیدا کر لئے تھے۔ جن کے خیال سے خواہ مخواہ انسان کے دل میں خوف اور ہیبت پیدا ہو۔ مثلاً چند ایسے عورت کی شکل کے جاندار تصور کر لئے تھے جن کے بیان سے ڈر لگتا ہے۔ تین عورتیں EURYAL, STHENO اور MEDUSA تھیں انکے اُڑنے والے بازو ہوتے تھے اور جسم پر بالوں کی جگہ پھنپھناتے ہوئے سانپ تصور کئے گئے تھے۔

اوران کوبھی خدا سمجھا جاتا تھا۔ ہرایک خدا کے ساتھ چند قصے منسوب کر دیے گئے تھے جن سے اُن کی خدائی کا یقین لوگوں کے دلوں میں پیدا کرنا مطلوب ہوتا تھا۔

یونان میں بہت سے فلاسفر جن میں سے چند تو بظاہر مثلاً سقراط اورسب دل سے اس مذہب کوایک لغویت سمجھتے تھے۔ لیکن یونانی تہذیب کے آخری وقت تک علوم الناس اہل یونان ان "خداؤں" کو خدا سمجھتے رہے اور اون کی پرستش کرتے رہے۔ بلکہ نئے خدا بناتے رہے۔

یہ خدا تعداد میں اتنے تھے کہ ان کا شمار کرنا انسان کی طاقت سے باہر تھا لیکن اگر ہم ان میں کچھ ترتیب پیدا کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ان کی سات قسمیں تھیں۔

(۱) آسمان کے خدا۔

(۲) زمین کے خدا۔

(۳) پیدائش اور پیداوار کے خدا۔

(۴) جانوروں میں سے خدا۔

(۵) زمین کے نیچے دوزخ Hades; میں رہنے والے خدا۔

(۶) قوم کے نامی لوگ اور خاندانوں کے آباء واجداد جن کو ہمیشہ خدائی درجہ دیا جاتا تھا۔

(۷) کوہ اولمپس کے خدا۔

قسم اوّل

اوّل تو آسمان ہی ایک خدا سمجھا گیا تھا۔ جیساکہ وید کے ہندوؤں کے یہاں تھا جو آخر کار یونان میں Zeus; بن گیا۔ اہل سپارٹا گھوڑوں کی قربانی کیا کرتے تھے تاکہ وہ گھوڑے اوپر آسمان میں سورج کی گاڑی کو چلائیں۔ تخیئل یہ تھا کہ جس طرح امراء رتھ میں بیٹھا کرتے ہیں اسی طرح سورج خدا بھی گاڑی میں بیٹھ کر آسمان پر اُڑتا چلا جاتا ہے، جزیرہ روڈس Rhodes; کے رہنے والے یونانی حکومت کے دنوں میں سورج کو اپنا خاص خدا سمجھتے تھے۔ اور اُس کا نام Helios تھا۔ اور ہر سال

اُس خدا کے واسطے ایک گاڑی اور چار گھوڑے سمندر میں ڈال دیتے تھے۔ یونان میں بھی اس خدا کا اتنا زور تھا کہ یہ کہنے پر کہ سورج تو محض ایک آگ کا کرہ ہے انکزاغورس فلاسفر کو اتنا ستایا کہ قریب تھا کہ اُس کو قتل کر دیتے اگر وہ اپنی جان بچا کر بھاگ نہ جاتا۔

قسم دوم

لیکن یونان کے خداؤں کی اکثریت زمین ہی پر تھی۔ خود زمین دھرتی ماتا (G: E) کے نام سے خدا سمجھی جاتی تھی۔ زمین پر سینکڑوں خدا رہتے تھے، پانی میں ہواؤں، درختوں میں، جنگلوں میں، دریاؤں اور جھیلوں میں۔ غرض زمین کے کونے کونے میں خدا تھے۔ چرواہوں اور گلے کا خدا Pan: بڑا مشہور اور دلچسپ تھا۔ جنگل میں بانسری کی آوازیں آیا کرتی تھیں۔ اور سب سمجھ جاتے تھے کہ خدائی Pan; تشریف لائے۔ گانوں کی نوجوان عورتوں سے اُنھیں بڑا شغف تھا۔ اکثر اُنھیں حاملہ کر دیا کرتے تھے۔ اور وہ عورتیں اپنے والدین اور خاوندوں سے جا کر کہا کرتی تھیں کہ ہم کو خدائے Pan; نے حاملہ کر دیا ہے اور وہ لوگ اس نعمت کے لئے اس خدا کا شکریہ قربانی کی صورت میں ادا کیا کرتے تھے۔ اس کی شکل نصف بکرے اور نصف آدمی کی تھی۔ اس تحقیقات کی تو اُن کو کیا ضرورت تھی کہ یہ بانسری بجانے والا کون تھا، جس نے ہماری لڑکی یا بیوی کو حاملہ کیا۔ اُن کو یقین مستحکم تھا کہ جناب Pan; کا یہ کام ہے کوئی اور نہیں ہو سکتا۔

قسم سوم

طاقت پیدائش اور پیداوار بڑی زبردست تھی اور بہت مفید بھی تھی۔ لہذا یونانی بھی ہندوؤں کی طرح مرد کے عضو تناسل اور عورت کے اندام نہانی کی خوب پرستش کرتے تھے۔ اُن کی شکلیں بنا کر بڑے جلوس نکالا کرتے تھے، ہر ایک مذہبی جلسہ پہلے اس اعضائے تناسل کے جلوس سے شروع ہوتا تھا بڑے بڑے شہروں کے مذہبی جلسوں اور جلوس میں چھوٹے چھوٹے شہر اپنے اپنے

اعضائے تناسل بنا کر اس جلوس میں شامل ہونے کے لئے بھیجدیتے تھے۔ یہ عبادت کی تعریف میں آئے یا نہ آئے، اس سے اُن کا مقصد توحل ہو جاتا ہو گا۔ حکماء اور اطباء کے پاس اس سے بہتر کمزوری کا اور کیا نسخہ ہوتا ہوگا۔ اس طرح نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں خوب اولاد پیدا کرنے کا جذبہ زور کرتا ہوگا اور خوب اولاد پیدا ہوتی ہوگی۔

یونان کے کئی مشہور اور بڑے شہروں اور صوبوں میں ماتا دیویوں یعنی مؤنث خداؤں کی بڑی پرستش ہوتی تھی۔ ان ماتاؤں کے نسبت تصور تھا کہ یہ بغیر خاوند کی ہیں۔ اور جس خدا سے جب چاہتی ہیں مجامعت کرا کر بچے لے لیتی ہیں۔ زراعت کی ایک ایسی ہی ماتا دیوی (;Demeter) تھی۔ اس کی نسبت یہ تصور تھا کہ اس کی لڑکی (;Persephone) کو جبکہ وہ عطر آمیز نسیم سحر کی مسحور کن فضا میں اپنے گل عارض سے مقابلہ کرنے کے لئے گلوں کے باغ میں سے گلچینی کر رہی تھی اور بلبل عاشق کے دل کو جلا رہی تھی کہ اتنے میں اندرون ارض کا خدا ;Pluto اُس پر عاشق ہو گیا اور اُس کو دبوچ کر اندرونِ ارض کی دوزخ کی تاریکی میں لے گیا۔ وہاں مُردوں کی ارواح رہتی ہیں اور اس ;Pluto کا حکم جاری ہے۔ اُس کی ماں (.Demeter) روتی دھوتی وہاں پہنچی اور ;Pluto سے اس شرط پر مصالحت کر لی کہ سال کے نو مہینہ تو ;Persephone اس کے پاس زمین کے اوپر رہے اور تین مہینے اندرون ارض کی تاریکی میں Pluto کی آغوش میں رہے۔ ایسے ہی تھے ;Isis اور ;Osiris کے مصر میں، ;Tammuz اور ;Ishtar کے بابل میں ASTARTE اور .Adonis کے شام میں اور Attis اور ;Cybele کے ایشیائے کوچک میں رائج تھے اور ہمارے اس نظریہ کی تصدیق کرتے ہیں اَلْکُفْرُ مِلَّۃٌ وَاحِدَۃٌ غالباً ان کے ہی زیر اثر مسیحیت میں ماتا مریم کو خدا کا درجہ دیا گیا۔

قسم چہارم

اسی طرح جانوروں کی پرستش اور اُن کی خدائیت ازمنہ قدیم کے تقریباً

سارے ہی ملکوں میں جاری تھی۔ مصر میں اور ہندوستان میں تو ان جانور خداؤں کا چرچا یا گھر بنا ہوا تھا۔ تقریباً ہر ایک عجیب اور ڈراؤنا یا خوبصورت جانور خدا تھا۔ یونان میں بھی تقریباً یہی حالت تھی۔ سانڈ خاص طور سے طاقت اور قوت جماع کی وجہ سے خداؤں کی فہرست میں داخل ہو گیا تھا۔ Zeus; اور Dionysus; خداؤں کی شکل میں سانڈ کی مشابہت بہت ہے۔ اسی طرح Hera جو ایک خدائنی تھی۔ اُس کی آنکھ گائے کی تھی۔ گویا وہ گائے خدا تھی۔ اسی طرح سور اور سانپ کو خاص طور سے شہری مندر کا محافظ سمجھا جاتا تھا۔

قسم پنجم

زمین کے اندر کے خدا بہت خطرناک تھے اور اُن کی پرستش رات کو کی جاتی تھی۔ اُن میں سے ایک عظیم الجثہ اژدہے کی شکل کا تھا جس کا نام Zeus Meilichios; تھا۔ دوسرا خطرناک خدا اس ارض تاریک کا Hades; تھا۔ اُس کی یہ بڑی طاقت تھی کہ زمین کے ہر قسم کے درختوں کی جڑوں کو جلا کر خاکستر کر سکتا تھا۔ اس کو خوش کرنے کیلئے خوشامد کے طور پر اس کا نام Pluto; یعنی فراوانی کا دینے والا رکھا تھا۔ اس سے بھی زیادہ خطرناک ایک دیوی خدائنی تھی جس کا نام Hecate; رکھا گیا تھا۔ اس کی یہ خاصیت تھی کہ جس کے پاس جاتی تھی اُس کو پاگل کر دیتی تھی۔ اُس کو خوش کرنے کے لئے یونانی کتوں کے بچوں یعنی پلّوں کی قربانی کیا کرتے تھے۔

قسم ششم

یونان کی تہذیب سے بہت پہلے سے دنیا کے ہر حصہ میں لوگ اپنے مُردہ آباؤ اجداد کی پرستش کیا کرتے تھے اور اُن کو خدائی کے درجہ پر رکھا کرتے تھے۔ اُن کے غصّے کو قربانیوں سے ٹھنڈا کرتے تھے۔ اسی طرح یونانیوں نے کیا۔ یہ محبت کی وجہ سے نہ تھا بلکہ ڈر کی وجہ سے تھا۔ اس میں دوسری قسم اُن نیکنام یا حسین مردوں اور عورتوں کی تھی جو دنیا میں لوگوں کی توجہ کے مرکز رہ چکے تھے تیسری

نوع یہ بھی تھی کہ خدا کسی آدمی کے جسم میں داخل ہو کر اُس کو خدا بنا دیتا تھا، یا خدا نازل ہو کر کسی انسان عورت سے مباشرت کر کے اُس کو حاملہ کر دیتا تھا اور وہ بچہ خدا کا بچہ ہوا کرتا تھا۔ جس طرح Zeus; خدا نے Alcmena; عورت سے مباشرت کی اور Hades; بچہ پیدا ہوا۔ اس کا قصہ بھی عجیب ہے۔ یہ Alcmena; ایک بادشاہ کی بیٹی تھی اور ایک شخص Amphitryon سے منسوب ہو گئی تھی۔ لیکن Zeus خدا کا دل اس پر آ گیا۔ اور وہ خدا Amphitryon کی شکل میں اس کے پاس آیا۔ اور عورت سے مزے اُڑائے۔ اُس کو دھوکہ دیا کہ میں ہی تیرا خاوند Amphitryon ہوں۔ دوسرے دن Amphitryon بھی آ گیا۔ اور اُن خدا صاحب کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ یہ تھے کفار کے خدا۔

قسم ہفتم

کوہ اولمپیا کے خدا جن کو ہومر کی شاعری نے آسمان ہفتم پر چڑھا دیا۔ یہ اُن قبیلوں کے خدا تھے جنھوں نے یونان پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا تھا۔ پہلے خدا بوجہ شکست کے اُن کے ماتحت ہو گئے۔ اور یہ امراء کے خدا نمایاں سطح پر آ گئے۔ ان خداؤں میں سب سے بڑا اُن کا سردار Zeus; تھا۔ یہ تین بھائی تھے۔ دنیا کی حکومت کے لئے آپس میں قرعہ اندازی ہوئی۔ Zeus کو آسمان ملا، Poseidon کو سمندر ملا اور تیسرے بھائی Hades; کو اندرونی زمین کی حکومت ملی۔ تخلیق کائنات کا سوال پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ان خداؤں کے پیدا ہونے سے پہلے ہی کائنات پیدا ہو چکی تھی، جس طرح ویدوں کے خداؤں کے پیدا ہونے سے پہلے ہی کائنات پیدا ہو چکی تھی۔ لہٰذا ان میں سے کسی کو نہیں معلوم کہ کائنات کیونکر پیدا ہوئی اور کس نے پیدا کی۔ انسان کیونکر پیدا ہوئے۔ ہاں اس کا تخئیل ہے۔ جب ان نر خداؤں نے اپنی مادہ خدائینوں سے جُفتی کھائی تو انسان پیدا ہوئے۔ پھر انسانوں کی عورتوں پر یہ خدا عاشق ہوتے رہے۔ اُن سے جُفتی کھاتے رہے اور انسان پیدا ہوتے رہے۔

ان خداؤں کی طاقت اور لیاقت بھی محدود ہوتی تھی۔ ایک دوسرے کی

طاقت کو محدود کرتے تھے - آپس میں لڑائیاں بھی ہوتی تھیں، ایک دوسرے سے حسد بھی کرتے تھے اور آپس میں ایک دوسرے کو دھوکہ بھی دیتے تھے - بہر صورت Zeus سب کا سردار ہے اور دربار لگاتا ہے - اُس کے دربار میں دیگر خدا مثل نوابوں اور ڈیوک کے حاضر رہتے ہیں - اُس کے خاص کام یہ ہیں :- بچوں کو باپ کا مطیع رکھنا - خاندان اور اُس کی املاک کی حفاظت کرنا - جھوٹی قسم کھانے والوں کو سزا دینا - مہمانوں اور غریبوں کی حفاظت کرنا وغیرہ وغیرہ -

یہ معلوم کرنا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ یہ بڑا خدا پیدا کیونکر ہوا - اس کے باپ Cronus کی عادت تھی کہ اپنے بچوں کو پیدا ہوتے ہی نگل جاتا تھا - جب Zeus کی ماں Rhea حاملہ ہوئی تو اُس نے Uranus اور Ge خداؤں سے التجا کی کہ اس بچہ کو بچائیں - اُنھوں نے اُسکو Crete جزیرہ میں بھیجدیا - اور جب Zeus پیدا ہوا تو اُس کی ماں نے ایک پتھر کو کپڑے میں لپیٹ کر Cronus کو دیدیا - وہ سمجھا کہ یہ اُس کا بچہ ہے اور اُسے نگل گیا -

Zeus کو عورتوں سے جُفتی کھانے کا بڑا شوق تھا - اس کی معشوقوں کی ایک بہت لمبی فہرست ہے - اولمپس پر اُس کی پہلی بیوی Metis تھی جو عقل کی خدائنی تھی - افواہ پھیلی کہ Metis کے بچے بڑے ہوکر ذیوس Zeus کو تخت سے اُتار دیں گے - لہذا وہ اپنی بیوی کو سالم نگل گیا - Zeus کے پیٹ ہی میں Metis کی بچی Athena پیدا ہوئی اور Zeus کا سر چاک کرنا پڑا تب وہ نکلی - آخر میں جب بہت زنا کاری کرلی تو اُس نے اپنی بہن Hera سے شادی کرلی - لیکن اُن کی زندگی خوشی سے نہ گزری - اب اُس نے بیویوں کا سلسلہ جاری کیا - انسانی عورتوں میں پہلی بیوی Niobe تھی اور آخری بیوی Alcmena تھی جو Niobe ہی کی نسل میں سولھویں پشت میں تھی - یونانی اعلام کے بہت عادی تھے - لہذا اُن کا خدا Zeus بھی اس ہنر سے عاری نہ ہونا چاہئے تھا - اوس نے ایک خوبصورت لڑکے Ganymede سے محبت شروع کی اور آخر کار اُس کو بھگا کر لے گیا - اور کوہ اولمپس پر اپنی محفل شراب میں اُس کو ساقی بنالیا -

یہ تھا یونانی مذہب کا سب سے بڑا خدا جس کی پرستش بطور خدا کے صدیوں تک

ہوتی رہی۔ اُس کی اولاد نے بھی ایساہی بڑا نام پایا۔ اس کی لڑکی Athena پوری جوان اُس کے سر میں سے پیدا ہوئی۔ وہ Athens کی خاص خدائینی تھی۔ اُس کا بھائی Apollo سورج کا خدا موسیقی کا عاشق اور Delphi کا خاص مدبر تھا۔ ڈیوس کی اولادوں کے قصے اور دوسرے خداؤں کی داستانیں بیان کرنے کے لئے تو ایک کتاب چاہئے۔ ہم اس مضمون کو یہاں ہی ختم کرتے ہیں۔ ہم کو پھر ان خداؤں، اُن کی پرستش کی رسوم اور اُن کے مذہب کے اسرار کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ جب ہم مسیحیت کا ذکر کریں گے۔ اور دکھائیں گے کہ مسیحیت نے ان مذاہب سے کیا کچھ لیا ہے۔ بلکہ سب کچھ لے کر اپنے تئیں مسخ کر ڈالا۔

باب ہشتم

یہودیت اور مسیحیت

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصَارٰى الْمَسِيحُ ابْنُ اللّٰهِ ۚ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ ۖ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ ۚ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ أَنّٰى يُؤْفَكُونَ۔ توبہ ۹ : ۳۰

یورپ کے محققین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مسیحیت اور اسلام دونوں یہودیت پر مبنی ہیں اور اُنہوں نے اپنے بڑے بڑے اُصول خصوصاً تخیئل الٰہیت صفات باری تعالےٰ۔ جنّت، دوزخ، حشر و نشر وغیرہ کے عقاید یہودیت سے لئے ہیں۔ اُن کی بحث ہے کہ ان تینوں مذاہب میں چند اعتقادات مشترک ہیں اور چونکہ یہودیت ان سے پُرانا مذہب ہے لہذا وہی مذہب اپنے بعد کے آنے والے مذاہب کا ماخذ ہوا۔ یہ بالکل سطحی بحث ہے اور جو شخص گہری تحقیق کی تکلیف نہیں اُٹھانا چاہتا وہ اس کو جلدی سے قبول کر لیتا ہے۔ اور دہریت کے مبلغین کے لئے یہ اچھا موقعہ مل گیا۔ اُنھوں نے دیکھا کہ یہودیت اور مسیحیت میں بہت سے اعتقادات ایسے ہیں کہ جن کو عقل سلیم تسلیم نہیں کرتی اور ان دونوں کا آخری ماخذ خداوند تعالےٰ کی براہِ راست تعلیم کو دکھایا گیا ہے تو

انھوں نے کہا کہ نہ تو کوئی خدا ہے اور نہ خدائی تعلیم۔ یہ تو سب کچھ انسانی تخیلات کا نتیجہ ہیں جو زمانۂ حال کی روشنی میں قائم نہیں رہ سکتے لیکن وہ عقائد اسلام میں نہیں ہیں لہٰذا اُن کی ذمہ داری اسلام پر عائد نہیں ہو سکتی۔

اسلام میں اور ان دونوں مذاہب کے چند عقائد میں مماثلت ضرور ہے۔ لیکن مخالفت بھی بہت سے امور میں ہے۔ اور ان تینوں مذاہب پر نظر غائر ڈالنے سے مماثلت و مخالفت دونوں عیاں ہو جاتی ہیں۔ مماثلت کیوں ہے؟ وہ اس وجہ سے نہیں ہے کہ اسلام ان دونوں مذاہب پر مبنی ہے اور یہ دونوں مذاہب اُس کے ماخذ ہیں۔ بلکہ یہ مماثلت اس وجہ سے ہے کہ تینوں مذاہب چونکہ الہامی ہیں ان تینوں کا ماخذ و منبع ایک ہی ہے اور جب ماخذ و منبع ایک ہوا تو اُن اُمور میں جو واقعی ان سابقہ مذاہب میں الہامی باقی رہ گئے ہیں مماثلت ضروری اور لازمی ہوئی۔ اور ان امور میں اختلاف بھی ضروری ہوا کہ جن میں یہ دونوں مذاہب اپنے الہامی منبع سے ہٹ گئے ہیں۔ کیونکہ یہودیت اور نصرانیت میں مذہب کے یہ بنیادی اُصول بھی سابقہ اقوام کے ملحدانہ و کافرانہ تخیلات سے اثر پذیر ہو چکے ہیں۔ وہ آیات قرآنی جو ہم نے عنوان میں نقل کئے ہیں ایک بہت بڑے اختلاف کا ذکر کرتی ہیں اور یہ بھی اطلاع دیتی ہیں کہ یہ اور ایسے ہی لغو عقائد ان لوگوں نے سابقہ ملحدانہ مذاہب سے لئے ہیں۔ یہ ذرا سی مماثلت اور بہت سا اختلاف اُس وقت اچھی طرح نمایاں ہونگے جب ہم فقہ اسلام اور تعلیم آئمہ کا ذکر کریں گے۔ یہاں ہم اتنا ضرور کہے دیتے ہیں کہ مسلمانوں کی اکثریت نے بھی اپنے کو یونانی فلسفہ اور ایرانی الحاد میں رنگ لیا ہے۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ اکثریت کا اسلام بھی یہودیت اور مسیحیت کی طرح متغیر ہو گیا ہے۔ اور اس ہی اسلام کو دیکھ کر یورپ کے محققین اپنے اُس نتیجہ پر پہنچے جس کا ذکر ہم نے اوپر کیا۔ لیکن اس تغیر و تاثر میں بھی فرق ہے۔ یہودیت و نصرانیت کی وہ کتابیں جن کو وہ الہامی کہتے ہیں اپنے متن میں اور اپنی عبارت میں اس تغیر کو ظاہر کرتی ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ وہ الہامی کتابیں ہی نہ رہیں اور موجودہ کتابیں ان ملحدانہ و کافرانہ اثر میں تالیف ہوئی تھیں۔ برعکس اس کے اسلام کی الہامی کتاب اس اثر سے بالکل مبرا ہے۔ مسلمانوں کی اکثریت نے جہاں یونانی فلسفہ کے زیر اثر مذہب میں تحریف کی ہے وہ اس کتاب کی تاویل میں کی ہے۔ ایک دوسری بات قابل غور یہ ہے کہ یہودیت اور

مسیحیت میں کسی ایسے معلّم کی تعلیم باقی نہیں ہے جو اُن کی الہامی کتابوں کے صحیح الفاظ معانی وتاویل سے واقف تھا اور اس ملحدانہ اثر سے مبرا تھا۔ برعکس اس کے اسلام میں آئمہ آل محمدؐ ایسے گذرے ہیں جو قرآن شریف کے صحیح معانی وتاویل سے واقف تھے اور ملحدانہ اثرات سے مُبرّا تھے۔ اور جن کی تعلیم اب تک باقی ہے۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ اسلام میں کوئی ایسا عقیدہ نہیں جو مضحکہ خیز اور خلاف عقل ہو جس کی طرف دہریت اُنگلی اُٹھا سکے۔

یہ سب امور متذکرہ بالا ہم اپنی دیگر تالیفات میں اچھی طرح ثابت کر چکے ہیں۔ یہاں اُس بحث کے دُہرانے کی ضرورت نہیں۔ سلسلۂ کلام قائم رکھنے کی غرض سے یہاں ہم اُن کی طرف محض اشارہ کرتے ہیں۔ لیکن مذہب یہودیت اور نصرانیت کے متعلق اس امر واقعہ کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے کہ یہ دونوں الہامی مذاہب ہیں۔ ان کی اپنی اپنی الہامی کتاب علٰحدہ ہے۔ اور یقیناً اصلی توریت وانجیل کی تعلیم وہ تھی جو بعد میں اسلام نے دنیا کو یاد دلائی جن میں سے توحید خالص اور خداوند تعالیٰ کا جسم اور عوارضات جسم سے منزہ ہونا خاص سبق تھے۔ لیکن بوجوہات چند در چند جو ظاہر ہیں اور جن کو محققین نے تفصیل سے بیان بھی کیا ہے بہت جلد یہ دونوں مذاہب اپنی صحیح تعلیم سے ہٹ گئے۔ موجودہ توریت وانجیل جب لکھی گئیں تو ان میں الہامی جزو بہت کم تھا۔ بلکہ ضرورت وقت اور مصلحت زمانہ کے زیر اثر ان دونوں مذہبوں کے کارکنوں نے جنھوں نے یہ کتابیں لکھی ہیں اصلی کتابوں میں تبدیلیاں کرکے پیش کیا ہے۔ اور ان تبدیلیوں کا موقعہ آسانی سے اس وجہ سے مل گیا کہ اُن اصلی کتابوں کی اصلی زبانوں سے ترجمہ کرنا تھا۔ ترجمے میں الفاظ کے معانی آسانی سے بدلے جاسکتے ہیں۔ وہ ضرورت اور مصلحت کیا تھی یہ ہم ابھی بتاتے ہیں۔

جب مسیحیت دنیا میں آئی تو اس کا نہایت مخالف ماحول سے مقابلہ ہوا۔ یہاں تک کہ خود اُس کے پیغمبر کو دنیا میں رہنا مشکل ہو گیا۔ حضرت عیسیٰؑ کے رفع کے وقت اس مذہب کے سنبھالنے کا بوجھ اُن چند آدمیوں پر پڑا جو اپنے ماحول میں دنیاوی لحاظ سے معزز نہیں سمجھے جاتے تھے۔ مقامی گورنمنٹ جو بہت منظم اور مضبوط بھی ان کے خلاف تھی۔ اور اُس کے حکام ان کو طرح طرح کی ایذا

دیتے تھے۔ یہ وہ لوگ سمجھے جاتے تھے جنھوں نے اپنے باپ دادا کا مذہب چھوڑ کر ایک ایسا مذہب اختیار کیا تھا جو کسی کو پسند نہ تھا اور جس کی تعلیم سب سے علٰحدہ تھی۔ یہودی جن کو چاہئے تھا کہ عیسائیوں کو اپنا بھائی سمجھ کر اُن کی مدد کرتے یا کم سے کم مخالفت تو نہ کرتے اُن کو اپنا رقیب اور معاذ اللہ ایک جھوٹے شخص کا پیرو سمجھنے لگے۔ اور ان کی ایذا کے درپے رہنے لگے۔ نصرانیوں کے پیغمبر کا دنیا چھوڑنے کا سبب یہی یہودی تھے۔ حکام ان کو باغی سمجھ کر ان کو سزائیں دیتے تھے۔ اُس زمانہ میں جو حکومت کے مذہب کے خلاف تھا۔ وہ حکومت کا باغی سمجھا جاتا تھا۔ حضرت عیسٰی کے حوارین جنھوں نے حضرت عیسٰی کو دیکھا تھا نہایت ایماندار آدمی تھے۔ اور وہ اپنے عقائد میں کفر و الحاد سے کسی قسم کا راضی نامہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اُن کے مرنے کے بعد عیسائیوں نے سوچا کہ اگر ہمیں زندہ رہنا ہے اور اپنے مذہب کو قائم رکھنا ہے تو ہم کو چاہئے کہ موجودہ مذاہب سے جو لوگوں کے دلوں میں راسخ ہو چکے ہیں مصالحت کر لیں۔ اور یہ اسی طرح ہو سکتا تھا کہ اپنے عقائد کو اُن کے نمونہ پر ایسا مرتب کریں کہ اُن کے لئے اُس میں جاذبیت پیدا ہو جائے اور مسیحیت کو آسانی سے قبول کر لیں۔ اُن پادریوں نے دیکھا کہ کفاروں کے خفیہ رازدارانہ مذاہب Mystery Cults عیسائیت کے خطرناک رقیب ہیں کیونکہ ان کے عقائد اور تخیلات عوام الناس کے دلوں میں گھر کر چکے تھے۔ اس ضرورت کی وجہ سے اُنہوں نے اپنے مذہب کے عقائد میں ترمیم و تنسیخ شروع کر دی۔ اور اپنی بائبل کو اس طرح مرتب کیا کہ وہ لوگوں کے سابقہ اعتقادات کے مطابق ہوں۔ دیکھو (۵۷) اور جہاں اُنھوں نے ایسا نہیں کیا وہاں مسیحیت کامیاب نہیں ہوئی۔ چنانچہ چین اور ہندوستان وغیرہ میں اُن کی ناکامیابی کی یہی وجہ ہے کہ وہاں پادریوں نے Confucianism اور Brahmanism وغیرہ کے اعتقادات مسیحیت میں نہیں لئے۔ اور اُس وقت

(۵۷)

(57) Toynbbee's Study of History, Vol. V. pp. 466, 367, 538; Cambridge Ancient History, Vol. IV pp. 528-9; The Rise of Christianity by Earnest Williams Barnes, p. 84.

تک اتنا زمانہ گزر چکا تھا کہ وہ نہیں لے سکتے تھے۔ کیونکہ اس زمانہ تک اُن کے مذہب کی بائیبل مرتب ہو چکی تھی اور اطراف عالم میں پھیل چکی تھی۔ اب اُس میں کوئی نئے اعتقادات نہیں داخل کر سکتے تھے۔ اس ناکامیابی اور اُس کے وجوہات کے لئے دیکھو (۵۸)

عہد جدید کی انجیلیں:۔ حضرت عیسیٰ ۴ ؁ ق م میں پیدا ہوئے اور ۲۹ ؁ء میں اس دنیا سے انتقال فرمایا۔ مسٹر ہٹی نے صلیب کی تاریخ ۲۳ مارچ ۲۹ ؁ء لکھی ہے۔ جو حضرت عیسیٰ کی تعلیم تھی وہ بہت کچھ انبیاء و سلف بیان کر چکے تھے۔ انجیل کا مشہور مقولہ کہ جو تم سے بدی کرے تم اُس سے نیکی کرو۔ اگر کوئی داہنے رخسار پر طمانچہ مارے تو تم بایاں رخسار طمانچہ کے لئے اُس کے سامنے کر دو۔ ساتویں صدی قبل مسیح میں اسیریوں کے یہاں پایا جاتا ہے (۵۹)

مسٹر ہٹی کے نزدیک فرق صرف اتنا ہے کہ حضرت عیسیٰ نے ان اقوال پر عمل کیا۔ اور انبیاء و حکماء و سلف میں سے کسی نے ان پر عمل نہیں کیا۔

خود عیسائی محققین کی رائے ہے کہ جو تھیوری اور نظریئے ان انجیلوں کے متعلق عیسائیوں میں اُنیسویں صدی عیسوی کے آخر تک رائج تھے وہ اب حال کی تحقیقات نے غلط ثابت کر دیئے ہیں۔

زمانۂ حال کی تحقیقات کے نتائج ہم ذیل میں درج کرتے ہیں۔

یہ خیال غلط ہے کہ سب سے پہلے متی کی انجیل لکھی گئی اور اُس کے بعد دوسری انجیلیں لکھی گئیں۔ اور یہ بھی غلط ہے کہ جن شخصوں کے طرف یہ منسوب ہیں وہ ہی لوگ ان کے لکھنے والے تھے۔ بلکہ یہ طے شدہ امر ہے کہ سب سے پہلے مرقس Marks انجیل لکھی گئی۔ اور پھر اُس کو دیکھ کر اور سامنے رکھ کر متی Matthew اور لوقا Luke کی انجیلیں لکھی گئیں۔ ان دونوں موخر الذکر انجیلوں کا ماخذ ایک اور کتاب بھی تھی جو اب ناپید ہے۔ اُس کا نام لوگوں نے Q رکھ لیا ہے۔

---

(58) Toynbee's History, Vol. V, p. 367, N. 2. (۵۸)

(59) History of Syria by P.K. Hitti, pp. 328-9. (۵۹)

مرقس. کا لکھنے والا ایک عیسائی تھا جس کا نام تک نہیں معلوم Marks کی طرف یہ غلط منسوب ہے - یہ ۷۰ء میں لکھی گئی تھی - اور یہ صرف اون قصے کہانیوں کا مجموعہ ہے جو اُس زمانہ میں لوگوں میں رائج تھے - یہ روم میں لکھی گئی تھی - اس کا لکھنے والا Barnabas کا چچازاد بھائی نہیں ہے - اور نہ اس میں PETER پطرس کے تاثرات ہیں -

لوقا - محض اس لئے کہ اس کتاب کی وقعت بڑھ جائے - اس کا نام لوقا (Luke) رکھدیا - ورنہ دراصل یہ لوقا کی لکھی ہوئی نہیں ہے - لوقا اور رسولوں کے اعمال (Acts) ایک ہی شخص کی تالیف ہیں اور یہ دونوں ۱۰۰ء میں ایک نامعلوم تعلیم یافتہ آدمی نے لکھی ہیں - اس کے بعد ان دونوں میں تبدیلیاں ترمیمات، اور اضافے ہوتے گئے - یہ تبدیلیاں ۷۰ء سے ۱۵۰ء تک جاری رہیں اور ۱۵۰ء میں اس کو موجودہ شکل دی گئی - چنانچہ حضرت عیسی کے قصہ رجعت بعد موت میں بہت سی تبدیلیاں ہوئیں -

متی کی انجیل - یہ مرقس اور Q پر مبنی ہے - ۹۵-۱۰۰ء میں لکھی گئی جبکہ لوقا کی انجیل مرتب ہوئی - یہ ملک شام اور فلسطین کے یونانی زبان بولنے والے باشندوں کے لئے لکھی گئی تھی - جس طرح لوقا عام عیسائیوں کے لئے لکھی گئی تھیں - اس کے مؤلف کا نام نہیں معلوم - لہذا دوسری صدی عیسوی کے وسط تک اُس کا موجودہ نام نہیں تھا - بلکہ کوئی بھی نام نہ تھا - لیکن دوسری صدی کے وسط کے بعد سے اُس کو متی کی طرف منسوب کرنے لگے تاکہ وقعت بڑھ جائے -

یوحنا کی انجیل - یہ انجیل بھی یوحنا John کی لکھی ہوئی نہیں ہے - اس کو دوسری صدی عیسوی کے شروع میں ایک مذہبی معلم نے لکھا تھا - لیکن لکھنے والے کا نام نہیں معلوم - اس میں بہت سے فرضی قصے درج کیے گئے ہیں اور معجزات کی بھرمار ہے تاکہ لوگوں کے اعتقاد پختہ ہو جائیں -

یہ چاروں انجیلیں مسودوں کی صورت میں لوگوں میں جاری رہیں - اور ان میں

تبدیلیاں اور اضافے ہوتے رہے۔ یہ یاد رکھنے کے قابل بات ہے کہ انجیل کا کوئی نسخہ چوتھی صدی عیسوی کے پہلے کا لکھا ہوا دستیاب نہیں ہوا۔ چوتھی صدی عیسوی تک جو تبدیلیاں تحریرات اور اعتقادات میں ہوئی، ہیں وہ ان میں ہوئی ہیں لہذا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ موجودہ دین عیسوی چوتھی صدی عیسوی میں تیار و مکمل ہوا۔ مندرجہ بالا واقعات کے لئے دیکھو۔(۶۰)

مسٹر ٹو آئن بی (MR. TOYN BEE) نے ان امور پر بہت اچھی تحقیق کی ہے۔ ان کی تحقیق کے بموجب ان انجیلوں کے مرتب ہونے کی تاریخیں یہ ہیں۔

انجیل مرقس ۵۶ء

انجیل متی اور انجیل لوقا ۷۰ تا ۹۵ء

انجیل یوحنا تقریباً ۱۰۰ء

تاریخوں میں تو زیادہ فرق نہیں ہے۔ لیکن مسٹر ٹو آئن بی نے جو اس تحقیق میں محنت اور جانفشانی کی ہے وہ قابل داد ہے۔ انھوں نے ان انجیلوں سے پہلی کی یونانی زبان میں لکھی ہوئی تاریخوں اور سوانح حیات کی کتابوں کا مقابلہ کر کے مندرجہ ذیل نتائج برآمد کئے ہیں۔

(۱) 87 نظائر دے کر ثابت کیا ہے کہ بائبل میں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق جن خیالات اور صفات کا ذکر ہے۔۔ وہ یونانی رومی مصنفین و بڑے آدمیوں کے متعلق پہلے ہی بیان کئے جا چکے تھے۔ وہاں ہی سے بائبل لکھنے والوں نے اپنی انجیلوں میں نقل کر لئے ہیں۔ یہ مثالیں زیادہ تر اور (Diodorus) کی تاریخ (History) سے لی ہیں۔ (Diodorus) انجیلوں سے تقریباً ۶۵ سال پہلے کی لکھی ہوئی تھی۔ اور (Plutarch) کی (Lives) اس وقت ہی لکھی گئی تھیں کہ جب متی اور لوقا مرتب ہوئی تھیں۔

(۶۰)

(60) The Rise of Christianity, by William Barnes Chapt. VII; Hitti's History of Syria, pp. 349, 549; The Life of Jesus by Ernest Renan.

یوحنا کی انجیل پلوٹارک کی Lives کے بعد لکھی گئی تھی۔

(۲) یونانی کفار کی کتابوں میں بہت سے الفاظ اور مثالیں اور جملے ان چاروں انجیلوں میں لئے گئے ہیں۔ اور قصّوں میں بھی بہت مشابہت ہے۔اس کی تیرہ مثالیں ہیں۔ ان میں بہت سی مثالیں Proverbs ایسی ہیں جن میں یونانی لکھنے والے نے اپنے ہیرو کو خدا کا بیٹا کہا تھا۔

(۳) حضرت عیسیٰؑ اور یونانی خدا کے بیٹے Herakles کے قصّے جو یونان کے زمانۂ الحاد میں مقبول تھے۔ وہ ہی ان انجیلوں کے لکھنے والوں نے اپنے عیسیٰ کے لئے ہو بہو وہاں سے لے لیں۔

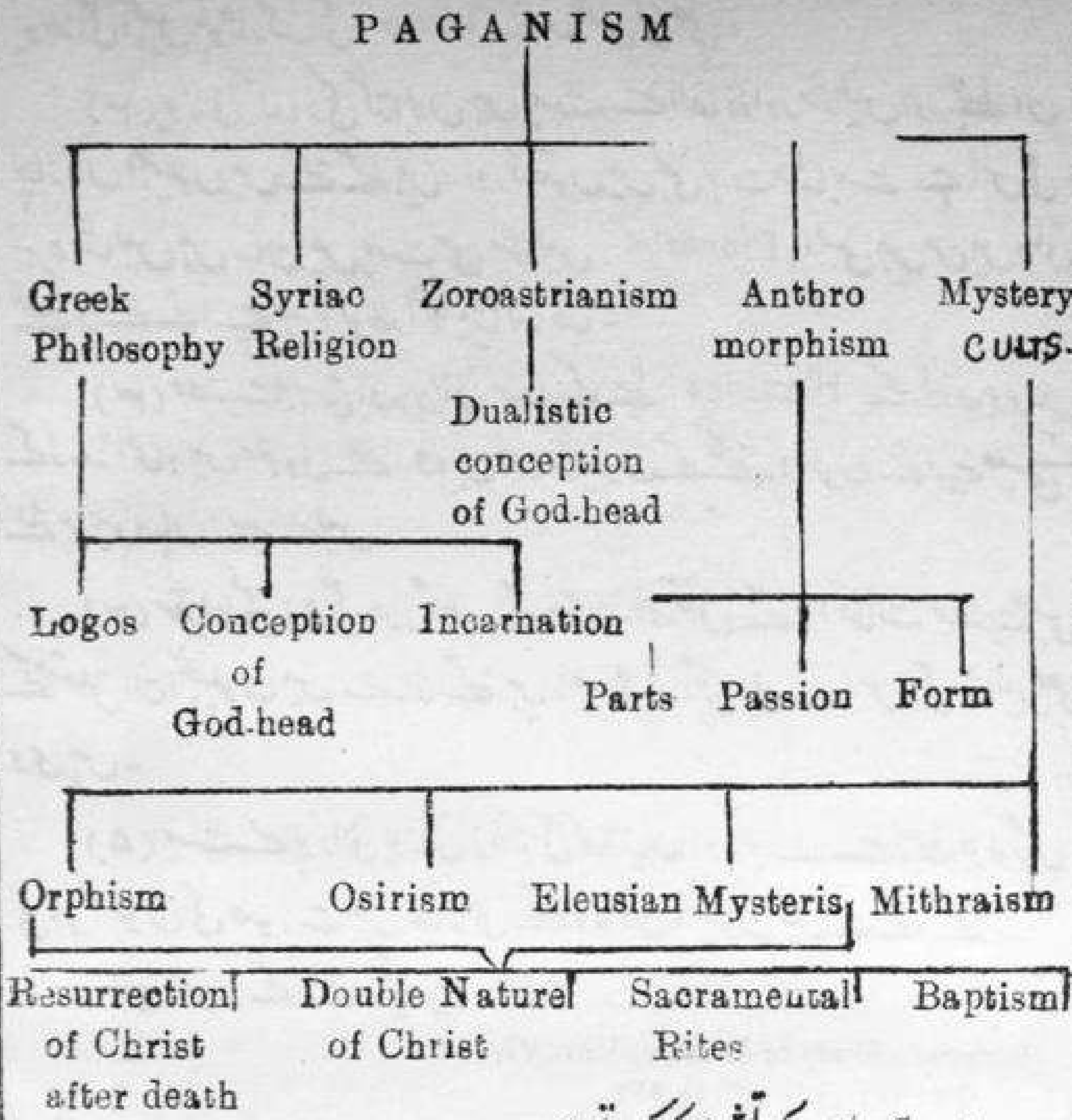
(۴) سقراط کی زندگی اور اُس کے مقدمہ اور قتل کے واقعات حضرت عیسیٰ کے متعلق ان انجیلوں میں لے لئے گئے ہیں۔ مسٹر ٹوائن بی نے اس کی مثالیں بھی دی ہیں۔

(۵) بہت سے پورانی یونانی زمانہ کی کہانیاں اور بہت سے جملے جو لوگوں کی افواہوں کی صورت میں جاری تھے وہ ان انجیلوں میں لے لئے گئے۔

ان امور کے لئے دیکھو:

Toynbee's Study of History, Vol. VI.
For (1). pp. 377 to 413;
For (2). pp. 414 to 417;
For (3), pp. 455 to 476;
For (4), pp. 486 to 495;
For (5), pp. 501 to 508;
Toynbee's Study of History.
Vol. I. p. 91; Vol. II. pp. 286, 287; Vol. V. pp. 366, 538;
Vol. VI. pp. 268n, 362, 456, 587;

اب ہم ایک ایسا نقشہ یا جدول پیش کرتے ہیں جس میں الحاد کے وہ مذاہب درج ہیں جن سے مسیحیت میں اعتقادات لئے گئے ہیں۔ اُن اعتقادات کو بھی اس میں بتایا گیا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ نقشہ محض ایک خاکہ ہے۔ وہ تمام اعتقادات اس میں درج نہیں ہو سکے ہیں جو مسیحیت نے اس طرح کفر سے راضی نامہ کر کے لئے ہیں۔ اس کے لئے تو ایک علیحدہ مستقل کتاب چاہئے اور وہ بھی اچھی خاصی ضخیم۔



اب ہم اس کی تشریح کرتے ہیں :-

یہ امر مسلمات میں سے ہے کہ مسیحیت کی انجیل یعنی عہد جدید میں یونانی فلسفہ کا عنصر غالب ہے اور یونانی تخئیلات کے زیر اثر یہ چاروں انجیلیں مرتب ہوئی ہیں - دیکھو-

Toynbee's Study of History, Vol. VI.
For (1), pp. 377 to 413;
For (2), pp. 414 to 417;
For (3), pp. 455 to 476;
For (4), pp. 486 to 495;
For (5), pp. 501 to 508.

مسٹر ہٹی کہتے ہیں :-

ترجمہ :- مسیحیت میں یونانی خیالات کی آمیزش کر کے انجیلوں کے لکھنے

والوں نے مسیحیت کو تمام دنیا میں پھیلنے کے قابل بنا دیا .... مسیحیت کو کبھی یونانی رومی قبول نہ کرتے اگر اُس میں یونانی عقائد شامل نہ کر لئے جاتے۔ (۶۱) - اصل کے لئے دیکھو ضمیمہ - ۱۲

الہیت کا تصوّر

مذہب کے یہی دو ارکان ہیں، خدا کا تصور اور انبیا کا توسل۔ یعنی خدا و رسول کی معرفت۔ اس صحیح معرفت ہی پر انسان کی ساری زندگی کا دار و مدار ہے۔ اُس پر ہی اُس کے طرزِ عمل کا انحصار ہے۔ انسان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کو اپنے خدا اور رسول کے صفات و احکام کے مطابق بنائے۔ اسلام کا حکم ہے کہ تخلقوا باخلاق اللہ ۔ قرآن شریف کا ارشاد ہے:۔

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ - الاحزاب ۳۳: ۲۱

اگر انسان نے خیال کیا (جیسا کہ کئی مذاہب کا عقیدہ ہے) کہ خدا میں بھی ہماری طرح کے جذبات ہیں، فرق یہ ہے کہ وہ اعلیٰ پیمانہ پر ہیں تو وہ اپنی ساری کمزوریاں خدا کے اندر بھی تصوّر کرے گا۔ پھر اپنے میں سے اُن کمزوریوں کے دور کرنے کے لئے نہ اُس میں خواہش ہوگی اور نہ کوشش ہوگی۔ اگر وہ سمجھتا ہے کہ اُسکے رسول میں بھی مکر و فریب و سازش کی صفات و عادات ہیں تو وہ ان صفات و عادات کو اپنے اندر مذہبی جوش کے ساتھ پیدا کرے گا۔ تمام مذاہب میں تنازعہ محض صفات خداوندی کے متعلق ہے۔ مسیحیت کو عوام الناس کے لئے خوش آئندہ اور قابل قبول بنانے کے لئے ان ہی کا فرانہ تخئیلات کو دیگر ملحدانہ مذاہب اور فلسفوں سے لیا گیا ہے۔ اختصار کے ساتھ ہم اس کا ذکر کرتے ہیں۔

مسیحیت کے اعتقادات کا ایک ماخذ یونانی فلسفہ کا تخئیل Logos بھی ہے۔ چوتھی انجیل کا لکھنے والا ایشیائی کوچک کے ساحلی

(61) Hitti's History of Syria, Chapt. XXV. p. 331. (۶۱)

شہر (Ephesus) کا باشندہ تھا۔ اور یہ وہی شہر تھا جہاں تقریباً ۵۰۰ ق م میں ہرقلاطیس : Heracleitus نے LOGOS کا نظریہ قائم کیا تھا اور اُس کی تشریح بھی کی تھی۔ دراصل ہرقلاطیس کے نزدیک LOGOS نیچر یا خدا ہے۔ اس کی تعلیم ... نے ۳۰۴ ق م میں دی تھی۔ ان کے خیال میں تمام عالم ہی خدا تھا۔ گویا نیچر ہی خدا تھی۔ اور LOGOS اُس میں جان پھونکنے والی روح تھی۔

مسٹر ولیم بارنز : William Barnes لکھتے ہیں :۔ (یہ اُن کی انگریزی تحریر کا ترجمہ ہے۔)

"یہ اعتقاد کہ حضرت عیسیٰؑ LOGOS ہیں اور بوجہ LOGOS ہونے کے تمام نور و زندگی کے سرچشمہ ہیں۔ چوتھی انجیل میں بار بار دُہرایا گیا ہے۔ اس کے مصنف کا سب سے بڑا پیغام یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ میں LOGOS نے گوشت و پوست کا جسم اختیار کر لیا اور ہمارے درمیان رہا۔ اور ہم نے اُس منور عظمت کا ملاحظہ کیا۔ وہ منور عظمت جو معلوم ہوتا تھا کہ ایک باپ کی اکلوتی پیدائش رحم و حق سے بھری ہوئی ہے۔ (۶۲)

ظاہر ہے کہ اس انجیل نے اپنے خدا کا تخیّل یونانی فلسفہ سے لیا۔ ابنیتِ عیسیٰ کا ماخذ بھی یہ ہی تخیّل ہے۔

INCARNATION : (اوتار) خدا کا انسان کے جسم میں ظاہر ہونا۔ یعنی انسان کا جسم اختیار کر لینا۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ ہندوستان، یونان، اور مصر تمام اصنام پرست اقوام کا یہ ہی عقیدہ تھا کہ بہت سے جانوروں میں اور انسانوں میں خدا حلول کئے ہوئے ہے۔ اور جب چاہتا ہے کوئی سا جسم اپنی مرضی کے مطابق اختیار کر لیتا ہے۔ بہت سے جانوروں اور انسانوں کو خداؤں کا اوتار مانتے تھے۔

یونان کے مذہب Orphism کا یہی عقیدہ تھا۔ اس سے (فیثا غورث) حکیم نے یہ تخیّل لیا اور وہاں سے ہندوستان وغیرہ میں یہ

(62) The Rise of Christianity, p. 95.　　　(۶۲)

عقیدہ گیا۔ یہ چھٹی صدی قبل مسیح کی بات ہے۔ افلاطون کا یہی عقیدہ تھا۔(۶۳)
انجیلوں کے مرتب کرنے والوں نے یہ ہی عقیدہ اختیار کر کے انجیلوں میں لکھ دیا۔(۶۴)
اس ہی عقیدہ کی اور شاخیں بھی مثلاً تناسخ ارواح Transmigration of Souls
اور اشتراک جسم انسان و حیوان Therianthropism ؛ یہ عقائد عام تھے۔ اوپر کا جسم
حیوان کا ہوتا تھا۔ اور نیچے کا جسم انسان کا۔ ہم ابھی ابھی بیان کر چکے ہیں کہ یہ عقیدہ بھی اُس
زمانہ میں عام تھا۔

یعنی ثانویت DUALISTIC CONCEPTION OF GOD-HEAD

عام طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ ثانویت کی تعلیم زرتشت نے کی تھی اور یہ اُن کے
مذہب سے شروع ہوئی ہے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ اُن کی تعلیم تو خالص وحدانیت کی تعلیم
تھی۔ اُن کی یہ تعلیم اُس زمانہ کے مذہبوں کے بالکل خلاف تھی جو ایران اور اسیریا
میں رائج تھے۔ اُن مذاہب میں ثانویت تھی۔ زرتشت کے بعد جب اُن کا
مذہب بگڑا ہے تو اُس بگڑے ہوئے مذہب میں ثانویت آگئی۔ بائیبل کا
عقیدہ ہے کہ خدا بالکل نیکی ہے اور چاہتا ہے کہ دنیا میں نیکی ہو جائے۔
لیکن وہ شیطان سے مجبور ہو گیا ہے جو نیکی کو پھیلنے نہیں دیتا۔ شیطان بدی
کا خدا ہے۔ اور ان دونوں خداؤں کی سلطنت جُدا جُدا ہے۔ اور آپس میں
لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں۔ خدا کی طرف سے جبرئیل فرشتوں کی فوج لے کر شیطان سے
لڑتے ہیں۔ یہ عقیدہ یونانی مذہب میں بھی تھا اور اب مسیحیت نے لیا ہے۔ دیکھو(۶۵)

(۶۳)
(63) Guide to Philosophy by C. E. M. Joad, pp. 287, 288
A Critical History of Greek Philosophy by W.T. Stace, p. 17
Encyclopedia Brittanica, Vol. XVI, p. 936.

(64) Royston Pike: Encyclopedia of Religion and Religions, Art. Incarnation.
Toynbee's History, Vol. VI. pp. 251-6..

(65) Toynbse's History, Vol. VI. p. 44, Foot Note 3. (۶۵)

یہودیت نے بھی یہ عقیدہ اس ہی بگڑے ہوئے زرتشتی مذہب سے لیا ہے۔(۶۶)

ANTHROMORPHISM یعنی خدا کو انسان کی شکل کا تصور کرنا

ازمنہ ماضیہ بعیدہ میں یہ مذہب عام تھا۔ ہندوستان، یونان، مصر، غرض جہاں جہاں صنم پرستی تھی رہاں یہ مذہب عام تھا۔ ان لوگوں میں جنھوں نے تعلیم انبیاء سے بغاوت کی تھی خدا کا اور کوئی تصور ہی نہ تھا سوائے اس کے کہ وہ بھی انسان کا جسم وحلیہ رکھتا ہے۔ اس زمانہ میں یہ تخیل عوام میں اس قدر رائج ہوگیا تھا کہ یہودیت اور مسیحیت بھی اُس کے اثر سے نہ بچ سکے۔ دیکھو پیدائش (Genesis) اُس میں کہا گیا ہے کہ انسانوں کی طرح خدا کے بھی ہاتھ پیر ہوتے ہیں۔ اور یہ کہ خدا نے انسان کو اپنی شکل پر بنایا ہے۔ ان مذہب میں خدا کو انسانی جسم کے ساتھ انسانی خواہشات وجذبات اور ضروریات سے بھی آراستہ کیا۔ اس مذہب کے متعلق ایک یونانی فلاسفر (ZENOPHANES) نے کہا ہے جو چھٹی صدی قبل مسیح میں گزرا ہے کہ انسان خیال کرتے ہیں کہ اُن کے خدا اُن کی طرح پیدا ہوتے ہیں، اُن کا سا جسم رکھتے ہیں۔ اُن کی طرح مرجاتے ہیں۔ چنانچہ حبشی اپنے خدا کو کالا سمجھتے ہیں اور یونانی اُس کو سُرخ بال دیتے ہیں۔

امور مندرجہ بالا کے لئے دیکھو۔ (۶۷)

MYSTERY CULTS.

(1) Orphism

یہ یونان کا ایک خفیہ مذہب تھا جو چھٹی صدی قبل مسیح یونان میں رائج تھا۔ اس کا بانی ORPHEUS تھا جو خدا کا بیٹا سمجھا جاتا تھا اور بربط پر خوب گاتا تھا۔ جب اس کی بیوی جس سے اُس کو عشق تھا، مرگئی تو یہ اُس کی تلاش میں زمین کے

(۶۶) (66) Toynbee's History, Vol. VI. P. 34, Ft. n. 5.
(۶۷) (67) Encyclopadia of Religion and Religions, Art. Anthromorphism.

نیچے وہاں چلاگیا جہاں مُردوں کی ارواح رہتی ہیں۔ اُس نے اپنی بربط سے ارواح کے نگہبان خدا کو اتنا خوش کرلیا کہ اُس نے اُس کی بیوی کو اس کے ساتھ آنے کی اجازت اس شرط پر دیدی کہ جب تک دنیا میں نہ پہنچیں Orpheus مڑکر اپنی بیوی کی طرف نہ دیکھے۔ سارا سفر تقریباً ختم ہو چکا۔ اوپر کی دنیا پر قدم رکھنے ہی کو تھا کہ محبت نے جوش کیا۔ عقل میں اور محبت میں ہمیشہ سے بیر ہے۔ اُس نے اپنی بیوی کی طرف مڑکر دیکھا۔ دیکھنا تھا کہ وہ ہوا میں غائب ہوگئی۔ یہ دنیا میں آیا۔ اور دنیا کی لذات کو بالکل ترک کردیا۔ عورتوں سے سارا تعلق چھوڑ دیا۔ لیکن عیش پسند مردوں اور عورتوں نے مل کر اس کو قتل کردیا۔

کچھ عرصہ کے بعد یہ قصہ یونان کے ایک خدا Dionysius کی طرف منسوب ہونے لگا۔ Dionysius بڑے خدا Zeus کا بیٹا تھا Dionysius لفظ کے معنی ہی خدا کا بیٹا ہیں۔ اُن کے اس خدا کو TITANS نے مار کر کھا لیا۔ TITANS ایک دیو ہیکل مخلوق تھی۔ جو دنیا پر آدمیوں سے پہلے بستی تھی Dionysius۔ کا دل بچ رہا تھا جو اُس کے باپ Zeus کے پاس پہنچایا گیا۔ اُس نے غصّہ میں آن کر Titans کو تو اپنی بجلی سے جلادیا۔ اور Dionysius کو دوبارہ زندہ کردیا۔ Titans کی راکھ سے انسان پیدا ہوئے۔ ان میں Zeus کے تعلق سے نصف ماہیت تو خدا کی ہے اور نصف ماہیت اپنی انسانوں کی ہے۔ اس مذہب کے پیروں کو Orphics کہتے ہیں۔ ان کا اپنا مذہب اور فلسفہ علحدہ تھا۔ مندرجہ بالا قصّہ کی مناسبت سے اُنھوں نے عقیدہ قائم کیا کہ انسان آدھا خدا ہے اور آدھا انسان۔ وہ لوگ جو اس مذہب کے خفیہ رازوں اور رواجوں میں داخل ہوں گے، اور رازِ درون پردہ سے واقف کرائے جائیں گے، اُن کا فرض ہے کہ دنیا سے تعلق نہ رکھیں۔ دُنیا کی لذّات اور عورتوں کو ترک کردیں۔ اور دنیا سے علحدہ خانقاہوں میں رہا کریں۔ روح ایک انسان کے مرنے کے بعد دوسرے قالب میں چلی جاتی ہے۔ اور اسی طرح ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ تمام نجاست دنیوی انسان سے علحدہ ہوکر وہ خدا میں مل جاتا ہے۔ یہ لوگ نہ گوشت کھاتے تھے اور نہ شراب پیتے تھے۔

اس فرقہ کے اعتقاد کے بموجب Dionysius۔ دنیا کی زندگی کا بھی خدا

تھا۔ اور مردوں کی روحوں کا بھی خدا تھا۔ رسومِ راز کے دوران میں ایک جانور کی قربانی ہوتی تھی۔ اور محرمانِ راز اس کا خون اور گوشت کھاتے تھے۔ اس جانور کو خدا کا اوتار سمجھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ خدا اس طرح مرگیا اور اب دوبارہ زندہ ہوگا۔ جو محرم راز بنائے جاتے تھے وہ اپنے تئیں اپنے خدا کے نام سے منسوب کرتے تھے۔ یہ تخیلات بہت کچھ عیسائیوں نے اپنے مذہب میں لے لئے اور وہ بھی اپنے تئیں اپنے خدا Christ ; کی نسبت سے Christians کہتے ہیں۔ اس مذہب کی بہت سی رسوم مسیحیت میں اختیار کر لی گئیں۔ اور اُن کے عقائد نے بھی مسیحیت پر بہت اثر ڈالا۔ ان ہی عقائد کے اثر سے مسیحیت نے مندرجہ ذیل عقائد قائم کئے۔

(۱) Resur rection ; یعنی صلیب دئے جانے کے بعد جسم کو قبر میں ڈالا گیا۔ لیکن وہاں زندہ ہو کر پھر نکل آئے۔

(۲) Double Nature of Christ ; یعنی حضرت عیسیٰ خدا بھی ہیں اور انسان بھی۔

(۳) انسان کے لئے خدا تکلیف اٹھاتا ہے یہاں تک کہ مر بھی جاتا ہے۔

(۴) حضرت عیسیٰ خدا کے بیٹے ہیں۔

ان امور کے لئے دیکھو۔ (۶۸)

(۲) (2) Eleusian Mysteries

یعنی الیوشن مذہب کے راز

یہ مذہب بھی بالکل Orphism سے ملتا جلتا ہے۔ امیدوار کے لئے خفیہ رسومات میں شامل ہونا ضروری تھا۔ پہلے تو وہ سمندر کے کنارے جا کر غسل کرتا تھا

(68) The Cambridge Ancient History Vol. IV. PP. 531-32
Encyclopedia of Religion and Religions, Art. Orphism.
Encyclopedia Brittanica, Vol. XVI.

سؤر کا خون اُس کے اوپر چھڑکا جاتا تھا۔ واپسی پر قربانی کرنی ضروری ہوتی تھی۔ خدا Zeus؛ کی شادی Demeter سے جسمانی تعلق کی سمجھی جاتی تھی۔ یہ رسم نکاح ادا کیجاتی تھی۔ جو تمام رسومات میں ایک اہم رسم سمجھی جاتی تھی۔ آخر میں پروہت آن کر اعلان کرتا تھا کہ خدا ئینی کا بچہ پیدا ہو گیا۔

خدا کے ساتھ تعلق پیدا کرنے کی بڑی مقدس رسم ہوا کرتی تھی یعنی وصل مقدس Holy Communion جس میں امیدوار وصل مقدس روٹی اور شراب کھا پی کر خدا کے ساتھ مل جاتا تھا۔ مذہب میں داخل ہونے والا اُسی پیالہ میں پانی، یا شراب پیتا تھا جس میں سے خدا ئینی Demeter نے پانی یا شراب پیا تھا جب وہ اپنی لڑکی کی تلاش کے مصائب میں مبتلا تھی۔ اس کا تعلق عیسائیوں کی Holy Grail سے کیسا عیاں ہے۔ یہ وہ مقدس رکابی تھی جس میں حضرت عیسٰی نے اپنا آخری رات کا کھانا صلیب سے پہلے کھایا تھا۔

اس مذہب کے ان رسومات کا کرنے والا پجاری نان مقدس کو توڑتا تھا اور پیالہ میں شراب ڈال کر مذہب میں داخل ہونے والے کو پلاتا تھا۔ ان رسومات میں بھی اور نیز Orphic رسومات میں وہ جانور جس کی قربانی کی تھی اور جس کا گوشت و خون اہل مذہب کھاتے تھے۔ خدا کا اوتار سمجھا جاتا تھا۔ گویا عقیدہ یہ تھا کہ خود خدا انسانوں کے لئے مرتا تھا اور پھر زندہ ہوتا تھا۔ اس مذہب والے بھی اپنے تئیں اپنے خدا کے نام پر موسوم کرتے تھے۔

Orphism ؛ کے رسومات بہت کچھ ان رسومات سے ملتے جلتے ہیں جو بعد میں مسیحیت میں قائم ہو گئے۔ اور اس مذہب کے معتقدات پر یورپ کے اخلاقیات مبنی ہیں۔ (۶۹)

(۳) OSIRIS مصر قدیم کا سب سے بڑا خدا جس کو وہ شاہ ابد، سلطان دوام بادشاہوں کا بادشاہ اور خداؤں کا خدا کہتے تھے۔ اُن کا اعتقاد تھا کہ اُس کی (Double Nature؛) ہے یعنی خدا بھی ہے اور انسان بھی ہے۔ اُس نے بھی موت

(69) Encyclopedia Brittanica, Vol. XVI. pp. 47, 49. (۶۹)

کی تکلیف برداشت کی، قبر میں ڈالا گیا۔ پھر اُٹھ گیا۔ زندہ ہو گیا۔ اور آسمان پر چلا گیا۔ جہاں وہ اب تک بادشاہت کرتا ہے۔ اور ہمیشہ بادشاہت کرے گا۔(۷۰)
یہ ہی اعتقادات عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ کے لئے قائم کر لئے۔

(۴) دین متھرا (4) Mithraism

دنیائے قدیم کا یہ ایک عالمگیر مذہب تھا جس میں متھرا کی پرستش ہوتی تھی ویدوں میں اس کو آسمانی نور کا خدا کہا گیا ہے۔ زرتشتی مذہب کی کتاب اوستا میں جنگی خدا کے نام سے مشہور ہے جو بڑے خدا ہرمز کی مدد کرتا ہے کیونکہ ہرمز تاریکی کے خدا سے ہمیشہ برسرِ پیکار ہے اور یہ متھرا اس جنگ میں ہرمز کی مدد کرتا ہے۔
قدیم ایرانی شہنشاہیت کے زوال پر یہ مذہب رومن افواج میں بہت ہر دلعزیز ہو گیا۔ اس مذہب کے اعتقادات میں بھی متھرا کی Double Nature تھی یعنی خدا بھی تھا اور انسان بھی۔ خدا کا خاص مددگار ہے۔ اور اس حیثیت سے اُس نے آسمانی سانڈ کو قتل کیا تھا جس کے خون سے دُنیا سرسبز ہوتی ہے۔ آخر کار بنی نوعِ انسان کی مدد کرنے کے بعد متھرا آسمان پر چلا گیا۔ اور وہیں رہتا ہے۔ اب بھی وہ بنی نوعِ انسان کو برکت پہنچاتا ہے۔ خیال تھا کہ یہ ایک غار میں پیدا ہوا ہے۔ لہٰذا اس کی پوجا غاروں میں ہوتی تھی۔ اب دوبارہ دنیا میں آنکر شر کے عناصر کو ہمیشہ کیلئے مغلوب کرے گا۔
متھرائی بننے کے لئے بہت سی رسومات کی ضرورت تھی۔ وہ ہی رسومات عیسائیوں نے دین مسیحی میں اختیار کر لی ہیں۔ اس میں بپتسما بھی ہوتا تھا۔ روٹی اور شراب یا پانی کی رسم بھی ادا ہوتی تھی، قربانی ہوتی تھی۔ دعائیں مانگی جاتی تھیں، اور سانڈ یا بھیڑ کے خون سے بپتسما کیا جاتا تھا۔ یعنی یہ خون متھرائی کے اوپر ڈالا جاتا تھا۔ متھرائی مذہب میں ہفتہ کا پہلا دن اتوار ہوتا تھا اور متھرا کی پیدائش کا دن

(۷۰) (70) Encyclopedia of Religion and Religioas p. 285. Art. Osiris.

۲۵ ردسمبر تھا۔ یہ دونوں باتیں مسیحیت نے اختیار کرلیں۔ حالانکہ ۲۵ ردسمبر نہ توحضرت عیسیٰ کی پیدائش کا دن تھا اور نہ اُن کی صلیب کا دن تھا۔ اور نہ دینِ مسیح میں اِس تاریخ کو کوئی خاص اہمیت ہے۔ ان امور کے لئے دیکھو۔ (۷۱)

متھرا کا جو تخئیل اور اُس کے متعلق جو عقیدہ تھا وہ بائیبل کے لکھنے والوں نے سب اپنی بائیبل میں لے لیا۔ ملاحظہ ہو حضرت عیسیٰؑ کی تصویر اور آسمان پر اُن کی حالت جو یوحنا کے مکاشفہ میں ہے۔ باب اوّل آیت ۱۵ تا ۱۸، باب دوم آیت ۱۸، باب ۱۲، آیت ۱ تا ۶، باب ۱۹ آیات ۱۱ تا ۱۶۔

یہ کیوں ایسا ہوا۔ مسیحیت نے کیوں دین کفار سے اثر لیا۔ اس کا جواب ہم پہلے دے چکے ہیں اب ایک عیسائی مورخ اور محقق کی زبان سے سُن لیجئے۔ (۷۲)

ترجمہ:۔ رومن ایمپائر میں مسیحیت کو کبھی فتح حاصل نہ ہوتی اگر مسیحیت کے پیشوا پہلی چار یا پانچ صدیوں تک نہایت صبر و استقلال کے ساتھ عیسوی عقائد کو یونانی فلسفہ کے مطابق نہ بنا لیتے اور مذہبی پیشواؤں کے نظامِ حکومت کو رومن سول سروس کے نمونے پر نہ بنا لیتے، اپنے عیسیٰ کے خدوخال کو آرفیوس ORRHEUS کی شکل پر نہ ڈھال لیتے۔ عیسوی رسومات کو اُن سابقہ مذاہب کے خفیہ رسومات کے مطابق نہ کر لیتے، اگر کافرانہ عیدوں کو مسیحیت میں نہ لے لیتے۔ اور کفار کے بہادر اور مشہور لوگوں کی بجائے اپنے مذہب کے اولیا نہ قائم کر لیتے۔ (ختم ہوا ترجمہ)

(اصل کے لئے دیکھو ضمیمہ نمبر ۲)

ایک اور جگہ زمانۂ حال کا یہی زبردست مورخ لکھتا ہے۔ (۷۳)

ترجمہ:۔ دینِ متھرا جو رومن ایمپائر پر روحانی قبضہ کرنے میں دین مسیح کا ہمعصر اور اُس کا نہایت طاقتور رقیب تھا خود خالص مذہب نہ تھا وہ تو یہودیت کا

---

(۷۱) (71) Encyclopedia of Religion and Religions, Art. Mithraism, p. 257.

(۷۲) (72) Toynbee's History, Vol. V. p. 366.

(۷۳) (73) Toynbee's History, Voi. II, p. 286n.

نہیں بلکہ زرتشتی مذہب کا یونانی تخیلات اور عقائد سے ملا ہوا ایک مثنیٰ تھا۔ دیکھو ضمیمہ عـ۳ (ختم ہوا ترجمہ)

غرضکہ مذہب مسیح کے تمام رسوم اور بہت سے عقائد ادیان سابقہ سے لئے ہوئے ہیں۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔ ایسٹر کی رسومات کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ یہ عیسائیوں کی بہت بڑی عید ہے۔ اور حضرت عیسیٰ کے قبر میں سے اٹھ کر آنے (Resurrection ;) کی یاد میں منائی جاتی ہے۔ عزت مآب مسٹر بیڈ (Venerable .Bede.) کی تحقیق کے مطابق یہ لفظ Eoster سے ماخوذ ہے جو اینگلوسیکسن قوم کی موسم بہار کی خدائینی تھی۔ اور اسی وجہ سے یہ عید موسم بہار کے آغاز میں منائی جاتی ہے۔ اس عید کے لئے ضروری ہے کہ اتوار کو ہو اور یہ اتوار (Sunday ;) یادگار ہے اُس زمانہ کی جب سورج (SUN) کی پرستش ہوتی تھی۔ دیکھو۔

Encyclopedia of Religion and Religions, Art. Easter,

بہت اچھی طرح ثابت ہو گیا اور خود عیسائی مورخین و محققین کی تحریرات سے ثابت ہوا کہ موجودہ دین مسیح وہ اصلی و خالص دین نہیں ہے جو حضرت عیسیٰ لائے تھے بلکہ سابقہ ادیان الحاد و کفر سے مرکب ایک دین محض سیاسی اغراض کے لئے مرتب کیا گیا ہے۔ یہ بھی ثابت ہو گیا کہ انکی اناجیل وہ اصلی الہامی کتاب نہیں ہیں جو حضرت عیسیٰؑ پر اُتری تھی۔ بلکہ وہ تو مفقود ہو گئی۔ موجودہ بائبل حضرت عیسیٰؑ کے بعد آنے والی مذہبی آدمیوں کی بنائی ہوئی ہے۔ یہ وہی دعویٰ ہے جو اب سے تیرہ صد سے زیادہ سال پہلے ایک نبی اُمّی اور اُس کی الہامی کتاب نے کیا تھا۔ اُس وقت یہ دعویٰ بذریعہ مباہلہ محمدؐ و آلِ محمدؐ نے ثابت کیا۔ اور اب اس دعوے کو اُن کے غلامانِ غلام خود عیسائی بیانات و تحریرات سے ثابت کر رہے ہیں۔ فالحمد للّٰہ علی ذالک۔

یہ ہے اسلام اور مسیحیت کا فرق۔ مسیحیت نے اپنے تئیں کفر میں مدغم کر کے اور اپنے عقائد چھوڑ کر کفر کے عقائد اختیار کر کے فتح پائی۔ اسلام نے کفر کے

ساتھ کسی قسم کا راضی نامہ نہ کیا۔ اور کفر کے ہر عقیدہ سے بریت ظاہر کی۔ اور پھر فتح پائی۔ عیسوی پیشواؤں نے دنیا کی سلطنت اور کفر کے رسوخ سے ڈر کر اپنے مذہب کو مسخ کر دیا۔ اسلام کے پیشواؤں نے ہر قسم کی سختیاں اٹھائیں، کفر کے ہر جارحانہ حملہ کو برداشت کیا۔ کربلا کے میدان میں جانیں دیں، بغداد کے قید خانوں کی سختیاں جھیلیں لیکن اپنے اسلام کے چہرہ پر کوئی بدنما داغ نہ آنے دیا۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ نے کوئی اپنا اصلی جانشین نہ چھوڑا۔ اُن کے بعد جن لوگوں نے اُن کے مذہب کی خود پیشوائی اختیار کی اپنے قیاس کو غلط طریقے سے استعمال کر کے مذہب کو مسخ کر دیا۔ جناب رسولخدا نے اپنے اصلی جانشین اپنی آل میں چھوڑے جنھوں نے اسلام کو اسی طرح سمجھا اور چلایا جس طرح آنحضرتؐ نے سمجھا اور چلایا تھا۔ اسلام کو ایک مقدس امانت سمجھ کر اپنے سینے سے لگائے رہے اور کفر کو اس پر اثر انداز نہ ہونے دیا۔ ضرورت ہوئی کہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد دوسرا پیغمبر آن کر اب تک نہ سمجھے ہوئے اصولوں کو سمجھائے۔ جناب محمدؐ مصطفےٰ کے بعد اُن کے جانشین آئمہ اہلبیت علیہم السلام نے تمام اصول اسلام اچھی طرح سمجھا دئے اور ان پر عمل کر کے دکھا دیا۔ کوئی اصول سمجھے جانے کے لئے باقی نہ رہا۔ خدا کی حجت اپنے بندوں پر تمام ہوگئی لہٰذا کسی اور پیغمبر کے آنے کی ضرورت نہ رہی۔

عیسائی پیشواؤں نے اپنے مذہب کی بنیاد حق پر نہیں رکھی۔ بلکہ ووٹوں کی تعداد پر رکھی۔ اور ان ووٹوں کے حصول کے لئے اُنھوں نے اپنے مذہب کو خوب مسخ کر لیا محمدؐ اور اصلی جانشینان محمدؐ نے اسلام کی بنیاد محض حق پر رکھی۔ اور ووٹوں کی اکثریت سے یہ کہہ کر بیزاری ظاہر کی کہ۔

اکثرھم للحق کارھون

دین مسیح اور دین اسلام میں ایک اور اہم فرق بھی ہے۔ دین مسیح کی کتاب اُس کے پیغمبر کی زبان میں نہیں ہے۔ اناجیل موجودہ کے الفاظ حضرت عیسیٰؑ یا روح القدس کی زبان پر کبھی جاری نہیں ہوئے۔ برعکس

اس کے قرآن شریف کے الفاظ وہ ہی ہیں جو بارگاہ قدس سے لوح محفوظ میں اُترے اور وہاں سے امانت خداوندی کی صورت میں جبرئیل امین کے پاس آئے۔ اُن کی زبان سے نکل کر پیغمبر اسلام کی زبان پر جاری ہوئے اور آلِ محمد کی ورد میں رہے ظاہر ہے کہ ایسے ایسے مقدس مقاموں اور زبانوں میں سے گزرنے میں خود الفاظ میں برکت آجاتی ہے۔ اس ہی بات کو حافظ نے شاعری کے انداز میں اس طرح ظاہر کیا ہے۔ ؎

نام من رفتست روزے بر لبِ جاناں بسہو　　اہلِ دل را بوئے جان می آید از نامم ہنوز

انجیل نے تو جادو اور اُس کے اثر کو بہت اہمیت دی ہے۔(۷۴)

قرآن شریف میں بھی اس کا ذکر ہے۔ لیکن معقولیت کے ساتھ۔ بہر صورت جادو کی اصلیت مسلم۔ لیکن جادو کیا ہے؟ محض الفاظ اور اُن کا اثر۔ یہ اثر کیوں ہے؟ اس لئے کہ یہ الفاظ شیطان کی بارگاہ سے گزرے ہیں۔ چونکہ وہاں سے گزرے ہیں لہٰذا ان میں شیطان کی طاقتِ شر بھری ہوئی ہے۔ شیطان میں یہ طاقت کیوں ہے؟ نصرانیت اور اسلام دونوں مانتے ہیں کہ خدا نے شیطان کو بہکانے کی مہلت دی یعنی اُس کی بہکانے کی طاقت کو برقرار رکھا سلب نہیں کیا۔ اُس کے بہکانے کی طاقتوں میں سے ایک طاقت یہ بھی تھی کہ اُس کے الفاظ میں وہ اثر قائم رکھا جو وہ چاہتا تھا۔ معلوم ہوا کہ الفاظ میں اثر ہوتا ہے جادو صرف الفاظ اور اُن کا اثر ہے۔

ایک اور بات بھی قابل غور ہے۔ شیطان نے خدا کا مقابلہ کرنیکی مہلت مانگی۔ خدا نے مہلت دی مقابلہ اُس وقت ہی ہو سکتا ہے کہ جب دونوں طرف لڑائی کی طاقت برابر کی ہو۔ اور اگر ایک فریق زیادہ طاقتور بھی ہے تو وہ اپنی اُن طاقتوں کو مقابلہ میں استعمال نہ کرے جو دوسرے فریق میں نہیں ہیں۔ اگر ایک فریق کے پاس ایروپلین اور ہائیڈروجن بمب ہیں۔ اور دوسرے کے پاس محض تلوار۔ تو اگر وہ ایروپلین اور ہائیڈروجن بمب بھی استعمال کرتا ہے تو

(۷۴) (74) Hitti's History of Syria, Chapt. XXVII. p. 361.

اُس کو مقابلہ کی لڑائی نہیں کہیں گے اور جب خدا نے شیطان کو مقابلہ کی مہلت دیدی تو پھر وہ خدائی کی طاقت استعمال نہیں کرے گا۔ اب صورت یہ ہوئی کہ خدا نظر نہیں آتا شیطان بھی نظر نہیں آتا۔ خدا دل پر اثر کرتا ہے شیطان بھی دل پر اثر کرتا ہے۔ خدا اپنے اولیاء کی طرف وحی بھیجتا ہے۔ شیطان بھی اپنے اولیاء کی طرف وحی بھیجتا ہے۔ خدا نے الفاظ میں طاقت دی، شیطان نے بھی الفاظ میں طاقت دی۔ اب شیطان یہ نہیں کہہ سکتا کہ مجھے پوری مہلت نہیں ملی۔ اُسے سارا موقع دیا گیا۔ وہ شیطانی خصائل کے انسانوں کو تو بہکا سکا لیکن خدا کے مخلص بندوں کو باوجود اپنی پوری طاقت کے نہ بہکا سکا۔ اگرچہ اُس کو پوری مہلت دی گئی۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ احد و صفین و کربلا میں خدا کے حکم سے دشمنان خدا برباد ہو جاتے، لیکن اُس صورت میں شیطان کا عذر باقی رہ جاتا کہ خداوندا امتحان پورا ہونے سے پہلے ہی تو نے نتیجہ نکال دیا۔ مجھے پوری مُہلت نہ ملی۔ قصّہ مختصر یہ ہے کہ جادو کی طاقت مسلّم، جادو کی طاقت محض الفاظ کی طاقت ہے۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ الفاظ میں طاقت ہوتی ہے۔ رحمانی الفاظ میں برکت ہوتی ہے۔ چونکہ بائیبل کے الفاظ وہ اصلی الفاظ نہیں ہیں، لہٰذا اُن میں برکت نہیں۔ اور یہ بھی بات ہے کہ جو خوبی اور معانی اصل زبان میں ہوتے ہیں وہ ترجمہ میں کہاں۔

یہودیت

(۱) تاریخ

یہودیوں کی تاریخ اُن کے مذہب کے ساتھ اس طرح وابستہ ہے کہ ایک کو دوسرے کے بغیر نہیں سمجھا جا سکتا۔ لہٰذا ہم بہت اختصار کے ساتھ پہلے ان کی تاریخ بیان کرتے ہیں۔ ان کی تاریخ کے صرف دو ماخذ ہیں ایک تو بائیبل کا وہ حصہ جو عہد عتیق کہلاتا ہے اور دوسرے اکتشافات آثار قدیمہ۔ عہد عتیق کے متعلق محققین کی رائے ہے کہ وہ محض کہانیاں ہیں صحیح تاریخ اُن میں بہت کم ہے۔ اُن کے لکھنے والے وہ لوگ ہیں جو اُن واقعات سے کئی صدیوں کے بعد ہوئے جن کو وہ بیان کرتے ہیں۔ جس طرح اُنہوں نے لوگوں میں کہانیاں اور افواہیں پائیں

اُن کو اسی طرح لکھدیا۔ بہرصورت کچھ تو ہے۔ لیکن یہ تو یقینی امر ہے کہ تاریخیں اور سن محض قیاس سے لکھے ہیں۔

بنو اسرائیل کے جداعلیٰ حضرت ابراہیم تھے جو عراق کے مقام ار (Ur;) سے اُٹھ کر حران ہوتے ہوئے فلسطین میں آن کر آباد ہوئے۔ اس وقت یہاں کنعانی آبادی تھی۔ حضرت ابراہیم کے لڑکوں میں سے اسحاق اور اسمٰعیل تھے۔ اسحاق کے لڑکے یعقوب ہوئے جن کو اسرائیل بھی کہتے تھے۔ یعقوب کے بارہ لڑکے ہوئے جن میں سے چھوٹے یوسف تھے۔ ان ناموں کے معنی معلوم کرنے بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔

ابراھیم = باپ بلند ہے۔

یعقوب = خدا حفاظت کرے۔

اسرائیل = اِل حکومت کرے۔

اسماعیل = اِل سن لئے۔

اسحاق = خدا مسکرائے یعنی راضی ہو۔

یوسف = خدا زیادہ دے۔

عبرانی میں ال خدا کو کہتے تھے۔ اسرائیل، جبرئیل، میکائیل، عزرائیل، عزازیل یہ وہ ہی لفظ ہے جو عربی کا اللہ ہے۔ حضرت یوسف کا واقعہ تو سب کو معلوم ہے۔ جدائی کے بعد پھر باپ بیٹے اور بارہ بھائی مصر میں رہنے لگے۔ حضرت یوسف مصر کے وزیر اعظم ہو گئے۔ مسٹر فلپ ہٹی کی تحقیق کے بموجب یہ وہ زمانہ تھا، جب مصر پر ہائک سوس (Hyksos;) قابض تھے۔ انھوں نے مصر پر ۱۷۵۰ ق م میں قبضہ کیا تھا۔ اور ۱۵۸۰ ق م تک قابض رہے۔ جب مصریوں نے اپنی قومیت کے جذبہ میں اُن کو نکال دیا (۷۵) مسٹر ہٹی کے خیال کی تائید کچھ قرآن شریف سے بھی ہوتی ہے: اِمْرَاَتُ الْعَزِیْزِ تُرَاوِدُ فَتٰھَا۔ (۱۲: ۳۰) ہائک سوس کے آخری مصری بادشاہ کا نام یوروپین مورخین نے اسیس (Asis;) لکھا ہے۔ مناسبت لفظی بتا رہی ہے کہ وہ عزیز ہی ہے جس کو بگاڑ کر اسیس بنا لیا ہے۔

(۷۵) (75) Hitti's History of Syria: Chapt. XI. P. 149.

ہائک سوس (Hyksos;) ہائک کے معنی بادشاہ اور سوس کے معنی اُس زمانہ کی زبان میں چرواہے کے ہیں۔ گویا چرواہوں کی قوم کے بادشاہ۔ ایک قدیمی مورخ کی رائے ہے کہ یہ عرب تھے (۷۶)۔ بہ (Josephus; ایک یہودی مورخ تھا ۳) کا زمانہ غالباً ۳۷ء سے ۹۵ء تک تھا۔

بنی اسرائیل بھی مصر میں اجنبی تھے۔ ہائک سوس کے زمانہ میں حضرت یوسُفؑ صاحبِ اقتدار تھے۔ دربار میں وزیر اعظم تھے۔ اجنبیوں سے جو منافرت تھی اور جس نے ہائک سوس کو مصر سے نکالا تھا وہ ہی بنو اسرائیل کے ساتھ ہوگئی۔ رفتہ رفتہ ان کی تعداد بھی بڑھ گئی۔ حضرت موسیٰؑ کے زمانہ کے مصری بادشاہ یعنی فرعون کو خوف ہوا کہ کہیں ہائک سوس کی طرح یہ بھی مصر پر قبضہ نہ کرلیں۔ فرعون کے اس خوف کا پتہ ہم کو قرآن شریف سے بھی ملتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ اور اُن کے بھائی ہارون سے لوگوں کو یہ کہہ کر ڈراتا ہے:۔

اِنَّ هٰذٰنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ۔

اِس ہی خیال سے وہ بنو اسرائیل پر سختیاں کرتا تھا۔ تاکہ اُن کی آبادی اور طاقت نہ بڑھنے پائے وہ اُن کی اولاد نرینہ کو قتل کرادیتا تھا جب بنو اسرائیل پر سختیاں زیادہ ہوگئیں تو حضرت موسیٰؑ کو خدا کا حکم ہوا کہ بنو اسرائیل کو مصر سے نکال لے جاؤ۔ مصر سے نکلنے کا زمانہ ۱۴۹۱ ق م بیان کیا جاتا ہے۔ چالیس سال جنگل میں سرگرداں پھرنے کے بعد آخر کار ۱۴۵۱ ق م میں وہ کنعان پہنچے۔ حضرت ہارون انتقال کرچکے تھے۔

حضرت موسیٰؑ کے حکم سے اُن کے جنرل (Joshua;) ۔ (یوشع) نے حملہ کیا۔ پہلا حملہ (Jericho;) پر ہوا۔ حضرت موسیٰؑ کا بھی انتقال ہوگیا۔ اور یوشع شہر میں داخل ہوئے ۷ سال کے عرصہ میں پورا کنعان فتح ہوا۔ حضرت یوشع نے حضرت موسیٰؑ کا قانون جاری کیا۔ اُس قانون کے مطابق ججوں کی حکومت شروع ہوئی جس کا ذکر بائیبل میں ہے۔ حضرت یوشع کے انتقال کے بعد بنو اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ کے مذہب کو چھوڑ کر بُت پرستی اختیار کی۔ مصر میں اگرچہ یہ سختیوں میں رہے، لیکن پھر بھی مصر کی زرخیزی

(76) Josephus, Vol. VI, Book 1, Sec. 14. (۷۶)

شادابی ہی کو یہ ہمیشہ یاد کرتے رہے۔ اور مصریوں کے بتوں خاص کر بچھڑے کو پوجتے رہے۔ ۱۰۹۵ء ق م بنواسرائیل نے اپنے نبی Samuel; سے درخواست کی کہ اُن کے لئے بادشاہ مقرر کردیں۔ چنانچہ Saul; (طالوت) بادشاہ مقرر ہوا۔ آخرکار ۱۰۵۵ء ق م میں اُس نے خودکشی کرلی اور حضرت داؤد بادشاہ ہوئے۔ ۱۰۱۵ء ق م میں ان کا بھی انتقال ہوگیا تو اُن کے بیٹے حضرت سلیمان ان کے جانشین بادشاہ اور نبی ہوئے۔ ۹۷۵ء ق م میں ان کا بھی انتقال ہوگیا۔ اور ان کے ساتھ بنواسرائیل کی متحدہ سلطنت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ اس متحدہ سلطنت میں بس یہی تین بادشاہ ہوئے۔ مسٹر ہٹی نے اُن واقعات کی مختلف تاریخیں لکھی ہیں۔ ان کی تحقیق کے بموجب صحیح تاریخیں یہ ہیں۔

۱۲۹۰ء ق م ...... حضرت موسیٰ بنواسرائیل کو لے کر مصر سے نکلے۔

۱۲۵۰ء ق م ...... حضرت موسیٰ نے کنعان فتح کیا۔

بارھویں صدی قبل مسیح کے آخری چوتھائی حصّہ سے لے کر گیارھویں صدی قبل مسیح کی پہلی تین چوتھائی تک } ججوں کا زمانہ۔

۱۰۲۰ء ق م .... طالوت (Saul;) بادشاہ ہوئے۔

۱۰۰۴ء ق م .... طالوت کی موت

۱۰۰۴ء تا ۹۶۳ء ق م .... حضرت داؤد کا زمانہ

۹۶۰-۹۲۵ء ق م .... حضرت سلیمان کا زمانہ

حضرت داؤد نے یروشلم (بیت المقدس) کا شہر آباد کیا۔ حضرت سلیمان کے انتقال پر سلطنت بنی اسرائیل کے دو ٹکڑے ہوگئے۔ شمالی ٹکڑے میں بنواسرائیل کے دس قبیلے آباد تھے۔ اُس کا نام سلطنت اسرائیل تھا اور اُس کا مستقل دارالسلطنت (Samaria.) تھا۔ جس کو عمری بادشاہ اسرائیل (Omari.) نے آباد کیا تھا۔ جنوبی سلطنت کو سلطنت جوڈا (Judah) کہتے تھے۔ اس میں بنواسرائیل کے باقی دو قبیلوں Judah اور Benjamin کی اولاد رہتے تھے۔ اس کا دارالسلطنت یروشلم رہا۔ ان دونوں سلطنتوں میں جو بھائیوں

ہی کی اولاد کی تھیں ہمیشہ آپس میں دشمنی اور لڑائیاں رہیں غالباً یہ اُس ہی پشتینی عداوت کا سلسلہ تھا جو حضرت یعقوبؑ کے دس بیٹوں نے حضرت یوسُفؑ اور ان کے حقیقی بھائی سے شروع کی تھی۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ آپس کا عناد و نفاق خداوند تعالیٰ کا عذاب تھا جو حضرت یعقوب کے دس بیٹوں کے ظلم کی وجہ سے اُن پر نازل ہوا۔ آپس کی اس عداوت سے ہمسایہ سلطنت (سلطنتِ دمشق) نے ان کو آپس میں لڑا کر بہت فائدہ اُٹھایا۔ یہ آپس کی دشمنی بڑی سیاسی غلطی تھی۔ یہ دونوں سلطنتیں تین بڑے دشمنوں میں گھری ہوئی تھیں۔ ایک طرف دمشق کے بادشاہ، دوسری طرف اشوری سلطنت اور تیسری طرف مصر۔ ان ہمسایوں کے مذہب کا اثر ان دونوں سلطنتوں پر پڑا۔ اور ان کی "تلوار" نے ان کے ملک کو برباد کر دیا۔ چونکہ انھوں نے خدائے اسرائیل کو چھوڑ دیا تھا اُس نے بھی ان کو سزا ان کے اپنے ہی ہاتھوں سے دلائی۔ یہ سنت الٰہیہ ہے کہ گناہگار کو سزا اس دنیا میں اس کے اپنے ہی ہاتھ سے ملتی ہے۔ یہ عذاب خدا نہیں تو اور کیا تھا کہ یہ ایسے اندھے ہو گئے کہ انہوں نے یہ نہ دیکھا کہ ہمارے سر پر تین دشمن کھڑے ہوئے ہیں ہم آپس میں مل جائیں تو مضبوط ہو جائیں گے۔ حضرت یوسف کے بھائیوں نے کس گھڑی سے یوسف سے عداوت کی تھی کہ بھائیوں کی عداوت ہی نہ گئی سلطنت کے تقسیم ہونے سے پہلے ان دونوں جماعتوں میں عداوت تھی اور اس تقسیم کے بعد بھی یہ عداوت رہی شمالی حصہ حضرت یعقوب کے دس بیٹوں کی اولاد نے لیا۔ اور جنوبی حصہ Judah اور Benjamin کی اولاد نے لیا Judah بھی حضرت یوسف کی طرح اپنے باپ کا لاڈلا بیٹا تھا اور Benjamin حضرت یوسف کا ایک ہی ماں سے حقیقی بھائی تھا۔ یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ Benjamin کے معنی ابنِ دست راست ہیں Ben تو وہی ہے جو عربی میں بن ہے۔ اور عربی کا "یا" عبرانی کی ج سے بدلتی ہے۔ جیسے یعقوب سے Jacob اور یوسف سے JOSEPH اسی طرح (jamin) دراصل یمین ہے۔ پورا نام ابن یمین ہوا۔ بائیبل میں یعقوب کے بڑے بیٹے کا نام Reu Ben لکھا ہے Ben = ابن = بیٹا Reu راؤ یا رؤا۔ انھوں نے دیکھا یا دیکھو۔ معنی ہوئے بیٹے کو دیکھا

یعنی بیٹا ہوا۔

یہ تو عداوت کا حال ہوا۔ اب بت پرستی کو لو۔ سلطنتِ بنی اسرائیل تو تقریباً ہمیشہ ہی بُت پرست رہی۔ اس کے ۱۹ بادشاہ ہوئے۔ وہ سب سوائے ایک بادشاہ Jehu; کے بُت پرست تھے اور اپنے انبیاء کو قتل کرتے تھے۔ ان کا سب سے زیادہ مشہور بادشاہ عمری تھا جس نے ۸۸۵ ق م سے ۸۷۴ ق م تک سلطنت کی۔ اُس نے سماریہ Samaria کو آباد کیا تھا۔ جس کا موجودہ نام سباسطیہ ہے جو یونانی لفظ Sebostos کا معرب ہے یہ نام Sebostos; نے آگسٹس رومن شاہنشاہ کے زمانہ میں دیا تھا Herod the Great; Sebostos; کے معنی صاحب جلالت و رفعت کے ہیں۔ اور یہی معنی Augustus; کے ہیں۔ عمری کا لڑکا Ahab ۔ (۸۵۲ - ۸۷۴ ق م) بادشاہ ہوا۔ اُس نے بُت پرستی میں بہت ہی مبالغہ کیا۔ اس کی بیوی کے خوف سے (Elijah;) نبی بھاگتے پھرتے تھے۔ اب (Elijah;) اور (ELISHAH) انبیاء نے لوگوں کو خاندان عمری کے خلاف کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۸۴۲ ق م میں ایک شخص (Jehu;) نے تخت پر قبضہ کر لیا۔ اس سلطنت میں فقط یہی ایک ایمان والا بادشاہ تھا۔ آخر کار اسیریا کے بادشاہ سرغون ثانی Sargon II; نے ۷۲۲ ق م میں سلطنت بنو اسرائیل کو برباد کر دیا۔ کم سے کم ۲۷۲۸۰ جوانِ بنو اسرائیل کو جلا وطن کر کے (Media;) میں لے گیا۔

سلطنتِ جوڈا کے بھی اُنیس بادشاہ ہوئے۔ ان میں سے صرف چھ بادشاہ تو خدائی واحد کی پرستش کرنے والے تھے۔ باقی سب بت پرست تھے۔ ۶۱۲ ق م میں نینوا اور ۶۰۹ ق م میں سلطنت اسیریا ختم ہو گئی۔ اب اُس کی جگہ نئی بابلی حکومت (Neo-Babylonian;) نے لی۔ سلطنت جوڈا نے اُس کی اطاعت کی اور باجگذار بن گئی۔ پھر مصر کے ساتھ مل کر جوڈا نے اپنے مالکوں سے غداری کی۔ اور آخر کار نیو بابلی سلطنت کے شاہنشاہ (Nebchadnezzar;) (۵۶۱-۶۰۴ ق م) نے ۵۸۶ ق م جوڈا کے بادشاہ (Zebedkiah:) (۵۸۶-۵۹۷ ق م) کے زمانہ میں یروشلم کو تاخت و تاراج کر کے سلطنت جوڈا کا

خاتمہ کر دیا۔ جوڈا کا بادشاہ Zebedkiab; جب فاتح بادشاہ کے سامنے پیش ہوا تو Nebuchadnezzar; نے اوّل تو اس کے بچوں اور بیویوں کو اُس کے سامنے قتل کر ڈالا۔ اور پھر فوراً اُس کی آنکھیں نکال ڈالی گئیں تاکہ بیویوں اور بچوں کے قتل کا نظارہ آخری سماں ہو جو اُس کی آنکھوں نے دیکھا۔ اور وہاں وہ محفوظ رہے۔ پھر جوڈا کے پچاس ہزار قیدیوں کو معہ اُس کے اندھے بادشاہ کے بابل میں لے گئے۔

اس کے بعد یہودیوں کی تاریخ وہ ہی حقارت اور جلا وطنی کی تاریخ ہے اب حال ہی میں اپنے اسلاف اور صلاح الدین ایوبی کے بدنام کرنے والے عربوں نے پھر بیت المقدس میں یہودیوں سے مغلوب ہو کر اُن کو تخت پر بیٹھا دیا۔ لیکن ابھی اس کا انجام کسی نے نہیں دیکھا۔ سلطنتوں کے انجام سالوں میں نہیں بلکہ صدیوں میں نکلا کرتے ہیں۔

فاعتبروا یا اولی الابصار ط

یہودیت

(۲) مذہب

جس قسم کے کافرانہ وملحدانہ ماحول سے متاثر ہو کر مسیحیت نے اپنے تئیں مسخ کر لیا، ویسا ہی بلکہ اُس سے تیز و قوی تر کافرانہ ماحول یہودیت کا تھا اور نتیجہ وہ ہی ہوا جو نصرانیت کا ہوا تھا۔ بلکہ امر واقعہ تو یہ ہے کہ بہت سے کافرانہ عقائد و ملحدانہ تخیلات مسیحیت میں یہودیت سے ہو کر آئے ہیں۔ مصر میں صدیوں تک صنم اور فرعون پرست قوم کے ساتھ رہنے کا یہ اثر ہوا کہ یہودیت میں بہت سے مصری بت آگئے۔ جن کی پرستش باوجود انبیاء کی ممانعت کے بنو اسرائیل میں رائج ہو گئی پھر جب مصر سے نکلے اور کنعان فتح کیا تو بہت سے کنعانیوں کے بت اور رسومات بنو اسرائیل نے اپنے میں لے لئے۔ اور کنعانی لٹریچر اپنی مذہبی کتابوں میں داخل کر لیا۔ شرہٹی نے اس کی بہت سی مثالیں دی ہیں۔ اُن کی

تحقیق کے بموجب Book of Job: (کتاب ایوب) میں بہت کچھ کنعانیوں کے کافرانہ تصورات داخل ہیں۔ (۷۷)

خدا کا تصور — یوروپین مورخین و محققین کی تحقیق سے پایا جاتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے بغاوت کرکے اور اُن کی تعلیم سے انحراف کرکے یہودیوں نے اپنے خدا کا تصور ایران کے شاہان خاندان ہنجامنش کے زیر اثر مرتب کیا ہے۔ اور اس خاندان کا اثر اِن کے اس تخئیل میں نمایاں ہے۔ خداوند تعالے کو شاہان ہنجامنش (Achaemenian Monarchy;) کی طرح جسم والا صاحب شان و شوکت تصور کیا ہے۔ اور اس کا دربار ان بادشاہوں کے دربار کیطرح خدم و حشم سے آراستہ تصور کرتے ہیں۔ دیکھو ذکریا باب سوم جو تقریباً ۵۱۹ ق م میں اور کتاب ایوبؑ جو تقریباً ۴۰۰ ق م میں لکھے گئے تھے۔ یہ ہی نقشہ کتاب دانیال باب ہفتم آیات ۹، ۱۰ میں خدا کا کھینچا گیا ہے۔ کتاب دانیال ۱۶۴-۱۶۶ ق م میں لکھی گئی تھی۔ یہ تصورات یہودیت نے زرتشتی مذہب کے ذریعہ سے لئے ہیں۔ نیز ملاحظہ ہو مزامیر داؤدؑ (Psalms;) باب ۸۲ آیات ۸، ۷، ۶، ۱ جس میں کئی خداؤں کا عقیدہ نمایاں ہے۔ یہ عقیدہ ادیان الحاد سے لیا گیا ہے۔ اور اتنا نمایاں ہے کہ محققین نے بائیبل کے مطالعہ سے نتیجہ نکالا ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت داؤدؑ کئی خداؤں کے ماننے والے تھے۔ جن میں سے ایک خدا کو بڑا سمجھتے تھے۔ ان سب امور کے لئے دیکھو۔ (۷۸)

خدا کا صاحب جسم ہونا، اور اُس جسم کا مثل انسانی جسم کے ہونا، خدا کا انبیاء بنی اسرائیل کے سامنے انسانی شکل میں نمودار ہونا، دیگر خداؤں کی ہستیوں کو بھی ماننا یہ سب امور کتاب پیدائش، کتاب امثال، اور مزامیر داؤدؑ سے عیاں ہیں۔ اور یہ عقائد کنعانی تصورات کی بناء پر قائم کئے گئے۔ عبرانی والدین اپنے پہلے بچے کا

(۷۷)

(77) Hitti's History of Syria Part. II, Chapt. X pp. 114-16, 118.
(78) Toynbee's History Vol. VI. pp. 34, 38, 39, 163n.

نام تو اپنے خدا (;Jehovah) پر رکھتے تھے۔ اور بعد کی پیدائش کے بچوں کے نام کنعانی خدا بال (;Baal) پر رکھتے تھے۔ بنو اسرائیل نے اپنے خدا کا تخیل ' ;Cherub کے نمونہ پر بنایا ہے اور . ;Cherub ، کو اسیریا کے خدا پردار بچھڑے کی صورت پر پردار بنایا ہے اور اپنے خدا کا تصور کیا ہے کہ وہ ایک ایسے ہی پردار بچھڑے پر بیٹھا ہوا ہے۔ آدھا عہد عتیق اس ہی نمونہ پر ہے ان سب امور کے لئے دیکھو (۷۹)

یہودیوں کے نام اکثر شمعون پر ہوا کرتے ہیں۔ یہ شمعون شہر ;Sidon کا خدا تھا یہودیوں نے اُس کو اپنا خدا بنالیا۔ دیکھو کتاب مندرجہ بالا ص ۱۲۵ نوٹ ۲

حضرت ابراہیم نے خالص وحدانیت کی تعلیم کی اور حضرت موسیٰ تک وہ ہی تعلیم رہی۔ لیکن جب بنو اسرائیل مصر میں گئے اور وہاں کے کفر کے زیر اثر آئے، اور پھر کنعان فتح کیا اور اُس کے کفر کے زیر اثر آئے تو ان کے مذہب یہودیت میں کفر اچھی طرح داخل ہوگیا۔ (۸۰)

اسی طرح زرتشت نے خالص وحدانیت کی تعلیم کی۔ لیکن اون کے بعد کے لوگوں نے اُن کے جاری کردہ مذہب میں کفر کو راہ دی۔ دیکھو کتاب مندرجہ بالا ص ۳۴ نوٹ۔

یہودیت اور زرتشتی مذہب نے ایک دوسرے پر اثر کیا۔ انبیاء بنی اسرائیل کے معتقدات زرتشتی مذہب میں موجود ہیں۔ (۸۱)

یہودیت میں اپنے سے پہلے مذاہب کے کافرانہ و ملحدانہ تخیلات و تصورات موجود ہیں۔ دیکھو کتاب (۸۱) ص ۱۱۹، ۱۲۰۔

مسٹر ٹوآئن بی کہتے ہیں کہ غالباً مسیحیت نے اپنے ماحول کے کفر و الحاد سے رشتہ جوڑنے اور ان کے تخیلات اپنے مذہب کے اندر لینے میں یہودیت کی نظیر بھی اپنے سامنے رکھی تھی۔ کیونکہ اُنھوں نے بھی ایسا ہی کیا اگرچہ انبیاء بنی اسرائیل خالص

(79) Hitti's History of Syria, pp. 114, 115, 204-207
Toynbee's History, Vol. Vol. VI. P. 39n.
(80) Toynbee's History, Vol. VI. P. 39n.
(81) Toynbee's History, Vol. V. pp. 121, 369.

وحدانیت کی تعلیم دیتے رہے۔ اور اُن کو اس طرح کفر کی طرف جانے سے روکتے رہے۔ دیکھو کتاب مندرجہ (۸۹) ص ۵۳۵-۵۳۶ - آگے چل کر کہتے ہیں کہ یہودیت نے بھی ملحدانہ فلسفہ کے معتقدات اور تصورات کو اپنے اندر داخل کر لیا تاکہ اُس کے پھیلنے میں آسانی ہو۔ دیکھو کتاب مندرجہ (۸۱) ص ۵۳۹، ۵۴۰

اہل کنعان کی پیروی دیگر امور میں

بنو اسرائیل نے اپنی تمام زندگی کو اہل کنعان کے معتقدات اور طرز کے مطابق کر لیا۔ ان دونوں مذاہب میں رہبانیت تھی اور وہ ان دونوں یعنی کنعان اور بنو اسرائیل نے یونان کے الحادی مذہب ;Orphism سے لی۔

اپنے معبدوں کی تعمیر و ہئیت، وہاں عوانوں کا گانا، راگ کے آلات مثلاً نے بربط، بانسری، اور ناقوس یہ سب کنعانیوں سے لئے گئے ہیں۔

موجودہ زندگی اور موت کے بعد کے حالات، مردوں کے دفن کرنے کا طریقہ، قبر میں مردوں کے ساتھ رکابیاں اور مرتباں رکھنا، لباس، زیورات، مٹی کے برتنوں کی شکل اور اُن کا استعمال یہ سب امور بنو اسرائیل نے اہل کنعان سے لئے تھے۔ شام میں ابتک تنوروں کا استعمال ہوتا ہے، جہاں روٹیاں پکائی جاتی ہیں۔ بجلی کے آنے سے پہلے اب تک مٹی کے چراغ یا دھات کے فتیلہ سوز جلتے تھے یہ سب کنعان کی نشانیاں ہیں۔ ہاتھ کی چکی جو ہندوستان میں عرصہ سے رائج ہے وہ بھی کنعان سے لی گئی تھی۔

موجودہ زبور، تورات غرضکہ جملہ کتبِ عہد عتیق کس طرح اور کس نے تصنیف کیں

بہت کچھ تو ہمنے اس کے متعلق اوپر لکھا ہے۔ جو باقی رہ گیا ہے وہ یہاں تحریر کرتے ہیں۔ یہ امر بایہ تحقیق کو پہنچ گیا ہے کہ ان کتابوں میں وقتاً فوقتاً ترمیم و تنسیخ، ایزادی و کمی ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ اُنہوں نے موجودہ صورت اختیار کر لی۔ عہد عتیق کی کتابوں کے لکھنے میں بہت سے معلموں اور مورخین نے حصہ لیا تھا۔ یہ اچھی طرح ثابت ہو گیا ہے کہ عہد عتیق کی پہلی پانچ کتابیں جن کو توراۃ

کہا جاتا ہے اور جن کی نسبت یہ گمان تھا کہ یہ حضرت موسیٰ کی تحریر کردہ ہیں دراصل حضرت موسیٰ کی تحریر کردہ نہیں ہیں۔ حضرت موسیٰ تو تیرھویں صدی قبل مسیح میں گزرے ہیں۔ اور یہ کتابیں تو پانچویں صدی قبل مسیح میں لکھی گئی تھیں اور ان کے لکھنے والے تمام یہودی علماء تھے۔ ان کتابوں میں مختلف اوقات میں ترمیم و تنسیخ اور اضافے ہوتے گئے۔ یہ کتابیں یہودیوں کے بابل کی جلاوطنی کے زمانہ میں لکھی گئی تھیں اور یہ جلاوطنی ۵۸۶ ق م میں ہوئی جیسا ہم اوپر بیان کر چکے ہیں۔ اس کے بعد دو صدیوں تک ان میں ترمیم و تنسیخ اور اضافے ہوا کئے۔ ان میں انبیاء سے منسوب جو کتابیں ہیں ان میں خالص وحدانیت کی تعلیم ہے۔ یہ کتابیں عہد عتیق کی کتابوں میں سب سے زیادہ پورانی ہیں۔ ان سب امور کے لئے دیکھو۔ (۸۲)

یہی باتیں مسٹر ہٹی اپنی تاریخ شام میں کہتے ہیں اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ صرف کتب انبیاء میں خالص وحدانیت کی تعلیم ہے یعنی وہ کتب جو انبیاء کے نام سے منسوب ہیں۔ ان میں سے یہ ان چھ کتابوں کا ذکر کرتے ہیں۔

(۱) یسعیاہ	Isaiah;
(۲) یرمیاہ	Jeremiah;
(۳) عاموس	Amos;
(۴) ہوسیع	Hosea;
(۵) میکاہ	Micah;
(۶) حزقی ایل	Ezekiel;

مسٹر ولیم بارنز کا خیال ہے کہ Isaiah; کو عرصہ ۱۵۰ سال کے درمیان میں کئی آدمیوں نے لکھا ہے۔ مسٹر ہٹی کہتے ہیں کہ تورات کو مختلف مورخین و معلمین اور اور کاہنوں نے لکھا ہے۔ قانون موسیٰ کی نسبت کہتے ہیں کہ اس کے لکھنے والے کو حضرت موسیٰؑ سمجھا گیا ہے۔ لیکن حمورابی کا قانون جو حضرت موسیٰؑ سے ۳۰۰ برس پہلے لکھا گیا تھا۔ اور جس کو حمورابی نے اپنے خدا شمس کی طرف منسوب کیا تھا، حضرت

(۸۲) (82) The Rise of Christianity by William Barnes. pp. 16, 17.

موسیٰ کے قانون سے بہتر تھا (۸۳) قرآن شریف اور بائیبل کی کتاب خروج اور انجیل متی کا دعویٰ ہے کہ جو قوانین یعنی الواح حضرت موسیٰ کو دیئے گئے تھے وہ خدا نے دیئے تھے۔ دیکھو

Matthew; Ex. 20: 19—22;

ظاہر ہے کہ حمورابی کا قانون خدا کے دیئے ہوئے قانون سے بہتر نہیں ہوسکتا نتیجہ نکلا کہ موجودہ تورات وہ نہیں ہے جو حضرت موسیٰ پر نازل ہوئی تھی۔ وہ تو گم ہو گئیں اور لوگوں نے اُن کے بدلے یہ لکھ دیا۔

اُن کتابوں کی نسبت جو انبیاء کی طرف منسوب ہیں مسٹر ہٹی کہتے ہیں کہ انبیاء کی اپنی اصلی تحریرات تو بہت کچھ ضائع ہو چکی ہیں۔ انبیاء کا لٹریچر 750 ق م تا 55 ق م کے درمیان مرتب ہوا ہے۔ اہل بابل، اہل اسیریا، مصری اور یونانی ان سب کا مذہب Henotheism; تھا۔ جس کے معنی ہیں کہ بہت سے خداؤں کے ساتھ ایک سب سے بڑے خدا کا اعتقاد رکھنا۔ لیکن یہ انبیا خالص موحد تھے۔ ان کے حالات وہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

۱۔ عاموس Amos; اس کا زمانہ 750 ق م تھا اور یہ شمالی سلطنت۔ یعنی سلطنت اسرائیل میں Jeroboam II.; کے زمانہ میں تھا۔

۲۔ یسعیاہ Isaiah. ان کا زمانہ ۷۳۸ ق م تھا۔ اور یہ سیاسی مصائب کے زمانہ میں رہے۔ اُنھوں نے سارغون Sargon: کے ہاتھوں ۷۲۲ ق م میں Samaria; کی بربادی اور یروشلم کی بربادی ۷۰۱ء ق م میں سناخرب کے ہاتھوں دیکھی۔ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ اُنھوں نے حضرت مہدی کے آئندہ کے امن و امان کے زمانہ کی پیشین گوئی کی تھی۔ دیکھو (۸۴)

۳۔ یرمیاہ Jeremiah, ۶۲۶ ق م سے ۵۸۶ ق م تک اُنھوں نے Nebuchadnezzar; کے ۵۹۷ ق م کے حملہ کو دیکھا۔ اور پھر یروشلم کی بربادی

(۸۳) (83) Hitti's History of Syria, Part. II. Chap. XV. P. 210.

(۸۴) (84) Is. 9: 6-7; 2: 2-4; 11: 1-9.

۵۸۶ ق م میں دیکھی۔ ان کے نہایت اعلیٰ تخیلات ۳۰ سے ۳۳ تک کے ابواب میں ہیں۔ اُنہوں ہی نے شخصی ذمہ داری کا اصول قائم کیا برعکس اس اصول کے کہ باپ کے گناہوں کا مواخذہ اُس کے بیٹوں سے ہوگا (۸۵) یہ ہی خیال حزقی ایل میں ہے۔ (۸۶)

۴- ہوشیع Hosea: ان کا زمانہ ۷۸۵ ق م تا ۷۳۵ ق م ہے۔ ان کو بدچلن بیوی ملی۔ لیکن اُنھوں نے اُس کو بھی بہت اچھی طرح بنھایا۔

۵- میکاہ Micah: ان کا زمانہ ۷۳۰ ق م تا ۷۲۲ ق م تھا۔ یہ بھی حضرت مہدی کے زمانہ مستقبل کے امن وچین کی پیشین گوئی کرتے ہیں (۸۷)

۶- حزقی ایل Ezekiel: یرمیاہ نبی کے ہمعصر تھے۔ ان کی کتاب کا باب ۱۸ نہایت اعلیٰ اخلاق کی تعلیم دیتا ہے۔ مسٹر ہٹی کہتے ہیں کہ ان کی اور یرمیاہ کی تعلیم کا اخلاق موجودہ زمانہ کی یورپ کی عیسائی سلطنتوں کی لڑائیوں میں نظر نہیں آتا۔

ان انبیاء کے حالات کے بیان کے لئے دیکھو (۸۸)

باب نہم

دہریت کے معتقدات اور ان کی تردید۔

وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُم بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ - الجاثیہ - ۴۵ : ۲۴

هَلْ مِنْ خَالِقٍ غَيْرُ اللَّهِ يَرْزُقُكُم مِّنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ

(85) Jer. 31: 29, 30; (86) Ezek. 18: 2, 3, 4. (۸۶)
(87) Mic. 4: 1-8. (۸۷)
(88) Hitti's History of Syria, Part. II. Chap. XV. pp. 210, 216. (۸۸)

لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ، فَاَنّٰی تُؤْفَکُوْنَ - فاطر ۳۵ : ۳

جو کچھ دہریے بحث کرتے ہیں یا کر سکتے ہیں اور جو کچھ اُن کو جواب دیا جا سکتا ہے وہ سب ان آیات متذکرہ بالا میں آگیا ہے۔ ہم جو کچھ اس باب میں لکھیں گے وہ ان آیات ہی کی تشریح ہو گی۔

دہریت اُس مذہب یا مجموعہ اعتقادات کو کہتے ہیں کہ جس میں کائنات کے خالق اور رب کی ہستی اور قدرت سے انکار کیا جاتا ہے اور یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ہم بلکہ تمام کائنات خود بخود زمانہ کے عمل سے اُس مادہ سے پیدا ہو گئے ہیں جو ازل سے موجود تھا اور ہے۔

ہر ایک دعوی کے لئے ثبوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لہذا اس دعویٰ کے لئے بھی ثبوت چاہئے۔ وہ اعتقاد جس کی اصلیت اور صداقت کا یقین نہیں عبث ہے۔ بے اثر ہے۔ کچھ نہیں۔ یقین کی بناء علم ہے۔ بغیر علم کے جو یقین ہو گا وہ مستحکم نہ ہو گا۔ علم حاصل کرنے کے دو ذریعہ ہیں۔ یا تو ذاتی علم ہو، خود دیکھ کر علم ہو یا ایسے لوگوں کی زبانی علم حاصل ہو جنکی علمیت و صداقت کا ہم کو یقین ہے۔ اس یقین کی شرط کے یہ معنی ہوئے کہ ہمیں ذاتی طور سے علم حاصل ہو کہ جو بات یہ کہہ رہا ہے اُس کا حقیقی علم اِس شخص کو ہے اور نیز یہ کہ وہ صادق ہے۔ مجھے کراچی کا ذاتی علم ہے۔ لنڈن کا ذاتی علم نہیں۔ ایک شخص لنڈن کے حالات مجھے بتاتا ہے۔ ان واقعات پر یقین کرنے سے پہلے مجھے یہ معلوم کرنا چاہئے کہ یہ شخص لنڈن گیا یا نہیں۔ اگر گیا تو ان حالات سے اُس کو سابقہ پڑا یا نہیں کہ جن کو وہ بتا رہا ہے۔ اور یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ وہ آدمی سچا ہے یا جھوٹ بولنے کا عادی ہے۔

اس معیار کو مد نظر رکھ کر ہم دہریت پر بحث کرتے ہیں۔

کیا دہریوں کو اپنے معتقدات کا علم و یقین ہے؟ اگر نہیں تو مزید بحث کی ضرورت نہیں۔ اگر ہے تو پھر اُس کا ثابت کرنا اُن کے ذمہ ہے۔ کیونکہ دعوی کا بار ثبوت مدعی پر ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے اغلب کیا ہے۔ خدا کا ہونا یا خدا کا نہ ہونا۔ صرف بار ثبوت کا فیصلہ کرنے کے لئے مندرجہ ذیل امور کافی ہیں۔

۱۔ دہریئے کہتے ہیں کہ مادہ ازل سے ہے، ایک بے جان بے عقل شے کا ازل سے ہونا ثبوت چاہتا ہے۔

۲۔ دہریے کہتے ہیں کہ مادہ سے ہی خود بخود کائنات بن گئی ہے۔ غیر ذی روح بے جان، بے عقل، شے سے اُس کے برعکس شے، یعنی عقل، زندگی کا برآمد ہونا ثبوت چاہتا ہے۔ جو چیز اُس میں خود نہیں ہے وہ کیونکہ پیدا کردیگی۔

۳۔ ہم کائنات میں عظیم الشان نظام اور قانون اور تناسب پاتے ہیں۔ بے عقل اور بے جان شے کا نظام و قانون و مناسبت پیدا کرنا ثبوت چاہتا ہے۔

۴۔ تمام کائنات میں حرکت ہے، حرکت ہی سے قائم ہے۔ وہ حرکت آزلین کس نے پیدا کی، اگر انسان اپنے پر غور کرے تو فوراً اس نتیجے پر پہنچے گا کہ اس تمام نظام کا کوئی خالق اور مدبر ہے۔ لہٰذا دہریت کو ثابت کرنا چاہیئے۔ کہ خدا نہیں ہے۔ دہریے یہ نہیں کہہ سکتے کہ منفی کا ثابت کرنا مشکل ہوتا ہے۔ چونکہ سائنس میں پہلے اکثر منفی ہی کو ثابت کیا کرتے ہیں۔ مثلاً اگر ہم ثابت کرنا چاہیں کہ ایک شے "ج" موجود نہیں ہے تو ہم کہیں گے کہ ایک وہ شے (ل) جو موجود ہے اور جس کا وجود عیاں ہے وہ نہ موجود ہوتی اگر شے "ج" موجود ہوتی۔ لہٰذا نتیجہ نکلا کہ شے "ج" موجود نہیں ہے۔ جرمنی کا مشہور حکیم شاعر گوئٹے (GOEHE) کہتا ہے کہ اس عالم میں دو چیزوں کی عظمت میرے دل پر ہیبت رعب و دہشت طاری کرتی ہے۔ اوپر تو ستاروں والا آسمان اور نیچے انسان کے اندر کا ضابطہ اخلاق۔ اگر غور کیا جائے تو واقعی ان دو باتوں سے خدا کی ہستی اور اس کی عظمت و جلالت کا نمایاں ثبوت ملتا ہے۔ تمام عالم میں انسان کے اندر اور انسان کے باہر، زمین پر اور آسمان پر، ایک عقل کل اور ذہن کامل کارفرما نظر آتا ہے۔ محض نیچر یا مادہ اس قابل نہیں کہ خود بخود اپنے تئیں ایک نظام میں جکڑ لے۔ ایسا کہ پھر ادھر سے اُدھر نہ ہو سکے۔ اس نظام کو دیکھتے ہوئے، اپنے معاملات پر غور کرتے ہوئے ایک اٹل قاعدہ کو کارفرما پاتے ہوئے ہر ایک شخص کہہ سکتا کہ اندریں صورت بارِ ثبوت اُس شخص کے ذمے ہے جو کہتا ہے کہ یہ سب کچھ بے جان بے حس، بے عقل مادہ نے پیدا کیا اور یہ سب کچھ اتفاقاً پیدا ہو گیا۔ یعنی محض یہ اتفاق

تھا کہ ایسا نظام قائم ہوگیا۔

لہذا بارِ ثبوت دہریوں کے اوپر ہوا کہ وہ ثابت کریں کہ اُن کے معتقدات صحیح ہیں۔ اس کے لئے ان کو مندرجہ ذیل امور ثابت کرنے ہوں گے۔

۱۔ مادہ ازل سے موجود ہے۔

۲۔ مادہ میں خود بخود زندگی پیدا کرنے کی صلاحیت ہے۔

۳۔ کائنات میں حرکت کیونکر پیدا ہوئی۔

۴۔ ایک ہی قسم کے مادہ سے مختلف الانواع اشیاء خود بخود پیدا ہوسکتی ہیں۔

۵۔ غیر عقل اور غیر حس مادہ میں سے عقل و حس و جذبات پیدا ہوسکتے ہیں۔

۶۔ کیا عمل ارتقاء سے کیچڑ کے کیڑے سے انسان بن سکتا ہے۔

۷۔ کیا Brain; (جسم والا دماغ) اور MIND (ذہن، قوت استقراء و استنباط) ایک ہی شے ہیں۔

۸۔ اگر نہیں تو ذہن و عقل کا ارتقاء کیوں کر ہوا۔ یعنی یہ انسان میں کیونکر پیدا ہوگئے۔

ہر ایک دہریے کو خود تو ان باتوں کا کیا علم ہوسکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ دوسروں کے علم پر انحصار کرتا ہے۔ وہ دوسرے کیسے شخص ہوں۔ یہ اُس کو انتخاب کرنا ہوگا۔ جو شرائط ہم نے اوپر اہل علم کی درج کی ہیں اُن کو مدنظر رکھنا ہوگا۔ یہ ہم اس وجہ سے کہتے ہیں کہ آج کل دہریا ہونا بھی فیشن میں داخل ہوگیا ہے۔ اور مذہب سے انکار علامت علم و ترقی کی سمجھی جاتی ہے جس طرح کہ عورتوں کا بے پردہ ہونا فیشن میں داخل ہوگیا ہے۔ کسی خاندان کی عورتوں کا بے پردہ ہوکر مردوں میں ملنا۔ اُس خاندان کی علامت ترقی سمجھا جاتا ہے کہ یہ Advanced; ہیں۔ مذہبی اور علمی گفتگو میں اس حماقت سے پرہیز لازم ہے۔

کیا دہریوں کو ان امور کا علم ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان لوگوں کو علم نہیں ہے۔ ان کے اہل سائنس خود کہتے ہیں کہ ہمیں علم نہیں ہے۔ پھر دہریت کی بنیاد کیا رہی۔

ہمارے اس مضمون کے یہ پانچ عنوان ہوں گے۔ مادہ، حرکت اولین

زندگی، ارتقاء، عقل۔

مادّہ اور مادیت

دہریت ایک غلط نظریۂ کائنات ہے۔ لہذا باطل ہے۔ لیکن دنیا میں یہ اُس وقت سے ہے کہ جب سے انسان کو سوچنے اور سمجھنے کی اہلیت ہوئی۔ اور اُس کے ساتھ ورغلائے جانے اور دھوکہ میں آنے کا امکان پیدا ہوا۔ یہ اُس وقت سے ہے کہ جب سے انسان نے آنکھ کھولی اور حضرت آدم شیطان کے بہکانے میں آگئے۔ دنیا میں آن کر اس کا مظاہرہ قابیل کی غلطی اور ہابیل کے قتل سے ہوا۔ حق و باطل کی آویزش شروع ہوئی اور یہ ہمیشہ رہے گی جب تک بنی نوع انسان اس دنیا میں ہے۔

دہریت کے فلسفہ یا مذہب کی بناء اس پر ہے کہ مادہ قدیم ہے۔ ہندو فلسفہ کا یہ پہلا گُر ہے۔ یونانی فلسفہ بھی یہ ہی کہتا ہے کہ مادہ حقیقتِ اوّل کے ساتھ قدیم ہے پٹے ٹوئیاں تو بہت سی ماری ہیں لیکن دہریت کبھی تسلی بخش جواب نہیں دے سکی کہ مادہ کیونکر پیدا ہوا کس طرح وجود میں آیا۔ چونکہ وہ بے عقل شے ہے لہذا اُس کی نسبت یہ کہہ کر پیچھا نہیں چھوٹ سکتا کہ وہ قدیم ہے۔ بتانا ہوگا کہ وہ کیونکر وجود میں آیا۔ صحیح یا غلط کچھ تو نظریہ قائم کریں۔ لیکن دہریے حضرات ادھر توجہ ہی نہیں دیتے یہ پہلا نقص ہے جو اس مذہب میں ہے، دہریت نے سائنس کے ساتھ مل کر یہ نظریہ قائم کیا کہ حقیقی شے (Substantial) وہ ہی ہے جو ہمارے حواس خمسہ سے محسوس ہو سکے۔ اگر ایسی نہیں تو وہ غیر حقیقی اور بے اصل ہے۔ اور اس کو ماننا حماقت ہے۔ خدا سے انکار کرنے کا یہ پہلا اصل موضوعہ ہے۔ سائنس نے یہ کہہ کر دہریت کو تقویت دی تھی کہ مادہ غیر فانی ہے کیونکہ اس کے آخری ایٹم کا تجزیہ نہیں ہو سکتا۔ یہ دہریت کے عروج کا زمانہ تھا جو اُنیسویں صدی عیسوی کے وسط ثانی سے شروع ہوا۔ لیکن یہ عروج صرف ۵۰ یا ۶۰ سال رہا کیونکہ بیسویں صدی کے شروع ہی سے سائنس نے اپنا نظریہ بدل دیا۔ اور کہا کہ وہ ہماری تصوری غلط تھی۔ مادہ کا آخری ایٹم بھی قابلِ تقسیم ہے۔ لیکن خرابی یہ ہوئی کہ یورپ والوں کا قبضہ اور اثر ہندوستان پر اُس

زمانہ میں ہوا کہ جب مادہ کے غیر فانی ہونے کی تھیوری کا عروج تھا۔ اہل یورپ ہندوستان پر غالب ہو چکے تھے۔ مسلمانوں پر اس تھیوری کا بہت اثر ہوا۔ دنیا کے ظاہری غلبہ والوں کے ساتھ ہو جانا تو مسلمانوں کی فطرت میں داخل ہو چکا ہے۔ ان کے خیال میں حق اور دنیاوی غلبہ آپس میں مترادف ہیں۔ علاوہ اس کے مسلمانوں نے اس مسئلہ پر اسلام کی روشنی میں کبھی غور ہی نہیں کیا تھا، اور جب کبھی ان کے چند پڑھے لکھے آدمیوں نے اس پر غور بھی کیا تو یونانی فلسفے کے زیر اثر غور کیا۔ خالص اسلامی فلسفہ تو یہ سمجھے ہی نہیں سمجھتے تو کب سمجھتے۔ ابھی رسول خدا دفن بھی نہیں ہوئے تھے کہ یہ دنیا کے حصول کی طرف دوڑ پڑے اور پھر باہر بھیجدئے گئے۔ وہاں انہیں صدیوں کے پختہ فلسفوں سے سابقہ پڑا۔ مقابلہ تو ہو نہیں سکتا تھا، تقلید شروع ہو گئی۔ اور مقابلہ کرنے کو جی ہی نہ چاہا۔ انھوں نے اپنے کفر کا عکس ایران و یونان و مصر و ہندوستان کے فلسفے میں دیکھا۔ کفر سے جو پرانا عشق ان کو تھا وہ پھر تازہ ہو گیا۔ مانی و مزدک کا فلسفہ ایرانی زرتشتی مذہب اور یونانی افلاطون وارسطو کے خیالات کا مجموعہ تھا جس میں مسیحیت کا بھی رنگ آ گیا تھا۔
۳۰۰ھ ہجری تک یہ ہوا کہ ۸۰ فیصدی دل سے مانوی اور زبان سے محمدی تھے۔ یہ ہی حالت اب ہوئی کہ روس کے کمیونزم اور سائنس کے ناقص علم کے زیر اثر تقریباً ننانوے فیصدی مسلمان دل سے دھریئے اور زبان سے مسلم ہیں۔ ان کا ہر قول و فعل بتاتا ہے کہ یہ حیات بعد ممات، حشر و نشر، سزا و جزا حساب و میزان پر اعتقاد نہیں رکھتے اور خدا کی ہستی سے عملاً منکر ہیں۔

ہاں تو ہم کہہ رہے تھے کہ دہریت کا یہ عروج ۵۰ یا ۶۰ سال ہی رہا۔ سائنس نے آگے ترقی کی تو معلوم ہوا کہ ایٹم بھی قابل تقسیم ہے (Radiation;) یعنی نور کا ذرہ جس کو Photon; کہتے ہیں اگر مادہ کے ایٹم سے تصادم کرے تو وہ مادہ کے ایٹم کے دو ٹکڑے کر دیتا ہے۔ ایک کو Electron; اور دوسرے کو Proton; کہتے ہیں اور یہ دونوں محض بجلی کی لہریں ہیں۔ نہ تو نظر آئیں اور نہ ان میں Substance; ہے۔ مادہ کی جو دو بڑی شرطیں تھیں وہ غائب ہو گئیں اور مادہ محض بجلی کی لہر رہ گیا۔ گویا مادہ فنا ہو گیا۔ مادہ کا یہ فنا ہونا یعنی Annihilation; زمانہ حال کے سائنس کا نہایت اہم انکشاف ہے اس انکشاف سے بہت سے دور رس نتائج نکلتے ہیں جو زمانہ حال کے علم طبیعیات کا

بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اُس نے پُرانے نظریات کو بالکل بدل کر سائنس طبیعیات میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ اب یہ نظریہ قائم ہو گیا ہے کہ کسی شے کا اصل اور واقعی ہونا اس پر منحصر نہیں ہے کہ وہ ہاتھ سے چھوئی جائے یا حواس خمسہ سے محسوس کی جائے۔ یہی روحانیت کی ابتدا ہے۔ دیکھو۔ (۸۹)

مادہ فنا ہو گیا۔ نہ ہستی رہی، نہ قدامت رہی اور نہ مادیت رہی۔ کوہ ہمالیہ، کوہ ایلپس، بحر اقیانوس، صحرائے اعظم، ہاتھی، انسان، نباتات، معدنیات، سونا، چاندی جواہرات، سورج، ستارے یہ سب کیا ہیں۔ یہ بالکل غیر مادی چیزیں ہیں۔ صرف لہریں ہیں جو آپس میں مل کر جم گئی ہیں۔ یا جمادی گوئی ہیں، مادہ کو ان لوگوں نے خدا کے مقابلہ میں رکھا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مادہ کی ہستی ہی گئی۔ اس کی قدامت بھی گئی اور مادیت بھی گئی۔ سائنس کا موجودہ نظریہ کس قدر نظریۂ کُن فیکون کے نزدیک آگیا۔ ارادۂ الٰہی یا مشیت الٰہی سے برقی لہر پیدا ہوئی۔ اور اُس سے یہ تمام عالم بن گیا۔

ایک سائنسدان کہتا ہے:۔

ترجمہ:۔ میں اس سے پہلے کہہ چکا ہوں کہ اب سائنس کسی شے کی حقیقی موجودگی کے لئے ضروری نہیں سمجھتا کہ وہ مادی ہو۔ عرصہ ہوا کہ مادیت مر گئی۔

اصل کیلئے دیکھو ضمیمہ ۴۳۔

چونکہ دہریت کی ساری بنیاد مادیت پر ہے اور اس کی ساری بحث کا دارومدار مادہ کے قدیم اور غیر فانی ہونے پر ہے لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم چند اقتباسات یورپ و امریکہ کے مصنفین کی تحریرات کے پیش کریں، جن سے بغیر کسی شبہ کے ثابت ہو جائے کہ مادہ کچھ نہیں۔ صرف نور ہے، برقی لہر ہے۔ دراصل مادہ فنا ہو چکا ہے اور اس کے ساتھ مادیت بھی گئی۔

مزید بیانات ملاحظہ ہوں۔ یہ ترجمے ہیں۔ اصل کیلئے ضمیمہ ۴۴ دیکھو۔

(۸۹)

(89) The Mysterious Universe, PP. 35 to 39, 61, 62, 65, 67, 68, 102, 131.
Sir Arthur Eddington: The Nature of the Physical World, Chapt. 1 (The Downfail of Classical Physics)
C. E. M. Joad: Guide to Modern Thought, pp. 18-21.

ترجمہ

(ا) زمانۂ حال کے علم ہیئت کے مطابق یہ عظیم الشان کائنات نور (روشنی) کی بنی ہوئی ہے نہ کہ مادہ یا جسمانی شے کی ...... آج کل اس امر کے یقین کرنے کی وجہ ہے کہ جس کو ہم مادہ کہتے ہیں وہ دراصل منجمد یا محدود اور بند کیا ہوا نور ہے۔

(ب) زمانۂ حال کے علم طبیعیات کا رجحان یہ ہے کہ تمام مادہ والی کائنات کا اگر تجزیہ کیا جاوے تو یہ محض ایک لہر ہے۔ اور کچھ نہیں سوائے لہروں کے۔ یہ لہریں دو قسم کی ہیں۔ ایک تو حدود کے اندر بند کی ہوئی لہریں جن کو ہم مادہ کہتے ہیں۔ اور دوسرے آزاد لہریں جن کو ہم روشنی (نور) یا شعاع افشانی کہتے ہیں۔ اگر ہم مادہ کو معدوم کرنا چاہیں تو صرف یہ طریقہ ہوگا کہ بند کی ہوئی یا حدود میں گھری ہوئی لہری طاقت کو آزاد کردیں تاکہ وہ فضا میں پھیل کر آزاد پھر سکے۔ ان نظریات کی رو سے تمام کائنات محض نور یا شعاع افشانی کی دنیا ہے۔ یا اندرون میں مضمر ہے یا بظاہر موجود ہے۔

(ج) کائنات کو اب مادی نہیں کہہ سکتے۔ یہ تو محض ذہنی ارادہ ہے.... اگر ایسا ہی ہے تو کائنات کا تصور یہ ہوا کہ وہ محض (کسی کے) ارادہ کا مظہر ہے۔ اگرچہ یہ نامکمل اور ناکافی بیان ہے یہ محض ارادہ یا تخئیل تو ہے۔ لیکن کس کا ارادہ ہمیں صحیح لفظ نہیں ملتا لہٰذا کہہ سکتے ہیں کہ کسی ریاضی دان ارادہ کرنیوالی ہستی کا ارادہ۔

(د) یہ امر واقعہ کہ زمان و مکاں دونوں محدود ہیں۔ ہمیں مجبور کرتا ہے کہ ہم عمل تخلیق کو محض ارادہ کا عمل سمجھیں۔

(ہ) اب سے تیس سال پہلے ہم (اہل سائنس) نے خیال کیا تھا یا محض فرض کر لیا تھا کہ بس اب ہم بہت جلد اصل حقیقت کو معلوم کرلیں گے جو محض ایک مشین کے قسم کی ہوگی معلوم ہوتا تھا کہ وہ حقیقت ایسے ایٹموں کا ایک اتفاقیہ اجتماع ہوگا جو بغیر کسی ترتیب اور قاعدہ کے آپس میں مل گئے تھے۔ اور وہ ایٹم کچھ عرصہ تک اندھی اور لایعنی قوتوں کے زیر اثر اوچھل کود کر پھر مُردہ ہو جائیں گے اور دنیا مردہ بن جائے گی۔ اس بالکل مشینی دنیا میں ان ہی اندھی اور لایعنی قوتوں کے زیر اثر کسی طرح اتفاقیہ طور سے حیات پیدا ہوگئی۔ اس کائنات کے ایک چھوٹے سے گوشہ میں یا ایسے کئی

گوشوں میں یہ ایٹم اتفاقاً کسی وجہ سے صاحبِ احساس ہو گئے - اور آخر کار یہ ان ہی اندھی اور عبث قوتوں کے زیر اثر مردہ ہو کر نیست و نابود ہو جائیں گے اور ایک بغیر زندگی والی دنیا رہ جائیگی - (لیکن اب یہ نظریات متروک ہو گئے ہیں اور) آج تمام اہل سائنس کا تقریباً اسپر اتفاق ہے کہ اب ہماری معلومات ایک غیر مرئی اور غیر مشینی حقیقت کی طرف جا رہی ہیں - اب ہماری تحقیقات کا نتیجہ ہے کہ کائنات ایک عظیم الشان ارادہ یا خیال ہے، مشین نہیں ہے - نفس انسانی یا عقل محض اتفاقاً مادی دنیا میں نہیں آگئی - بلکہ اب ہم کو خیال ہونے لگا ہے کہ ہم کو چاہیئے کہ اس نفس یا عقل (Mind; کو مادہ کا خالق اور حاکم سمجھیں - ہمارے انفرادی نفس یا عقل کو نہیں - بلکہ اس محیط عالمیان عقل کو خالق اور حاکم سمجھیں جس میں وہ تمام اجزاء یا ایٹم ہیں - جن میں سے ہماری انفرادی عقل نکلی ہے -

یہ جدید علم ہم کو جو حاصل ہوا ہے وہ ہم کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ ہم اپنے ان پہلے خیالات کی تصحیح اور نظر ثانی کریں - جن کی رو سے ہم سمجھتے تھے کہ ہم اتفاقاً ایک ایسی دنیا میں آگئے ہیں جو یا تو زندگی کی طرف ملتفت نہ تھی یا شاید اس کے بالکل مخالف تھی - وہ پورانا روح و مادہ کی ثنویت کا نظریہ جو اس دنیا یا حیات کی دشمنی کے اعتقاد کا ذمہ دار تھا اب معدوم ہو رہا ہے - اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ مادہ پہلے کی نسبت زیادہ، غیر حقیقی ہو گیا ہے یا نفس مادہ کا ایک آلۂ کار ہو گیا ہے - بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ثابت ہو گیا ہے کہ خود مادہ عقل کا مخلوق و منظر ہے - اب ہمیں معلوم ہو گیا ہے کہ نظام سے ظاہر ہو رہا ہے کہ اس کو ترکیب دینے والی اور قابو میں رکھنے والی کوئی طاقت ہے جس میں کچھ مشابہت ہمارے نفس (Mind;) کی سی پائی جاتی ہے - اور جہاں تک ہم معلوم کر سکے ہیں وہ طاقت، جذبہ، اخلاقی عمل یا ذوقِ جمال نہیں ہے، بلکہ ایک طاقت ہے جس کو بیان کرنے کے لئے اس سے بہتر لفظ نہیں ملتا کہ وہ صحیح ریاضی کے طریقہ پر غور کرنے والی طاقت ہے -

(آخر میں سائنس کی تحقیقات کے بیان کرنے کے بعد یہ سائنس داں کہتا ہے) اب ہم اپنے بیان کو ختم کرتے وقت اتنا اور اضافہ کرتے ہیں جو پہلی تحریرات سے بھی اچھی طرح واضح ہے کہ ہر ایک سائنسی نظریہ محض مزید غور کے لئے تذبذب

کے ساتھ پیش کیا گیا ہے اور وہ محض قیاسی اور غیر یقینی ہے۔

اس کے لئے دیکھو ضمیمہ ع ۴ (ختم ہوئے تراجم)

اس مضمون پر سینکڑوں اقتباسات یوروپین اہل سائنس کے پیش کئے جا سکتے ہیں۔ ایک اور سائنس داں کہتا ہے :۔

تراجم

(و) یہ خاص طور سے خیال کیا جاتا ہے کہ موجودہ زمانہ کا علم طبیعیات، روحانیات کی حمایت کرتا ہے۔ اور مشورہ دیتا ہے۔ بلکہ واقعی مطالبہ کرتا ہے کہ تمام کائنات کو مذہبی رنگ سے دیکھنا چاہیئے۔

(ز) لہذا اب ان لوگوں کے لئے جو علم طبیعیات کے نتائج کو قبول کرتے ہیں یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنی فطرت کے اخلاقی اور روحانی جذبات کو ذاتی دھوکہ کہیں جیسا کہ وہ پہلے کہا کرتے تھے۔ اور انیسویں صدی عیسوی میں جو مذہب اور سائنس کے درمیان خلیج پیدا ہو گئی تھی وہ اب بھرتی جا رہی ہے۔

(ح) آج مادہ کا یہ تصور کہ وہ سخت اور آنکھوں سے دیکھنے جانے والی شے ہے بالکل جاتا رہا ہے۔ موجودہ زمانہ میں مادہ کی خاصیت یہ سمجھی جاتی ہے کہ وہ ایک برقی رو ہے یا ایک لہر ہے جس کی موجودگی ممکن تصور کر لی گئی ہے۔ اور وہ چلتے چلتے آخر معدوم ہو جاتی ہے۔

اصل کے لئے دیکھو ضمیمہ ع ۵ (ختم ہوئے تراجم)

اقتباسات مندرجہ بالا سے واضح ہے کہ سائنس کی صدیوں کی کاوش اور تحقیقات کے نتائج یہ ہیں :۔

۱۔ مادہ میں مادیت نہیں ہے۔ یہ نہ قدیم ہے اور نہ غیر فانی۔ بلکہ نور یا برقی لہر ہے۔

۲۔ کائنات خود بخود ذرات کے آپس میں ملنے سے پیدا نہیں ہوئی۔ بلکہ یہ صاحبِ عقل و قدرت ہستی کے ایک عظیم الشان ارادہ کا نتیجہ ہے۔

۳۔ وہ ذاتِ حق یا حقیقت جس نے دنیا کو پیدا کیا مادی جسم والی نہیں ہے

کسی خاص جگہ میں محدود نہیں یا آنکھوں سے دیکھی نہیں جا سکتی۔ وہ ایک روحانی ذات ہے جو سب جگہ ہے اور سب کو محیط کیئے ہوئے ہے۔

۴۔ وہ ہی ساری کائنات کا انتظام کرتی ہے۔

۵۔ تمام کائنات اُس کی قدرت کے اندر ہے۔

۶۔ تمام کائنات ایک عظیم الشان ارادہ کا نتیجہ ہے۔

حرکت اوّلین

تخلیق کائنات کے متعلق علم الاصنام اور علم اولاثان میں بہت سی قیاس آرائیاں ہوئیں۔ ان کا ذکر ہم اُن کے سلسلہ میں کر چکے ہیں۔ کسی نے کہا کہ خدا کے سر میں سے نکلی۔ کسی نے پیر میں سے نکالا۔ تعجب ہے کہ جہاں سے اُن لوگوں نے انسانوں کو اپنے سامنے نکلتے ہوئے دیکھا اپنے خدا کے اُس عضو میں سے کائنات کو نہ نکالا۔ فلسفہ نے بھی اس پر قیاس آرائی کی۔ اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ پہلے ذرات موجود تھے۔ فضائی عالم ان ذرات سے بھری ہوئی تھی۔ ان کے آپس کے ملنے اور علیحدہ ہونے سے یہ کائنات بنی ہے۔ لیکن وہ فلسفہ یہ بتانے سے مطلقاً قاصر رہا کہ یہ حرکت جس نے وصل وفصل پیدا کیا کہاں سے آئی۔ اس حرکت اوّلین کا باعث کیا تھا۔ زمانہ حال کے سائنس نے بھی اسپر قیاس آرائی کی۔ جب یہ معلوم ہو گیا کہ تمام، مادہ محض بجلی کی لہروں کے اجتماع اور انجماد کا نتیجہ ہے تو اُنھوں نے نتیجہ نکالا کہ۔

پہلے ایک Primaeval Chaos; تھا۔ جب کہ تمام کائناتیں جو اب تک معلوم ہوئی ہیں اور ابھی تک معلوم نہیں ہوئیں ایک Gas; کی صورت میں تھیں۔ پھر یہ گیس اپنی اندرونی حرکت کی وجہ سے جمنے لگی اور بڑے بڑے گولے چکر لگانے لگے۔ اس چکر لگانے کو یہ لوگ Rotation; کہتے ہیں اور بگولے اپنی اندرونی کشش ثقل کی وجہ سے جمنے لگے۔ اور اس انجماد کا نتیجہ متفرق ستارے اور سیارے ہیں جن میں ہماری دنیا شامل ہے۔ لیکن حرکت بگولائی اون میں باقی ہے اور باقی رہے گی۔ اور یہ ہی ان کی حیات کا باعث ہے اور آخر میں یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ یہ محض اٹکل ہے۔ ممکن ہے

ایسا ہو۔ ممکن ہے ایسا نہ ہو۔ (۹۰)
دیکھیئے وہ ہی بات آگئی کہ ہم کو یقینی علم نہیں ہے۔ دوسری بات جو وہ کہتے ہیں وہ یہ ہے کہ یہ چکری حرکت Rotation; اُس وقت ہی ممکن ہو سکتی ہے۔ کہ جب چکر لگانے والی شے گیس ہو یا پانی۔ کسی اور صورت میں ممکن نہیں۔ ناظرین اس بات کو ذہن میں رکھیں۔ کیونکہ جناب امیر علیہ السلام کا خطبہ جو تخلیق کائنات کے متعلق ہے۔ اور نہج البلاغہ کا پہلا ہی خطبہ ہے۔ اُس کے سمجھنے میں یہ بات مدد دے گی۔

زمانۂ حال کے سائنس میں کشش ثقل (Gravitation;) کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ ان تمام کائناتوں کے ستارے اور سیارے فضا میں اس کشش ہی کی وجہ سے اپنا اپنا کام کر رہے ہیں۔ اگر یہ کشش نہ ہو تو درہم برہم ہو جائے۔ اس کشش کی رفتار ایک مقررہ راستہ پر اُس وقت ہی قائم رہ سکتی ہے۔ اگر ایک دوسرے سے کشش کرنے والے اجرام ہمیشہ اُس ہی وزن کے رہیں جو اس رفتار کے وقت اُن کا وزن تھا۔ اگر وزن کم و بیش ہوا تو کشش کے توازن میں فرق پڑ جائے گا اور اگر کشش کے توازن میں فرق پڑا تو اُن کا پہلا مقررہ راستہ قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ سب کچھ اُن کے اجسام کے وزن یا MASS پر منحصر ہے۔ (۹۱) اب اپنے نظام شمسی کو لو۔ یہ ثابت ہے کہ سورج کا جسم یا وزن یا MASS ہر سکنڈ میں چالیس لاکھ ٹن کم ہو رہا ہے (۹۲) زمین کی عمر تین ارب سال کم سے کم بیان کی جاتی ہے۔ سورج کی عمر اس سے بہت زیادہ ہے۔ ایک سکنڈ میں ۴۰ لاکھ ٹن سورج کا جسم کم ہوا۔ اور اتنے عرصہ سے کم ہو رہا ہے۔ اب تک تو کبھی کا ختم ہو گیا ہوتا۔ لیکن ظاہر ہے کہ جو کچھ وزن کم ہو رہا ہے۔ بالکل اتنا ہی ہر سکنڈ

---

(۹۰) (90) Sir James Jeans: The The Universe Around Us, Chapt. V. PP. 210-236.

(۹۱) (91) The Universe Around Us, P. 39.

(۹۲) (92) The Universe Around Us, P. 159.

میں بڑھ رہا ہے۔ وہ کہاں سے بڑھ رہا ہے۔ یعنی یہ کمی کہاں سے پوری ہو رہی ہے۔ اہل سائنس کہتے ہیں کہ کچھ سورج کے اندر خزانہ ہو گا جس میں سے اس کا وزن وجسم جو بشکل نور (Radiation;) ختم ہو رہا ہے پورا ہوتا ہے۔ لیکن اہل سائنس کو نہیں معلوم کہ کہاں سے اور کس طرح یہ کمی پوری ہو رہی ہے (۹۳) یہ تو ان لوگوں کے علم کی حالت ہے۔ اور دعویٰ اتنا کہ رموزِ کائنات ہم محض اپنی عقل سے معلوم کریں گے۔ بات وہی ہے۔ مَا لَهُم بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ، إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ جو کمی ہر سکنڈ میں ہو رہی ہے وہ اسی وقت پوری ہو جائے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ادھر وزن جسم میں کمی ہوئی، ادھر نظام کشش بگڑا۔ اور ساری کائنات درہم ہوئی۔ ان کو تو خبر نہیں یہ کیونکر ہوتا ہے۔ کیا پھر بھی قرآن شریف کے اس دعویٰ کو نہ مانیں گے کہ

وَالشَّمْسُ تَجْرِي لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ۚ ذَٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ۝ لَا الشَّمْسُ يَنبَغِي لَهَا أَن تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ۚ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ ۝ یس ۳۶ : ۳۸، ۴۰

حیات

قرآن شریف میں موت وحیات کے خالق کا ذکر اس طرح ہے۔

تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ ۝ الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ طِبَاقًا ۖ مَّا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمَٰنِ مِن تَفَاوُتٍ ۖ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرَىٰ مِن فُطُورٍ ۝ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنقَلِبْ إِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَهُوَ حَسِيرٌ ۝ الملک ۶۷ : ۱تا۴

ترجمہ: برکت والا ہے وہ خدا جس کے قبضہ میں تمام جہان کی

---

(۹۳) The Universe Around Us, PP. 157-58

بادشاہت ہے اور وہ ہر چیز پر پوری پوری قدرت رکھتا ہے۔ جس نے موت کو بھی پیدا کیا اور حیات کو بھی تاکہ تم کو آزمائے کہ تم میں سے کون شخص عمل میں بہتر ہے اور وہ ہی زبردست اور سب سے زیادہ بخشنے والا ہے جس نے سات آسمانوں کو اوپر تلے پیدا کیا۔ تم خدائی رحمان کی آفرینش میں کوئی نقص نہ پاؤ گے پھر نظر ڈال کر دیکھو آیا تم کوئی خلل دیکھتے ہو پھر بار بار نظر ڈالو وہ نظر تمھاری طرف تھک کر ذلیل ہو کر لوٹ آئے گی۔

اسلام نے بغیر کسی تذبذب اور شبہ کے بتا دیا کہ موت و حیات کو خداوند تعالےٰ نے پیدا کیا۔ جن اسباب سے موت واقع ہوتی ہے اُن کو بھی خدا نے پیدا کیا اور جن اسباب سے حیات پیدا ہوتی ہے اُن کو بھی خدا نے ہی پیدا کیا۔ وہ خدا ایسا قدرت والا ہے کہ تمام کائنات کی بادشاہت اُس کے ہاتھ میں ہے۔ اور سب اسباب و واقعات اُس کے زیر حکم اور اُس کی اجازت سے کام کر رہے ہیں۔ اُس کی مخلوقات اور مصنوعات میں کوئی نقص نہیں ہے۔ اپنی نظر چاروں طرف دوڑاؤ، خوب غور کرو کہیں نقص و فطور نہ پاؤ گے۔ یہ بہت بڑا دعویٰ ہے اور دہریت کے لئے قاطع جواب ہے۔ دہریت تو ابھی سمجھ ہی نہیں سکی ہے۔ نقص کیا نکالے گی۔ سائنس کی ساری کوشش قوانین قدرت کے معلوم کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ اور اُس میں بھی پوری کامیابی نہیں ہوئی۔ جب یہ حالت ہے تو وہ نقص کیا نکالیں گے۔ اگر بے عقل اور بے حس مادہ کی لایعنی حرکت کا نتیجہ ہوتا تو ضرور اس میں نقص ہوتا۔ یہ سارا انظام جس میں نہ نقص ہے اور نہ کوئی بے جا معارضہ و اختلاف اس امر کا مقتضی ہے کہ وہ کسی ایک ذات کے تابع ہو۔ اُس کی بادشاہت میں ہو۔ اُس کے کہنے پر اور اُس کی مرضی کے مطابق عمل کرے۔ ورنہ اگر کائنات کو کوئی قابو میں رکھنے والا نہیں ہوتا تو سارا شیرازہ فوراً درہم و برہم ہو جاتا۔ یہی مطلب تھا حضرت ابراہیم کا جب اُنھوں نے کافر سے کہا تھا کہ میرا خدا تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، اگر تیرا تصرّف ہے، یا یہ بالکل اتفاق ہے تو تو اِس کو مغرب سے نکال کر دکھا یا اتفاق تو چاروں طرف کا ہو سکتا ہے مشرق ہی سے کیوں نکلا کرے۔

منکرین خدا کہتے ہیں کہ ہم کو دھر ہی پیدا کرتا ہے اور دھر ہی مار ڈالتا ہے، اچھا۔اب وہ آئیں اور ہمیں بتائیں کہ دھر اُن کو کس طرح پیدا کرتا ہے۔ عقل اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتی کہ بے عقل و بے حس شے کس طرح ایک باعقل صاحب جذبات ہستی کو پیدا کر دے گی۔ جو شے اُس میں خود نہیں ہے۔ وہ دوسرے کو کس طرح دیدے گی۔

اہل سائنس ابتدا سے کوشش کر رہے ہیں کہ معلوم کر سکیں کہ کائنات میں حیات کیونکر آئی۔ لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ اور اب اُنھوں نے تسلیم کر لیا ہے کہ وہ کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ اُنھوں نے کئی نظریات قائم کئے۔ آخری نظریہ یہ تھا کہ ایک .Moleeule کے ایٹموں کی خاص تعداد اور تناسب میں .Carbon کا .Atom ملنے سے حیات پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اسی طرح پیدا ہوئی ہوگی۔ اُن کے اس گمان کی بنیاد یہ تھی کہ ;Living Cell میں یہ ایٹم اسی طرح واقع ہیں۔ اس تھیوری کو اُنھوں نے اس طرح بیان کیا تھا:۔

ترجمہ:۔ (الف)۔ (کاربن والی تھیوری بیان کرنے کے بعد مصنّف کہتا ہے کہ) اگر یہ اسی طرح ہے تو نتیجہ نکلا کہ کائنات میں حیات ہونے کی وجہ یہ ہے کہ کاربن کے ایٹم میں کچھ غیر معمولی خاصیتیں ہیں۔ ممکن ہے یہ وجہ ہو کہ کاربن ایک ایسی شے ہے جو دھات اور غیر دھات کے درمیان درمیان ہے۔ لیکن اب تک کاربن کے ایٹم میں کوئی ایسی خاص بات نہیں معلوم ہو سکی ہے کہ جس سے اُس کی اس خاصیت کی توجیہ ہو سکے جو اس میں دوسرے ایٹموں کو باہم بندش میں رکھنے کی ہے۔ کاربن کے ایٹم میں چھ الیکٹرون ہوتے ہیں جو ایک درمیانی مرکز کے اردگرد اسی طرح چکر لگاتے رہتے ہیں جس طرح چھ سیارے مرکزی سورج کے گرد چکر کاٹ رہے ہیں۔ جہاں تک معلوم ہو سکا ہے کیمکل عناصر کی فہرست میں کاربن اپنے دو نزدیک ترین ہمسایوں، بورن اور نائٹروجن، سے صرف اتنا مختلف ہے کہ اس میں بورن سے ایک زیادہ الکٹرون ہے اور نائٹروجن سے ایک کم ہے۔ اب اس ہی ذرا سے اختلاف سے حیات اور غیر حیات کا عظیم الشان فرق ثابت ہو جانا چاہئے۔ بلاشبہ یہ وجہ کہ چھ الیکٹرون والے ایٹم میں یہ عجیب و غریب

خاصیتیں کیوں ہیں۔ اسرار قدرت میں تلاش کرنی چاہیئے۔ ریاضی پر سخت طبیعیات تو اب تک یہ وجہ نہیں معلوم کر سکی ہے۔

(ب) دوسرے الفاظ میں۔ کیا حیاتیہ Life cell صرف معمولی ایٹموں کا غیر معمولی طریقے سے مرتب کیا ہوا اجتماع ہے؟ یا کیا وہ اس سے کچھ اور زیادہ ہے؟ کیا وہ صرف ایٹم ہیں یا ایٹم جمع زندگی ہیں؟ یا بالفاظ دیگر کیا کوئی ہشیار کیمسٹ چند ایٹموں کو جمع کر کے زندگی پیدا کر سکتا ہے جس طرح کہ ایک لڑکا مکانو سے مشین بنا کر اسے چلا دیتا ہے۔ ہمیں ان سوالات کا جواب نہیں معلوم۔ (ختم ہوا ترجمہ) اصل کے لئے دیکھو ضمیمہ ۱۲۔

اس ہی عدد ۶ کی اس طلسمی خاصیت کو ایک اور سائنس داں اس طرح بیان کرتا ہے:۔

ترجمہ:۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ حیاتیہ میں چھ کا عدد ہے۔ لیکن مجھے نہیں معلوم کہ اس امر واقعہ کو کس طرح واضح کیا جائے کہ کائنات میں حیات نہ ہوتی۔ اگر قدرت نے ۶ کے عدد کو نظر انداز کر دیا ہوتا۔ (اصل ضمیمہ ۱۳)

لیکن یہ نظریہ بھی آخر کار غلط ثابت ہوا۔ اب آخری فیصلہ ان کا یہ ہے کہ ہمیں نہیں معلوم کہ دنیا میں حیات کس طرح نمودار ہوئی۔ دیکھو (۹۴) اور لیں وہ اس نظریہ پر پہنچے ہیں کہ ہم اہل مذہب کے خدا کا انکار نہیں کر سکتے۔ (۹۵)

ترجمہ:۔ سچ تو یہ ہے کہ کوئی نہیں جانتا کہ اس بے جان دنیا میں حیات کیونکر شروع ہوئی۔ یہ تو کائنات کے بڑے لاینحل تعجبات میں سے ایک تعجب ہے کہ دنیا جو ابتداء میں محض بے جان میدان تھی کیونکر ایسی چہل پہل والی جگہ بن سکتی تھی۔ لیکن اگرچہ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ حیات کس طرح شروع ہوئی۔ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ کہاں شروع ہوئی۔ وہ سمندر میں شروع ہوئی۔

(94) Mysterious Universe, pp. 7,8.
The Universe Around Us, p. 285.
The Golden Book of Knowledge, Vol. 1. P. 22.

(95) Sir Arthur Eddington: The Nature of the Physical World. pp. 192, 272, 304, 310, 311, 320, 335.
The Mysterious Universe, pp. 111, 137.

(اصل ضمیمہ ع ۹)

Science is not yet in contact with ultimate reality.

The Mysterious Universe, P. 111

ترجمہ:۔ سائنس کو ابھی آخری و قطعی حقیقت نہیں معلوم۔

EVOLUTION: ارتقاء

دہریت کی یہ بہت بڑی بحث ہے کہ کوئی مذہب الہامی نہیں ہے۔ بلکہ بنی نوع انسان بتدریج وحدانیت کے تخیل تک پہنچی ہے۔ اپنی بحث کی تائید میں وہ ان ازمنہ ماضیہ کے لوگوں کو پیش کرتے ہیں۔ جب پتھر، درخت، جانور کو خدا سمجھا جاتا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ مذہب کی ابتدا خوف سے ہوئی نہ کہ الہام سے۔ جس چیز سے ڈر لگا اُس ہی کو خدا سمجھنے لگے۔ جسمانی صورت میں بھی انسان اس شکل تک قانون ارتقاء سے پہنچا ہے۔ اس کے آباو اجداد بندر تھے۔ اب بندروں کی تھیوری کو چھوڑ کر کہا جاتا ہے کہ اس کے آباو اجداد بحری جانور تھے۔

اتنا تو ثابت ہے کہ کچھ قومیں ایسی گزری ہیں جو اپنی تاریخ کے کسی دور میں ارواح خبیثہ کا اعتقاد رکھتی تھیں۔ اور اپنے خداؤں کو جانوروں کی سی شکلیں دیتی تھیں۔ اور ایسی اقوام دور افتادہ مقامات میں اب بھی پائی جاتی ہیں۔ یہ تو یقینی ہے۔ اس کے بعد جو ہے وہ قیاس ہے۔ جس کی بناء پر آج کل کے لوگوں نے ازمنہ سابقہ کی اقوام کی تاریخیں لکھی ہیں۔ واقعات کو قیاسات سے ملا کر ایک مسلسل بیان بنا لیا ہے۔ تاریخ بنانی تو ضرور تھی۔ اور مواد کچھ زیادہ ملتا نہ تھا، لہذا قیاس ہی کو کام میں لانا پڑا۔ اس ہی اصول پر انھوں نے پرانے زمانے کے لوگوں کے واقعات کی تاریخ لکھی ہے۔ اور اس ہی اصول پر ان کے مذہب کی تاریخ لکھی گئی۔ چونکہ کسی زمانہ میں ان لوگوں نے اُن کے خداؤں کو جانوروں کی شکل میں پایا تو نتیجہ نکالا کہ ابتداء ان کی عبادت کی جانوروں سے ہوئی۔ یہ قیاس ہے، یہ بھی تو ممکن ہے کہ یہ نتیجہ غلط ہو۔ ہو سکتا ہے کہ جانوروں کی صورت کی ابتداء اوتار کے تخیل سے ہو۔ جن اقوام میں جانوروں اور بتوں کی صورت میں خدا ملتے ہیں، اُن اقوام میں اوتار

Incarnation کا تخئیل بھی تو ساتھ تھا۔ دریائے نیل و گنگا و جمنا کے متعلق بھی تو یہ ہی کہا جاتا ہے کہ پہلے وہ دیویاں تھیں۔ اب ایک واقعہ کی وجہ سے جو بتایا جاتا ہے وہ روتے روتے دریا بن گئیں۔ کسی سراغرساں نے کسی طرح رامچندر جی کو لنکا پہنچایا۔ ان کی سمجھ میں یہ تو نہ آیا کہ کس طرح پہنچایا تھا۔ سمجھنے لگے کہ وہ ہنومان جی تھے جنھوں نے اپنی دم پر رام چندر جی اور اُن کے سارے لشکر کو پار اُتارا۔ امر واقعہ تو یہ ہے کہ اُن لوگوں نے ان جانوروں کو اپنا خدا نہیں سمجھا۔ بلکہ اپنے خداؤں کی نسبت انکا خیال تھا کہ اُنھوں نے ان جانوروں کا اوتار لیا ہے۔ کون ہے، خواہ کتنا ہی وحشی کیوں نہ ہو، جس کی دل میں خدا کا تخئیل موجود ہے۔ وہ چوہے، بلی، کُتے، درخت، پتھر۔ یا دریا کو اپنا خدا سمجھے گا۔ بلکہ اصل وجہ یہ ہی ہے کہ اوتار یا حلول کے غلط تخئیل نے ان لوگوں کو اس جال میں پھنسا دیا۔ دیکھئے ویدوں میں تو اصلی اور واحد خدا کا تخئیل موجود ہے۔ زرتشت کی کتھا میں سوائے وحدانیت کے اور کچھ نہیں۔ لیکن مرور ایام سے ویدوں کے خداؤں کی جگہ بت آگئے اور کتھا کے خدا کی جگہ آگ آگئی۔ یہ اگر ارتقاء تھا تو اُلٹا ارتقاء تھا۔ اور یہ ہو نہیں ہو سکتا۔ اوتار کا تخئیل اتنا فضا میں پھیلا ہوا تھا کہ مسیحیت جیسا الہامی مذہب بھی اُس تخئیل سے نہ بچ سکا۔ اور جب اپنی اصلی کتاب کی جگہ جو گم ہو چکی تھی دوسری کتاب اپنے تخئیل سے لکھنے لگے تو اُس میں لکھ دیا کہ عیسیٰؑ انسان بھی ہیں اور خدا بھی۔

جب اوتار کے تخئیل سے وہ لوگ نہ بچ سکے جو الہامی تعلیم کے نزدیک تھے تو وہ کیسے بچتے جو اُس سے بہت دور جا پڑے تھے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ جب خداوند تعالےٰ نے انسان کو زیورِ عقل سے آراستہ کر کے اس دنیا میں بھیجا تو عقل کو صحیح راستے پر رکھنے کے لئے ساتھ ساتھ ہی اپنے پیغمبروں کو بھیجدیا اور یہ بھی بتا دیا کہ تمھارے ساتھ تمھارا سب سے بڑا دشمن شیطان لگا ہوا ہے اس سے بچتے رہنا۔ بہت جلدی شیطان نے قابیل کو اپنے قابو میں کر لیا۔ اب دنیا میں دو طاقتیں ساتھ ساتھ متوازی راستوں پر چلیں۔ قابیلی طاقت اور ہابیلی قدرت۔ جو انبیاء کی تعلیم کے علم کے نیچے رہے۔ وہ ہابیلی قدرت کے زیر اثر موحد رہے۔ جو انبیا کی تعلیم سے بھٹک گئے۔ وہ قابیلی طاقت کے زیر اثر

اوتار کو ماننے لگے - خدا کے وہ بھی قائل رہے لیکن اُس کی صفات کے منکر ہو گئے۔

تعلیم انبیاء سے اعراض کرنے کی دو بڑی وجوہات تھیں - ایک تو خود غرضی اور دوسرے قیاس - تعلیم انبیا میں ہمیشہ آخر کار نتیجہ مدنظر رہا - اور آخری نتیجے کے لئے موجودہ راحت و فائدہ کو ترک کرنے کی تلقین کی گئی - خود غرضی نے موجودہ راحت و آسائش کو ترک کرنا حماقت سمجھا اور قیاس نے اس کوتاہ نظری کی تائید کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم انبیاء سے ہٹ کر اُنھوں نے اپنا ایک علیحدہ مذہب قائم کر لیا۔ یہ وہ علیحدہ مذہب ہے جس پر دہریت قانون ارتقاء حاوی کر رہی ہے - ہم فلسفۂ یونان اور مذاہب عالم کے بیانات میں ہر جگہ جتلاتے رہے ہیں کہ کہاں کہاں اور کس کس اقوال میں تعلیم انبیا کا اثر نمایاں ہے۔ بابلی مذاہب کے حمورابی اور مصری مذہب کے اخناطون کے حالات میں یہ اثر بہت زیادہ نمایاں ہے۔ اُنکی توحید کتنی اعلیٰ درجہ کی ہے - حضرت عیسیٰ سے سینکڑوں برس پہلے یہ توحید کا ارتقاء کیسا - آنحضرت کے زمانہ میں ساتویں صدی عیسوی میں تو بت پرستی کا یہ عروج اور حضرت عیسیٰ سے کئی ہزار برس پہلے یہ توحید - یہ کیسا ارتقاء ہوا - اگر قانون ارتقاء ہوتا تو آں حضرت کے زمانہ تک تو بت پرستی اور شرک غائب ہو چکے ہوتے اور توحید بہت اعلیٰ و ارفع قسم کی ہو چکی ہوتی - اگر الہام نہیں اور ارتقاء ہی ارتقاء ہے تو ارتقاء ایک جگہ تو نہیں ٹھہرتا - توحید پر آن کر کیوں ٹھہر گیا - کیا توحید سے اعلیٰ درجہ دہریت ہے - لیکن دہریت تو اتنی ہی پورانی ہے جتنی توحید - قرآن شریف بتا رہا ہے کہ حضرت ابراہیم سے ایک دہریے اور نیچری ہی نے تو بحث کی تھی علاوہ اس کے توحید مذہب ہے اور دہریت مذہب نہیں ہے - نوع ہی مختلف ہے۔ بہر صورت قانونِ ارتقاء یہاں بھی حاوی نہ ہوا - اور بات یہی ہے - ارتقاء یا Evolution; میں رجعت قہقری نہیں ہوتی - یہ نہیں ہو سکتا کہ ترقی کر کے پھر سابقہ حالت پر عود کر جائے - اہل سائنس اس کو ممکن نہیں سمجھتے کہ مثلاً اونٹ آگے ترقی کر کے پھر اژدہا بن جائے - اگر ایسا ہو تو دنیا میں پھر اژدہوں اور سینگے والے جانوروں کا راج ہو جائے - یہ نہیں کہہ سکتے کہ دنیا میں جو حمورابی اور اخناطون حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ کی توحید تھی - اُس کے بعد پھر دماغ انسانی

بُت پرستی کی طرف راجع ہو گیا۔ رجعت قہقری الفرادی Acquisition میں ہو سکتی ہے۔
میں نے آج ایک علم حاصل کر لیا اور کل بھول گیا۔ آج نیک اور موحد بن گیا۔
کل خیال آیا کہ یہ تو فائدہ مند چیز نہیں۔ دو مہینہ کے بعد پھر صنم پرستی کی طرف
چلا گیا۔ لیکن Evolution میں رجعت قہقری ناممکن ہے۔ ذہنی ارتقاء پر وہ ہی
اصول حاوی ہوں گے جو جسمانی ارتقاء پر۔ کیونکہ دہریت کے مطابق روح کوئی شے نہیں ہے۔ ذہنی
ارتقاء یعنی Mind منحصر ہوا جسمانی ارتقاء یعنی Brain پر اور Brain مادی جسم ہے۔ لہذا
Mind ساتھ ساتھ چلے گا Brain کے اور جب Brain درجہ توحید پر پہنچ گیا تو Mind
بھی پہنچ گیا۔ اب Brain کے لئے رجعتِ قہقری ممکن نہیں لہذا Mind کے لئے بھی
رجعت قہقری نہیں ہو سکتی۔ لہذا ہم یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہیں کہ تخیل توحید بذریعہ
ارتقاء نہیں پیدا ہوا بلکہ بذریعہ الہام حاصل ہوا۔

اب دہریت پلٹا کھاتی ہے۔ کہتی ہے کہ بروئے مذہب تو انسان کو دنیا
پر آئے ہوئے تقریباً چھ ہزار سال ہوئے۔ اور انکشافات ارضی سے معلوم ہوتا ہے
کہ انسان زمین پر کروڑوں برس سے ہے۔ لہذا بروئے مذہب تعلیم انبیاء
زمین پر چھ ہزار برس سے پہلے نہ تھی۔ اور انسان کروڑوں برس سے ہیں تو اِن
چھ ہزار برس پہلے کے آدمی بغیر تعلیم انبیاء کے رہے۔ خدا نے پہلے کیوں نہ
انسان کی ہدایت کی۔

اس کے دو جواب ہیں۔ ایک تو یہ کہ مسیحیت ضرور انبیاء کی ابتداء کو اب
سے چھ ہزار برس پہلے کی بتاتی ہے۔ لیکن قرآن یہ نہیں کہتا۔ اس میں نہ تو الہام
کے زمانہ کی ابتدا کے سال بتائے گئے ہیں اور نہ دنیا پر انسان کی آبادی کو
چھ ہزار سال میں بند کیا ہے۔ بلکہ یہ کہدیا ہے کہ بہت سے بشیر و نذیر و انبیاء
گزرے ہیں جن کا ہم نے ذکر نہیں کیا۔ اور ان کا نام نہیں بتایا۔ لہذا ہم اتنا
ہی کہہ کر ختم کر سکتے ہیں کہ ہم کو اس چھ ہزار سال کی قید سے کچھ تعلق نہیں ہے۔
لیکن جب بات نکل آئی تو اُس کو پورا ہی کر دیں۔

اہلِ بائیبل اپنی کتاب سے حضرت آدم سے آج (۱۹۵۶ء) تک ۵۹۸۴ سال
بتلاتے ہیں۔ ان کے خیال میں حضرت آدم کے دنیا میں آنے کے ۱۶۵۶ سال کے

بعد طوفان نوح آیا۔ اور طوفان نوح سے حضرت ابراہیم کی بعثت تک ۴۲۷ سال ہوئے حضرت ابراہیم کا زمانہ ۱۹۴۵ سال قبل مسیح تھا۔ اس طرح حضرت آدمؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک ۴۰۲۸ سال ہوئے۔ دیکھو (۹۶)

اہل سائنس اور مورخین تہذیب کی ابتداء تو اب سے تقریباً چھ ہزار سال ہی پہلے بتاتے ہیں۔ اس سے پہلے اُن کے خیال میں آدمی تو تھے۔ لیکن وہ جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا کو بنے ہوئے ۲,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰ سال ہوئے۔ دنیا میں زندگی کی ابتداء کو ۳۰۰,۰۰۰,۰۰۰ سال ہوئے۔ انسان کو دنیا میں پیدا ہوئے تین لاکھ سال ہوئے۔ اور تہذیب کو شروع ہوئے ۶۰۰۰ سال ہوئے۔ دیکھو (۹۷)

پادریوں اور اہل سائنس وتاریخ کا یہ اہم تنازعہ ہے۔ سائنس دانوں کے نظریہ کے متعلق اہل بائیبل یہ کہتے ہیں:۔

ترجمہ:۔ خداوند تعالےٰ کے کلمۂ حق سے معلمین سائنس کی حماقت ظاہر ہے جو کہتے ہیں کہ انسان اس زمین پر اپنی اسی مکمل حالت میں لاکھوں برس سے ہے۔ لیکن اس زمانہ کی صحیح مقدار کے متعلق خود اہل سائنس کا آپس میں اتفاق نہیں ہے اصل ضمیمہ نمبر۱۰ (ترجمہ ختم ہوا) (۹۸)

ڈارون کے اصول ارتقاء پر اعتماد کرکے بعض اہل سائنس یہ کہتے ہیں کہ بندر کا جسمانی اور دماغی ارتقاء بتدریج ہو کر انسان بنا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اہل مذہب جو کہتے ہیں کہ انسان اپنی موجودہ صورت اور حالت ہی میں زمین پر ڈالا گیا ہے غلط ہے۔ لیکن سائنس کا یہ نظریہ ثبوت کے اُس درجہ تک نہیں پہنچا جس سے یقین پیدا ہوتا ہے۔ اُن کی تھیوری کی بناء صرف یہ ہے کہ پُرانے ڈھانچے، کھوپری اور جسم کے جو پائے گئے ہیں اُن پر غور کرنے سے

(۹۶) (96) The Truth shal make You Free, published by Watch Tower Bible and Tract Society. pp. 150-52.

(97) The Universe Around Us, P. 13, Toynbee's History, Vol. I. pp. 173-4. (۹۷)

(98) The Truth Shall Make You Free, p. 146. (۹۸)

معلوم ہوتا ہے کہ وہ آدمی کے ہیں۔ اور فلاں فلاں علامات سے یہ پایا جاتا ہے کہ وہ اتنے سال کے ہیں۔ لیکن ان ڈھانچوں سے موجودہ بنی نوع انسان کی قدامت کا نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ وہ ایسی مخلوق کے ہوں جن کے جسم آدمیوں سے ملتے جلتے ہیں۔ مثلاً اگر آج کے ہرن اور بکری کے ڈھانچے اب سے دس ہزار سال بعد ملیں، تو ان سے نتیجہ نکالنا کہ یہ دونوں بکرے کے ہیں یا ہرن کے ہیں غلط ہوگا۔ ڈارون کی یہ تصویری خود اہل سائنس میں شک کی نظر سے دیکھی جا رہی ہے۔ اور ان میں ایک جماعت ہے جس کا اتفاق اس نظریہ سے نہیں ہے Mr. Ouspensky. لکھتے ہیں۔ (۹۹)

ترجمہ: انسان کی ابتدا، اور اس کے گذشتہ ارتقاء کی نسبت جو زمانۂ حال کے نظریات ہیں۔ میں بغیر کسی ہچکچاہٹ ور کاوٹ کے کہتا ہوں کہ وہ قابل قبول نہیں ہیں۔ ہم کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ ہم کو انسان کی ابتدا کے متعلق کچھ علم نہیں ہے اور ہمارے پاس انسان کے جسمانی اور دماغی ارتقاء کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

برعکس اس کے اگر ہم تاریخی زمانہ کے بنی نوع انسان کو لیں یعنی اب سے دس یا پندرہ ہزار برس پہلے کے بنی نوع انسان تو ہم کو بلاشک وشبہ موجودہ انسانوں سے کہیں بہتر انسانوں کے نشانات ملتے ہیں۔ جن کی موجودگی ایسے آثار اور یادگاروں کے ذریعہ سے ثابت ہوتی ہے جو نہ تو موجودہ بنی نوع انسان بنا سکتے ہیں اور نہ اُن کی نقل کر سکتے ہیں۔

تاریخی زمانہ سے پہلے کے انسان یا مخلوقات ظاہری طور سے انسان کے مشابہ تھے لیکن اس کے ساتھ ہی وہ انسانوں سے بہت مختلف تھے۔ ان کی ہڈیاں برفانی دور یا اس سے پہلے کی تہ نشین طبقات میں ملتی ہیں۔ ان کے متعلق ہمارا یہ نظریہ صحیح ہے کہ یہ ہڈیاں ایسی مخلوقات کی ہیں جو بالکل انسان سے مختلف تھے اور جو عرصہ ہوا کہ نابود ہو چکے ہیں۔

(99) P D. Ouspensky: The Psychology of Man's Possible Evolution, pp. 10,11.

ہمارا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ انسان جس کو ہم جانتے ہیں یہ مکمل انسان نہیں ہے قدرت اس کی نشو ونما ایک حد تک کرتی ہے اور پھر اس کو وہیں چھوڑ دیتی ہے۔ اب اس کے بعد یا تو وہ خود اپنی کوشش اور ترکیبوں سے آگے ترقی کرے یا ایسا ہی زندہ رہے اور مرجائے جیسا کہ وہ پیدا ہوا تھا یا اس سے بھی نیچے گر جائے اور ترقی کرنے کی اہلیت ہی کھو بیٹھے۔

اس صورت میں انسان کے ارتقاء کے معنی ہوں گے: چند اندرونی طاقتوں اور حالتوں کا نشو ونما جو عام طور سے بغیر نمو کے رہتی ہیں اور خود بخود ترقی نہیں کر سکتیں۔

تجربہ ومشاہدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ترقی یا نشو ونما صرف چند محدود حالتوں ہی میں ممکن ہے وہ بھی محض انسان کی خود اپنی خاص قسم کی کوششوں کے ذریعہ سے جس کے ساتھ کافی مدد ان لوگوں کی بھی ہونی چاہیئے جو پہلے ایسی کوشش کر چکے ہیں اور اب وہ نشو ونما یا ترقی کر کے ایک خاص درجہ پر پہنچ گئے ہیں یا کم سے کم ان کو اس نشو ونما کے طریقے معلوم ہو گئے ہیں۔

لہٰذا ہم کو اس نظریہ سے آغاز کرنا چاہیئے کہ دو شرطوں کے بغیر ارتقا ناممکن ہے ایک تو یہ کہ انسان خود کوشش کرے اور دوسرے یہ کہ اس درجہ کو حاصل کیئے ہوئے لوگوں کی مدد اس کو ملے۔

اس کے بعد ہم کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس نشو ونما سے انسان بالکل مختلف ہستی ہو جائیگا اور ہم کو معلوم ہونا چاہیئے اور سمجھنا چاہیئے کہ کن معانی میں اور کس رخ کی طرف انسان ایک مختلف ہستی ہو جائے گا۔ یعنی مختلف ہستی کے کیا معنی ہیں۔

پھر ہم کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ ہر ایک آدمی یہ نشو ونما حاصل نہیں کر سکتا اور تمام بنی نوع انسان کو زیر نظر رکھ کر یہ بہت شاذ و نادر استثناء ہے۔ یہ بات اگرچہ عجیب معلوم ہو لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ صرف یہی نہیں کہ یہ نشو ونما شاذ و نادر ہے بلکہ جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے یہ زیادہ شاذ و نادر ہو رہا ہے۔ (ختم ہوا ترجمہ اصل ضمیمہ ۱۱)

مسٹر اوس پنسکی روسی محقق ہیں۔ اہل روس کے قلم سے ایسی باتوں کا نکلنا حق کے ہمیشہ غالب رہنے کا ثبوت ہے۔ اس محقق نے نہایت قوی اور معقول دلائل سے

ثابت کیا ہے کہ ڈارون اور اُس کے متبعین کی ارتقائی تھیوری غلط ہے ۔ وہ ہڈیاں اور ڈھانچے جو پرانے ہیں اور اب زمین سے برآمد ہوئے ہیں وہ ایسی مخلوق کی ہیں جو ساخت میں کچھ انسان کے مطابق تھے ۔ لیکن دراصل انسان نہ تھے ۔

بڑے غور کی ضرورت ہے ۔ .Ouspensky کی تحریر سے انبیا کے آنے کی ضرورت بھی ثابت ہوتی ہے اور اُن کی بعثت کی تصدیق بھی ہوتی ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ قدرت انسان کو نشو ونما کے ایک درجہ پر لاکر چھوڑ دیتی ہے اُس کے بعد اُس کے اندرونی قوائے کا نشو ونما نہیں ہو سکتا ۔ اس حد کے بعد ذہنی و اخلاقی نشو ونما ہونے کے لئے دو شرطوں کے اجتماع کی ضرورت ہے ایک تو یہ کہ انسان نشو ونما کے لئے خود اپنی ترکیبوں سے کوشش کرے ۔ اور دوسرے یہ کہ ان آدمیوں کی مدد بھی اُس کو حاصل ہو جائے جو اس سے پہلے اس منزل سے گزر چکے ہیں مسٹر .Ouspensky روسی ہیں اور روس آجکل دہریت کا دار القرار ہے ۔ ایسا نظر آتا ہے کہ انشاءاللہ بہت جلد یہ ہی روس دہریت کا دار الفرار ہوگا ۔ یہ محقق انبیاء و مرسلین کا لفظ تو نہیں استعمال کر سکتا تھا ۔ کیونکہ وہ پکا روسی ہے ۔ لیکن اگر غور کرو تو ان کی ہی بحث سے انبیاء کی ضرورت اور بعثت کی تصدیق ہوتی ہے ۔

وہ کہتے ہیں کہ انسان کے اندرونی قوائے روحانی کے نشو ونما کے لئے دو شرطیں ہیں ۔ ایک تو انسان کی اپنی کوشش اور دوسرے ایسے اشخاص کی مدد جو یہ ترقی کر چکا ہو اور ان قویٰ سے اُس کے قوائے اعلیٰ و ارفع ہوں یا اُس کو اس ترقی کے طریقے معلوم ہوں ۔ اب سے کئی نسلوں پیچھے تک چلو ۔ ایسے آدمی ملتے جائیں گے کیونکہ موجودہ اُٹھتی ہوئی نسل کی تعلیم کے لئے ان سے زیادہ عمر والے لوگ جنھوں نے پہلی نسل دیکھی ہو ۔ موجود ہوتے ہیں ۔ لیکن آخر میں چل کر ایسی بھی تو منزل آجائے گی ۔ جہاں یہ اونچی روحانی طاقتوں والا آدمی نہ ہوگا ۔ وہاں سے یہ سلسلہ کیوں کر چل کر ہم تک آیا ۔ ظاہر ہے کہ آخر میں ایک ایسا آدمی ہوگا ۔ جو خود اس بیرونی مدد کا محتاج ہوگا ۔ یہ اصول تو .Mr. Ouspensky قائم ہی کر چکے ہیں کہ بیرونی مدد کے بغیر قوائے اندرونی کی نشو ونما نہیں ہو سکتی ۔ اُس آدمی کو کون تعلیم و مدد دینے والا تھا ۔ یہی وہ کہتے ہیں کہ یا یہ خود اس منازل سے گزر چکا ہو یا اُس کو اس نشو ونما کے طریقے معلوم ہوں ۔ طریقے بتلانے

والا کون ہوگا - ظاہر ہے کہ اُس آدمی کو اُس ذات سے تعلیم و مدد و علم اسباب ترقی ملے ہوں گے - جو ہمیشہ سے ہے - ایسے تعلیم یافتہ آدمی ہی کو ہم حامل علم لدنی کہتے ہیں - وہ ہی انبیاء و مرسلین تھے - اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک ذات ایسی ازل سے ہے جو بنی نوعِ انسان کو مدد دیتی رہی ہے - کیونکہ بغیر اُس کی مدد کے یہ ترقی و نشو و نمائی قوائے اندرونی نہ ہوتے - ایک دہریے کی تحریر سے خداوند تعالےٰ کی ہستی ثابت ہو رہی ہے - کیا یہ معجزہ نہیں ہے - جب لوگ ایک نبی کی تعلیم تقریباً بھول گئے تو دوسرا نبی آگیا - اور یہ ترقی کا سلسلہ اسی طرح جاری رہا - آخر میں ایک ایسا زمانہ آگیا کہ آخری نبی کی تعلیم محو نہ ہوئی - بلکہ کوئی نہ کوئی آدمی ضرور اس کی تعلیم کو آگے چلانے کے لیے رہنے لگا - یہ آخری نبی جناب محمد مصطفٰے تھے - آخری تعلیم اسلام کی صورت میں باقی رہی - اور اس تعلیم کو اُس کی اصلی حالت میں قائم رکھنے والے آئمہ اہلبیت رسالت تھے - مسلمانوں کی تاریخ کو غور سے مطالعہ کرنے والا اس ہی نتیجہ پر پہنچے گا - اس کی تفصیل تو بعد میں کریں گے - اتنا یہاں بتلائے دیتے ہیں کہ وہ لوگ حکومت کے تخت یا امارت مسند پر بیٹھنے والے نہ تھے - وہ یا تو مسجد میں سوکھی روٹی کھا کر درس دینے والے تھے یا حضرتِ یوسف کی طرح قید خانہ میں رہ کر اس تعلیم کو پھیلانے والے تھے - اور جب شیطان نے اُن کی ہستی میں اپنی موت دیکھی تو اپنے مریدوں اور اولیاؤں کو حکم دیا کہ اب ان کو زندہ نہ چھوڑو اور جب اُن بزرگواروں نے یہ دیکھا تو اصحاب کہف کی طرح نظروں سے غائب ہوگئے اور وہیں سے اُن کا فیض ان لوگوں کو پہنچ رہا ہے جو اُس کے طالب ہیں - Mr. Ouspensky. یہ بھی کہتے ہیں کہ بغیر اس مدد اور اس تعلیم کے انسان مکمل نہیں ہوتا - جو آدمی یہ مدد اور تعلیم دیتا ہے وہ انسانِ کامل ہونا چاہیئے - اس روسی مصنّف نے ان کامل انسانوں کے نام نہیں بتائے ورنہ ہم اُن کے سوانح حیات سے ان کی استعداد اور کمال کا اندازہ کرتے - بہرصورت - وہ لوگ جن کو اُستادِ ازل نے تعلیم دے کر بھیجا ہے اور تعلیم کے لئے مقرر کیا ہے وہ تو کامل انسان ہونے چاہئیں - واقعی وہ کامل تھے - ہم اُن کے نام بھی بتائیں گے اور اُن کی تعلیم بھی پیش کریں گے تاکہ اس تعلیم اور اُن کے سوانح حیات سے ناظرین خود اُن کے کامل ہونے کو دیکھ لیں -

Mr. OUSPENSKY یہ بھی کہتے ہیں کہ اس تعلیم کی وجہ سے آدمی عام انسانوں سے بالکل مختلف ہو جاتا ہے۔ اور ہونا ہی چاہیئے۔ کیونکہ وہ کمال ہی ایسا اعلیٰ درجہ کا ہوتا ہے کہ کامل انسان عام آدمیوں سے بالکل مختلف اور ممیز ہو جاتا ہے۔ وہ کمال کیا ہے۔ وہ کمالِ احتراز از گناہ ہے۔ سائیکولوجی اور فزیولوجی (Psychology & Physiology.) کا علم جاننے والے جانتے ہیں کہ ایک دفعہ کا گناہ عمر بھر کے لئے اپنا اثر چھوڑ جاتا ہے۔ فقہِ اسلام میں گناہ سے توبہ صحیح کرنے کے بعد خداوند تعالیٰ مغفرت کر دیتا ہے۔ بشرطیکہ توبہ ان شروط کے ساتھ کی جائے جو قرآن شریف میں درج ہیں۔ یغفر الذنوب کا فقرہ استعمال ہوا ہے۔ خداوند تعالیٰ غفور الرحیم ہے۔ مغفرت کر دے گا۔ ان الفاظ کا مادہ ہے غ۔ ف۔ ر یعنی غفر جس کے معنی ہیں ڈھک لینا۔ گناہ ڈھک لیا گیا لیکن اگرچہ خدا نے معاف کر دیا۔ مگر BRAIN Paths. پر اُس کا اثر رہا اور رہے گا۔ ایک گناہ نے اتنے اثرات پیدا کیئے تھے کہ وہ گناہ کرنے والے پر اثر انداز ہوئے۔ گناہ معاف ہو گیا۔ لیکن کمال میں فرق آگیا۔ کامل انسان وہ ہے جو صاحبِ عصمت ہو یعنی اُس نے ایک گناہ بھی نہ کیا ہو۔ معصوم ہو۔ اس ہی وجہ سے بروئے اعتقاد اسلامیہ انبیاء اور آئمہ علیہم السلام معصوم تھے۔ کیونکہ وہ کامل انسان تھے۔ قانونِ فطرت، قانون الٰہی، سنّت الٰہیہ یہ سب ہم معنی الفاظ ہیں۔ انبیا اور آئمہ علیہم السلام کے سوانح حیات دنیا کے سامنے ہیں۔ کہیں گناہ کا شائبہ تک نہیں۔ لیکن سوانح حیات سچے ہونے چاہئیں وہ نہیں جو موجودہ انجیل میں ہیں۔ ان کی رو سے تو معاذ اللہ حضرت داؤدؑ زانی ہوں گے۔ اور حضرت لوطؑ نے شراب پی کر اپنی لڑکیوں سے زنا کیا ہو گا (۱۰۰) یہ موجودہ انجیل کا ذکر ہے۔ اصلی توریت، زبور اور انجیل تو قرآن کی طرح الہامی کتابیں ہیں اور ان لغویات سے بری ہیں۔ قیامت کے نزدیک تو یہ سب اصلی کتابیں جو حضرت علیؑ کے مرتب کردہ قرآن کے لوگوں کے سامنے آجائیں گی۔ اور قیامت کے دن خداوند تعالیٰ ان اُمور کا فیصلہ کرنے گا۔ جن میں یہ سب لوگ اختلاف کرتے تھے۔ اُس دن

(۱۰۰) (100) Ge.: 19:31-36.

معلوم ہو جائے گا کہ کون حق پر تھا اور کون ناحق سے چمٹ رہا تھا۔ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۔ السجدہ - ۳۲ : ۲۵ نیز ملاحظہ ہوں - (۱۰۱)

اسی روسی عالم کی تحریر سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اب انسان جسمانی اور ذہنی قوتوں میں ترقی نہیں کر رہا ہے - بلکہ تنزل کی طرف جا رہا ہے - پہلے لوگوں نے جو عظیم الشان کام کئے ہیں ان کو اب یہ انسان دوبارہ نہیں کر سکتا - بلکہ ان کی نقل بھی نہیں کر سکتا - اور یہ بالکل درست ہے - جسمانی طاقت، ذہنی لیاقت اور اخلاقی جرأت میں موجودہ انسان اپنے ازمنہ سابقہ کے آبا و اجداد سے بہت گرا ہوا ہے - جسمانی طاقت اور ذہنی لیاقت کو لو - اہرام مصری، اشوری نہریں، ایل اور تصویر اور ازمنہ وسطیٰ کے تعمیری کارنامے موجودہ انسان کی طاقت اور لیاقت سے قطعاً باہر ہیں - جرأت کو لیجئے - دور سے بیٹھا ہوا توپ، گولے اور بم چلاتا رہتا ہے - موت کے سامنے کبھی نہیں آتا - اخلاقی ہمت میں کربلا کے میدان اور بغداد کے قید خانے تو اس کے دماغ ہی میں نہیں آسکتے - اور نہ اب تک آئے ہیں - اپنے ہی مکر و فریب و دغا کے رنگ میں ان کارناموں کو رنگتا رہتا ہے جو اس کے خیالاتِ خود غرضی و ہوس پرستی اور نفس پرستی کی رو سے اس کو ناممکن نظر آتے ہیں - لیکن ہاں چونکہ رومیوں اور یونانیوں کی گود میں پلا ہے - ہوریشیس اور ہینی بال کے کارناموں کے گیت گا کر ناچ کود لیتا ہے - ان کی پیروی کرنے کی پھر بھی ہمت نہیں ہوتی - یہ ہے "ارتقاء شدہ" انسان جس پر آپ کو فخر ہے - ہاں حسد، خود غرضی اور نفس پرستی میں گوئے سبقت لے گیا ہے - ان جذباتِ رذیلہ نے جب اس کو تازیانہ لگایا تو اس نے ایٹم بم، ہائیڈروجن بم اور خبر نہیں کیا کیا خاک دھول جراثیم مہلکہ سے بھرے ہوئے بنی نوع انسان کو نیست و نابود کرنے کے لئے تیار کر لئے ہیں - اس پر اگر کسی کو فخر کرنا ہے تو کر لے - خدا ان مجرموں کو ان کے ہی ہاتھوں سے سزا دلاتا ہے - اور یہ اس سزا کو اپنی ترقی کی نشانی سمجھتے ہیں ذٰلِكَ

(۱۰۱) (101) Ge. 113:2, 93: 10, 124: 16. 46·39 45: 17.

لِلنَّاسِ سُوْءُ اَعْمَالِھِمْ۔ یہ ترقی کیا ہے۔ خود غرضی کا بدترین ارتقاء ایک دوسرے سے عداوت جان کے دشمن۔ دوسروں کی ترقی میں اپنا زوال دیکھنا۔ بے گناہوں کو بم سے اڑا کر اپنی تجارت کے لئے میدان پیدا کرنے۔ ہر وقت خوف کی حالت میں زندگی گزارنا، کبھی چین سے خود نہ بیٹھنا اور نہ دوسروں کو بیٹھنے دینا۔ دنیا کے اس کنارے سے دوسرے کنارے تک بے چینی، بدامنی، ہر قسم کا ظلم، کمزوروں کو ظاہر امارنا، طاقتوروں کو سازش سے گرانا۔ نہ خود پنپنا۔ نہ دوسرے کو پنپنے دینا۔ دنیا سے راحت و چین و آرام۔ اطمینان کو معدوم کر دیا۔ اور اُس کو ظلم و فساد سے بھر دیا۔ یہ ہیں اوس سائنس کی ترقی کے کارنامے جن کو اپنی اعلیٰ تہذیب کے ثبوت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اور ان کے غلام اس تہذیب کی تقلید کرنا اپنی زندگی اور اپنی سیاستدانی کا واحد مقصد سمجھتے ہیں۔

یہ بھی تو سوچو۔ اگر بنی نوع انسان بذات خود ایک علیحدہ نوع نہیں ہے تو پچھلی سے تو بندر بنا اور بندر سے انسان۔ اور اس انسانی ہیئت میں بقول مورخین اس کو اس زمین پر تین لاکھ سال ہو گئے ہیں۔ یہ تو بہت بڑا عرصہ ہے۔ ارتقاء کی رفتار اب کیوں بند ہو گئی اور وہ انسانی منزل سے آگے کیوں نہ بڑھا۔ انسان کو اُڑنے کا بہت شوق ہے اور ہمیشہ سے خیالی اڑن کھٹولے میں اُڑتا رہتا ہے۔ اس سلسلۂ ارتقاء میں اس کے پر ہی لگ جاتے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ کسی عضو کو زیادہ استعمال کرنے سے وہ عضو اس استعمال کے بموجب شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اونٹ کو اونچے درختوں سے پتیاں کھانی تھیں تو اُس کی گردن اونچی اور لمبی ہو گئی، ہرن کو صیاد سے بچنے کے لئے دوڑنے کی ضرورت ہوئی تو اُس کی ٹانگیں اس مقصد کے مطابق بن گئیں۔ شترمرغ بھی اپنے ماحول کے مطابق ہو گیا وغیرہ وغیرہ انسان کو اپنی آنکھوں سے بہت کام کرنا پڑا ہے۔ وحشیانہ حالت میں دشمنوں سے بچنے کے لئے اور شکار کو دور سے دیکھ لینے کے لئے اس نے اپنی آنکھوں پر بہت زور ڈالا ہے۔ اس کی آنکھیں کیوں نہ تیز ہو گئیں۔ آنکھیں تیز ہونے کی بجائے وہ تو اب اندھا ہوتا جا رہا ہے۔ آنکھوں میں طاقت نہ رہی۔ صدیوں

سے عینک لگانے پر مجبور ہے۔ یہ کیسا ارتقا ہوا اور وہ اصول استعمال کہاں گیا۔
اگر یہ کہا جائے کہ دوربین و خوردبین ایجاد کرنے کی وجہ سے اس کو اپنی قدرتی آنکھوں پر زور ڈالنے کی ضرورت نہ رہی تو یہ چیزیں تو زیادہ سے زیادہ دو یا تین صدیوں کی باتیں ہیں۔ اور انسان تو زمین پر تین لاکھ سال سے بیان کیا جاتا ہے۔ ترقی اگر ہونی تھی تو اس سے پہلے ہی ہو جانی چاہئے تھی اور اس کو دوربین و خوردبین کے ایجاد کی ضرورت ہی نہ رہتی۔ ہاتھی کے اتنے بڑے جسم پر اتنی چھوٹی آنکھیں۔ یہاں ارتقا اپنا راستہ کیوں بھول گیا۔ پودنا اور بیا تو ایسے عجیب اور عمدہ گھر بنا سکیں۔ اور چیلیں اور کوے یوں ہی دھوپ اور بارش میں مارے مارے پھریں۔ ان کو تو چاہئے تھا کہ لکڑیاں رکھ کر گھونسلے بناتے اور بندر پتھر اور لکڑیوں کا گھر بناتا۔ وہ تو ارتقا کی اس اونچی منزل تک پہنچ گیا تھا کہ اب انسان بننے والا تھا۔ لیکن ان صدیوں کے تجربات نے اسے معمولی گھر بنانا بھی نہ سکھایا۔

سال گذشتہ بین الاقوامی شہرت کے حامل دو سائنسداں کراچی میں آئے تھے اور ان دونوں نے ڈارون کی بندر والی تھیوری پر لکچر دئے تھے۔ ان میں سے ایک تو اس تھیوری کا حامی تھا اور دوسرا سخت مخالف تھا۔ اس سے ہمارا مدعا یہ ہے کہ ڈاروِن کا نظریہ متفقہ طور سے مسلم نہیں ہے۔ اور اب اس کی مخالفت بڑھتی جا رہی ہے۔

قرآن شریف کی یہ آیت ملاحظہ ہو۔ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً
اس میں دو الفاظ قابل غور ہیں: الارض اور خلیفۃ۔ الارض سے ظاہر ہے کہ تخلیق آدم سے پہلے زمین موجود تھی خلیفۃ کے مفسرین نے پانچ معنی لئے ہیں۔ اور وہ پانچوں اس پر حاوی ہیں۔ بلاغت کی یہ نادر مثال ہے کہ ایک لفظ سے پانچ حالتیں بیان کر دی گئیں۔ وہ یہ ہیں:۔

۱۔ نیابت الٰہیہ در زمین برائے انتظام و تدبیر۔
۲۔ زمین کی پہلی مخلوقات میں سے آخر اور سب سے اشرف مخلوق۔
۳۔ جانشین ملائکہ۔
۴۔ جانشینِ جن۔ ۵۔ حاکم منصوص من اللہ۔

ہم کو یہاں تفسیر قرآن مطلوب نہیں۔ ہم دوسرے معانی لیتے ہیں یعنی آخر و اشرف خلقت۔ اس سے معلوم ہوا کہ آدم کے زمین پر آنے سے پہلے بہت سی مخلوق آباد تھی۔ ملائکہ ہوں، جن ہوں، اُن میں سے کوئی ایسی بھی مخلوق ہو جیسی کہ انسان سے مشابہ تھی۔ لیکن انسان نہ تھی۔

P. D. Ouspensky: کہتے ہیں کہ اس روسی سائنس داں ہی پر کیا منحصر ہے۔ دیگر اہل علم بھی ڈارون کے اُس مشینی اور بے عقل والے نظریہ ارتقاء سے منحرف ہو چکے ہیں اور جو اس ذہنی اور جسمانی ارتقاء کو مانتے ہیں وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ یہ مشین کی طرح کا ارتقاء نہیں ہے بلکہ اس ارتقاء میں ایک بہت بڑے ذہن کا مقصد کارکن ہے۔ یہ محض بے عقل قوتوں کا نتیجہ نہیں ہے۔ چنانچہ ایک زبردست سائنس داں کہتا ہے۔

ترجمہ:۔ (ارتقاء کا) مشینی نظریہ جس نے اعلان کیا تھا کہ زندگی محض غیر جاندار عملوں کی ایک ضمنی پیداوار اور نفس محض دماغ کی ایک شاخ ہے۔ اب علم الحیات میں روز بروز غیر اطمینان بخش ثابت ہوتا جا رہا ہے۔ اور بہت سی شہادت ہر طرف سے جمع ہو رہی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ زندہ جرم کا طریقہ عمل مشین کے طریقہ سے بالکل مختلف ہے اور اس کی توجیہ کسی صورت میں مشینی اصول پر نہیں کی جا سکتی۔ حیات دراصل ایک نہایت اہم اصلیت ہے اور اس کے علاوہ اُس میں تخلیقی قوت موجود ہے اور وہ زندہ اجرام کو بطور اپنے آلہ کار کے استعمال کرتی ہے اور ان کی تشکیل کرتی ہے تاکہ اُن سے اُس کے مقصد کی تکمیل ہو۔ اس سے تخلیقی ارتقاء کے نظریات مستنبط ہوتے ہیں جو ارتقاء کی توجیہ اس طرح کرتے ہیں کہ ارتقا ایک مقصد رکھنے والی قوت یا سنت ہے جو زندہ اجرام میں ظاہر ہو کر اس کوشش میں رہتی کہ حیات کی اعلیٰ صفات پیدا ہو کر اُس کے آخری مقصد کو پورا کریں۔ ابھی تو ہم اُس مقصد کا نہایت دھندلا سا قیاس کر سکتے ہیں۔ .... دوسرے الفاظ میں ارتقاء کو اب سمجھا جاتا ہے کہ وہ ایک تخلیقی عمل ہے جو ہمیشہ ایک بالکل نئی شے پیدا کرنے میں مشغول رہتا ہے۔ ہر ایک لحظ کائنات میں ایک نئی افزائش ہو رہی ہے جو اس سے قبل کے لحظہ میں نہیں تھی مستقبل کی نسبت کچھ پیشین گوئی نہیں کی جا سکتی اور انسان اپنے عمل و ارادہ میں چند حدود کے اندر

آزاد ہے۔ (ختم ہوا ترجمہ) اصل ضمیمہ ۱۲۔

زمانہ حال کے نہایت مشہور فلاسفر اور سائنس داں مسٹر برگوسان نے ایک مستقل رسالہ اس تخلیقی ارتقا پر لکھا ہے جس کا نام Creative Evolution. ہے۔ یہ وہ ہی برگوسان ہے جس کے فلسفہ کا تتبع علامہ اقبال نے بہت حد تک کیا ہے۔ اور اُس کے ہی اصولوں پر علامہ اقبال نے اپنے مجموعۂ تقاریر کو مبنی کیا ہے۔ یہ مجموعہ انگریزی میں ہے اور اس کا نام Reconstruction of Islamic Thought. ہے۔

عقل اکثر دہریت کا یہ طعنہ سُننے میں آیا ہے کہ مذہب کو عقل سے دشمنی ہے۔ جہاں عقل کی روشنی پہنچتی ہے وہاں سے مذہب چلتا بنتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بغیر غور کئے ہوئے اپنی روزمرہ کی عقل کو اپنے گرد کے مذاہب پر آزماکر اس نتیجے پر یہ لوگ پہنچتے ہیں۔ مغربی تہذیب جس کے دامن عاطفت میں دہریت نے پناہ لی ہے اپنے یہاں کے دو ہی مذاہب سے تو واقف تھی یونان کی صنم پرستی اور باقی یورپ کی مسیح پرستی۔ یہودی تو یورپ میں مفروروں کی طرح آئے اور چوروں کی طرح رہے۔ یہودیت کی جو تعلیم بائبل میں تھی اور جس طرح یہ دونوں الہامی مذاہب یہودیت اور مسیحیت، الحاد کے زیر اثر آن کر مسخ ہوئے ہیں اُن کا تذکرہ ہم پہلے کر چکے ہیں۔ مسیحیت کا اصول کفارۂ گناہاں ممکن ہے کہ دہریت کیلئے باعث مضحکہ ہو۔ لیکن اسلام تو کہتا ہے کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔ ان دونوں بلکہ ان تینوں مذاہب میں کئی اور ایسے ہی خلافِ عقل سلیم نظریے قائم کئے گئے ہیں۔ یہاں اُن کے تفصیل کی ضرورت نہیں۔ مثلاً جادوگرنیوں پر ظلم اور خدا کو جسم اور اعضاء عطا کرنے وغیرہ وغیرہ یہ کہہ کر کہ جادوگرنیاں اپنے حکم سے طوفان اور طاعون پیدا کرتی ہیں ان مذاہب نے سائنس کو اپنے اوپر ہنسایا۔ سولھویں صدی عیسوی تک مذہب کے نام پر کروڑہا بے گُناہ عورتوں کو اس جرم میں نہایت بے رحمی سے قتل کیا اور جلایا کہ وہ شیطان سے مواصلت رکھتی ہیں اور دنیا میں بیماریاں اور طوفان پھیلاتی ہیں۔ اور اس کے لیے اپنی بائبل کو سند ٹھہرایا۔ معجزات کی اتنی بھرمار کردی کہ ہر مسیحی پادری ولی ہو گیا۔ اور اُس کے جوتوں، چادروں اور بالوں وغیرہ سے سینکڑوں معجزے نکال دئے۔ اہل سائنس کے ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ اور انسانیت انگشت بدنداں ہو کر رہ گئی۔

یہ حماقتیں اتنی عام تھیں کہ عقل نے پھونک پھونک قدم رکھا۔ اُس کی اس احتیاط اور سستی رفتار کی بھی تاریخ لکھی گئی۔ اُس کا نام ہے- History of the Rise and Influence of the Spirit of Rationalism in Europe اور اس کا مصنّف W. E. H. Lecky. ہے۔ اس کو دیکھ کر دہریت نے یہ نظریہ قائم کر لیا کہ مذہب اور عقل ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ ورنہ اسلام میں تو عقل کو بہت اعلیٰ درجہ دیا گیا ہے۔ اور جب کوئی پیغمبروں کی بات نہیں سمجھتا تو عقل کی طرف اسلام اپیل کرتا ہے۔ قرآن شریف میں جا بجا افلا تعقلون ہے۔

اگر مذہب اور عقل کا مقابلہ کرنا ہے تو عقل کا ایک معیار قائم کرنا ہوگا۔ حق کی صفت یہ ہے کہ مستقل ہوتا ہے۔ اُس میں تغیر نہیں ہوتا۔ ساری دنیا بدل جائے لیکن وہ نہیں بدلتا۔ اگر عقل کے ذریعہ سے حق معلوم کرنا ہے تو عقل میں بھی یہی صفات ہونی چاہئیں۔ اُس کا علم اتنا وسیع اور ہمہ گیر ہو کہ اُس کے آگے علم کا کوئی اور اونچا درجہ نہ ہو۔ اس عقل میں استقلال اور استحکام ہونا چاہئیے تغیر مطلق نہ ہونا چاہئیے کہ آج کچھ اور کل کچھ۔ آج بھی تذبذب ہے۔ اور کل بھی تذبذب ہی رہے گا۔ بلکہ علم اور یقین اتنا کامل ہو کہ پھر آج کے بعد کل کے تغیر کا کوئی امکان نہیں۔ عقل کو اس درجہ کا ثابت کرنے کے بعد پھر اُس کا مقابلہ مذہب سے کرنا چاہئیے۔ الہامی مذہب ہمیشہ علم کامل اور حق کامل کا دعویٰ کرتا ہے تو عقل کو اوّل علم کامل اور حق خالص حاصل کر لینا چاہئیے۔ بغیر اس کے دعویٰ کی تردید نہیں ہو سکتی۔

اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ آیا سائنس کی عقل کو یہ درجۂ کمال حاصل ہو گیا ہے۔ جن ناظرین نے ہمارا سابقہ بیان تک دیا ہے۔ اُن پر سائنس کی جہالت اور بے بسی ظاہر ہو گئی ہو گی۔ اور اُس کا تذبذب ایسا عیاں ہو گیا ہو گا کہ جس میں شک و شبہ کا امکان نہیں ہے۔

سائنس کی لاعلمی و جہالت اور اُسکے نظریات کا تغیر و تبدل و غیر یقینی ہونا۔

ہم ابھی دیکھ چکے ہیں کہ اُن کو نہیں معلوم کہ دنیا میں حیات کیونکر آئی۔ انسان

کی قدامت کا بھی یقین نہیں۔ ارتقاء کے بہت سے مسائل غیر یقینی ہیں۔ کاربن ایٹم کے چھ الکٹروں میں وہ خاصیتِ زندگی کیوں ہے جو اُن میں ہے۔ مقناطیس کی بہت سی خاصیتوں کا علم نہیں ہے۔ ہپناٹزم میں اور مسمریزم میں یہ اثرات کیوں ہیں۔ روشنی کیا ہے۔ برق کی نفی وا ثبات میں آپس میں مل کر یہ اثرات کیوں پیدا ہوتے ہیں۔ علم الادویہ سارا اس لاینحل "کیوں" کا مجموعہ ہے۔ تجربہ سے ہر ایک دوا کا اثر معلوم کر لیا ہے۔ اور وہ بھی بعض دفعہ غلط ہو جاتا ہے جس کو مولانا روم نے اس طرح ظاہر کیا ہے۔

از قضا سرکنگبیں صفرا فزود　　روغنِ بادام خشکی می نمود

از ہلیلہ قبض شد اطلاق رفت　　آب آتش را مدد شد ہمچو نفت

شربت وادویہ واسباب او　　از طبیبان ریخت یکسر آبرو

بہرصورت یہ تو مسلمہ ہے کہ کسی طبیب کو خواہ یونانی حکیم ہو یا انگریزی ڈاکٹر کسی دوا کی نسبت یہ نہیں معلوم کہ اُس میں جو اثر ہے وہ کیوں ہے۔ پوٹیشیم برومائڈ دماغ میں کیوں اضمحلال پیدا کرتی ہے۔ اور عنّاب مصفی خون کیوں ہے؟ روزانہ استعمال کی ادویہ کی "کیوں" تو معلوم نہیں۔ خدا سے پوچھتے ہیں کہ تو نے دنیا میں شر کو کیوں مہلت دی ہوئی ہے۔ اور پھر کہتے ہیں کہ ہماری سمجھ میں تو نشر کی موجودگی نہیں آتی۔ مرنے کے بعد زندہ ہونا ہماری عقل سے باہر ہے۔ ان سے کوئی پوچھے کہ تمہاری سمجھ میں آیا کیا ہے جو نشر تمہاری سمجھ میں نہیں آتی۔ اور تمہاری عقل کی وسعت کیا ہے کہ حیات بعد ممات اس میں نہیں سماتا۔ امر واقعہ یہ ہے کہ دنیا کی ہر ایک شے کی ماہیت انسان کی سمجھ سے باہر ہے۔ تمام سائنس اب تک کچھ نہیں سمجھا ہے اور نہ آئندہ سمجھے گا۔ ایک شے کی بھی ماہیت نہیں سمجھا۔ ریڈیو کا معجزہ ہو یا ہوائی جہاز کی ہوابازی ہو یا ستارہ بازی۔ یہ سب کچھ تجربہ پر مبنی ہے۔ ہوا کی ایک خاصیت تجربہ سے ثابت ہو گئی۔ ریڈیو اور ہوائی جہاز بنا لیے۔ یہ تو ان سے پوچھئے کہ ہوا میں یہ خاصیت کیوں ہے Long Wave اور Short Wave. میں یہ فرق کیوں ہے۔ گرمی کے درجۂ حرارت سے رنگ میں فرق کیوں آجاتا ہے اُن کی شعاعوں کے رنگ کی وجہ سے ستاروں کا درجہ حرارت

تو معلوم ہوگیا۔ یہ نہ معلوم ہوا کہ یہ فرق کیوں ہے۔ ایک درجہ حرارت سرخ رنگ کی شعاع کیوں پیدا کرتا ہے۔ اور دوسرا درجۂ حرارت زرد یا نیلے رنگ کی شعاع کیوں پیدا کرتا ہے۔ کہتے ہیں کہ تمام فلکی نظام قوت کشش پر مبنی ہے۔ ایک دوسرے کی کشش و رفتار سے ستارے و سیارے اپنے اپنے راستوں پر چل رہے ہیں۔ یہ قوت نہ ہو تو رات دن نہ ہوں، بارش نہ ہو۔ سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔ اور اگر ان سے پوچھو کہ یہ قوت کشش کیوں ہے تو کچھ نہ بتا سکیں گے۔ یہ تو جہالت محض ہوئی۔ جہل مرکب یہ ہوا کہ اس جہالت کے باوجود کہتے ہیں کہ چونکہ اس ظاہری موت کے بعد پھر زندہ ہونا ہماری سمجھ میں نہیں آتا لہٰذا ہم اس کو بعید از عقل سمجھ کر نہیں مانتے۔ یہ تو ان کو معلوم نہیں کہ حیات کیا ہے۔ موت کو کیا سمجھیں گے۔ موت سے جسم ظاہری کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ اور اس کے ذرات فضا میں پھیل جاتے ہیں۔ لیکن باقی رہتے ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ جسم ظاہری مرگیا۔ لیکن وہ شے تو نہیں مری جس کی نسبت فرمایا گیا ہے۔ نفخت فیه من روحی وہ اس جسم سے نکل گئی۔ اگر کوئی وقت ایسا آئے اور ایسے اسباب پیدا ہوں کہ وہ ہی قوت اور طاقت کشش کیلئے ہیں اور جو اجرام فلکی کو سنبھالے ہوتے ہے ان ہمارے جسموں کے ذرات پر عمل کرنے لگے تو کیا یہ ممکن نہیں کہ ہمارے ہڈیوں کے اجزاء جو فضا میں پھیلے ہوئے تھے پھر آپس میں اپنے ہی اُن ذرات سے مل جائیں جن سے پہلے ملے ہوئے تھے اور ہمارا جسم پورا موجود ہو جائے۔ دیکھئے میری ہڈیوں اور میرے جوڑوں کے اجزاء پیدائش سے بلکہ ماں کے پیٹ سے آپس میں ملے ہوئے ہیں ان میں ایک دوسرے سے جاذبیت پیدا ہوگئی ہے۔ چند اسباب نے اُن کو الگ الگ کر دیا۔ تمام کائنات ذروں میں تبدیل ہوگئی۔ اب دوسرے اسباب پیدا ہوئے خاص قسم کی بجلی کی رو آئی۔ اُس نے ان تمام ذروں کو ملا دیا جو پہلے ملے ہوئے تھے۔ کیونکہ یہ تو ہر نوع کی فطرت کا قاعدہ ہے: ؎

ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش　　　باز جوید روزگار وصل خویش

لہٰذا میری ہڈیوں کے ذرے آپس میں مل گئے اور میری ہڈیاں بن گئیں۔ ان پر گوشت پیدا ہونا تو آسان ہے۔ پورا میرا جسم بن گیا۔ پھر وہ ہی روح جس کو میرے

جسم سے آلفت تھی، اُس جسم میں بحکم خداوندی داخل ہو گئی۔ تو کیا چیز نئی ہوئی جو پہلے نہیں ہو چکی تھی۔ اسی وجہ سے خداوند تعالےٰ فرماتا ہے :-

اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ۭ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ ۝۷۸ قُلْ يُحْيِيْهَا الَّذِيْٓ اَنْشَاَهَآ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ ۝۷۹ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ ۝۸۰ یٰسٓ ۳۶ : ۷۸-۸۰

ان آیات میں اس اعتراض کا مکمل اور تسلی بخش جواب دیدیا گیا ہے۔ ہڈیوں کا گل سڑنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا عجیب تو ضرور نظر آتا ہے۔ لیکن انسان کی پہلی تخلیق اعجب تھی یہ محض نطفہ کا ایک قطرہ ہی تو تھا۔ جن ہڈیوں کا دوبارہ زندہ ہونا اس کو عجیب معلوم ہوتا ہے۔ اُس وقت نطفہ میں تو اُن ہڈیوں کا نشان بھی نہ تھا۔ جس دماغ سے اب یہ اُلٹی سیدھی بحث کر رہا ہے۔ اُس وقت تو اُس کا پتہ بھی نہ تھا۔ آنکھیں ہاتھ پیر دل جگر وغیرہ کہاں تھے۔ اب جو یہ انسان ایسا بن گیا جیسا کہ اب ہے تو یہ کیوں کر ہوا۔ اس پہ غور کیوں نہیں کرتا جس طرح خداوند تعالےٰ نے اسباب پیدا کر کے اُس گندے پانی کے قطرہ سے انسان بنا دیا۔ اُسی طرح اسباب پیدا کر کے انسان کی ان ہی ہڈیوں سے دوبارہ اُس کو بنا دے گا۔ کیوں کہ وہ تدبیر و ترکیبِ خلق سے واقف ہے، ماہیت اشیاء سے واقف ہے۔ کسی چیز کا عجیب ہونا اُس کے ناممکن ہونے کا ثبوت نہیں ہے۔ غور تو کرو دنیا میں بہت سی چیزیں عجیب و عجیب تر پاؤ گے۔ کیا محض بجلی کی لہروں سے اس عظیم الشان کائنات کا بننا عجیب نہ تھا۔ یہ تو سائنس والوں کے سمجھنے کی بات ہے۔ اُن جاہل عربوں کا سمجھانا مقصود تھا۔ وہ ہرے لہراتے ہوئے درختوں کو دیکھتے تھے کہ آپس میں رگڑ کھائی اور آگ پیدا ہو گئی۔ آگ اور پانی کی کتنی دشمنی ہے۔ لیکن وہاں پانی نے آگ کو پیدا کر دیا۔ اگر اس سے زیادہ کہا جاتا تو وہ نہ سمجھتے۔ جہلاء کہتے ہیں کہ قرآن شریف نے اُسی وقت نہ کیوں سائنس کے وہ اصول بتا دئے جو آجکل

بہت مشکل سے دریافت ہو رہے ہیں۔ لیکن اُن کو سمجھتا کون ۔اور اگر کوئی نہ سمجھتا تو ایمان کون لاتا۔ اور اگر وہ اوّل کے لوگ ایمان نہ لاتے تو آج کو مسلمان نہ ہوتے اور نہ قرآن ہوتا۔ سمجھانا تو اُن کو مطلوب تھا۔ اس طرح سمجھایا کہ وہ بھی سمجھیں اور آئندہ کی "ترقی یافتہ" نسلوں کے لئے بھی سب کچھ اس میں رکھ دیا۔ راسخون فی العلم سے پوچھنے کی شرط لگا دی۔

ہاں تو ہم انسان کی کمی عقل اور اُس کی جہالت کا ذکر کر رہے تھے۔ چونکہ دہریت کا ابھی تک یہی خیال ہے کہ اگر اُسے کہیں ٹھکانا مل سکتا ہے تو اہل سائنس ہی کے پہلو میں ملے گا۔ اہل سائنس کی لاعلمی تو ہم بہت کچھ بیان کر چکے ہیں۔ اب تھوڑی سی اُن کی اپنی زبانی بھی سُن لیں۔

ترجمے: ۔(۱) اب ہم کو معلوم ہو گیا ہے کہ یہ جو توجیہ (کائنات و واقعات کی) کی جاتی ہے۔ وہ تو ظاہر ہے کہ بالکل ناکافی اور غیر تسلی بخش ہے۔ وہ تو دنیا کے سادے سے سادے واقعہ کی ماہیت نہیں بتا سکتی مثلاً سورج کی شعاعوں کا تمام کائنات میں پھیل جانا۔ نور کی ماہیت، سیب کا درخت پر سے گرنا (قانون کشش)، یا ایک ایٹم میں اُس کے الکٹروں کا چکر لگانا۔

(۲) اسی کائنات کے عمل کا سائنٹفک طور سے مطالعہ کرنے سے جو ایک نتیجہ نکلتا ہے جس کے بیان کرنے کے لئے ہمارے پاس غیر تسلی بخش اور بھونڈے الفاظ ہیں (کیونکہ انسان کے پاس کوئی اور الفاظ سوائے اُن کے نہیں ہیں جو اُس نے دنیا سے حاصل کئے ہوئے تجربات و تخیلات کی بناء پر اختراع کر لئے ہیں) وہ یہ ہے کہ یہ ساری کائنات کسی بہت بڑے ریاضی داں کی تجویز شدہ ہے۔

(۳) نیچر کی اٹل اور ناقابل تعبیر یکسانیت خلق کرنے والے ذہن (خالق) کی وحدت استقامت پر دلالت کرتی ہے۔

(۴) خلاصہ یہ ہے کہ ریاضی کے گُر سے کسی شے کی ماہیت نہیں معلوم ہو سکتی۔ اُس سے تو صرف اتنا معلوم ہو جاتا ہے کہ کسی شے کا اثر کرنیکا طریقہ کیا ہے۔

یعنی اُس سے کسی شے کے اثر ہی کا اندازہ ہو سکتا ہے اور یہ اثرات روزانہ زندگی کی خورد ترین شے کے بھی اصل خاصیت کے مطابق نہیں ہوتے۔

(۵) یہ ہم پہلے ہی بتا چکے ہیں کہ سائنس مادی دنیا کے اجزاء کی صحیح ماہیت معلوم کرنے کی کبھی امید بھی نہیں رکھ سکتا۔ اشیاء کی اُفتاد ہی بتا رہی ہے کہ یہ بات (صحیح علم ماہیتِ اشیاء) ہمارے دائرہ علم سے بالکل باہر ہے اور باہر رہے گی۔

(ختم ہوا ترجمہ) اصل ضمیمہ ۱۳

سائنس کی غیر یقینی اور مذبذب حالت کو خود یہ لوگ اِن الفاظ میں بیان کیے ہیں جو ہم نے "مادیت" اور "حیات" کے عنوانات کے نیچے نقل کیے ہیں۔ ان کو وہاں ملاحظہ کیا جائے۔

ان اقتباسات سے مندرجہ ذیل امور اچھی طرح ثابت ہیں۔

ا۔ اہل سائنس کو اصلی ماہیت اشیاء اور کنہ اسباب وعلل نہ معلوم ہے اور نہ کبھی معلوم ہوگی۔ یہ ہی وہ ماہیتِ اشیاء و کنہ اسباب تھی جو فرشتوں کو بھی نہ معلوم ہوئی۔ یہ ہی وہ ماہیت اشیاء و کنہ اسباب تھی جو فرشتوں کو نہ معلوم تھی اور خدا نے اپنے نبی حضرت آدم کو بتا دی۔ اور پھر اُن کی نسل کے سلسلہ انبیاء کو یہ علم بطور وراثت و وصیت کے منتقل ہوتا رہا۔ ان آیات پر غور کیجئے۔ جب فرشتوں نے عرض کی بار الٰہا تو ایسے نوع کو خلافت دے رہا ہے کہ جو دنیا میں فساد برپا کرے گی تو خدا نے اپنے خلفاء کی فوقیت ملائکہ پر اس طرح ظاہر کی:-

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلَائِكَةِ فَقَالَ أَنبِئُونِي بِأَسْمَاءِ هَٰؤُلَاءِ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ (۳۱) قَالُوا سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا إِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ۖ إِنَّكَ أَنتَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ (۳۲) البقرہ ۲: ۳۱، ۳۲

ان آیات کا ترجمہ مولوی فرمان علی صاحب نے اس طرح کیا ہے۔

(اور آدمؑ کی حقیقت ظاہر کرنے کی غرض سے) آدم کو سب چیزوں کے نام سکھا دیئے۔ پھر اُن فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا کہ اگر تم (اپنے دعویٰ میں کہ ہم مستحق خلافت ہیں) سچے ہو تو مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ تب فرشتوں نے (عاجزی سے) عرض کی تو (ہر عیب سے) پاک و پاکیزہ ہے۔ ہم تو جو کچھ تو نے بتایا اس کے

سوا کچھ نہیں جانتے۔ تو بڑا جاننے والا مصلحتوں کا پہچاننے والا ہے۔

یہ ہی ماہیت اشیاء (کنہ اسباب تھی جو بتائی گئی تھی کنہ اسباب کا جملہ قابل غور ہے اس ہیں ہدایت کے اسباب اور نجات کے ذرائع آ گئے۔ اور یہ انبیاء اور پنجتن پاک تھے، جو سب صلب آدم میں سے تھے جن کی تعظیم فرشتوں پر لازم کی گئی تھی۔ اور یہ وہی وصیت تھی جس کا ذکر مسعودی نے اپنی تاریخ میں کیا ہے کہ ایک نبی اپنے جانشین کے پاس منتقل کرتا رہا ہے۔ دیکھو مروج الذہب الجزء الاوّل ص ۲۸ مطبوعہ مصر۔

جب تک ہم کو کائنات کی اشیاء کی ماہیت کا حقیقی اور صحیح علم نہیں ہوتا اُس وقت تک ہم کو یہ نہیں معلوم ہو سکتا کہ عدم کیا ہے۔ عاقبت کیا ہے۔ حیات کس کو کہتے ہیں۔ موت کیا ہے۔ ہم کیا ہیں اور یہ دنیا کیا ہے۔ جناب رسولِ خدا کی یہ دعا کتنی اہم اور معنی خیز ہے۔ اَللّٰھُمَّ اَرِنی الاشیاءَ کما ھی۔ خداوندا مجھے اشیاء کی اصلی ماہیت دکھا دے۔ اس سے افلاطون کے اس نظریہ کی کس طرح حرف بحرف تائید ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا اور اُسکی اشیاء کی ہم کو اصلی ماہیت نہیں معلوم۔ ہماری تو یہ حالت ہے کہ جیسے ہم کسی بڑے غار میں ہیں۔ اور اُس کے کناروں پر جو سوار اور آدمی گزر رہے ہیں ہم محض ان کے اُس سایہ کو دیکھ رہے ہیں جو غار کی دیواروں پر پڑتا ہے۔ اصلی سوار اور آدمی ہماری نظر سے اوجھل ہیں۔ ہمیں تو فقط اُن کے سایہ نظر آ رہے ہیں۔ ہم کو اشیاء کی اصلی ماہیت نہیں معلوم۔ قرآن شریف کہتا ہے۔ وما الحیوٰۃ الدنیا الا متاع الغرور۔ دنیا کی زندگی تو محض دھوکہ ہے۔ اصلی ماہیت کا صحیح علم کب ہوتا ہے؟ جب آنکھوں پر سے پردے اُٹھ جاتے ہیں۔ پردے کب اُٹھتے ہیں؟ جب ہم کو موت آتی ہے اُس وقت ہماری آنکھ کھلتی ہے۔ جب ہی قرآن شریف میں موت کو یقین سے مترادف کیا ہے۔ حتیٰ یاتیک الیقین۔ لیکن انبیاءؑ اور مرسلین کی آنکھوں پر سے پردے اُٹھا دئے جاتے ہیں۔ ورنہ جس کی نظر خود پردوں سے رُکی ہوئی ہے وہ کیا دوسروں کو ہدایت کرے گا۔ یہ ہی شرط امامت کی ہے۔ جناب امیر المومنین علیہ السلام کا ارشاد قابل غور ہے۔ آپ فرماتے تھے کہ پوچھ لو

جو مجھ سے پوچھنا چاہتے ہو قبل اس کے کہ تم مجھ کو نہ پاؤ۔ اس کو ہم تفصیل سے عنوان امامت کے تحت میں لکھیں گے۔

(۲) دوسری بات جو ان اقتباسات سے ظاہر ہوئی وہ یہ ہے کہ کائنات میں اٹل، مستقل، کبھی تبدیل و متغیر نہ ہونے والا قانون جاری ہے۔ اور سب پر حاوی ہے۔ ان کے پاس صحیح حق ظاہر کرنے کے قابل زبان نہیں ہے اور نہ الفاظ ملتے ہیں جو ظاہر کریں کہ وہ خالق کیسا ہے۔ لہذا انھوں نے کہہ دیا کہ جو بھی خالق ہو وہ بڑا ریاضی داں ہے۔ ریاضی داں اس وجہ سے کہا کہ اس کی صنعت میں ریاضی کی طرح کا اٹل اور صحیح اندازہ ہے۔ اب قرآن شریف کی یہ آیت تو ملاحظہ ہو:

لَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا۔

(۳) سائنس کبھی حقیقت اور صحیح ماہیت کائنات نہیں معلوم کر سکتا۔

(۴) مصنوعات کائنات سے وحدتِ خالق عیاں ہے

(۵) اہل سائنس کبھی اشیاء کی ماہیت نہیں معلوم کر سکتے۔ وہ صرف ان کے اثرات سے اُن کی تخصیص کرتے ہیں۔

قرآن شریف کی یہ آیات ملاحظہ ہوں۔

(الف) وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا ۔ بنی اسرائیل ۱۷: ۸۵

(ب) هَا أَنْتُمْ هٰؤُلَاءِ حَاجَجْتُمْ فِيمَا لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَاجُّونَ فِيمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ ۚ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ۔ آل عمران ۳: ۶۶

(ج) قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللّٰهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ۔

البقرہ ۲: ۲۵۸

(د) لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا ۔ الانبیا ۲۱: ۲۲

ترجمہ

(الف) تم کو بہت کم علم دیا گیا ہے۔

(ب) اے لوگو! تم وہی تو ہو جو ابھی تو اس بارے میں جھگڑتے تھے جس کا تمھیں علم ہے۔ پھر اس کے بارے میں کیوں جھگڑنے لگے جس کا تمھیں علم نہیں ہے۔

یہ لوگ سائنس کی اُن باتوں میں بھی جھگڑتے ہیں اور آپس میں اتفاق نہیں کرتے جن کا کچھ علم تو ان کے پاس ہے۔ اب اُس سے آگے بڑھ کر روح و عاقبت کی باتوں میں جھگڑا کرنے لگے جن کا ان کو کچھ بھی علم نہیں۔

(ج) ابراہیم نے کہا کہ خدا سورج کو مشرق کی طرف سے نکالتا ہے تو اُس کو مغرب کی طرف سے نکال لا۔ اس پر وہ کافر مبہوت ہوگیا۔ اور اللہ ظالموں کی رہبری نہیں فرماتا۔

یعنی تو اگر خدا ہے تو اب اس کا اُلٹا کر کے دکھادے نظام بدل دے اور سورج کو مغرب سے نکال دے۔ منکرین خدا کو بھی یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ اگر خدا نہیں ہے اور یہ اندھا نظام بادلوں کی طرح سے چل رہا ہے تو اس میں تبدیلی و تغیر کیوں نہیں؟ آج مشرق سے سورج نکلا، کل مغرب سے نکل آئے۔

(د) اگر (بفرض محال) زمین و آسمان میں خدا کے سوا چند معبود ہوئے تو دونوں (یعنی زمین و آسمان) کبھی کے برباد ہوگئے ہوتے۔

یہ توحید کے لئے بہترین دلیل ہے۔ اگر سب امور میں سب خدا ایک ہی سا حکم دیتے تو اتنے خداؤں کا ہونا بے کار تھا۔ اور اگر دو یا کئی خدا ہوتے تو ایک کا حکم دوسرا روک سکتا یا نہیں۔ اگر روک دیتا تو پہلا خدا عاجز و مجبور اور اگر نہ روک سکتا تو یہ دوسرا خدا عاجز و مجبور کہلاتا۔

دہریت کیا ہے۔ یہ خود دہریوں کی زبانی سُنئے۔

ترجمہ:۔ دہریت کے یہ معنی ہیں کہ کسی طرح کے خدا میں اعتقاد نہ ہو۔ خدا کی کوئی بھی صفت سمجھی جائے۔ گویا دہریت تو صرف ایسی بدنظمی کا اعتقاد ہے۔ اگر اُس کو اعتقاد کہہ سکتے ہیں کہ جس میں انسان کو اندھے اتفاق کا کھلونا سمجھا جائے۔ (۱۰۲) اصل ضمیمہ ۱۴

کہنے والے کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی مختلف لوگوں نے مختلف صفات بیان

(102) R. G. Gordon: The Philosophy of a Scientist, P. 80.

کی ہیں۔ یہاں تک کہ بت پرستی میں بھی خدا کا تخیل تو ضرور ہے۔ دہریے یا ملحد وہ ہیں کہ جنکو ان میں سے کسی صفت کے خدا پر اعتقاد نہیں ہوتا۔ بلکہ اگر ان کے تصورات پر غور کیا جائے تو ان کی رو سے دنیا ایک ایسی بدنظمی اور فساد کی جگہ ہوگی کہ جہاں انسان محض اتفاق کی رو میں بہتے ہوئے نظر آئیں گے۔

آج کل یہ بھی ایک فیشن ہوگئی ہے کہ تذبذب کی زندگی کو نہایت عاقلانہ خیال کرتے ہیں۔ یعنی ہم کو خبر نہیں کہ خدا ہے یا نہیں ہے۔ خدا ہو بھی سکتا ہے اور خدا نہیں بھی ہو سکتا۔ اس حماقت کا نام عالمانہ عقلمندی رکھا گیا ہے ——— اور AGNOSTICISM یعنی لاادریت کا لقب دے کر فلسفہ کا ایک عنوان بنالیا ہے وہ زندگی حیوانوں کی زندگی ہے جس میں کوئی راسخ اعتقاد نہ ہو جس کے مطابق انسان اپنی زندگی کو مرتب کرلے۔ اس نہ اللذی نہ اوللذی کی زندگی کو تو خسر الدنیا والآخرۃ کہتے ہیں۔ نہ اس دنیا کے مزے اٹھائے کہ شاید خدا ہو۔ اور نہ آخرۃ کی تیاری کی کہ اگر خدا نہیں ہے تو یہ تکلیف کیوں اٹھائیں۔ ایسی تذبذب کی زندگی انسان کے فعل و کردار پر عمل نہیں کرسکتی۔ وہ مذہب جو انسان کے فعل پر اثر انداز نہ ہو بے سود ہے۔

قرآن شریف میں ان لوگوں کی نوعیت کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے:۔

مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ۔ ۴ ؍ ۲۳

دہریوں کی ایک جماعت جناب رسول خدا کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ ان کے دلائل اور جناب رسول خدا کے جوابات سننے کے قابل ہیں۔ تفسیر جناب امام حسن عسکری میں اس بحث کو کچھ تفصیل سے لکھا ہے:۔

احتج رسول اللہ صلعم فقال ما الذی دعاکم الی القول بان الاشیاء لا بدأ لھا ھی دائمۃ لم تزل ولا تزال فقالوا لانا لا نحکم الا بما شاھدنا و لم نجد لھا القضاء و فناء فحکمنا بانھا لا تزال فقال رسول اللہ صلعم افوجدتم لھا قدما او وجدتم لھا بقاء ابدا فان قلتم انکم وجدتم ذالک اثبتم لانفسکم لم تزالوا

علی حقیقتکم وعقولکم بلا نہایۃ ولا تزالون کذلک ولئن قلتم ہذا
دفعتم العیان وکذبکم العالمون الذین یشاہدونکم قالوا لم نشاہد
لہا قدما ولا بقاء ابد الآبدین قال رسول اللہ صلعم فلم صرتم بان
تحکموا بالبقاء والقدم دائما لانکم لم تشاہدوا حدوثہا وانقضاءہا
اولی من تارک التمیز لہا مثلکم فیحکم لہا بالحدوث والانقضاء
لانہ لم یشاہد لہا قدما ولا بقاء ابد الابد اولستم تشاہدون اللیل
والنہار واحدہما بعد الآخر فقالوا نعم فقال اترونہما لم یزالا ولا یزالان
فقالوا نعم فقال افیجوز عندکم اجتماع اللیل والنہار فقالوا لا فقال
فاذن ینقطع احدہما عن الآخر فیسبق احدہما ویکون الثانی
جاریا بعدہ قالوا کذلک ہو فقال قد حکمتم بحدوث ما تقدم من
لیل ونہار ولم تشاہدوہما فلا تنکروا للہ قدرۃ ثم قال اتقولون
ما قبلکم من اللیل والنہار متناہ ام غیر متناہ فان قلتم غیر متناہ
فقد وصل الیکم آخر بلا نہایۃ لاولہ ان قلتم انہ متناہ فقد کان
ولا شئ منہما قالوا نعم۔ قال لہم اقلتم ان العالم قدیم لیس بمحدث
وانتم عارفون بمعنی ما اقررتم بہ وبمعنی ما جحدتموہ قالوا نعم
قال رسول اللہ صلعم فہذا الذی تشاہدونہ من الاشیاء
بعضہا الی بعض یفتقر لانہ لا قوام للبعض الا بما یتصل بہ کما
تری البناء محتاجا بعض اجزائہ الی بعض والا لم یتسق ولم
یستحکم وکذلک سائر ما ترون قال فان کان ہذا المحتاج
بعضہ الی بعض لقوتہ وتمامہ ہو القدیم فاخبرونی ان لو کان
محدثا کیف کان یکون وکیف اذا کان تکون صفتہ یصفونہ
بہا الا وہی موجودۃ فی ہذا الذی زعموا انہ قدیم فرجعوا و
قالوا سننظر فی امرنا۔

(منقول از ابطال مادیت تالیف علامہ سید محمد رضی زنگی پوری اعلی اللہ مقامہ)

ترجمہ :- جناب رسول خدا نے ان دہریوں کی بحث کے جواب میں جو

آپ کے پاس بغرضِ مباحثہ آئے تھے فرمایا کہ آخر کس بنا پر تم کہتے ہو کہ کائنات کی کوئی ابتداء نہیں، وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ وجہ یہ ہے کہ اس ہی چیز پر حکم لگاتے ہیں جس کو ہم نے دیکھا ہے اور ہمارا فیصلہ فقط مشاہدہ پر مبنی ہوتا ہے۔ ہم نے دیکھا تو اشیاء عالم کے لئے حدوث نہ پایا (یعنی اُس کو ہمیشہ ایسا ہی پایا۔ اُس کو عدم سے وجود میں آتے ہوئے نہیں دیکھا) اور نہ اُس کو فنا ہوتے ہوئے دیکھا لہذا ہم نے نتیجہ نکالا کہ وہ ازلی ہیں۔ اور ابدی ہیں۔ جناب رسول خدا نے سوال کیا کہ کیا تم نے اُن کا ازلی ہونا دیکھا ہے یا اُن کی بقاء و دوام کا تم نے مشاہدہ کیا ہے۔ اگر تم کہو گے کہ ہاں ہم نے ان کی ابتداء اور دوام کا مشاہدہ کیا ہے تو تمہارا یہ دعویٰ ہوا کہ تمہارے اجسام اور تمہارے عقول کے لئے بھی کوئی نہایت نہیں۔ اور تم ہمیشہ اسی طرح رہو گے۔ اور اگر تم یہ کہو گے تو عیاں و ظاہر کی تم نے مخالفت کی اور جو تم کو جانتے ہیں وہ تمہاری تردید کریں گے۔ (یعنی جن کے سامنے تمہاری زندگی شروع ہوئی ہے اور جنھوں نے تمہاری حالت میں تغیر دیکھا ہے وہ تمہارے اپنے لئے دعویٰ قدم و بقا کی تردید کریں گے)۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ ہم نے خود تو ان اشیاء کی ابتداء اور انتہا (قدم و بقا) کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ تو جناب رسول خدا نے فرمایا کہ پھر تم کیوں ان کے لئے قدم و بقا تجویز کرتے ہو۔ جب خود تم نے اس کو نہیں دیکھا (اور تم کہتے ہو کہ ہم اُس چیز ہی کو تجویز کرتے ہیں جس کو ہم نے خود مشاہدہ کیا ہے) بلکہ تمہارے اس حق تجویز سے اُس شخص کا حق فیصلہ زیادہ ہے جو تمہاری ہی طرح (مشاہدہ کو اپنے حکم و تجویز کے لئے ضروری سمجھتا ہوا) یہ کہتا ہے کہ اشیاء عالم حادث اور فانی اور متغیر ہیں کیونکہ ہم نے اُن میں قدم و بقا نہیں دیکھا۔ کیا تم رات اور دن کو اور اُن کو یکے بعد دیگرے ہوتا نہیں دیکھتے۔ اُنھوں نے جواب دیا کہ ہاں ہم دیکھتے ہیں۔ آپ نے پوچھا کہ کیا تمہاری رائے یہ ہے کہ یہ رات دن اسی طرح ہوتے آئے ہیں اور اسی طرح ہوتے رہیں گے۔ اُنھوں نے کہا کہ ہاں۔ آنحضرت نے فرمایا کہ اگر یہ ہے تو تم نے اپنے سے پہلے گزرے ہوئے رات و دن پر یہ حکم کیونکر لگایا کہ وہ حادث تھے۔ حالانکہ

تم نے ان کا مشاہدہ نہیں کیا۔ (جب تم یہ حکم بدون مشاہدہ محض عقل کی بناء پر لگا سکتے ہو تو) خدا کی اس قدرت کا انکار نہ کرو کہ اُس نے اشیاء کو عدم سے پیدا کیا۔ جو رات و دن تم سے پہلے گزر چکے ہیں ان کے متعلق کیا کہتے ہو۔ وہ متناہی تھے یا غیر متناہی۔ اگر غیر متناہی کہو گے تو۔ (اس کا مطلب یہ ہوا) کہ تمہارے پاس ایک ایسا آخر پہنچ گیا ہے۔ جن کے اول کی کوئی انتہا نہیں ہے (اور یہ محال ہے) اور اگر یہ کہو گے کہ وہ متناہی ہیں تو پھر تم اس بات کے قائل ہو گئے کہ خدا تھا اور ان دونوں میں سے کوئی نہ تھا۔ اُنھوں نے کہا کہ ہاں یہ ٹھیک ہے۔ پھر آپ نے فرمایا۔ کیا تم یہ کہتے ہو کہ عالم قدیم ہے۔ حادث نہیں ہے۔ اور تم اس قدم و حدوث کے معانی بھی جانتے ہو جس کا تم اقرار اور انکار کر رہے ہو۔ اُنھوں نے کہا کہ ہاں۔ آنحضرت نے فرمایا کہ جن اشیاء عالم کو ہم دیکھ رہے ہیں اُن کی حالت یہ ہے کہ ایک دوسرے کی محتاج ہیں۔ ایک کو بغیر دوسرے کے قوام و استحکام نہیں ہے۔ جس طرح ایک عمارت کے کچھ ارکان دوسرے ارکان کے محتاج ہوتے ہیں بغیر انکے نہ نظم و ترتیب پا سکتے ہیں اور نہ مستحکم ہو سکتے ہیں اسی طرح تمام اشیاء عالم کی حالت ہے۔ جن کو تم دیکھتے ہو۔ اگر وہ چیزیں قدیم ہیں جو اپنے قوت اور کمال کے لئے دوسروں کی محتاج ہیں تو مجھے بتاؤ کہ اگر یہ چیزیں حادث ہوتیں تو کیسی ہوتیں۔ اس وقت انکی صفت کیا ہوتی۔ اس سوال پر وہ لوگ حیران ہو گئے۔ اور اُنھوں نے معلوم کر لیا کہ جو اوصاف حادث میں ہو سکتے ہیں وہ سب وہ لوگ ان اشیاء میں موجود بتاتے ہیں جن کی بابت ان کا دعویٰ ہے کہ وہ قدیم ہیں۔ ان اوصاف کے علاوہ حادث میں وہ کوئی اور اوصاف نہیں پاتے۔ لہٰذا خاموش ہو گئے اور کہنے لگے کہ ہم اپنے امر میں پھر نظر کریں گے۔ (ختم ہوا ترجمہ)

اس سے بہتر بحث مادہ کے حادث و فانی ہونے کی نہیں ہو سکتی۔ اور جناب رسول خدا نے ساتویں صدی عیسوی میں وہ ثابت کر دیا جواب بیسویں صدی میں سائنس نے معلوم کرنا شروع کیا ہے۔

جناب امام جعفر صادق علیہ السلام نے وجوہ اقسام کفر کے سلسلہ میں دہریت کو اس طرح بیان فرمایا ہے:۔

فاما کفر الجحود بالربوبیۃ وھو قول من یقول لا رب ولا جنۃ ولا نار وھو قول صنف من الزنادقۃ یقال لھم الدھریۃ وھم الذین یقولون وما یھلکنا الا الدھر وھو دین وضعوہ لانفسھم بالاستحسان منھم علی غیر تثبت منھم ولا تحقیق لشیئ مما یقولون قال اللہ عز وجل ان ھم الا یظنون۔

ترجمہ: کفر جحود وہ ہے جس میں خدا کی ربوبیت ہی سے انکار کیا جاتا ہے اور یہ زنادقہ کی ایک جماعت کا قول ہے جن کو دہریہ کہتے ہیں۔ اور یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم کو سوائے دہر کے اور کوئی نہیں مارتا۔ یہ اُن کا اپنا خود ساختہ دین ہے جسے اُنھوں نے بغیر یقین اور تحقیق کے اپنے لئے ایک خود ساختہ دین بنالیا ہے۔ اس کا کوئی ثبوت ان کے پاس نہیں ہے۔ جو کچھ وہ کہتے ہیں اُس کی تحقیق نہیں ہے۔ ان کے لئے خداوند تعالے فرماتا ہے۔ ان ھم الا یظنون۔ یہ لوگ فقط اٹکل پچو باتیں کہتے ہیں۔

جناب امام جعفر صادق علیہ السلام نے دہریوں اور زنادقہ کے خلاف بہت بڑا اجہاد کیا ہے۔ احتجاج طبرسی میں یہ مفصل درج ہے۔ ہم نے اس میں کی ایک بحث کا اردو ترجمہ اپنی کتاب نور المشرقین من حیاۃ الصادقین میں نقل کیا ہے۔ دیکھو اُس کتاب کے صفحات ۵۱۹ لغایت ۵۶۴۔ یہاں اُس کو دوبارہ نقل کرنا بے جا طوالت کا باعث ہوگا۔

جناب امام جعفر صادق علیہ السلام کی دو کتابیں دھریوں اور زنادقہ کے رد میں بہت مشہور ہیں۔ ایک کا نام توحید مفضل ہے اور دوسرے کو کتاب اہلیلجیہ کہتے ہیں۔ توحید مفضل وہ رسالہ ہے جو دھریوں کی تردید میں حضرت امام موصوف نے اپنے خاص شاگرد مفضل بن عمر کو لکھوایا تھا۔ یہ کتاب مصر و استنبول میں شائع ہو چکی ہے اس کا فارسی ترجمہ ملا محمد صالح قزوینی نے ۱۰۸۰ھ ہجری میں کیا تھا۔ اور ۱۳۲۷ھ میں اس کا اردو ترجمہ جناب مولوی سید محمد ہارون صاحب اعلی اللہ مقامہ نے توحید الائمہ کے نام سے کیا۔ اس کو تمام و کمال علامہ مجلسی علیہ الرحمہ نے بحار الانوار جلد دوم میں نقل کیا ہے۔ وہاں وہ اس کتاب کے صفحات ۵۰ لغایت ۱۹۹ پر ہے۔

کتاب اہلیلجہ بھی جناب امام موصوف کا وہ مراسلہ ہے جو دہریت کی تردید میں مفضل بن عمر کے خط کے جواب میں لکھ کر اُن کے پاس بھیجا تھا۔ یہ بھی علامہ مجلسی علیہ الرحمہ کی بحار الانوار جلد ثانی کے صفحات ۱۹۹ لغایت ۲۵۹ پر ہے۔ شیخ صدوق علیہ الرحمہ نے بھی ان دونوں رسالوں کو اپنی کتاب التوحید میں نقل کیا ہے۔

ہر ایک شیعہ جو اپنے امام کے علوم سے واقفیت حاصل کرنا چاہتا ہے اُس کا فرض ہے کہ ان دونوں کتابوں کو بہت غور سے پڑھے اور بار بار پڑھے۔

بولشوزم Bolsheviam.

دہریت کو اپنے بولشوزم پر بڑا فخر ہے اور روس کی "کامیابی" کو مثال میں پیش کرتی ہے۔ نظام بولشوزم اس کلیہ پر مبنی ہے کہ انسان کا محرک عمل ہمیشہ اُس کا پیٹ رہا ہے۔ لہٰذا حکومت کا مقصد اولین اقتصادی اصلاح ہونا چاہئے۔ لیکن غور تو کرو۔ اس قانونِ جنگل میں جو دہریت پیش کرتی ہے۔ اصلاح اقتصادیات ممکن بھی ہے یا نہیں۔ کوئی اصلاح بھی ممکن نہیں۔ اس میں تو خود غرضی اور طاقت ہی کی عملداری ہے۔ کہتے ہیں کہ روس نے اپنے یہاں کے نظام اقتصادیات کی اصلاح کر لی ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ روس کی حکومت صرف زبردستی و ظلم پر مبنی ہے۔ کے آمدی و کے پیر شدی۔ ابھی وہ نظام کتنے دن زیر عمل رہا ہے۔ پورے پچاس سال بھی نہیں ہوئے۔ وہ کوئی نظام نہیں ہے۔ مغربی یورپ کی دولت اور خود غرضی کے خلاف ردعمل ہے۔ اور دوسرے سرے پر چلا گیا ہے۔ انگریزی کی مثل صادق آئی کہ EXTREMES MEET ایک مخالف طریقے کی انتہا دوسرے کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہاں بھی وہ ہی ہوا۔ وہ ہی خود غرضی رونما ہو گئی جس کے خلاف ردعمل تھا۔ یہ تو دراصل ایک سیاسی طعمہ ہے جو جہلاء کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ اگر یہ محض اقتصادی نظام ہے کہ جس میں ہر ایک کو قوت لایموت مہیا کرنے کا انتظام کیا گیا ہے تو اس کو ایک مذہب بنا کر سیاسی بلاک کیوں قائم کئے گئے۔ چونکہ غریب طبقہ ہر ایک ملک میں ہوتا ہے۔ اور اس کی کثرت ہوتی ہے کیونکہ وہ ہی انسان کا پورا دشمن، خود غرضی، غریبوں کو زیادہ غریب اور زیادہ مجبور رکھنے میں ہمیشہ کوشاں

رہتا ہے، لہذا اہل روس کا محض یہ وعدہ کرنا کہ ہم سب کو روٹی دیں گے لوگوں کو ان کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ یہ وعدہ نہ کبھی پورا ہوا ہے اور نہ پورا ہو سکتا ہے۔ یہ تو محض وہ نمونہ ہے جس کا نقشہ مسلمانوں نے کھینچا ہے کہ آخری زمانہ میں ایک شخص یا ایک قوم آئے گی، جس کا نام دجال ہوگا۔ اور وہ لوگوں کو ایک ایسی دراصل غلیظ اور ظاہرا اچھی شے پیش کرے گی کہ لوگ بھوک کے مارے اُس کی طرف مائل ہو جائیں گی۔ دجال صیغہ مبالغہ ہے جس کے معنی بہت دھوکہ دینے والے کے ہیں۔ اور بولشوزم محض دھوکہ ہی دھوکہ ہے۔ دراصل یہ سیاسی تحریک ہے اور وسعت و استحکام حکومت اس کا مدعا ہے۔ اپنے ملک کے لوگوں کو سبز باغ دکھا کر اور بے شمار سیاسی اغراض کے کارخانوں میں انھیں مشغول کر کے اُن سے کام لیتے ہیں، کہتے یہ ہیں کہ ہمارے یہاں بے روزگاری نہیں ہے۔ سب کو روزی ملتی ہے۔ یہ بہلا پھسلا کر کہ تم اپنے ہی ملک کا کام کر رہے ہو، ان سے محنت لیتے ہیں۔ اُجرت محض اتنی ہی دیتے ہیں کہ جتنی اُن کی زندگی کے لئے کافی ہے۔ اور اُن کی محنت کا سارا فائدہ اپنے خزانے میں رکھتے ہیں۔ نتیجہ وہ ہی ہے جو Capitalism کا ہوتا ہے۔ نام بدلا ہوا ہے، شکل بدلی ہوئی ہے۔ بات وہ ہی ہے۔ صرف فرق اتنا ہے کہ وہاں Capitalist (سرمایہ دار) افراد تھے۔ یہاں حکومت ہے یہ کہنا کہ انسان کا محرک عمل ہمیشہ اُس کا پیٹ رہا ہے عام آدمیوں پر حاوی ہو سکتا ہے جیسا کہ شیخ سعدی نے فرمایا ہے کہ ؎

چناں قحط سالے شد اندر دمشق کہ یاراں فراموش کردند عشق

لیکن عموماً اگر اس کو حاوی کرنا چاہو گے اور خاص و عام کی کوئی تخصیص نہ ہو گی تو قطعاً اور یقیناً یہ وہ تاریخی غلطی ہوگی جو ایک احمق ہی کر سکتا ہے ہر ملک میں ایسے لوگ گزرے ہیں جنھوں نے محض حق کی خاطر اپنی عزیز ترین شے کو قربان کر دیا ہے۔ نہ تلواروں سے ڈرے اور نہ قید خانوں سے اور نہ ہسپانیہ کی Inquisition سے۔ اگر عیسائیوں تک کربلا کے میدان اور بغداد کے قید خانوں کی خبریں نہیں پہنچیں تو حضرت عیسٰی اور سینٹ پیٹر اور سینٹ پال اور دیگر عاشقان مسیحیت کی خبریں تو ضرور پہنچی ہوں گی۔ کیا وہ سب پیٹ کے خاطر تھا۔ کہتے ہیں کہ مذہب کی وجہ سے دنیا میں

بہت کشت وخون ہوا ہے۔ اس میں بھی ذرا غور وفکر وتمیز کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر تاریخ عالم کا مطالعہ صحیح طریقہ سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مذہب کے نام پر لڑنے والے اکثر وہ تھے جنھوں نے مذہب کی آڑ میں اپنی ہوس ملک گیری کو پورا کرنا چاہا تھا اور اس میں مسیحیت اور اسلام میں کچھ فرق نہیں ہے۔ لیکن کشت وخون دنیا میں کب نہیں ہوا — مذہب کے پہلے بھی یہ کشت وخون جاری تھا اور اب کہ جب مذہب کی طاقت بالکل دنیا سے معدوم ہو گئی ہے اب بھی جاری ہے۔ اور بڑے اعلیٰ پیمانہ پر اور صریح ظلموں کے ساتھ۔

اقتصادی نظام جو بولشوزم نے ایجاد کیا ہے محض دھوکہ ہے اور ایک ہنگامی کامیاب دھوکہ سے زیادہ اس کی زندگی نہیں ہوگی۔ اب ہی سے اس کے گرنے کے آثار شروع ہو گئے ہیں۔ یہ مضمون ایک مستقل اور ضخیم رسالہ چاہتا ہے یہاں اس کی گنجائش نہیں۔ ہاں اس سلسلہ میں مناسب مقام پر ہم اسلام کا اقتصادی نظام ذرا تفصیل سے بیان کریں گے۔

دہریت کی دیگر وجوہات۔ دہریت کی مندرجہ بالا بحث محض سائنسی اور سیاسی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی وجوہات ہیں۔ جو ان دہریوں کے دل میں گھر کئے ہوئے ہیں۔ جن کی وجہ سے یہ اپنی دہریت پر قائم ہیں وہ چار ہیں:-

(۱) اسباب وعلل کے پردے۔

(۲) دنیا میں شر کی موجودگی اور بسا اوقات اس کی ظاہری کامیابی۔

(۳) دنیا میں ظلم کی فراوانی اور کوتاہ بین نظروں میں ظالم کا بسا اوقات پھولنا پھلنا۔

(۴) یورپ میں مسیحیت سے سائنس کی آویزش اور اس مذہب کی کمزوری۔

ان میں سے نمبر ۴ پر ہم بحث کر چکے ہیں۔ اور ۱، ۲، ۳ کی بحث کی مناسب جگہ فلسفۂ اسلام کے عنوان کے نیچے ہے۔ جو اس کتاب کا حصہ دوم ہے۔ ان امور پر ہم اس جگہ قرآن اور اقوال آئمہ علیہم السلام سے بحث کریں گے لیکن یہاں بھی اختصار کے ساتھ اس کی توجیہ کرتے ہیں۔

نظام عالم کے علاوہ دنیا میں دو چیزیں ہیں جن کی وجہ سے انسان خدا کی ہستی اور عقبیٰ کو ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ایک تو مجبوری جس کا سب سے بڑا مظاہرہ

موت ہے اور دوسرے ظلم ۔ دنیا کے کسی گوشہ میں کسی ملک میں انسان کو ان دو باتوں سے چھٹکارا نہیں ۔ موت بسا اوقات ایسے بے وقت آتی ہے کہ اس کے سبب سے گھر کے گھر دریائے غم میں ڈوب جاتے ہیں ۔ ظلم تو دنیا کی ہوا میں بس گیا ہے اگر مظلوم کی دادرسی نہیں اور ظالم سے انتقام نہیں لیا جاتا اور موت نے جو خاندان برباد کئے تھے اس کا معاوضہ نہیں تو پھر دنیا کا ایک لمحہ بھی قائم رہنا بے سود ہے ۔ اور عقلمندوں کے لئے سوائے خودکشی کرنے کے چارہ نہیں ۔ اب یہ غور کرنا چاہئے کہ انسان کے اندر جو موت کو ہر ممکن طریقے سے دور رکھنے اور زندگی کو ہر ممکن طریقے سے قائم رکھنے کا جذبہ ہے وہ کیوں ہے ؟ یا تو وہ جذبہ غلطی سے فطرت انسان میں ودیعت کیا گیا ہے یا دنیا میں نہ ظلم ہے ، نہ موت ہے ، نہ مجبوری ہے ، انسان اس لئے جینا چاہتا ہے ۔ ایک شخص ہر قسم کے مصائب سے دوچار ہے لیکن پھر بھی وہ زندہ رہنا چاہتا ہے ۔ ایک شخص ہر قسم کے امراض میں گھرا ہوا ہے پھر بھی وہ زندہ رہنا چاہتا ہے ۔ انسان کی زندگی کا ناقابل برداشت ہو جانا لیکن پھر بھی اس کی خواہش زندگی کا قائم رہنا ایسی دو متضاد باتیں ہیں کہ جب تک اس کی توجیہ نہ کی جائے معمہ حل نہیں ہوتا ۔ جیسا کہ ہم اوپر ثابت کر چکے ہیں ، دہریت اور سائنس کو یہ معلوم ہی نہیں کہ دنیا میں زندگی کیونکر آئی تو پھر وہ کیونکر بتا سکیں گے کہ ایک ایسا جذبہ یعنی خواہش زندگی کیوں فطرت انسان میں آخر راسخ ہو گیا ۔ جس جذبہ کی موجودگی کا اس کا ماحول کسی صورت میں متقاضی نہیں ہے ۔ یا تو جذبہ نہ ہوتا یا یہ ماحول ایسا نہ ہوتا کہ جیسا ہے ۔ یہ دونوں متضاد چیزیں کیوں ایک ساتھ ہیں دہریت اس کی توجیہ نہیں کر سکتی ۔ اسلام نے اس کی توجیہ ایسی عمدگی سے کی ہے کہ اس پر کوئی اعتراض وارد نہیں ہو سکتا ۔ یہ جذبہ (خواہش زندگی) خداوند تعالےٰ نے کائنات کی فطرت میں اس وجہ سے داخل کیا ہے کہ وہ اس کے قیام کے لئے ضروری تھا ۔ اور کائنات کو قائم رکھنا خداوند تعالےٰ کی مشیت میں تھا ۔ دوسری اور سب سے بڑی وجہ اس کی یہ ہے کہ انسان کی زندگی اس دنیا میں ختم نہیں ہوتی ۔ اس کا سلسلہ عاقبت کی زندگی سے ملا ہوا ہے اور عاقبت کی زندگی پر دنیا کی زندگی کا اثر پڑتا ہے ۔ مصائب برداشت کر کے انسان کے مدارج عاقبت میں بڑھ جائیں یا اس دنیا کے سئیات اور گناہان کا اتنا کفارہ ہو جائے کہ

مرتے وقت وہ شخص ہلکا مرے۔ اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ خدا رحمان بھی ہے اور رحیم بھی ہے۔ اصلی زندگی عاقبت کی زندگی ہے جو دیرپا ہوگی۔ اس دنیا کی زندگی محض خیال ہی خیال ہے۔ اور بہت قلیل ہے۔ کتنا زمانہ ہم سے پہلے گزر گیا۔ کتنا زمانہ ہمارے بعد آئے گا۔ اُس کے مقابلہ میں ہماری زندگی کیا ہے۔ کچھ نہیں۔ شاعر نے سچ کہا ہے کہ

سہ کیا اعتبار ہستیٔ ناپائدار کا چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

غالب نے بہت نکتہ کی بات کہی ہے۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

اس لئے خداوند تعالےٰ انسان کو دائمی راحت و آرام کے لئے مستحق بنا رہا ہے اور یہ استحقاق کا درِ امتحانِ ایمان محض صبر و برداشت و رضا بقضاء الہیٰ سے پیدا ہوتا ہے اس کے لئے ابتلاء و مصائب سے بہتر کوئی ذریعہ نہ تھا یہ جواب ہو گیا دہریت کے اُس اعتراض کا بھی کہ دنیا میں شر و ظلم کیوں ہے۔ نیکی کی قدر کیا تھی اگر شر نہ ہوتی اور عدل کی قیمت کیا تھی اگر ظلم نہ ہوتا۔ اور پھر انسان کو عافیت کی راحت کا استحقاق کہاں سے ہوتا۔ قرآن شریف کہتا ہے۔

وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ۔

خداوند تعالےٰ نے آسمان و زمین کو حق کے ساتھ پیدا کیا۔ اور تاکہ ہر ایک نفس کو اس کی جزا ملے جو اُس نے کیا ہے اور ان پر ذرا بھی ظلم نہ ہوگا۔

اس ساری بحث کا ماحصل یہ ہے

۱۔ مادہ فانی ہے۔ اور غیر مرئی ہے۔

۲۔ تمام عالم برق کی ایک لہر ہے جو روحانیت محض ہے اور مادیت سے اُس کا کوئی تعلق ہی نہیں۔

۳۔ انسانی روح بھی ایک برقی لہر ہے جس کو جسم میں آنے کی وجہ سے ایک شکل و صورت مل گئی۔

۴۔ تمام کائنات ایک وحدت کا پرتو ہوا اس میں دوئی کو جگہ نہیں۔

۵- تمام حیوانات بلکہ نباتات بھی جن میں نشوونما ہے۔ اس ہی وحدت کے اصول پر بنائے گئے ہیں۔ سب کی ترکیب وساخت وزندگی کے اصول ایک ہی ہیں۔ غذا کھانا فضلہ نکلنا، خون بننا۔ خون سے تمام جسم کی آبیاری ہونی۔ جزئیات میں اختلاف ہے۔ اصول پیدائش ونشوونما ایک ہی ہیں۔ یہاں تک کہ انسان کے اندرونی اعضا بھی ایک ہی اصول پر مبنی کئے گئے ہیں، دل ودماغ وجگر ومعدہ وغیرہ اور جریانِ خون سب میں پائے جاتے ہیں۔ جب ہی تو یہ ممکن ہوا ہے کہ اطباء نے جانوروں پر تجربے کرکے آدمیوں کے لئے ادویہ مرتب کی ہیں۔ یہاں تک کہ اجرام فلکی کی گردشیں بھی کائنات (جمادات، نباتات، حیوانات) کے ہر ذرہ میں پائی جاتی ہیں۔ ان کے ہر ایک ایٹم میں Electrons اسی طرح Proton کے گرد گردش کرتے ہیں جس طرح سبعہ سیارہ آفتاب کے گرد گردش کرتے ہیں اور آفتاب کی طرح Proton بھی متحرک ہے۔ گویا انسان کے ہر ذرہ میں تمام اجرام فلکی کا نمونہ موجود ہے۔ اور خود انسان ہی تمام کائنات کا نقشہ ہے۔ وہ ہی دریا، وہ ہی پہاڑ وپتھر ہڈیوں کی شکل میں۔ وہ ہی نور روح کی شکل میں، وہ ہی ایک حاکم اور اُس کے متفرق کارکنان یعنی دماغ وجوارح۔ یہ حکومت کا نمونہ ہوا۔ اس کے اعضاء کی خون سے آبیاری ہوتی ہے۔ تمام کائنات کا ایک خدا ہے۔ اُس ہی خدا کا ایک نمونہ یا نائب روح۔ انسان میں ہے۔ جب ہی تو فرمایا گیا کہ۔ نفخت فیہ من روحی۔

۶- مخلوق کی یہ زبردست وحدانیت خالق کی وحدانیت کی دلیل ہے۔

۷- وہ برقی لہر جو تمام کائنات کی مبنیاد ہے، خود مخلوق ہے کیونکہ برق کیلئے ایک برق پیدا کرنے والے کی ضرورت ہے۔

۸- جب مادّہ فانی ہوا تو مادیت نہ رہی۔ چونکہ برقی لہر ایک قسم کی روح ہے۔ کسی ہستی اعظم کے کن کہنے سے بھی پیدا ہو سکتی ہے۔

۹- اندریں صورت روحانیت نے فلسفۂ انسانی میں مادیت کی جگہ لے لی۔

۱۰- اہل سائنس نہیں جانتے کہ زندگی کیونکر پیدا ہوئی۔

۱۱- اہل سائنس کو یہ بھی نہیں معلوم نہ معلوم ہو سکتا ہے کہ باوجود سورج کے ہر سکنڈ میں کروڑوں ٹن وزن وجسم خرچ کرنے کے کس طرح اور کہاں سے یہ کمی پوری ہوتی

ہے۔ اور بہت سی باتیں ہیں جو سائنس کو نہیں معلوم ہیں اور نہ معلوم ہو سکتی ہیں۔ اور اس کا اقرار یہ بار بار کر چکے ہیں۔

۱۲۔ جب دہریت کائنات کی توجیہ نہیں کر سکتی تو یہ کیونکر کہہ سکتی ہے کہ خدا نہیں ہے حالانکہ اس دعویٰ کے ثابت کرنے کا بارِ ثبوت دہریت پر ہے۔

۱۳۔ اسلام کائنات کی توجیہ کرتا ہے۔ اُس کے ہر نظام کی جزئیات کو بتاتا ہے۔

۱۴۔ اہلِ دہریت کے ضابطہ میں انسان اور اُس کی زندگی کی کچھ قدر نہیں۔ اُن کے نزدیک انسان اور ایک گوبر کا کیڑا برابر ہے۔ اور یہ صریحاً غلط ہے۔

۱۵۔ دہریت میں عدل اور جزائے صبر کی کوئی جگہ نہیں اور نہ انتقامِ ظلم ہے۔ اُس کا اعتقاد فقط طاقت کی حکومت پر ہے۔

۱۶۔ اہلِ دہریت کے عقائد فتنہ و فساد پر منتج ہوتے ہیں۔ کیونکہ جب ظلم و جور و زیادتی کیلئے کوئی سزا نہیں اور نہ مظلوم کیلئے کوئی جزا تو پھر کیوں نہ لوگ ظلم اور استعمالِ طاقت کے ذریعہ سے کمزوروں کو دبا کر اپنا فائدہ کریں اور یہ کشمکش فتنہ و فساد کی طرف لے جائیگی۔ یہ جواب کافی نہیں ہے کہ ظلموں کی سزا کے لئے حکومت مقرر ہے کیونکہ ظلموں کی اکثریت حکومت کی آنکھوں سے اوجھل رہتی ہے۔ اور جو ظلم و جرائم اُس کی نظر میں آبھی جاتے ہیں تو حکام کی نااہلی اور رشوت ستانی اور طرفداری بیجا اور مجرم کا رسوخ و دولت مجرم کو سزا سے بچا دیتی ہیں۔ علاوہ اس کے ہر ایک ظلم کی نوعیت مجموعہ ضابطہ تعزیرات میں نہیں ہے اور نہ آسکتی ہے۔ یہ بھی ہے کہ زیادہ سے زیادہ مجرم کو سزا دیدی۔ مظلوم کی صحیح دادرسی تو نہ ہوئی۔ اور اگر حکومت ان جرائم کا معاوضہ مستحقین کو دینے لگے تو اس کے لئے روپیہ کہاں سے آئے۔

اب ہم جناب امیر علیہ السلام کے چند خطبے نقل کرتے ہیں۔ ان کو بہت غور و فکر سے مطالعہ کیجئے۔ ان کو سمجھنے اور ان پر غور کرنے کے بعد کوئی شخص دہریہ نہیں رہ سکتا۔ اور اب بھی اگر وہ دہریت پر ضد کرتا ہے تو اس کی ضد وہی شیطان کی ضد ہے کہ آدم کو سجدہ ہی نہ کیا اور دائمی لعنت اور عذاب قبول کر لیا۔

دہریوں کی حالت ایسی ہوتی ہے: وَهُوَ فِي مُهْلَةٍ مِنَ اللهِ يَهْوِي مَعَ الْغَافِلِينَ وَيَغْدُو مَعَ الْمُذْنِبِينَ، بِلَا سَبِيلٍ قَاصِدٍ وَلَا إِمَامٍ قَائِدٍ،

حَتّٰی اِذَا کَشَفَ لَھُمْ عَنْ جَزَاءِ مَعْصِیَتِھِمْ، وَاسْتَخْرَجَھُمْ مِنْ جَلَابِیْبِ غَفْلَتِھِمْ، اسْتَقْبَلُوْا مُدْبِرًا. وَاسْتَدْبَرُوْا مُقْبِلًا، فَلَمْ یَنْتَفِعُوْا بِمَا اَدْرَکُوْا مِنْ طَلِبَتِھِمْ، وَلَا بِمَا قَضَوْا مِنْ وَطَرِھِمْ (نہج البلاغہ محمد عبدہ الجزء الثانی ص ۵۵۔

ترجمہ:۔خداوند تعالیٰ اس گمراہ شخص کو (بذریعہ تاخیر اجل) مہلت دیتا ہے کہ وہ اپنے جیسے غافلوں کی راہ چلے اور گنہگاروں کے ساتھ اپنے دن گزارے بغیر مقصد کے اور بغیر کسی ہادی کے راہ چلتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ جب خداوند تعالےٰ ان کے معصیت کے نتیجہ کو ظاہر کرتا ہے اور ان کی غفلت کے پردوں میں سے ان کو نکالتا ہے (یعنی جب ان کو موت آتی ہے) تو وہ اس کی طرف جو ان کو سامنے نظر آتا ہے منھ موڑ کر جاتے ہیں (یعنی وہ ان کو برا لگتا ہے) اور جس کو پیچھے چھوڑتے ہیں (یعنی دنیا) اس کو (حسرت) رغبت سے مڑ مڑ کر دیکھتے جاتے ہیں۔ (اس کا یہ بھی ترجمہ ہو سکتا ہے)

[تو انھوں نے آخرت کی طرف رخ کیا حالانکہ (دنیا میں) اس کی طرف پشت کیے ہوئے تھے اور دنیا کی ان دولتوں کی طرف سے پیٹھ پھرائی جن کی طرف دنیا میں منھ کئے تھے] پس اس سے جو دنیا میں لذت وخوشی حاصل کی تھی فائدہ نہ حاصل کر سکے اور اپنی حاجتوں کے موافق جو کچھ بھی پیدا کیا اس سے کچھ بھی انھیں نفع نہ پہنچا (ختم ہوا ترجمہ)

ایک اور خطبہ میں فرماتے ہیں:۔

فَاِنَّ الْغَایَۃَ اَمَامَکُمْ وَاِنَّ وَرَاءَکُمُ السَّاعَۃَ تَحْدُوْکُمْ، تَخَفَّفُوْا تَلْحَقُوْا فَاِنَّمَا یُنْتَظَرُ بِاَوَّلِکُمْ اٰخِرُکُمْ۔ خطبہ ۲۰ الجزء الاول شرح محمد عبدہ

سید رضیؒ جامع نہج البلاغہ کہتے ہیں کہ انسان کا کلام ایسا مختصر اور ایسا بلیغ کبھی سننے میں نہیں آیا۔ کلام اللہ و کلام رسول کے بعد بلیغ ترین کلام ہے۔

ترجمہ:۔تمھاری زندگی کی غایت و ماحصل آگے ہے۔ اور تمھیں پیچھے سے قیامت ہنکاتی ہوئی لا رہی ہے (اس سفر مہلت میں اپنے تئیں گناہوں سے) ہلکا رکھو تاکہ ان لوگوں سے تم مل جاؤ جو تم سے پہلے جا چکے ہیں اور

اعمالِ نیک کا عوض پا چکے ہیں۔ قیامت انتظار کر رہی ہے تمھارے اوّل جانے والے سے لیکر تمھارے آخر تک کا۔ (ختم ہوا ترجمہ)

اس خطبہ کے پڑھنے سے بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں:۔

فَإِنَّكُمْ لَوْ عَايَنْتُمْ مَا قَدْ عَايَنَ مَنْ مَاتَ مِنْكُمْ لَجَزِعْتُمْ وَوَهِلْتُمْ
وَسَمِعْتُمْ وَأَطَعْتُمْ وَلٰكِنْ مَحْجُوبٌ عَنْكُمْ مَا قَدْ عَايَنُوا، وَقَرِيبٌ مَا
يُطْرَحُ الْحِجَابُ وَلَقَدْ بُصِّرْتُمْ إِنْ أَبْصَرْتُمْ، وَأُسْمِعْتُمْ إِنْ سَمِعْتُمْ
وَهُدِيتُمْ إِنِ اهْتَدَيْتُمْ، بِحَقٍّ أَقُولُ لَكُمْ لَقَدْ جَاهَرَتْكُمُ الْعِبَرُ وَزُجِرْتُمْ
بِمَا فِيهِ مُزْدَجَرٌ وَمَا يُبَلِّغُ عَنِ اللهِ بَعْدَ رُسُلِ السَّمَاءِ إِلَّا الْبَشَرُ۔

(نہج البلاغہ شرح محمد عبدہ خطبہ نمبر ۱۹ حصہ اوّل)

ترجمہ:۔ اگر تم وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے جو انھوں نے بچشم خود دیکھا جو تم میں سے پہلے مر چکے ہیں تو یقیناً تم جزع و زاری کرتے اور (اوامر و نواہی خداوند تعالیٰ کو) سنتے اور انکی اطاعت کرتے لیکن جو کچھ ان مرنے والوں نے دیکھا ہے وہ تمھاری آنکھوں سے پنہاں ہے۔ اور نزدیک ہے کہ (اب تمھاری آنکھوں پر سے بھی) پردے اُٹھا لئے جائیں۔ اور تحقیق اب بھی تمھیں دکھا دیا گیا ہے اگر تم دیکھو۔ تمھیں سنا دیا گیا ہے اگر تم سنو۔ تمھیں ہدایت کی گئی ہے اگر تم ہدایت پاؤ۔ اور میں سچ کہتا ہوں کہ دنیا کی عبرتوں نے (حال زندگان تم پر) آشکارا کر دیا ہے۔ تمھیں زجر و توبیخ کی گئی ہے اور تم اس چیز سے منع کر دیئے گئے جس سے منع کر دیا جانا ضروری تھا۔ پروردگار کی جانب سے رسولانِ آسمان (یعنی ملائکہ) کے بعد انسان کے سوائے کسی اور نے تبلیغِ رسالت نہیں کی۔ (ختم ہوا ترجمہ)

ایک اور خطبہ میں آپ فرماتے ہیں:۔

فَإِنَّهُ وَاللهِ الْجِدُّ لَا اللَّعِبُ، وَالْحَقُّ لَا الْكَذِبُ، وَمَا هُوَ إِلَّا الْمَوْتُ
قَدْ أَسْمَعَ دَاعِيهِ وَأَعْجَلَ حَادِيهِ فَلَا يَغُرَّنَّكَ سَوَادُ النَّاسِ مِنْ نَفْسِكَ
فَقَدْ رَأَيْتَ مَنْ كَانَ قَبْلَكَ مِمَّنْ جَمَعَ الْمَالَ، وَحَذِرَ الْإِقْلَالَ وَأَمِنَ
الْعَوَاقِبَ؛ طُولَ أَمَلٍ وَاسْتِبْعَادَ أَجَلٍ، كَيْفَ نَزَلَ بِهِ الْمَوْتُ فَأَزْعَجَهُ
عَنْ وَطَنِهِ وَأَخَذَهُ مِنْ مَأْمَنِهِ مَحْمُولًا عَلَى أَعْوَادِ الْمَنَايَا، يَتَعَاطَى بِهِ
الرِّجَالُ الرِّجَالَ حَمْلًا عَلَى الْمَنَاكِبِ، وَإِمْسَاكًا بِالْأَنَامِلِ أَمَا رَأَيْتُمْ

اَلَّذِیۡنَ یُؤَمِّلُوۡنَ بَعِیۡدًا، وَیَبۡنُوۡنَ مَشِیۡدًا، وَیَجۡمَعُوۡنَ کَثِیۡرًا کَیۡفَ اَصۡبَحَتۡ بُیُوۡتُہُمۡ قُبُوۡرًا، وَمَا جَمَعُوۡا بُوۡرًا، وَصَارَتۡ اَمۡوَالُہُمۡ لِلۡوَارِثِیۡنَ، وَاَزۡوَاجُہُمۡ لِقَوۡمٍ آخَرِیۡنَ لَا فِیۡ حَسَنَۃٍ یَزِیۡدُوۡنَ وَلَا مِنۡ سَیِّئَۃٍ یَسۡتَعۡتِبُوۡنَ؟ اَفَمَنۡ اَشۡعَرَ التَّقۡوٰی قَلۡبَہٗ بَرَّزَ مَہَلُہٗ وَفَازَ عَمَلُہٗ، فَاہۡتَبِلُوۡا ہَبَلَہَا وَاعۡمَلُوۡا لِلۡجَنَّۃِ عَمَلَہَا فَاِنَّ الدُّنۡیَا لَمۡ تُخۡلَقۡ لَکُمۡ دَارَ مُقَامٍ، بَلۡ خُلِقَتۡ لَکُمۡ مَجَازًا لِتَزَوَّدُوۡا مِنۡہَا الۡاَعۡمَالَ اِلٰی دَارِ الۡقَرَارِ، فَکُوۡنُوۡا مِنۡہَا عَلٰی اَوۡفَازٍ وَقَرِّبُوۡا الظُّہُوۡرَ لِلزِّیَالِ۔ (نہج البلاغہ خطبہ ۱۲۸ء)

ترجمہ:۔ قسم بخدا یہ (موت) بہت اہم بزرگ شے ہے۔ کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ یہ حق ہے۔ جھوٹ نہیں۔ جس کو یہ پکارتا ہے اُسے سُننا پڑتا ہے۔ جس کو یہ ہنکاتا ہے اُسے جلدی کرنی پڑتی ہے۔ پس لوگوں کی تیرے لئے اطاعت تجھکو مغرور نہ کرے۔ یعنی دھوکہ میں نہ ڈالے۔ تو نہیں دیکھتا کہ تجھ سے پہلے کتنے لوگ جنھوں نے مال وافر جمع کیا تھا فقیر و مفلسی سے دور بھاگتے تھے۔ مآل کار کو بھولے ہوئے لمبی چوڑی آرزوئیں لئے بیٹھے تھے اور موت کو بہت دور سمجھتے تھے کس طرح موت نے اُن کو آدبوچا اور اُن کو اُن کے وطن سے نکال باہر کیا۔ اور ان کی جائے امن میں جاکر اُن کو پکڑ لیا۔ اب وہ بانس کی پچیوں کے تابوت میں لوگوں کے کندھوں پر اُٹھائے جاتے ہیں اور اُٹھانے والے کندھا بدلتے جاتے ہیں۔ کیا تم نے اُن لوگوں کو نہیں دیکھا کہ کثرت خواہشات رکھتے تھے۔ مضبوط گھر بناتے تھے۔ مال جمع کرتے تھے اور حکومت کرتے تھے کس طرح وہ قبر میں ڈال دئے گئے۔ اور جو اُنھوں نے جمع کیا تھا وہ برباد ہوگیا۔ اُن کا مال اُن کے وارثوں کے پاس چلا گیا۔ اُن کی بیویوں پر دوسروں نے قبضہ کر لیا۔ وہ نیکی میں زیادتی نہیں کرتے۔ بدی سے پرہیز نہیں کرتے۔ جس نے تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کی، خیر و نیکی میں دوسروں سے بڑھ گئے وہ ہی رستگار ہوئے۔ پس غنیمت جانو اس مہلت کو اور پرہیزگاری اختیار کرو اور وہ کام کرو جن سے بہشت تمہیں نصیب ہو۔ کیونکہ یہ دنیا تمھاری اقامت اور ہمیشہ رہنے کے لئے نہیں بنائی گئی۔ بلکہ یہ تو گزرگاہ ہے کہ یہاں سے توشہ لیکر

دائمی قرارگاہ کی طرف چلو۔ پس کوچ کرنے کے لئے جلدی کرو۔ اور سفر کے لئے اپنے مرکبوں کو تیار رکھو۔ (ختم ہوا ترجمہ)

ایک خطبہ میں یوم حساب سے ڈراتے ہیں اور قبر کی وحشت و تاریکی کو اس طرح بیان فرماتے ہیں :-

عِبَادَ اللّٰهِ، إِنَّ الدَّهْرَ يَجْرِي بِالْبَاقِينَ كَجَرْيِهِ بِالْمَاضِينَ، لَا يَعُودُ مَا قَدْ وَلَّى مِنْهُ، وَلَا يَبْقَى سَرْمَدًا مَا فِيهِ. آخِرُ فَعَالِهِ كَأَوَّلِهِ، مُتَشَابِهَةٌ أُمُورُهُ، مُتَظَاهِرَةٌ أَعْلَامُهُ، فَكَأَنَّكُمْ بِالسَّاعَةِ تَحْدُوكُمْ حَدْوَ الزَّاجِرِ بِشَوْلِهِ، فَمَنْ شَغَلَ نَفْسَهُ بِغَيْرِ نَفْسِهِ تَحَيَّرَ فِي الظُّلُمَاتِ، وَارْتَبَكَ فِي الْهَلَكَاتِ، وَمَدَّتْ بِهِ شَيَاطِينُهُ فِي طُغْيَانِهِ، وَزَيَّنَتْ لَهُ سَيِّئَ أَعْمَالِهِ، فَالْجَنَّةُ غَايَةُ السَّابِقِينَ، وَالنَّارُ غَايَةُ الْمُفَرِّطِينَ۔

اَعْلَمُوا عِبَادَ اللّٰهِ، أَنَّ التَّقْوَى دَارُ حِصْنٍ عَزِيزٍ، وَالْفُجُورَ دَارُ حِصْنٍ ذَلِيلٍ، لَا يَمْنَعُ أَهْلَهُ، وَلَا يُحْرِزُ مَنْ لَجَأَ إِلَيْهِ۔ أَلَا وَبِالتَّقْوَى تُقْطَعُ حُمَةُ الْخَطَايَا، وَبِالْيَقِينِ تُدْرَكُ الْغَايَةُ الْقُصْوَى۔

عِبَادَ اللّٰهِ، اللّٰهَ اللّٰهَ فِي أَعَزِّ الْأَنْفُسِ عَلَيْكُمْ، وَأَحَبِّهَا إِلَيْكُمْ، فَإِنَّ اللّٰهَ قَدْ أَوْضَحَ لَكُمْ سَبِيلَ الْحَقِّ وَأَنَارَ طُرُقَهُ، فَشِقْوَةٌ لَازِمَةٌ، أَوْ سَعَادَةٌ دَائِمَةٌ. فَتَزَوَّدُوا فِي أَيَّامِ الْفَنَاءِ لِأَيَّامِ الْبَقَاءِ، قَدْ دُلِلْتُمْ عَلَى الزَّادِ، وَأُمِرْتُمْ بِالظَّعْنِ، وَحُثِثْتُمْ عَلَى الْمَسِيرِ، فَإِنَّمَا أَنْتُمْ كَرَكْبٍ وُقُوفٍ لَا تَدْرُونَ مَتَى تُؤْمَرُونَ بِالْمَسِيرِ۔

أَلَا فَمَا يَصْنَعُ بِالدُّنْيَا مَنْ خُلِقَ لِلْآخِرَةِ؟ وَمَا يَصْنَعُ بِالْمَالِ مَنْ عَمَّا قَلِيلٍ يُسْلَبُهُ، وَتَبْقَى عَلَيْهِ تَبِعَتُهُ وَحِسَابُهُ؟

عِبَادَ اللّٰهِ، إِنَّهُ لَيْسَ لِمَا وَعَدَ اللّٰهُ مِنَ الْخَيْرِ مَتْرَكٌ، وَلَا فِيمَا نَهَى عَنْهُ مِنَ الشَّرِّ مَرْغَبٌ. عِبَادَ اللّٰهِ، اِحْذَرُوا يَوْمًا تُفْحَصُ فِيهِ الْأَعْمَالُ، وَيَكْثُرُ فِيهِ الزِّلْزَالُ، وَتَشِيبُ فِيهِ الْأَطْفَالُ۔

اِعْلَمُوا عِبَادَ اللّٰهِ، أَنَّ عَلَيْكُمْ رَصَدًا مِنْ أَنْفُسِكُمْ، وَعُيُونًا مِنْ جَوَارِحِكُمْ، وَحُفَّاظَ صِدْقٍ يَحْفَظُونَ أَعْمَالَكُمْ وَعَدَدَ أَنْفَاسِكُمْ

لا تَسْتُرُكُمْ مِنْهُمْ ظُلْمَةُ لَيْلٍ دَاجٍ وَلَا يُكِنُّكُمْ مِنْهُمْ بَابٌ ذُو رِتَاجٍ، وَإِنَّ غَدًا مِنَ الْيَوْمِ قَرِيبٌ۔

يَذْهَبُ الْيَوْمُ بِمَا فِيهِ، وَيَجِيءُ الْغَدُ لَاحِقًا بِهِ، فَكَأَنَّ كُلَّ امْرِئٍ مِنْكُمْ قَدْ بَلَغَ مِنَ الْأَرْضِ مَنْزِلَ وَحْدَتِهِ، وَمَخَطَّ حُفْرَتِهِ فَيَا لَهُ مِنْ بَيْتِ وَحْدَةٍ، وَمَنْزِلِ وَحْشَةٍ، وَمُفْرَدِ غُرْبَةٍ! وَكَأَنَّ الصَّيْحَةَ قَدْ أَتَتْكُمْ، وَالسَّاعَةَ قَدْ غَشِيَتْكُمْ، وَبَرَزْتُمْ لِفَصْلِ الْقَضَاءِ، قَدْ زَاحَتْ عَنْكُمُ الْأَبَاطِيلُ، وَاضْمَحَلَّتْ عَنْكُمُ الْعِلَلُ، وَاسْتَحَقَّتْ بِكُمُ الْحَقَائِقُ، وَصَدَرَتْ بِكُمُ الْأُمُورُ مَصَادِرَهَا، فَاتَّعِظُوا بِالْعِبَرِ، وَاعْتَبِرُوا بِالْغِيَرِ، وَانْتَفِعُوا بِالنُّذُرِ۔ نہج البلاغہ شرح محمد عبدہ خطبہ ۱۵۳

ترجمہ اے خدا کے بندو! دنیا کی روش باقی رہنے والوں کے ساتھ بھی ویسی ہی ہے جیسی کہ اس کی روش گزر جانے والوں کے ساتھ تھی زندگی کا جو حصہ یا جو وقت گزر گیا پھر وہ واپس نہیں آتا۔ اور جو اب ہے وہ ہمیشہ باقی رہنے والا نہیں ہے (یعنی اس کی خوشی و رنج ہمیشہ رہنے والے نہیں ہیں) آنے والوں کے ساتھ دنیا کی رفتار ویسی ہی ہے جو اس سے پہلے گزرنے والوں کے ساتھ تھی۔ اس کے مصائب مسلسل ہیں۔ اور اس کے حوادث ایک دوسرے کے معین و مددگار ہیں۔ (فیض الاسلام نے ان دو جملوں کے یہ معنی دیئے ہیں: کارہائے آں زود نابود میگردد، پس خردمند از گردشِ روزگار عبرت گرفتہ بآں دل نبندد) پس سمجھ لو کہ تم قیامت میں حاضر ہو، کیونکہ زمانہ تم کو اس طرح ہنکا رہا ہے جس طرح ہنکانے والا سانڈنیوں کو ہنکاتا ہے جن کا دودھ سوکھ چکا ہو۔ پس جس نے اپنے تئیں ماسوا (دنیا کی آرائشوں) میں مشغول کر لیا وہ بدبختی کی تاریکی میں سرگرداں ہو گیا۔ اور ہلاکت میں پھنس گیا۔ اس کے گمراہ کرنے والے شیطانوں نے اسے سرکشی پر آمادہ کر دیا اور اس کے کردار بد کو اس کی نگاہوں میں خوشگوار بنا دیا۔ پس جنت انجام ہے اُن کا جنھوں نے تقویٰ میں سبقت کی اور دوزخ انجام ہے تقصیر کرنے والوں کا۔

بندگانِ خدا! جان لو کہ تقویٰ عزت دار جمندی کا مضبوط قلعہ ہے۔ اور فسق و فجور ذلت و رسوائی کا ایسا مضبوط گھر ہے کہ جو اپنے ساکن کو بلا و سختی سے محفوظ نہیں

گر سکتا اور جو اس کی طرف پناہ لے جاتا ہے اُس کو بچا نہیں سکتا۔ اچھی طرح جان لو کہ تقویٰ کے ذریعے سے گناہوں کے زہریلے خاروں کو دور کیا جا سکتا ہے اور یقین (یعنی خدا و رسول خدا و آئمہ پر ایمان) کے ذریعہ سے پایان بلند مرتبہ (بہشت جاوید) حاصل کیا جا سکتا ہے۔

بندگانِ خدا! خدا سے ڈرو، خدا سے ڈرو، اپنے نفس کے معاملہ میں جو تمھارے نزدیک سب سے زیادہ عزیز اور محبوب ہے۔ خداوند تعالیٰ نے تمھارے لیے دینِ حق کو آشکار کر دیا، اور اس کے راستوں کو روشن کر دیا بس اب یا تو ابدی شقاوت و بدبختی ہے یا دائمی سعادت و خوش بختی۔ اس عالم باقی کے لئے توشہ مہیا کر دو۔ تمھیں توشہ بتا دیا گیا ہے۔ اور کوچ کا حکم دے دیا گیا ہے۔ اور سفر کے لئے آمادہ کر لیا گیا ہے۔ پس تم اس کاروان کی طرح ہو جس نے (چند لمحوں کے لئے) کمر کھولی ہے تم نہیں جانتے کہ کب تمھیں کوچ دگر بند کا حکم دے دیا جائے۔

خبردار! دنیا سے اس شخص کو کیا مطلب جو آخرت کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ اور مال سے اُسے کیا واسطہ جو جلد ہی چھین لیا جائے گا۔ اور صرف اس کا حساب کتاب ہی باقی رہ جائے گا۔

بندگانِ خدا! خدا نے جو خیر کا وعدہ کیا ہے اس میں ترک کی گنجائش نہیں اور جس عذاب سے منع کیا ہے اس میں لیت و لال کی گنجائش نہیں۔ خدا کے بندو! اُس دن سے ڈرو جس دن اعمال کی جانچ پڑتال کی جائے گی۔ زلزلوں کی کثرت ہو گی۔ اور بچوں پر (دہشت کے مارے) بڑھاپا طاری ہو جائے گا۔

بندگانِ خدا! تمھارے نفوس تمھاری گھات میں ہیں، تمھارے اعضا تمھارے جاسوس ہیں۔ اور بہت سچے نگہبان (فرشتے) ہیں جو تمھارے اعمال و انفاس کے عدد کو محفوظ رکھتے ہیں۔ رات کی تاریکی تمھیں اُن سے چھپا نہیں سکتی۔ اور نہ کوئی بند دروازہ تم کو اُن سے مخفی رکھ سکتا ہے۔ بلاشبہ آنے والا فردا آج کے دن (امروز) سے قریب ہے۔

آج کا دن اُن تمام باتوں کے ساتھ جو اس میں ہیں گزر جائے گا اور کل کا دن تیزی کے ساتھ نمودار ہو جائے گا۔ گویا تم میں سے ہر کوئی زمین کے نیچے تنہا

مکان اور کنجِ لحد میں پہنچ چکا ہے۔ کتنا ہولناک ہے وہ تنہائی کا گھر، وہ منزلِ وحشت! اور مسافرت کا تنہا مقام۔ گویا حشر کی گونج تم تک پہنچ چکی، قیامت تم پر طاری ہو گئی اور تم فیصلۂ اعمال کے لئے نکل آئے۔ باطل تم سے دور ہو چکا۔ علتیں مضمحل ہو گئیں۔ حقائق تم پر ثابت ہو گئے! امور قضا نے تم کو اپنے مصادر تک پہنچا دیا۔ پس عبرت سے نصیحت حاصل کرو۔ اور انقلاب روزگار سے اعتبار کا سبق لو۔ اور عذاب الٰہی سے ڈرانے والی چیزوں سے نفع حاصل کرو۔ (ختم ہوا ترجمہ)

یہ ہیں وہ کلمات جن کو سُن کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں اور چون و چرا کی ساری بحث دماغ سے نکل جاتی ہے۔ کیا خلفائے رسول میں سے کوئی ایسا خلیفہ تھا جس نے دین کو اور دنیا کو اس طرح سمجھا ہو جس طرح علیؑ نے سمجھا تھا۔ اور جس نے اپنی رعایا کی ہدایت کے لئے اتنی کوشش کی ہو۔ اگر اب بھی کوئی مسلمان ایسا ہے کہ جسے اصلی امام و ہادی اور نقلی امام و ہادی کی پہچان نہیں ہوئی تو پھر اُس کو دہریت کا یہ قول ماننا پڑے گا کہ انسان کی زندگی میں اور کیچڑ کے کیڑے کی زندگی میں کچھ فرق نہیں ہے۔

بابِ دہم

آیاتِ فطرت دلیلِ ہستیِ فاطر

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔

وَاِلٰـهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۳﴾
اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ
وَالْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ
مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيْهَا
مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۠ وَّتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ

السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ البقرہ ۲: ۱۶۳، ۱۶۴

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤْمِنُوْنَ۔ الجاثیہ ۴۵: ۶

ترجمہ:- اور تمہارا خدا خدائے واحد ہے۔ سوائے اُس رحمان و رحیم کے اور کوئی معبود نہیں ہے۔ بالتحقیق آسمانوں کی اور زمین کی پیدائش اور رات و دن کے ادلنے بدلنے میں اور ان کشتیوں میں جو سمندر میں وہ کچھ لے چلتی ہیں جس سے لوگوں کو نفع پہنچتا ہے اور اُس پانی میں جسے خدا نے آسمان سے اُتارا اور جس کے ذریعہ سے زمین کو اس کے مرنے کے بعد پھر زندہ کر دیا اور ہر قسم کا چلنے والا اُس میں بکثرت پھیلا دیا اور ہواؤں کے چلنے میں اور ان بادلوں میں جو آسمان و زمین کے مابین معلق ہیں سمجھنے والے کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں۔

یہ خدا کی آیتیں ہیں جن کو ہم ٹھیک (ٹھیک) تمہارے سامنے پڑھتے ہیں تو خدا اور اُس کی آیتوں کے بعد کونسی بات ہوگی جس پر یہ لوگ ایمان لائیں گے۔

خداوند تعالیٰ کی ہستی کا ثبوت کائنات کے ذرہ ذرہ سے نمایاں ہے اور اُس کی قدرت و حکمت پر خود انسان اور اس کا نظامِ حیات شاہد ہے۔ وہ کور چشم اور کور باطن ہیں جو کہتے ہیں کہ خدا نظر نہیں آتا۔ خدا اُسی طرح آنکھوں کے سامنے عیاں ہے جس طرح ایک جسم نہ رکھنے والی ہستی نمایاں ہو سکتی ہے۔ وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ خدا عیاں نہیں ہے دراصل خود اُن میں سے چشمِ باطن سے دیکھنے کی اہلیت زائل ہو چکی ہے۔ اُن پر مادیت نے اتنا غلبہ کر لیا ہے کہ وہ اپنی جسمانی آنکھ کو ہی معیارِ ہست و نیست سمجھنے لگے ہیں۔ اس سے آگے اُنھیں کچھ نظر نہیں آتا۔ والد مرحوم فرماتے ہیں۔

نمایاں اُس کی حکمت ہے شجر میں — بن و شاخ و گل و برگ و ثمر میں
ہیں اُس کی ہستی کی دیتے گواہی — زمیں سے آسماں تک مرغ و ماہی

ان چیزوں کی عظمت کچھ کم نہیں۔ لیکن چونکہ انسان انکو روزمرہ دیکھتا رہتا ہے لہذا باستثنائے صاحبانِ غور و فکر عوام الناس ان سے وہ سبق نہیں لیتے جو ان کو لینا چاہیئے۔ اس غرض کے لئے فضاء آسمانی اور ستاروں کا علم جس کو علمِ ہیئت کہتے ہیں بہت موزوں ہے۔ ہم کو یقین ہے کہ جب شیطانِ دہریت اُس طرف رخ کرتا ہوگا

تو ضرور اُسے اپنی بے بسی اور مردودیت کا احساس ہوتا ہوگا۔ ارشاد خداوندی پر غور کیجیے:۔ وَلَقَدْ زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ وَجَعَلْنَاهَا رُجُومًا لِّلشَّيَاطِينِ وَأَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِيرِ۔ الملک ۶۷: ۵

یعنی ہم نے نیچے کے آسمان کو چراغوں (ستاروں) سے زینت دی ہے اور ہم نے ان کو شیطانوں کے مارنے کا آلہ بنایا اور ہم نے ان کے لیے دہکتی ہوئی آگ کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

ہم آگے چل کر معلوم کریں گے کہ کئی کائنات ہیں اور کئی افلاک ہیں اور یہ ستارے جو نظر آتے ہیں یہ سب آگ کے دہکتے ہوئے کرہ ہیں۔ جہاں تک علم ہیئت ان کے حالات معلوم کر سکا ہے اُس کے مطالعہ سے انسان کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔ اور جہنم کی جو حالت قرآن شریف نے بیان کی ہے وہ نظروں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ ان آیات پر بھی غور کرنا چاہیے:۔

إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزِينَةٍ الْكَوَاكِبِ ۝ وَحِفْظًا مِّن كُلِّ شَيْطَانٍ مَّارِدٍ ۝ لَّا يَسَّمَّعُونَ إِلَى الْمَلَإِ الْأَعْلَىٰ وَيُقْذَفُونَ مِن كُلِّ جَانِبٍ ۝۸ دُحُورًا ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ وَاصِبٌ ۝۹ إِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَةَ فَأَتْبَعَهُ شِهَابٌ ثَاقِبٌ ۝۱۰ فَاسْتَفْتِهِمْ أَهُمْ أَشَدُّ خَلْقًا أَم مَّنْ خَلَقْنَا ط

ترجمہ:۔ یقیناً ہم نے اس آسمانِ اوّل کو ستاروں کی زینت سے مزین کیا ہے اور ہر سرکش شیطان کے لئے اُن کو نگہبان بنایا ہے۔ اب وہ ملا اعلیٰ کی کنسوئیاں نہیں لے سکتے۔ اور ہر طرف سے ان کے بھگانے کے لئے مار پڑتی ہے۔ اور یہ ان کے لئے پائیدار عذاب ہے سوائے اس کے کہ کوئی اُڑتی ہوئی بات لے بھاگا سو ایک ستارہ ٹوٹ کر اس کا بھی پیچھا لیتا ہے۔ اب اُن سے پوچھو کہ ازروئے پیدائش یہ زیادہ مضبوط ہیں یا وہ (مذکورہ) چیزیں جن کو ہم نے پیدا کیا ہے۔

ان آیات سے معلوم ہوا کہ:۔

(۱) فضاء میں بہت دور ملاءِ اعلیٰ ہے۔

(۲) وہاں شیطانوں کا گزر نہیں ہوتا۔

(۳) شیاطین ایک مخلوق ہے جو انسان کو نظر نہیں آتی۔
(۴) شیاطین ملاءِ اعلیٰ تک پہنچنے اور وہاں کی خبریں سننے کیلئے کوشش کرتے ہیں
(۵) لیکن وہاں تک نہیں پہنچ سکتے اور وہاں جو فرشتے ہیں وہ اُن کو بھگاتے ہیں۔
(۶) شہابِ ثاقب اُن کا تعاقب کرتے ہیں۔

علمِ ہیئت نے بھی وہاں کا حال معلوم کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن بہت کم معلوم ہو سکا ہے۔ جتنا معلوم ہوا ہے وہ بھی ہمارے مقصد کے لئے کافی ہے۔

اہل سائنس کو یہ نہیں معلوم ہو سکا ہے اور نہ کبھی معلوم ہو گا کہ دنیا کی ابتداء کیا ہے اور یہ کیونکر بنی۔ صرف قیاس کیا جاتا ہے کہ تمام کائنات پہلے ایک بڑے دخانی گولے کی صورت میں تھی۔ اور وہ بگولہ کی طرح چکر لگا رہا تھا۔ سائنس کو یہ نہیں معلوم ہو سکا اور نہ کبھی یہ معلوم ہو گا کہ بگولہ کو حرکت کس نے دی؟ اس میں حرکت کیوں کر پیدا ہوئی۔ اُس میں سے سورج اور دیگر ستارے نکلے۔ اور سورج میں سے زمین نکلی۔ جب ٹھنڈی ہونی شروع ہوئی تو وہ پانی کی صورت میں ہو گئی۔ گویا زمین ایک پانی کا کرہ بن گیا۔ اُس میں مزید سردی آنے کی وجہ سے وہ منجمد حالت میں ہوتی گئی۔ (۱۰۲ الف)

ایک مشہور عالم علمِ ہیئت اور طبیعیات کی رائے ملاحظہ ہو: (۱۰۳)

ترجمہ:۔ (۱) ہمارا قیاس ہے کہ کائنات کی فضا میں پہلے ہوائی مادہ (گیس) بھرا ہوا تھا اور جب وہ گیس ذرا انجماد کے درجہ پر آئی تو ستارے بنگئے اسکے بعد وہ رفتہ رفتہ سکڑے اور پھر سیال پانی کی صورت میں ہو گئے اور درجۂ انجماد بڑھا تو منجمد ہو گئے۔ یہاں تک کہ اُنھوں نے موجودہ صورت و حالت اختیار کی۔

فضا میں ہمارا گھر (ہماری زمین) ابتداء میں ہوائی مادہ کی صورت میں تھا۔ اس کے بعد پہلے تو وہ سب پانی پانی ہو گیا۔ پھر کسی حد تک نرم منجمد۔ آخر کار اُس کا اوپر کا چھلکا یعنی اوپر کی تہ بالکل منجمد ہو گئی اور چٹانیں، پہاڑ وغیرہ اُسی طرح منجمد

(102a) The Universe Around Us. pp. 10, 248 250, 258.
(103) The Universe Around Us, P. 258.

ہو گئے جیسے وہ پہلے نرم و گداز حالت میں تھے ...... رفتہ رفتہ زمین کی ایسی حالت ہو گئی جس میں زندگی ہو سکتی تھی۔ آخر کار زندگی بھی پیدا ہو گئی لیکن ہمیں نہیں معلوم کیونکر ہوئی۔ کہاں سے آئی۔ اور کس طرح آئی (۹۶)۔ (اصل ضمیمہ ۱۵)

علم ہیئت کے یہ انکشافات اس آخری صدی کے ہیں۔ اس سے پہلے تو عجیب عجیب جاہلانہ نظریات تھے جو اب ترک کر دیئے گئے ہیں۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ یہ آخری نظریہ صحیح ہی ہوگا۔ کیونکہ اب سے تقریباً ۱۳۰۰ برس پہلے جناب علی مرتضےٰ نے جو تخلیق عالم کی حالت بتائی ہے وہ اس کی تائید کرتی ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔

ثُمَّ أَنْشَأَ سُبْحَانَهُ فَتْقَ الْأَجْوَاءِ، وَشَقَّ الْأَرْجَاءِ، وَسَكَائِكَ الْهَوَاءِ، فَأَجْرَى فِيهَا مَاءً مُتَلَاطِماً تَيَّارُهُ، مُتَرَاكِماً زَخَّارُهُ، حَمَلَهُ عَلَى مَتْنِ الرِّيحِ الْعَاصِفَةِ، وَالزَّعْزَعِ الْقَاصِفَةِ، فَأَمَرَهَا بِرَدِّهِ، وَسَلَّطَهَا عَلَى شَدِّهِ، وَقَرَنَهَا إِلَى حَدِّهِ، الْهَوَاءُ مِنْ تَحْتِهَا فَتِيقٌ، وَالْمَاءُ مِنْ فَوْقِهَا دَفِيقٌ۔ ثُمَّ أَنْشَأَ سُبْحَانَهُ رِيحاً اعْتَقَمَ مَهَبَّهَا، وَأَدَامَ مُرَبَّهَا، وَأَعْصَفَ مَجْرَاهَا، وَأَبْعَدَ مَنْشَأَهَا بِتَصْفِيقِ الْمَاءِ الزَّخَّارِ، وَإِثَارَةِ مَوْجِ الْبِحَارِ، فَمَخَضَتْهُ مَخْضَ السِّقَاءِ، وَعَصَفَتْ بِهِ عَصْفَهَا بِالْفَضَاءِ، تَرُدُّ أَوَّلَهُ إِلَى آخِرِهِ، وَسَاجِيَهُ إِلَى مَائِرِهِ۔ حَتَّى عَبَّ عُبَابُهُ، وَرَمَى بِالزَّبَدِ رُكَامُهُ، فَرَفَعَهُ فِي هَوَاءٍ مُنْفَتِقٍ، وَجَوٍّ مُنْفَهِقٍ، فَسَوَّى مِنْهُ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ، جَعَلَ سُفْلَاهُنَّ مَوْجاً مَكْفُوفاً، وَعُلْيَاهُنَّ سَقْفاً مَحْفُوظاً، وَسَمْكاً مَرْفُوعاً، بِغَيْرِ عَمَدٍ يَدْعَمُهَا، وَلَا دِسَارٍ يَنْظِمُهَا، ثُمَّ زَيَّنَهَا بِزِينَةِ الْكَوَاكِبِ، وَضِيَاءِ الثَّوَاقِبِ، وَأَجْرَى فِيهَا سِرَاجاً مُسْتَطِيراً، وَقَمَراً مُنِيراً، فِي فَلَكٍ دَائِرٍ، وَسَقْفٍ سَائِرٍ، وَرَقِيمٍ مَائِرٍ۔

ترجمہ:۔ پھر خداوند تعالےٰ نے پیدا شدہ فضا میں شگاف دیا۔ اور کنارے نکالے۔ اور ہوائے عالیہ کو پیدا کیا۔ اور اُن میں نہایت شدید امواج والا پانی چلایا جس کی موجیں عظیم اور تہ بہ تہ تھیں۔ اور وہ پانی تیز و تند ہوا کے اوپر تھا۔ پھر ہوا کو حکم دیا کہ

(96) The Truth shal make You Free, published by WatchTower Bible and Tract Society pp. 150-52.

اس پانی کو قائم رکھے اور اُس کے کناروں پر اُس ہوا کو مسلط کر دیا۔ اور اس ہی ہوا سے پانی کی حد بندی کر دی۔ اُس پانی کے نیچے ہوا پھیلی ہوئی تھی۔ اور اُس کے اوپر پانی اُچھل رہا تھا۔ پھر خداوند تعالےٰ نے ایسی ہوا چلائی جو عقیم تھی۔ اُس کے رفتار بہت تیز تھی اُس عقیم ہوا کو حکم دیا کہ پانی کو حرکت دیتی رہے اور موجوں کو اُبھار کر اوپر کی طرف پھینک دے پس اس ہوا نے اس پانی کو اس طرح چھلکایا جس طرح دہی کو بلوتے ہیں۔ یہ ہوا فضاء میں بڑی تیزی کے ساتھ رواں ہو گئی اور پانی کے نچلے حصہ کو اوپر کی طرف پلٹانے لگی۔ اور ساکن کو متحرک سے پیوستہ کرنے لگی۔ یہاں تک کہ پانی کی چوٹی بلند ہو گئی اور تہ بر تہ پانی پر جھاگ آئے۔ پھر اُس پانی کو شگاف دی ہوئی اور وسیع فضا میں بلند کیا۔ جس سے سات آسمان بنائے۔ آسمان زیریں کو ایک جمی ہوئی اور رُکی ہوئی موج قرار دیا اور آسمان بالا کو ایک محفوظ چھت اور بناء مرفوع قرار دیا۔ آسمان (اجرام فلکی) کو بغیر کسی ستون کے روک کے رکھا۔ بغیر میخ کے اپنی جگہ پر قائم رکھا۔ پھر خدائے بزرگ و برتر نے اُن آسمان کو چمکتے ہوئے ستاروں اور دمکتے ہوئے ستاروں سے مزین کیا۔ اور اس میں چراغ نور افشاں (سورج) اور ماہ درخشاں کو رواں دواں کیا۔ اور یہ ساری چیزیں گھومتے ہوئے آسمان، رواں چھت اور لوح متحرک میں تھیں۔ (ختم ہوا ترجمہ)

یہ تو لفظی ترجمہ ہوا۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ اکثر مترجمین نے اس کا صحیح ترجمہ نہیں کیا۔ مثلاً شروع کے جملہ کا ترجمہ سید رئیس احمد صاحب جعفری نے اپنے حال کے طبع شدہ کتاب میں اس طرح کیا ہے "پھر خدائی بزرگ و برتر نے زمین و آسمان کے درمیان شگاف دیا اور جو (فضا) پیدا کی" حالانکہ ابھی زمین و سماوات کی تخلیق کا ذکر نہیں ہوا۔ یہ اُس سے پہلے کی بات ہے۔ کس طرح زمین و آسمان پیدا ہوئے یہ اُس کے بعد بیان کیا گیا ہے۔ ترجمہ میں آگے چل کر بھی چند ایسے ہی الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جو جناب امیر علیہ السلام کے مفہوم کو اچھی طرح ادا نہیں کرتے۔ صفحہ ۹۲ کے نوٹ میں فاضل مترجم فرماتے ہیں کہ "پانی کو گرنے سے روکے رہنے کا ہوا کو حکم دیا اس لئے کہ پانی ثقیل ہے اور ثقیل چیز بغیر ٹھہراؤ کے ہمیشہ نیچے گرتی ہے" حالانکہ فضا میں بوجہ ثقل کے اوپر سے نیچے گرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جناب امیر کا مفہوم

ہے کہ پانی کو فضا میں پھیل کر منتشر ہو جانے سے روکے رہے - یہ ترجمہ اس جملہ کا ہے:-
" ناصرها بردها " جس کے معنی اوپر سے نیچے گرنے کے لئے گئے ہیں رد کے معنی منتہی الارب میں اس طرح لکھتے ہیں:- بالفتح دگر فتگی زبان یقال فی لسانہ رُدُّاہی حلستہ جس کے معنی رُکنے کے ہیں - مطلب یہ ہی ہے کہ پھیلنے نہ دے - علم طبیعیات و ہیئت کا یہ بڑا مسئلہ ہے کہ سورج یا دیگر ستاروں کے کنارے کیوں کر رُکے ہوتے ہیں - حالانکہ اُن کا پھیل کر ہوا میں منتشر ہو جانا اغلب تھا - ان اجرام کا جسم ہوائی یعنی Gaseous: بیان کیا جاتا ہے - اور گیس کا خاصہ پھیلنا ہے - جناب امیر کا اس کے بعد ہی کا جملہ ان معانی کو صاف کر دیتا ہے - وسلطها علی شدها یعنی پانی کے کناروں پر اُس ہوا کو مسلط کر دیا -

اس خطبہ کو اگر سائنس کی زبان میں بیان کریں گے تو اس طرح کہیں گے:- ہوائی فضا پھٹنی شروع ہوئی اور اُس میں متلاطم پانی جاری ہو گیا (Gas کی حالت سے liquify: ہونا شروع ہوا) اور نہایت تیز و تند و زبردست ہوا چلی جس نے اس پانی کو فضا میں پھیلنے سے روکا - اور اس کی حدوں کو قائم رکھا - اس کے بعد پھر سخت ہوا چلی - جس نے پانی کو نیچے اوپر تہ و بالا کرنا شروع کر دیا اور وہ پانی مکھن کی طرح بلو یا گیا - اس سے بہت بڑے بڑے جھاگ پیدا ہوئے - اور وہ منجمد ہوتے گئے - اور زمین و اجرام فلکی اپنی موجودہ صورت میں آنے لگے -

اب وہ انگریزی کی عبارت ملاحظہ ہو جو ہم نے اوپر نقل کی ہے کس طرح ایک دوسرے میں مطابقت ہے - بلکہ جو انگریزی کی عبارت میں کمی ہے اُس کو جناب امیر کا خطبہ پورا کرتا ہے - انگریزی کی عبارت میں یہ تو درج ہے کہ پہلے گیس تھی - پھر وہ رقیق یعنی LIQUIFIED ہوئی اور پھر منجمد یعنی Solidified ہوئی - لیکن یہ نہیں بتایا کہ جب وہ رقیق تھی - اُس وقت کس چیز نے اُس پانی کو فضا میں پھیلنے سے روکا - حالانکہ یہ بہت بڑا مسئلہ تھا - جناب امیر نے بتا دیا کہ تیز و تند ہوا نے اُس کے کناروں کو روکے رکھا - اہل سائنس کی تحقیقات اس امر پر ابھی صاف نہیں ہے - ان کو ابھی یہ یقین نہیں کہ اُس فضا میں ہوا تھی - وہ یہ نہیں کہتے کہ ہوا تھی اور یہ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ہوا نہیں تھی - لہذا خاموش ہیں - اگر وہ یہ کہہ دیں کہ ہوا تھی تو اور مشکلات میں

پھنس جائیں، یہ چیز کہاں سے آئی۔ کیونکر پیدا ہوئی۔ کس نے چلائی۔ ان سوالات کا وہ جواب نہیں دے سکتے۔ لہذا خاموش ہیں۔

کیا تخلیق ارض و سماوات کا بیان امام کی زبان سے ساتویں صدی عیسوی میں معجزہ نہیں ہے۔

یہ تو بات میں بات نکل آئی ہم عجائبات سموات کا ذکر کر رہے تھے۔ جیسا ہمارا عالم ہے ایسے ایک کے بعد ایک کئی عالم ہیں جن کا کوئی ستارا کسی دوربین سے کہیں نظر نہیں آتا۔ اُن کی موجودگی کا علم فقط اُن نور کی شعاعوں یا لہروں ; Radio Rays سے ہوتا ہے۔ جن کا اثر آلہ مقیاس الشعاع پر ہوتا ہے۔ ہمارے عالم کو انگریزی میں علم ہیئت میں ;Milky Way ;Galaxy کہتے ہیں۔ یہ جو آسمان پر کہکشاں نظر آتا ہے یہ اُس عالم کا محض ایک کنارہ ہے۔ اس کہکشاں میں ہمارے اس سورج کی طرح جو نظر آتا ہے ایسے ۴۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ سورج ہیں۔ اور ہمارا یہ عالم ایک گاڑی کے پہیئے کی طرح گردش کر رہا ہے اس پہیئے کا قطر ۱۰۰،۰۰۰ روشنی کے سالوں کی مسافت کے برابر ہے روشنی ایک سکنڈ میں ۱۸۶،۰۰۰ (ایک لاکھ چھیاسی ہزار) میل کی رفتار سے چلتی ہے۔ ایک گھنٹے میں کتنے سکنڈ ہوئے۔ اُن سب کو ۱۸۶،۰۰۰ میں ضرب دو جو حاصل ضرب ہوگا وہ ہی روشنی کے ایک سال کی مسافت ہے۔ وہ ریاضی دانوں نے معلوم کی ہے۔ وہ ۵،۸۸۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ میل ہے۔ اس پہیئے کے دھرے میں سورج ۱۵۰ میل فی سکنڈ کے حساب سے چکر لگا رہا ہے یا یوں سمجھو کہ ایک دن میں ۱۳،۰۰۰،۰۰۰ میل سفر طے کر لیتا ہے۔ لیکن پورا چکر طے کرنے میں اسکو ۲۰۰،۰۰۰،۰۰۰ سال لگتے ہیں۔ اس کو ایک Cosmic year کہتے ہیں۔ اس فضا کی وسعت کو تو دیکھو یہ پورا پہیہ جس میں ۴۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ سورج ہیں سب مل کر پوری فضا کا صرف اس قدر حصہ لیتے ہیں جتنا ہماری زمین سے چاند اپنی ہلالی صورت میں نظر آتا ہے۔ ایک بالشت بھر یا کچھ زیادہ۔ تو وہ فضا کتنی وسیع ہوئی۔ صرف ہمارے عالم کی وسعت اتنی ہے کہ روشنی کی شعاع جو زمین سے چل کر اس عالم کے گرد چکر لگائے تو اُسے چکر لگانے میں ۳۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ سال لگیں گے۔ ایک سال میں روشنی کی شعاع ۵،۸۸۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ میل طے کرتی ہے۔ تو ان تین کھرب سالوں میں وہ کتنے میل

چلے گی۔

ہمارے اس عالم Galsotic System کے علاوہ بہت سے عالم ہیں۔ جن کی موجودگی کا علم ہو چکا ہے۔ اور اُن کے آگے اور عالم ہوں گے جن کا علم نہیں ہوا۔ (۱۰۵)

ہمارے عالم سے نزدیک ترین عالم یہاں سے ۰۰۰ر۱۸ روشنی کے سالوں کی مسافت پر ہے۔ ہم سے نزدیک ترین ستارہ ہمارے ہی عالم میں اس دنیا سے ۴½ روشنی کے سالوں کی مسافت پر ہے۔ معمولی جسم کا ستارہ ہمارے زمین سے ۰۰۰۰۰۱ اگنا زیادہ بڑا ہے اور پھر یہ تو محض اوسط درجے کے ستاروں کا حال ہے۔ بہت سے ستارے ایسے ہیں جو ان سے بھی ۰۰۰۰۰۰ اگنے زیادہ بڑے ہیں۔ سب سے طاقتور دوربین جو ۱۰۰ انچ قطر کا کیلی فورنیا میں (Mount Wilson:) پر ہے ۰۰۰ر۰۰۰ر۱۵۰۰ ستاروں کا فوٹوگراف لیا جا چکا ہے۔ اب ۲۰۰ انچ قطر کا دوربین بنایا جا رہا ہے۔ اُس سے اور زیادہ ستارے شمار ہو سکیں گے۔ اور یہ تو ہمارے عالم کی حالت ہے۔ اور عالموں کے اور ستارے ہیں۔

بہت سے ستارے ایسے ہیں جن کے جسم ووزن و روشنی و گرمی کا خیال کرنا بھی مشکل ہے۔ وہ SUPER GIANTS اور GIANTS کہلاتے ہیں۔ ان بڑے ستاروں میں سے ایک ستارہ ALPHA ہے۔ جو روشنی میں بھی بہت زیادہ ہے۔ اس کا قطر ۰۰۰۰۰۰ر ۴۰۰۰۰۰۰ میل ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ ہمارے جیسے ۰۰۰۰۰۰ر۴ سورج اُس میں آسانی سے سما سکتے ہیں اور پھر جگہ خالی رہے۔ اور بعضے بہت چھوٹے ستارے ہیں۔ ایک ستارہ S DORADUS بہت زیادہ روشنی والا ستارہ ہے۔ اُس کی گرمی اور روشنی ہمارے سورج کی گرمی اور روشنی سے ۰۰۰۰۰۰ر ۴ گنی زیادہ ہے۔ اگر کبھی ہمارے زمین اُس کے نزدیک اتنی آجائے جتنی وہ سورج کے نزدیک ہے تو صرف آنکھ جھپکنے میں ہم سب معہ زمین کے جل کر خاکستر ہو جائیں۔ سورج ہمارے زمین سے ۰۰۰۰۰۰ر۹ میل دور ہے۔

ان ستاروں کی روشنی کے رنگوں سے ان کی گرمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ گرم وہ ہیں جن کی روشنی نیلی (Violet) رنگ کی ہے اُس کے

(105) J. Robinson: The Universe pp. 45, 46.

بعد سفید رنگ کی روشنی والے گرمی میں تیز ہیں۔ اُن کے بعد زرد رنگ کی روشنی والے ہیں جیسا ہمارا سورج ہے۔ پھر نارنگی رنگ والے اور سب سے آخر میں سرخ رنگ کی روشنی والے ستارے ہیں۔

ان میں ایسے بھی ستارے ہیں جو یک لخت روشنی میں تیز ہو جاتے ہیں اور پھر کچھ دنوں کے بعد مدھم ہو جاتے ہیں۔ ان کو Novae کہتے ہیں۔ ان میں سے ایک Nova; دیکھا گیا کہ یک لخت چند دنوں میں اُس کی روشنی ۸۰۰۰ گنی ہو گئی۔ آلہ مقیاس الالوان (SPECTROSCOPE) سے دیکھا گیا کہ اس میں سے جلتی ہوئی ہائیڈروجن کے گولے، یا بمب ۱۰۰۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ہماری زمین تک آ رہی ہیں۔ معمولی Nova; سورج کی روشنی اور گرمی سے ۵۰۰۰۰ گنی زیادہ روشنی اور گرمی دیتا ہے۔ بعض اُن سے بھی بڑے ہیں۔ جن کی روشنی ان سے بھی ۱۰۰۰ گنی زیادہ ہوتی ہے۔ لیکن ایسے Novae غالباً صرف ۱۲ ہی ہیں۔ یہ تو آ جان کے ایٹم بمب ہیں۔ عالمان علم ہئیت کو ابھی تک یہ نہیں معلوم ہو سکا ہے کہ کس وجہ سے یہ فوراً تیز ہو جاتے ہیں اور وہ جلانے والا ایندھن کہاں سے آتا ہے۔

ایک اور قسم کے ستارے ہیں جن کو (Nebulae;) کہتے ہیں۔ یہ لاطینی لفظ ہے۔ اور Nebula; کے معنی بادل یا دخان کے ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ اوپر سے تو یہ بہت روشن اور گرم ہیں لیکن اندر سے بالکل خالی ہوتے ہیں۔ ان کی روشنی اتنی تیز ہوتی ہے کہ ساٹھ ہزار روشنی کے سالوں کی مسافت سے نظر آ جاتی ہے۔ ان کے اندر کی حالت دوزخ کا نمونہ ہے۔ جوزا کے جھمکے (Orion) (Constellation; میں ایک Nebula; ہے۔ جس کا قطر روشنی کے ۱۲ سالوں کی مسافت کے برابر ہے۔ اور ہم سے ۱۰۰۰ روشنی کے سالوں کی مسافت سے دور ہے۔ اُس کے اندر کی حالت یہ بیان کی گئی ہے۔ اس کا منہ ایک بہت بڑا غار ہے۔ جس میں ہر قسم کی رنگوں کی روشنی نظر آتی ہے۔ اس کے اندر آگ کے ستون، دیواریں، عمود، اندر کے درجوں کا چہرہ یا رُخ، فصیلیں، چھتوں سے سیپ کی شکل کے رسنے والے لٹکتے ہوئے عمود عجیب ہیبتناک نظارہ پیش کرتے ہیں۔

جیسا ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ ہمارے عالم Galaxy کے علاوہ اور بہت سے عالم ہیں اور پھر کئی عالموں کے مجموعے بھی ہیں۔ ایک مصنف لکھتا ہے:۔

ترجمہ:۔ ان سب مختلف قسم کے عظیم الجثہ دخانی اجرام کو کہکشانی کہتے ہیں کیونکہ وہ ہمارے ستاروں کے کہکشانی نظام کے اندر ہیں۔ لیکن اب ہم بڑے چکر دار عظیم الجثہ دخانی اجرام کا ذکر کرتے ہیں جو کئی وجوہات سے ایک ہی قسم کے ہیں۔ یہ کائناتوں کے جزائر ہیں۔ یہ ہماری طرح کی کئی کہکشائیں ہیں لیکن ہماری کہکشاں سے باہر اور اُس سے بالکل علیحدہ۔ لیکن بہت دور ہماری کہکشاں سے بھی اور ایک دوسرے سے بھی۔ ان میں سے جو ہم سے نزدیک ترین ہے وہ بھی ہم سے تقریباً دس لاکھ روشنی کے سالوں کی مسافت سے دور ہے۔ اور ان کا آپس کا بعد اوسط تقریباً بیس لاکھ سالوں کی مسافت ہے۔ علم ہیئت نے یہ تو عرصہ سے بتادیا تھا کہ ہماری زمین کی طرح اور بھی دنیائیں ہیں۔ لیکن اب تقریباً پچیس سال ہوئے کہ یک صد انچ کے دوربین نے ہمیں یہ عجیب و غریب لیکن یقینی خبر دے کر کہ ہماری کائنات کے علاوہ اور بھی کئی کائناتیں ہیں ایک نہایت ہنگامہ خیز زمانہ کی ابتدا کی ہے۔۔

...ستاروں کے یہ گول جھرمٹ جو سورج سے کروڑوں گنی زیادہ گرمی اور روشنی دے رہے ہیں، کارخانہ قدرت کے عجائبات ہیں جیسا ہم پہلے ہی بیان کر چکے ہیں۔ لیکن یہ تو ان کائناتوں کے جھرمٹوں کے آگے کچھ بھی نہیں جن کی موجودگی اب معلوم ہوئی ہے۔ اُن میں سے چند تو ایسے ہیں، کہ جن میں ہزاروں ایسے ستاروں کے گول جھرمٹ ہیں.....

یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ہمارا یہ عظیم الشان کہکشانی نظام بھی ایسے کہکشانی جھرمٹ کے نظاموں یا سلسلوں میں سے ایک نظام ہے۔ غالباً یہ ہمارا کہکشانی نظام سنبلہ جھرمٹ میں ہے۔ اس کی وسعت ستر لاکھ روشنی کے سالوں کی مسافت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کائناتوں کا جھرمٹ ستر لاکھ روشنی کے سالوں کی مسافت کے برابر طویل ہے۔ ذرا خیال تو کرو۔ ایک ایک کائنات ایک دوسرے سے دس لاکھ یا زیادہ روشنی کے سالوں کی مسافت پر دور ہیں اور پھر ایک ہی جماعت کے ممبر ہیں۔ اس سے تمہیں ذرا آسمانوں (فضا) کی وسعت اور عظمت کا اندازہ ہوگا جو خداوند تعالیٰ کی جلالت و

حکمت اور قدرت کی گواہی دے رہے ہیں۔ صرف ستارے ہی نہیں بلکہ یہ ستاروں کی دنیائیں ایک دوسرے کے پیچھے چلی گئی ہیں، یہاں تک کہ نظر کی پہنچ سے باہر ہو جاتی ہیں اور ابھی خاتمہ نہیں ہوتا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک چکردار نظام دوسرے اور بڑے چکردار نظام کا حصہ ہو اور پھر وہ خود بھی کسی اور بڑے نظام کا حصہ اور اسی طرح یہ لاانتہا ہی سلسلہ جاری ہو۔ (ختم ہوا ترجمہ) اصل ضمیمہ ۱۶

خداوند تعالیٰ کی جلالت، قدرت، عظمت اور حکمت کا اندازہ کیا۔ اہلِ سائنس بھی قائل ہو گئے اور خدا خدا کرنے لگے۔

سورج کی روشنی اور گرمی کا ذکر آیا ہے۔ سورج کے اندر کی گرمی ۴۰,۰۰۰,۰۰۰ یعنی چار کروڑ فیرن ہائٹ تھرمامیٹر کی ڈگری کے برابر ہوتی ہے۔ گویا ابلتے ہوئے پانی سے ایک لاکھ اسی ہزار گنا زیادہ۔

سورج زمین سے تین لاکھ تیس ہزار گنا زیادہ بوجھل ہے۔ وہ ساری روشنی جو سورج سے نکلتی ہے زمین کو اس میں سے صرف $\frac{1}{۲,۰۰۰,۰۰۰,۰۰۰}$ حصہ ملتا ہے۔ اور اس میں سے بھی آدھی بغیر اپنا اثر کئے ہوئے واپس فضا میں چلی جاتی ہے۔
ایک سائنس داں نے کہا ہے کہ اگر تمام دنیا کا سارا کوئلہ ایک ایک ٹکڑا کر کے ایک جگہ جمع کیا جائے اور پھر جلا کر روشن کیا جائے تو وہ ساری گرمی صرف سورج کی اس گرمی کا دسواں حصہ ہو گی جو وہ ایک سکنڈ میں خارج کرتا ہے۔

سورج کی اندرونی حالت بھی سنئے۔ اس کے اندر کی آگ کے بھڑکنے کے دھماکے ہر وقت ہوتے رہتے ہیں۔ اور اندر کی جلتی ہوئی گیس کو اتنا اونچا پھینک دیتے ہیں جتنا کہ چاند کا فاصلہ زمین سے ہے اور فی سکنڈ ۱۰۰ میل کی رفتار سے اٹھتے ہیں۔ ایک دفعہ ہائیڈروجن کا جلتا ہوا ستون ستر ہزار میل اونچا دیکھا گیا ہے۔ اسکی قیامت خیز، ہولناک آواز سے ہم کو خدا نے اس طرح بچایا ہوا ہے کہ درمیانی فضا میں ہوا نہیں ہے اور ہوا نہ ہونے کی وجہ سے آواز ہم تک نہیں آسکتی۔ اہلِ سائنس کو یقیناً نہیں معلوم کہ ہوا ہے یا نہیں۔ لیکن چونکہ وہاں کی آواز نہیں آتی لہٰذا انھوں نے نتیجہ نکالا کہ ہوا نہیں ہے۔ لیکن روشنی بھی تو ہوا ہی کی مدد سے چلتی ہے۔ اور روشنی وہاں سے آتی ہے ۔ تو روشنی کا وسیلہ ہوا کے علاوہ کچھ اور

ہوگا۔ ایتھر ETHER کا نظریہ تو اب غلط ثابت ہوگیا ہے۔

چند امور اور غور طلب ہیں۔ سورج کے ایندھن کا خرچ ہر منٹ میں ۲۵۰۰۰۰۰۰۰ پچیس کروڑ ٹن ہے اور یہ ایندھن اندر ہی سے آتا ہے۔ باہر سے نہیں آتا۔ غور تو کرو یہ کیونکر پیدا ہوتا ہے۔ اندر اس کی فیکٹری ہوسکتی ہے۔ سورج کی نسبت کہا جاتا ہے کہ کھربوں کھربوں سال سے ہے۔ اتنے سال فی منٹ پچیس کروڑ ٹن کے حساب سے یہ ایندھن خرچ ہو رہا ہے۔ اندر سے کیونکر پیدا ہوتا ہے اہلِ سائنس کو اس کا علم نہیں ہے۔

روشن گرم جسم سکڑتا رہتا ہے۔ کیونکہ اس میں سے گرمی اور روشنی نکلتی رہتی ہے اب سائنس کی دریافت یہ ہے کہ روشنی اور گرمی میں بھی وزن ہوتا ہے۔ سورج کا جسم ہر منٹ پچیس کروڑ ٹن کے حساب سے سکڑ رہا ہے۔ یہ کمی کیوں کر پوری ہو رہی ہے۔ پوری ہو بھی رہی ہے یا نہیں، اہل سائنس نہیں جانتے صرف قیاسات کرتے ہیں۔ (۱۰۶ا)

یہ آسمانی آگ جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں مختلف ہے اس آگ سے جو ہم دنیا میں جلاتے ہیں۔ آسمانی آگ تو ایسی ہے کہ جس سے زندگی کو مدد ملتی ہے۔ ممکن ہے کہ جب سائنس آگے ترقی کرے تو جہنم کی اس خاصیت کا قائل ہو جائے کہ لایموت فیھا ولا یحییٰ۔

سائنس کی زمانہ حال کی دریافت یہ ہے کہ تمام عالمین صرف روشنی یا نور ہیں مادہ کیا ہے؟ صرف منجمد ٹھوس کی ہوئی روشنی ہے۔ اب فقرہ نور السمٰوٰت والارض کے معنی سمجھ میں آجائیں گے۔

ایک بہت بڑا سائنس داں لکھتا ہے (یہ اس کی انگریزی کا لفظی ترجمہ ہے۔)

"سورج اور ستارے محض نار، طوفان اور دھماکوں کے دوزخ بڑے پیمانہ پر ہیں۔ بیسویں صدی کی بڑے انکشافات میں سے یہ انکشاف ہے کہ عالم کے مادی حصہ کا نوے فیصدی ایک کروڑ سے زیادہ درجے کا گرم ہے۔ دوسرے بڑی دریافت یہ ہے کہ یہ مادی حصہ تمام عالم کا صرف ایک فیصدی سے بھی کم ہے۔ باقی تمام خلا ہے تیسری

(۱۰۶ا) (106a) The Universe Around Us, pp. 157, 159, 160.
The Universe pp. 102, 103.

دریافت یہ ہے کہ ہمارے سورج کی طرح کے نظامِ شمسی کائنات میں شاذ و نادر ہی ہیں"(۱۰۷)
یہ بھی دریافت ہوا ہے کہ تمام کائنات اور کائناتوں میں صرف ہماری زمین ہی ایسی ہے کہ جس پر زندگی ہے۔ اور انسان جیسی آبادی ہے۔ اور کہیں زندگی نہیں پائی جاتی۔ اب تو انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کا ثبوت مل گیا۔ (۱۰۸)

تمام کائنات میں ایک ہی قسم کے MATERIAL ہیں یعنی سونا، چاندی، ہلیم، لوہا، تانبا جست وغیرہ۔ (۱۰۹) تمام ستاروں و سیاروں کی ایک ہی رفتار ہے (۱۱۰) ایک ہی قانون کشش سب پر حاوی ہے۔ نظامِ شمسی کتنا بڑا ہے۔ بالکل ویسا ہی نظام ہم کو ایٹم میں ملتا ہے۔ ایک ہی قسم کے قوانین زندگی پر حاوی ہیں۔ آخر کار اہلِ سائنس یہ کہنے پر مجبور ہو گئے ہیں کہ تمام کائناتوں کا بنانے والا ایک ہی ہے۔ (۱۱۱)۔ اب بھی خداوند تعالیٰ کی وحدانیت اور قدرت میں کچھ شک رہا۔ اہلِ دہریت کہاں ہیں۔ ہم ان سے پوچھیں کہ کیا یہ سب کچھ خود بخود، اندھا دھند پیدا ہوا ہے۔ اب تو اہلِ سائنس خدا کی قدرت کے آگے اپنی بے بسی کے مقر ہو گئے ہیں۔ (۱۱۲)

جب سے نظامِ شمسی وجود میں آیا ہے جس کو کروڑہا سال ہو گئے اب تک وہ تقریباً بیالیس ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آگے چل رہا ہے۔ اتنی کائناتیں، اتنے ستارے، اتنے سیارے۔ لیکن پھر آپس میں تصادم نہیں ہوتا۔ فضا جس میں یہ چل رہے ہیں اور جس فاصلے سے چل رہے ہیں اُس سے یہ تصادم ناممکن ہے۔ (۱۱۳)

یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ تمام کائنات پھیل رہی ہے۔ اس پھیلاؤ کی رفتار ۱۰۵ میل فی سکنڈ ہے۔ تمام کائنات ......۱۹۳۴۰ سالوں میں ڈبل ہو جائے گی۔ اور ......۳۴ سالوں میں آٹھ گنی ہو جائے گی۔ (۱۱۴) کہتے ہیں کہ کائنات کی زندگی

(107) The Universe, pp. 106-7 ;

(108) The Universe p. 108.

(109) The Universe, p. 47; The Universe Around Us, pp. 34, .03.

(110) The Universe, Around Us, p. 31.

(106a) The Universe Around Us, pp. 157, 159, 160.

The Universe pp. 102, 103.

(111) The Universe Around Us, P. 219.

کا تو کوئی اندازہ ہی نہیں ۔ کھربوں سال سے ہے ۔ پہلے کتنی چھوٹی اور گنجان ہو گی جو اتنے سالوں میں رفتار مندرجہ بالا کی شرح سے پھیلتے پھیلتے اب اتنی ہو گئی ہے ۔ خدا کی قدرت کا کچھ ٹھکانا ہے ۔ اتنے سے ایٹم سے ساری کائنات بنائی ہے ۔ اور ایٹم میں وہ ہی نظام رکھا ہے جو ساری کائنات کا ہے ۔ اور پھر دہریوں کو شیطان نے یہ کہنے پر آمادہ کر دیا ہے کہ خدا نہیں ہے ۔

ان تمام ستاروں سے جو بڑے سے بڑے دوربین سے نظر نہیں آتے اور جن کی محض روشنی پہنچتی ہے ہماری زمین پر Radiation: اور Cosmic Rays: کا اثر پڑ رہا ہے جس اثر کی وجہ سے ضمنی دھاتیں بنتی ہیں اور اُس ہی اثر کی وجہ سے ایک دھات دوسری دھات میں منتقل ہو سکتی ہے ۔ یہاں تک کہ اگر انسان اُن کے خاص اثر میں خاص وقت پر خاص زاویہ سے آجاوے تو اُس کی جنس تبدیل ہو جاتی ہے ۔ مرد سے عورت اور عورت سے مرد بن جاتا ہے ۔ اور آج کل اس طرح کی تبدیلی جنس کے نظائر سامنے آرہے ہیں ۔ دیکھو ۔ (۱۱۵)

زمین اپنی ساری ہوا کے ساتھ گردش کر رہی ہے ۔ اس کی ہوا تمام فضا میں کیوں نہیں پھیل جاتی ۔ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ زمین کی کشش اُس کو اپنی طرف روکے رکھتی ہے اہل سائنس کہتے ہیں کہ یہ تمام نظام قانون کشش ثقل پر مبنی ہے ۔ اگر یہ کشش نہ رہے تو تمام عالم درہم برہم ہو جائے ۔ ممکن ہے یہ درست ہو ۔ چند سوالات پیدا ہوتے ہیں ۔ اس کشش کا یہ اصول ہے کہ اُس کی طاقت یعنی رفتار ان اجرام کے حجم وزن اور درمیانی فاصلہ پر مبنی ہوتی ہے یعنی فاصلہ کم ہے تو کشش کی قوت زیادہ ہو گی ۔ اور جسم وزن جس جرم کا زیادہ ہو گا اُس میں کشش کی طاقت زیادہ ہو گی ۔ یہ امر بھی مسلمہ ہے کہ سب ستارے و سیارے و نظام شمسی اپنے اپنے مقررہ راستوں پر چل رہے ہیں ۔ ادھر سے ادھر نہیں ہٹ سکتے ۔ یہ بھی ثابت ہو گیا ہے کہ سورج و ستاروں و زمین کا جسم ہر لحظہ کم ہو رہا ہے ۔ ستارے بھی کم نہیں کروڑوں میل ایک دوسرے کی کشش اثر انداز ہو رہی ہے ۔ یہ بھی ثابت ہو گیا ہے کہ ان سب کی رفتار ایک سی ہے ۔ اندریں حالات رفتار کی یکساں شرح قائم رہنا اور پھر ہمیشہ مقررہ راستوں پر چلنا ، اِدھر سے اُدھر نہ ہونا ، صرف کششِ ثقل اس کا موجب نہیں معلوم ہوتا ۔

ہم تو یہی کہتے ہیں کہ صرف حکم خدا ہی پر یہ سب امور مبنی ہیں۔ بہر صورت کشش ثقل کی توضیح کے لئے یہ جگہ موزوں نہیں ہے۔ اس کے لیئے علٰحدہ رسالہ چاہیئے۔ اگر کشش ثقل بھی اس کا موجب ہے تو ان اجرام فلکی میں کشش ثقل کی خاصیت پیدا کرنا اور پھر اُس کشش ثقل کو اس طرح ترتیب دینا محض مادہ کا اپنا کام نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ذہن عقل و حکمت و قدرت چاہیئے جو بے جان مادہ میں نہیں ہے۔

جن لوگوں کو علم طبیعیات اور علم ہیئت کے عجائبات معلوم کرنے کا شوق ہے اُن کو ہم صلاح دیتے ہیں کہ مندرجہ ذیل ابتدائی کتابوں کا مطالعہ کریں۔

Sir Jamss Jeans : The Universe Around Us ;
The Mysterious Universe ;
The New Background of Science ;
Sir Arthur Eddington : The Nature of the Physical World ;
Science and the Unseen World ;
J. Robinson.........The Universe ,
H. Macpherson :...The Romauce of Modern Astronomy.
Scientific Thought in the Twentieth Century ;
New Handbook of the Heavens ;
The Golden Book cf knowledge.

ہمارے ناظرین یہ تو معلوم کر چکے ہیں کہ یہ اجرام فلکی ایک دوسرے سے کتنے فاصلہ پر ہیں۔ لیکن ایک دوسرے کی روشنی آپس میں پہنچتی رہتی ہے۔ اگرچہ وہ اپنی منزل تک پہنچنے میں ہزاروں اور کروڑوں بعض حالات میں اربوں سال کا عرصہ لیتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ دنیا کی ابتداء کے حالات و واقعات ایران و یونان کی لڑائیاں، روم اور فنیقیا کی جنگیں جنگھائی بدر و احد و احزاب، خیبر، جمل و صفین اور کربلا واقعات سقیفہ و شوریٰ، اسیرانِ کربلا کا سفر کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام تک وغیرہ وغیرہ ان تمام واقعات کی خبریں لے کر شعاعیں نور کی چل رہی ہیں۔ کوئی کوئی قاصد اپنی منزل تک پہنچ گئی ہیں۔ بہت سے قاصد ایسے

(115) The Universe Around Us. pp. 124-133.
The Universe, pp. 149, 156, 158.

ہیں کہ ابھی راستے ہی میں ہیں۔ ایسا بھی ممکن ہے کہ جہاں قیامت واقع ہو تو وہاں
قیامت کے میدان پر قیامت کے دن وہ قاصد پہنچیں۔ پھر انھیں دیکھ کر شرمانے
والے شرمائیں اور خوش ہونے والے خوش ہوں اور اس آیات کی توضیح اُس دن
اچھی طرح ہو جائے گی۔

يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ أَشْتَاتًا لِّيُرَوْا أَعْمَالَهُمْ ۝ فَمَن يَعْمَلْ
مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَرَهُ ۝ وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا
يَرَهُ ۝ - ۹۹:۶،۷،۸ -

اس دلچسپ مضمون کے لیے دیکھو۔ (۱۱۶)

اب ایسی آیات کے معنی اچھی طرح سمجھ میں آجائیں گے۔ کہ أَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ
خَلَقَ اللَّهُ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ طِبَاقًا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ کس طرح خداوند تعالے
نے سات آسمانوں کو ایک دوسرے کے اوپر بنایا ہے۔ عربی میں کثرت کے لئے
سات کا لفظ اکثر بولا جاتا ہے اور جب بہت کثیر تعداد کا اظہار مطلوب ہو تو سات
کے لفظ سے ظاہر کرتے ہیں سورۂ فاتحہ میں ہر روز رب العالمین کا جملہ پڑھتے
ہیں۔ اب کچھ عالمین کی عظمت اور حقیقت معلوم ہوئی۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ قرآن شریف کی گفتار میں تکلم الناس
علی قدر عقولہم کے اصول کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ خداوند تعالے کو ہر ایک سر غیب
کا علم ہے۔ لیکن اگر قرآن شریف میں ایسے اسرار کا ذکر کر دیا جاتا جو لوگوں کے مشاہدے
ہی میں نہیں آئے تھے اور جو اُس زمانہ کے لوگوں کی عقلوں سے بالاتر تھے تو کفار تو
ایسا بہانہ ہی ڈھونڈتے رہتے تھے اور پہلے ہی سے جنون جنون پکار رہے تھے فوراً
کہہ دیتے کہ دیکھو ہم نہ کہتے تھے کہ (معاذ اللہ) محمدؐ تو مجنون ہے۔ یہ بھلا عقل کی باتیں
ہیں جو وہ کہہ رہا ہے۔ سب لوگ ان امور کو جنوں کی شکل دے کر مذاق میں اُڑا دیتے
کسی انسانی دماغ کے لئے یہ بہت مشکل بلکہ ناممکن تھا کہ وہ ایسی ہی بات کہے یا ایسی تحریر

(116) The Universe Around Us. p. 32: The Universe pp. 27, 28.

لکھے جو اُس زمانہ کی عقل کے بھی مطابق ہو اور آئندہ آنے والی عقلوں کے لئے بھی راہ نما ہو۔ یہ قرآن ہی کا معجزہ ہے کہ اس کی تحریریں ہر زمانہ کی عقل کے لئے باعث تسکین ہیں اور اصلیت بیان بھی کر دی گئی ہے۔ یہ آیات ملاحظہ ہوں:۔

(۱) وَلَقَدْ خَلَقْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعَ طَرَائِقَ - المومنون ۲۳ : ۱۷

بہ تحقیق ہم نے پیدا کئے تمہارے اوپر سات طبق (تہ بہ تہ) راستوں والے۔

(۲) اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا - الملک ۶۷ : ۳

وہ جس نے پیدا کیا سات آسمانوں کو اوپر تلے۔

(۳) وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ - الذاریات ۵۱ : ۷

قسم ہے راستوں والے آسمان کی۔

(۴) وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ - یٰس ۳۶ : ۴۰

اور سب ستارے بیچ آسمان کے چلتے ہیں۔

(۵) وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى - الرعد ۱۳ : ۲-

اور مسخر کیا سورج کو اور چاند کو، ہر ایک چلتا ہے مدت معینہ تک کے لئے۔

(۶) وَاٰیَةٌ لَّهُمُ الَّیْلُ ۚۖ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ﴿۳۸﴾ وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ ﴿۳۹﴾ لَا الشَّمْسُ یَنْۢبَغِیْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَكُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ۝

ترجمہ:۔ اور (میری قدرت کی) ایک نشانی رات ہے جس سے ہم دن کو کھینچ کر نکال لیتے (زائل کر دیتے) ہیں تو اُس وقت یہ لوگ اندھیرے میں رہ جاتے ہیں اور (ایک نشانی) آفتاب ہے جو اپنے ایک ٹھکانے پر چل رہا ہے۔ یہ (سب سے) غالب واقف کار (خدا) کا (باندھا ہوا) اندازہ ہے اور ہم نے چاند کے لئے منزلیں مقرر کر دی ہیں، یہاں تک کہ ہر پھر کے (آخر ماہ میں) کھجور کی پرانی ٹہنی کا سا (پتلا ٹیڑھا) ہو جاتا ہے۔ نہ تو آفتاب ہی سے یہ بن پڑتا ہے کہ وہ ماہتاب کو جالے اور نہ رات ہی دن سے آگے بڑھ سکتی ہے (چاند، سورج، ستارے) ہر ایک آسمان میں چکر لگا رہے ہیں۔ (ختم ہوا ترجمہ)

فی فلک یسبحون - آسمان میں تیرتے پھرتے ہیں - یہ اُس وقت کہا گیا ہے کہ جب تمام دنیا بشمول اہل سائنس یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ آسمان ایک ٹھوس سخت شے ہے اور اُس میں ستارے جڑے ہوئے ہیں اور وہ فلک ان ستاروں کو لے کر گردش کرتا رہتا ہے - وہ لوگ کہتے تھے کہ یہ فلک مغرب سے مشرق کی طرف گردش کر رہا ہے - کوئی تو کہتا تھا کہ یہ گردش ۱۲۴۵ ۲ سال میں پوری ہوتی ہے - کسی کا خیال تھا، ۳۶۰۰۰ سال میں اور کسی کی رائے میں یہ گردش ۲۵۰۰۰ سال میں پوری ہوتی تھی - انگریزی کا لفظ Firmament; جس کے معنی آسمان کے ہیں یہ ہی بتاتا ہے کہ وہ لوگ آسمان کو ٹھوس شے سمجھتے تھے - یہ لاطینی لفظ Firmamentum; سے ہے جس کے معنی ٹھوس مضبوط - پشتہ وسہارا کے ہیں - انگریزی کا لفظ Firm; بھی اس ہی سے ہے اور یہ ہی معنی رکھتا ہے - علم ہیئت حال میں جس کا زمانہ مشکل سے ۱۳۰۰ئ سے شروع ہوتا ہے - فلک کو صرف ستاروں کی گردش کرنے کا راستہ قرار دیا ہے وہ کوئی شے نہیں - اس ہی کو قرآن شریف نے ساتویں صدی عیسوی میں بنا دیا تھا - امور متذکرہ بالا کے لیے دیکھو - (۱۱۷)

اگرچہ خداوند تعالےٰ کی ہستی کی دلیل دنیا کی ہر شے میں پائی جاتی ہے جیسا کہ شاعر نے کہا ہے ۔ ؎

برگِ درختانِ سبز در نظرِ ہوشیار ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

لیکن چند صنعتیں تو ایسی ہیں کہ ہر ایک شخص کو غور کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں ۔ اور جب غور کیا تو خداوند تعالےٰ کی ہستی بالکل عیاں ہو جاتی ہے - (۱) دنیا میں حیات کی ابتداء (۲) انسان اور دیگر جانوروں کی ترکیب و ساخت (۳) وسعتِ فضا اور نظام سماوی - انسان خود ہی خدا کی ہستی و قدرت و حکمت کی بہت بڑی دلیل ہے جسمانی حیثیت سے بھی اور روحانی حیثیت اور تصوری ماہیت سے بھی - آج کل مشینوں کا زمانہ ہے - مشینوں کی مثال سے دیکھو - دنیا کی کوئی مشین نہیں جو خود بخود چلے - خدا نے انسان کو ایسی مشین بنایا ہے جو خود بخود چلتی ہے - اس مشین کی ترکیب و

(117) Encyplogedia Brittanica & Encyclopedia Americanna, Art. Astrology.

ساخت ایسی ہے کہ اگر بیرونی حالات بھی موافق ہوں تو اس کے بیکار ہونے کی کوئی وجہ ہی نہیں۔ اگر ہمیشہ نہیں تو صدیوں تو چلتی رہے لیکن چونکہ اس طولِ حیات میں خدا کو بھول جانے کا اندیشہ تھا۔ لہٰذا ایسے حالات بیرونی بھی پیدا کر دیئے گئے کہ وہ اس کے جسم کو بہت جلد فنا کر دیتے ہیں۔ یہ مشین صرف ایک ذریعہ سے خود چل رہی ہے اور وہ ذریعہ بھوک ہے۔ بھوک کا اعلیٰ نظام اور پھر غیر ضروری مادہ کا اخراج یہ نظام ہر ایک جاندار میں پیدا کر دیا گیا ہے جو محض نیچر یا دہر کے لئے ناممکن تھا۔ جذبات وحسیات جو کم وبیش ہر جاندار میں ودیعت کر دیئے گئے ہیں۔ اور ان کے علاوہ انسان میں جو عقل وفہم وذہن عطا کر دیئے گئے ہیں وہ سب بتا رہے ہیں کہ ان کا بنانے والا خود صاحبِ عقل وذکا ہے۔ دھر یا نیچر محض بے عقل، بے حس گونگی بہری ہے۔ بے عقل صانع سے صاحبِ عقل مصنوع نہیں پیدا ہو سکتا۔ عجیب لطیفہ ہے۔ عقل وذہن وفہم جو پیدا ہوئے وہ تو ایسے اعلیٰ اور حیرت انگیز ہیں اور صانع جو بیان کیا جاتا ہے یعنی دہر یا نیچر وہ ایسا ہے عقل گونگا، بہرا محض پتھر یہ کیونکر ممکن ہے۔ قرآن شریف میں اس کی تردید کیسی عمدہ طرح سے کر دی گئی ہے۔ حضرت ابراہیم نے جو بحث اپنے دعویٰ خدائی کرنے والے بادشاہ سے کی وہ قابلِ غور ہے۔ نظامِ عالم ایک ایسی دلیل ہے کہ خود بخود خدا کی ہستی اُس سے ثابت ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیم نے کہا کہ اگر تو خدا ہے تو نظامِ عالم کو بدل دے۔ اس کا جواب وہ کچھ نہ دے سکا۔ سائنس نے بڑا زور لگایا تو معلوم کر لیا کہ اشیاء کیا کام کر رہی ہیں۔ کشش سے ستارے رُکے ہوئے ہیں۔ روشنی کی رفتار کیا ہے۔ آواز کیوں کر سُنائی دیتی ہے۔ ستارے کتنے بڑے یا چھوٹے ہیں۔ اُن کے اندر کیا ہو رہا ہے۔ تجربہ سے معلوم کیا کہ کس دوا کا کیا اثر ہے جیسا دیکھا یا دیکھ سکے وہ صحیح یا غلط بنا دیا۔ لیکن دنیا کی کوئی طاقت، کوئی تجربہ، کوئی سائنس نہ یہ بتا سکا ہے اور نہ بتا سکے گا کہ ایسا کیوں ہے۔ کشش کیوں ہے۔ ادویہ میں یہ اثر کیوں ہے کسی شے یا کسی جاندار کی ماہیت کیوں ایسی ہے کہ جیسی وہ ہے۔ یہ ہی مطلب تھا امام جعفر صادق علیہ السلام کا جب آپ نے اُس دہریہ کو جس نے کیچڑ کو سڑا کر اُس میں کیڑے دیکھے تھے اور کہا تھا کہ دیکھئے میں نے جاندار چیزیں پیدا کر دیں تو آپ نے فرمایا کہ اچھا

بتا اس میں کتنے مادہ ہیں اور کتنے نر ہیں اگر وہ خالق تھا تو اُس کو یہ معلوم ہونا چاہئے تھا۔ کسی شے میں کیوں وہ خاصیت ہے جو اُس میں ہے یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔

ایسے ہی چند اور اسرارِ قدرت ملاحظہ کیجئے۔

یہ تو امر قطعی طور سے ثابت ہے کہ تمام کائنات ایٹم کی بنی ہوئی ہے۔ اگر روح کچھ شے نہیں ہے اور حیات کی بناو بھی مادی ہے تو یہ بھی کسی قسم کے ایٹموں کی بنی ہوئی ہونی چاہئے۔ اس پر تجربات کئے گئے۔ اہل سائنس کہتے ہیں کہ زندگی والے جسم کے اجزاء ہائیڈروجن، نائٹروجن، کاربن، آکسیجن اور ایسے ہی چند اور عناصر ہیں۔ دنیا میں حیات پیدا ہونے کا نظریہ اہل سائنس نے یہ قائم کیا کہ جب دنیا اپنی موجودہ حالت میں ہوئی تو اس میں یہ سب عناصر موجود تھے۔ اور یہ سب ایٹم آپس میں اس طرح ملے کہ زندگی پیدا ہو گئی۔ لیکن ہائیڈروجن، آکسیجن، نائٹروجن وغیرہ کے ایٹم آپس میں ملتے ہیں تو اور چیزیں بن جاتی ہیں۔ زندگی نہیں پیدا ہوتی۔ لیکن اگر ان میں کاربن کا ایٹم مل جائے تو زندگی پیدا ہو جاتی ہے۔ صرف کاربن کے ایٹم میں خدا نے یہ خاصیت رکھی ہے کہ باقی عناصر کے ایٹموں کو ملا کر زندگی پیدا کر دیتا ہے کاربن کے ایٹم میں چھ الکٹرون Electrons ہیں۔ اُس میں یہ خاصیت صرف اس چھ کی تعداد نے پیدا کی ہے۔ کیمیائی عناصر کی فہرست میں کاربن کے نزدیک کاربن کی دو اور بہنیں ہیں۔ ان کو Boron اور Nitrogen کہتے ہیں متقدم الذکر میں پانچ اور موخر الذکر کے ایٹم میں سات الکٹرون Electrons ہیں لیکن ان میں یہ خاصیت نہیں، صرف ایک الکٹرون کے فرق سے ہستی اور نیستی میں فرق ہو گیا۔ انسان اور تمام جاندار چیزوں کی زندگی کا انحصار بقول ان سائنس دانوں کے صرف کاربن کے ایٹم میں چھ الکٹرون ہونے پر ہے۔ لیکن ایسا کیوں ہے یہ لوگ نہیں جانتے۔ اگر صرف اتنی ہی بات ہوتی تو ہر ایک سائنس داں کی Laboratory (معمل) میں زندگی پیدا ہو سکتی۔ لیکن کوئی سائنس داں زندگی نہیں پیدا کر سکا۔ لہٰذا انھوں نے نتیجہ نکالا کہ ہمیں معلوم ہی نہیں کہ زندگی کس طرح پیدا ہوئی۔

اب مقناطیس کو لو۔ مقناطیسی صفت سب سے زیادہ لوہے میں اور پھر

نکل اور COBALT میں ہے جو نکل ہی سے مشابہ ہوتی ہے۔ ان عناصر کے ایٹموں میں علی الترتیب ۲۶، ۲۷، ۲۸، الیکٹرون ہوتے ہیں۔ اہل سائنس کو نہیں معلوم کہ مقناطیسی قوت کا انحصار کیوں ۲۶، ۲۷، اور ۲۸، الیکٹرون پر ہے۔

Radio Activity : بھی ایک ایسا ہی معمہ ہے۔ مولوی عبدالحق صاحب نے اپنی ڈکشنری میں اس لفظ کا ترجمہ شعاع زنی سے کیا ہے۔ اس کا انحصار بھی ان ہی ایٹموں پر ہے جن میں ۸۳ سے ۹۲ تک الکٹرون ہوتے ہیں۔ اہلِ سائنس کو نہیں معلوم کہ ایسا کیوں ہے۔

اس بحث کے لئے دیکھو (۱۱۸)

یہ Radio- Activity : یا شعاع زنی بھی قدرت کا ایک عجیب نمونہ ہے۔ ہر ایک ایٹم کا ایک مرکزی حصّہ ہوتا ہے جس کو نوا کہہ سکتے ہیں۔ اس کے گرد ہی الکٹرون چکر لگاتے ہیں۔ یہ مرکزی حصّہ جس کو انگریزی میں NEUCLEUS کہتے ہیں پروٹون Proton : اور ایک اور ذرّہ کا جس کو NEOTRON کہتے ہیں مرکب ہوتا ہے یعنی NEUCLEUS میں Proton : اور NEUTRON ہوتے ہیں۔ اس مرکزی حصّہ اور الکٹرون کی تعداد پر کسی چیز کی ماہیت منحصر ہوتی ہے۔ اور دھاتوں میں اور اشیاء میں جو آپس میں اختلاف ہوتا ہے وہ اس ہی پر منحصر ہے۔ اکثر دھاتیں Radio Active ہوتی ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اُن کا NEUCLEUS خود بخود بہت عرصہ کے بعد پھٹ جاتا ہے۔ اور یہ دھات دوسری دھات میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مثلاً Uranium : کچھ عرصہ کے بعد Radium میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور Radium : ریڈیم کچھ عرصہ کے بعد جست (LEAD) میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ان کے زیرِ اثر جو دھاتیں یا جو اشیاء آتی ہیں اُن میں یہ خاصیت پیدا ہو جاتی ہے۔ پہلے زمانہ میں جو ہوس معمولی دھاتوں کو قیمتی دھاتوں میں تبدیل کرتے تھے یا کرنا چاہتے تھے۔ انکے خوابوں کی تعبیر آج پوری ہوئی۔ لیکن یہ نہیں کہ معمولی دھاتیں سونا بنیں نہیں، بلکہ قیمتی دھاتیں معمولی دھاتوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ پھر بھی اہل سائنس کو یہ نہیں

(118) The Mysterious Universe. PP 6,7,8.

معلوم کہ ایسا کیوں ہوتا ہے۔ یہ عجائبات قدرت میں سے ہے۔ دیکھو (۱۱۹)

Cosmic Rays: ایک اور معجزہ اور عجیب مشاہدہ ہے۔ یہ وہ شعاعیں ہیں جو ہر ایک چیز اور جاندار کے اندر گھس کر اُس کا قلع قمع کر دیتی ہیں۔ ہر وقت آ رہی ہیں دن کو بھی رات کو بھی۔ گویا یہ آسمانی بمب ہیں۔ اہل سائنس کہتے ہیں کہ اُن کا اثر یہ ہے کہ ہم سب فوراً مر جائیں۔ لیکن نہیں مرتے۔ تعجب ہے کہ کیوں نہیں مرتے۔ ان کی وجہ سے مرد عورت اور عورت مرد بن جاتے ہیں۔ اہل سائنس کو نہیں معلوم کہ یہ کہاں سے آتی ہیں اور اُن کا یہ اثر کیوں ہے۔ یہ تو معلوم ہو گیا ہے کہ سورج اور ستاروں سے یہ نہیں آتیں۔ ممکن ہے کہ دوسرے کائناتوں سے آتی ہوں۔ یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ ان کا اثر دنیا اور دنیا کی اشیاء کے ارتقاء اور نشو و نما پر بہت ہوا ہے۔ یہ ابتدائی عالم ہی سے فضا میں سفر کر رہی ہیں۔ دیکھو (۱۲۰)

یہ وہ امور ہیں جن سے خداوند تعالیٰ کی قدرت و حکمت کا اندازہ ہوتا ہے اور ماننا پڑتا ہے کہ وما اوتیتم من العلم الا قلیلا۔

ایسے ہی بہت سے عجائبات ہیں۔ ہمارا مدعا علم ہیئت اور علم طبیعیات کی کتاب لکھنا نہیں ہے۔ ہمارا مقصد تو انسان کا عجز اور خداوند تعالیٰ کی قدرت و حکمت کا دکھانا ہے۔ تاکہ دہریت کا بے جا دعویٰ لوگوں کی نظروں میں بے حقیقت اور غلط معلوم ہو۔

قرآن شریف میں شہد کی مکھی (نحل)، اور چیونٹی (نمل) جیسی بظاہر ناچیز اور حقیر اور کمزور جانوں کا بیان کیا گیا ہے۔ بلکہ ایک ایک سورہ ان کے نام پر ہے لہذا ہم ذرا اُن پر بھی نظر ڈالتے چلیں کہ ان کمزور ہستیوں سے کس طرح خداوند تعالیٰ کی شان و حکمت ظاہر ہوتی ہے۔

خداوند تعالیٰ کا قرآن شریف میں ارشاد ہے:—

وَاَوْحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحْلِ اَنِ اتَّخِذِیْ مِنَ الْجِبَالِ بُیُوْتًا وَّ مِنَ الشَّجَرِ وَمِمَّا یَعْرِشُوْنَ ﴿۶۸﴾ ثُمَّ کُلِیْ مِنْ کُلِّ الثَّمَرٰتِ فَاسْلُکِیْ سُبُلَ رَبِّکِ ذُلُلًا

(119) The Universe, pp. 146-158.
(120) The Universe, pp. 158-161; The Universe Around Us, pp. 124-28

يَخْرُجُ مِنْ بُطُونِهَا شَرَابٌ مُّخْتَلِفٌ اَلْوَانُهُ فِيْهِ شِفَاءٌ لِّلنَّاسِ ط
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۔ سورۃ النحل ۱۶: ۶۸، ۶۹

ترجمہ:۔ (اے رسول) تمھارے پروردگار نے شہد کی مکھی کی طرف وحی کی (اس کے دل میں یہ بات ڈال دی) کہ تو پہاڑوں، درختوں میں اور جو اونچی اونچی ٹٹیاں لوگ بناتے ہیں ان میں اپنے چھتے بنا پھر ہر طرح کے پھلوں (کے عرق) کو چوس۔ پھر اپنے پروردگار کی راہوں میں تابعداری کے ساتھ چلی چل۔ ان مکھیوں کے پیٹ سے پینے کی ایک چیز نکلتی ہے۔ (شہد) جس کے مختلف رنگ ہوتے ہیں۔ اس میں لوگوں (کی بیماریوں) کی شفا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس میں غور و فکر کرنے والوں کیلئے (خدا کی) بڑی نشانی ہے۔

اگر انسان خود اپنے معاملات پر نظر ڈالے اور اپنے ہوش سنبھلنے سے بڑھاپے تک کے زمانہ پر غور کرے اور ضد کو درمیان میں نہ لائے تو جو واقعات اس کو پیش آتے رہے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے واقعات کو ترتیب دینے والی کوئی ہستی ہے جس پر ہم اس کا اختیار نہیں ہے۔ اس ہی امر واقعہ کو جناب امیر المومنین نے ان الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے: عرفت ربی بفسخ العزائم۔ بڑے سے بڑے عقلمند آدمیوں کے سوانح حیات کو دیکھ لو۔ سیزر، نپولین، ہینی بال، نادر شاہ، ہٹلر وغیرہ۔ یہ لوگ ہر ایک چھوٹی سی چھوٹی بات کو بھی اپنی تجاویز مرتب کرنے میں نظر انداز نہیں کرتے تھے لیکن پھر بھی درمیان میں ایسی شے پیدا ہو جاتی تھی کہ اُن کی تجاویز کو درہم برہم کر دیتی تھی، اور ان تمام بڑے جنرلوں میں یہ بات مشترک پاتے ہیں کہ وہ خداوند تعالی کی ہستی سے انکار نہیں کرتے تھے۔ یہ لوگ تو بڑے آدمی تھے جن کے سوانح حیات ہم کو معلوم ہیں ہر ایک انسان اگر اپنے حالات پر غور کرے تو یہ بات نہایت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے۔

اس سلسلہ میں یہ آیات بھی غور کے قابل ہیں۔

تُسَبِّحُ لَهُ السَّمٰوٰتُ السَّبْعُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ ط وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ
اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ط اِنَّهٗ كَانَ
حَلِيْمًا غَفُوْرًا ۔ بنی اسرائیل ۱۷ : ۴۴

ترجمہ:۔ ساتوں آسمان اور زمین اور جو اُن میں ہیں وہ سب، اس کی تسبیح کرتے ہیں اور (سارے جہانوں میں) کوئی ایسی چیز نہیں جو اس کی حمد و ثنا کی تسبیح نہ کرتی ہو۔ مگر تم لوگ ان کی تسبیح نہیں سمجھتے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بڑا بردبار بخشنے والا ہے۔

تسبیح کرنے والوں میں بے جان اور بے زبانوں کے علاوہ کافر بھی تو آگئے۔ جو خدا کی ہستی ہی سے انکار کرتے ہیں۔ وہ زبان سے کچھ ہی کہیں لیکن ان کا ذرہ ذرہ اُن کے اس انکار کے باوجود خدا کی تسبیح و حمد و ثنا کرتا ہے۔ ایک تو اُن کی موجودگی اور ان کی ترکیب و ساخت ہی خدا کی حمد و ثنا ہے۔ دوسرے اب سائنس نے معلوم کر لیا ہے کہ ہر ذرہ میں آواز ہے۔ گویا وہ آواز کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں۔ یہ تو ہمارے ناظرین معلوم کر چکے ہیں کہ مادہ کا آخری جزو جس کو ایٹم کہتے ہیں، اب وہ بھی تقسیم ہو سکتا ہے۔ اُس کے دو اجزا ہیں۔ ایک کو الکٹرون اور دوسرے کو پروٹون کہتے ہیں۔ اس ایٹم کے اندر کا نظام ایسا ہی ہے کہ جیسا ہمارا نظام شمسی ہے۔ یعنی سورج کے گرد چند سیارے گردش کر رہے ہیں اور سب کے درمیان میں فضا یعنی خلاء ہے۔ یہ ہی حالت ایٹم کی ہے ایٹم کے Electron اُس کے Proton; کے گرد چکر لگا رہے ہیں۔ اور ان کا ایک مقرر راستہ ہوتا ہے جس کو Orbit ; کہہ سکتے ہیں۔ اور درمیان میں خلا ہے یہ تو ظاہر ہے کہ حرکت میں طاقت یا Energy ہوتی ہے اور یہ طاقت دو چیزوں میں مبدل ہو جاتی ہے ایک تو گرمی اور دوسرے آواز میں یعنی ہر ایک حرکت میں گرمی اور آواز ہوتی ہے۔ ایٹم میں حرکت ہے۔ لہذا ایٹم میں گرمی بھی ہوئی اور آواز بھی۔ لیکن چونکہ وہ بہت چھوٹی شے ہے نہ تو اُس کی گرمی محسوس ہو اور نہ اُس کی آواز سُنائی دے۔ یہ ثابت ہو گیا ہے کہ کائنات کی ہر شے ایٹم سے مرکب ہے۔ لہذا ہر شے میں گرمی بھی ہے اور آواز بھی۔ پتھر میں کہیں آواز یا گرمی معلوم ہوتی ہے؟ لیکن اسی کے ٹھوس انجماد کو بھٹی میں آگ کے ذریعہ سے چونے میں تبدیل کر دو۔ اب چونے پر پانی ڈالو۔ گرمی بھی نکلے گی اور آواز بھی۔ ہماری اس

بحث کی تائید کے لئے دیکھو - (۱۲۱)

بہر صورت کچھ ہی ہو۔ جو لوگ قرآن شریف کو کلام الٰہی مانتے ہیں۔ اور عربی زبان سے واقف ہیں وہ ان آیات کے یہ ہی معنی لیں گے کہ ہر شے آواز کے ساتھ خدا کی تسبیح کرتی ہے۔ دہریوں کی زبان کچھ ہی کہے اُن کے جسم کا ذرہ ذرہ خداوند تعالےٰ کی تسبیح آواز کے ساتھ کرتا ہے۔ لیکن وہ آواز ہم نہیں سُن سکتے اور نہ اُس کے معنی سمجھ سکیں۔ اگر صرف یہ ہی معنی ہوتے کہ اُن کی ہستی خداوند تعالےٰ کی حکمت و قدرت کی طرف دلالت کرتی ہے اور یہ ہی اُن کی تسبیح ہوتی تو یہ بات تو ہم سمجھ سکتے ہیں۔ پھر اس کہنے کی کیا ضرورت ہوئی - ولکن لا تفقھون تسبیحھم - آگے چلئے سورۂ النمل میں ہم وہ آیات پاتے ہیں جن کا ترجمہ یہ ہے :-

یہاں تک کہ جب وہ چیونٹیوں کے میدان سے گزرے تو
ایک چیونٹی نے کہا کہ اے چیونٹیوں اپنے اپنے بلوں میں گھس جاؤ۔
ایسا نہ ہو کہ سلیمانؑ اور اُن کا لشکر تم کو کچل ڈالے اور اُن کو خبر
بھی نہ ہو۔ سورۃ النمل ۲۷: ۱۸، ۱۹

یہاں ہم یہ ہی کہیں گے کہ اُس خدا کی قدرت سے یہ کچھ بعید نہیں جس کی حکمت و قدرت کی مثالیں ابھی ابھی ہم کو سائنس بتا چکا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جانوروں کی بھی آپس میں گفتگو ہوتی ہے جس کو وہ خود اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ جنھوں نے جانور پالے ہیں وہ ہماری اس بات کو اچھی طرح سمجھیں گے۔ علاوہ اس کے یہ بھی تو دیکھو کہ طائران ہوا ایک جنس میں ایک ہی سے ہوتے ہیں۔ طوطا، مینا، کبوتر، کوا، چڑیاں، لال وغیرہ وغیرہ۔ یہ صرف گفتگو ہی سے تو اپنے جوڑے کو پہچانتے ہیں۔ اور تو کوئی شناخت نہیں ہوتی۔ وہ لوگ جو اپنے قیاس سے چیونٹیوں کے معنی غریب اور کمزور انسانوں کے طبقے کے لیتے ہیں۔ جیسا کہ علامہ یوسف علی نے اپنے انگریزی کے ترجمہ قرآن میں کیا ہے

(121) Eddiogton: The Nature of the Physicai World, pp. 18-16., 281
Jeans: The Mysterious Universe, pp. 43, 44, 46.

تو وہ دراصل زمانہ حال کے نیچریوں اور دہریوں سے شرماتے ہیں اور اس طرح اپنے قیاس کو عمل میں لاتے ہیں۔ اس واقعہ سے محض اس وجہ سے انکار کرنا کہ ہم چیونٹیوں کی آواز نہ سن سکیں اور نہ سمجھ سکیں غلط ہے۔ یہ اس وقت صحیح ہوتا جب ہم دیکھتے کہ ہماری قوائے مدرکہ یعنی قوت حاسہ، قوت لامسہ، قوت شامہ فہم لامحدود ہیں۔ ان کی کوئی حد ہی نہیں۔ ان سے زیادہ قوت ہو ہی نہیں سکتی۔ حالت تو یہ ہے کہ پہاڑ سے نیچے زمین پر گرا ہوا دانہ یا بوٹی انسان نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن کبوتر، چیل اور عقاب اچھی طرح دیکھ لیتے ہیں۔ بلی رات کو بھی دیکھ لیتی ہے۔ انسان اندھیرے میں نہیں دیکھ سکتا۔ اس کو دیکھنے کے لئے مائیکروسکوپ اور مسافت طے کرنے کے لئے گاڑی، موٹر اور ایروپلین چاہئیں۔ یہ سب امور اچھی طرح ثابت کر رہے ہیں کہ انسان کی قوتیں کامل نہیں جب یہ حالت ہے تو یہ دعوی کیا حقیقت رکھتا ہے کہ جس کو ہم سن نہ سکیں، دیکھ نہ سکیں، سمجھ نہ سکیں تو وہ موجود ہی نہیں۔ وہ ناممکن ہے۔ لندن کی آواز کراچی میں نہیں سنائی دیتی۔ لیکن ریڈیو کے ذریعہ سے سن لیتے ہیں۔ یہ آواز تو چیونٹی کی آواز سے بھی کراچی میں خفیف ہوئی۔ بلکہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ پھر بھی سنی جا سکتی ہے فرق تو صرف اتنا ہی ہوا کہ حضرت سلیمانؑ کے پاس ریڈیو نہ تھا۔ لیکن نبی کا ریڈیو اور قسم کا ہوتا ہے۔ اور وہ خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ اب آخری یہ اعتراض رہ گیا کہ زبان کا سمجھنا الفاظ پر منحصر ہے اور الفاظ آپس کے معاہدہ اور قواعد سے مرتب کئے جاتے ہیں۔ چیونٹیوں میں الفاظ کو معانی دینے اور الفاظ کے لئے قواعد مرتب کرنے کی اہلیت نہیں ہے۔ گویا ایک طریقہ تو آواز سمجھنے کا یہ ہوا کہ الفاظ منتخب کئے جائیں اور ان کو معانی دئے جائیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آواز کے سمجھنے کا اس کے علاوہ کوئی اور طریقہ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ جب مرغی و کبوتر اور دیگر جانور ڈرتے ہیں تو خاص قسم کی آواز نکالتے ہیں۔ جب بھوک لگتی ہے تو گھوڑے کی آواز اور طرح کی ہوتی ہے۔ کتے کی آوازیں کتنے قسم کی ہوتی ہیں۔ دشمن کو دیکھ کر اور طرح سے بھونکتا ہے۔ اپنے آقا کو دیکھ کر اور طرح کی آواز نکالتا ہے۔ تنہائی میں اس طرح بولتا ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ کتا رو رہا ہے۔ ہاتھی کی ڈر کے وقت اور آواز ہے۔ اپنی مادہ کو بلانے کی اور آواز ہے۔ بلی لڑتے وقت خاص آواز

نکالتی ہے نہ مالک کو پیار کرتے وقت اور طرح سے بولتی ہے۔ ایک ہی نوع کے جانور کی مختلف حالات میں مختلف قسم کی آوازوں کا ہونا ظاہر کرتا ہے کہ ہر ایک آواز کے علٰحدہ معنی ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ آواز کے سمجھنے کے لئے لفظ ہوں اور لفظ کے سمجھنے کے لئے معنی ہوں۔ اور اگر ایک مساوی الاضلاع مسدس بنانا چاہیں تو اُس کے لیے پرکار و پیمانہ کی ضرورت ہے۔ لیکن شہد کی مکھی تو بغیر اس مدد کے نہایت عمدہ مساوی الاضلاع مسدس بنالیتی ہے۔ بیا اپنا گھر کس خوبصورتی سے بناتا ہے اور پھر اُس کو روشن کرتا ہے۔ یہ تو موٹی موٹی مثالیں روزمرہ کے مشاہدہ کی ہم نے بیان کی ہیں۔ بہت سی کتابیں جو جانوروں کی عادات، افعال، اطوار، رہائش کے متعلق ہیں ان کو پڑھیئے اور خدا کی قدرت کے قائل ہو جائیے۔ قرآن شریف میں ان عادات و اطوار کا منبع وحیِ الٰہی کو بتایا ہے۔ دہریے INSTINCT کہہ دیتے ہیں

یہ بہت ممکن بلکہ اغلب کیا یقینی ہے کہ بعض انسان خداوند تعالےٰ ایسے منتخب کر لیتا ہے کہ جو اُس کی وحی و رسالت کے حامل ہونے کی اہلیت رکھتے ہیں اور پھر اُن میں ان قوتوں کو بہت اعلےٰ درجہ میں عطا کرتا ہے۔ اُن کے لئے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ بغیر ریڈیو کے خفیف اور دور کی آواز نہ سُن سکیں۔ بغیر دوربین کے دور سے نہ دیکھ سکیں۔ یا بغیر TELEVISION کے اُن کی آنکھوں کے سامنے دور کی اشیا نہ آسکیں۔ انسان میں ایک روحانی قوتِ فہم و تمیز یعنی MIND کی موجودگی کا ثبوت دیتے ہوئے ایک سائنس داں لکھتا ہے۔

ترجمہ:۔ اگرچہ اب تک تو ہم کو صرف اشارات، گفتگو اور تحریر ہی ایسے ذرائع معلوم ہیں جن سے ایک شخص دوسرے سے رابطہ پیدا کر سکتا ہے اور اپنے خیالات اُس تک پہنچا سکتا ہے۔ لیکن ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ ان ذرائع سے کوئی کم زیادہ لطیف اور دقیق ذریعہ نہیں ہے۔ موجودہ حالت میں ہم غیر واضح اور غیر یقینی طور سے صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ممکن ہے کہ چند منتخب اشخاص کو ان ذرائع سے لطیف تر ذریعہ بطور امداد (غیبی) دیا گیا ہو اور وہ وائرلیس کی طرح کام کرتا ہو جس طرح وائرلیس خاص ٹرانسمیٹر کے ذریعہ سے خاص ریسیور کو پیغام پہنچا دیتا ہے۔ (۱۲۲) (ختم ہوا ترجمہ)

دیکھو اصل انگریزی کا ضمیمہ نمبر ۱۷

اصل ضمیمہ نمبر ۱۷-

ہمارا دعوے ثابت ہوا کہ یہ منتخب اشخاص حضرت سلیمان کی طرح خاص انبیاء ہیں اور وہ جانوروں کے خیالات کو سمجھ سکتے ہیں۔

انسان کی کمزوری کی تو یہ حالت ہے اور اس پر اتنا غرور کہ خدا کی کنہ کو معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جناب امیر علیہ السلام نے اس ناجائز و ناموزوں غرور و پندار کو نہایت عمدہ الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:-

مَا لِابْنِ آدَمَ وَالْفَخْرِ، اَوَّلُهُ نُطْفَةٌ وَآخِرُهُ جِيفَةٌ وَلَا يَرْزُقُ نَفْسَهُ وَلَا يَدْفَعُ حَتْفَهُ -

یعنی ابن آدم کو فخر سے کیا کام۔ اس کی ابتداء نطفہ سے ہے اور اس کی انتہا ایک مُردار گوشت کا لوتھڑا ہے۔ خود اپنے نفس کو رزق نہیں پہنچا سکتا اور نہ اپنی موت کو دور کر سکے۔

ایک اور موقعہ پر آپ نے فرمایا:-

مِسْكِينٌ ابْنُ آدَمَ! مَكْتُومُ الْاَجَلِ مَكْنُونُ الْعِلَلِ مَحْفُوظُ الْعَمَلِ تُؤْلِمُهُ الْبَقَّةُ وَتَقْتُلُهُ الشَّرْقَةُ وَتُنْتِنُهُ الْعَرْقَةُ -

یعنی انسان کیسا مسکین و غریب ہے۔ اس کی اجل کا وقت اس سے پنہاں ہے۔ بیماریوں کا اس کو علم نہیں، عمل محدود ہے۔ ایک مچھر اس کو تکلیف دے سکتا ہے۔ غم و غصہ اس کو مارے ڈالتا ہے۔ اس کا اپنا ہی پسینہ اس کو گندہ اور بدبودار کر دیتا ہے۔

انسان کی اس ذلیل ابتدا اور اس کے بے جا و بدنما غرور و پندار کو قرآن شریف میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

اَوَلَمْ يَرَ الْاِنْسَانُ اَنَّا خَلَقْنٰهُ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَّنَسِيَ خَلْقَهٗ ۭ قَالَ مَنْ يُّحْيِ الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيْمٌ -

یس ۳۶ : ۷۷، ۷۸

ترجمہ:- کیا آدمی نے اس پر بھی غور نہیں کیا کہ ہم نے اس کو ایک (ذلیل شے) نطفہ سے پیدا کیا اور پھر وہ یکایک (ہمارا ہی) کھلم کھلا مقابل

بنتا ہے اور ہماری نسبت باتیں بنانے لگا اور اپنی خلقت (کی حالت) بھول گیا۔ (اور) کہنے لگا کہ بھلا جب یہ ہڈیاں (سڑ گل کر) خاک ہو جائیں گی تو (پھر) کون (دوبارہ) زندہ کر سکتا ہے۔

عجائباتِ قدرت کون بیان کر سکتا ہے۔ ہم صرف شہد کی مکھی اور چیونٹی کا حال بیان کرتے ہیں کیوں کہ یہ بہت ہی کمزور جانور ہیں اور ان کے کام بڑے سے بڑے جانوروں سے بہتر ہیں چیونٹیوں کی آپس کی گفتگو کا بھی ثبوت مل جائے گا۔

شہد کی مکھیاں ٹولیاں اور جماعتیں بنا کر رہتی ہیں۔ ایک جماعت کیلئے ایک چھتہ ہوتا ہے۔ ہر ایک چھتہ میں صرف ایک مادہ ہوتی ہے جس کو ملکہ کہتے ہیں اور وہ ہی ساری جماعت پر حکومت کرتی ہے۔ یہ جماعت تین حصوں میں تقسیم ہوتی ملکہ، نکھٹو اور مکھی یا یعنی کام کرنے والے۔ ایک چھتے میں سینکڑوں نکھٹو ہوتے ہیں۔ یہ نر ہوتے ہیں، کام کچھ نہیں کرتے۔ ایک چھتہ کی جماعت کا سب سے بڑا رکن یہ کام کرنے والی مکھیاں ہوتی ہیں۔ یہ ہی شہد لاتی ہیں اور جمع کرتی ہیں۔ موم بناتی ہیں، خانے بناتی ہیں اور بچوں کی پرورش کرتی ہیں۔ اڑنے میں یہ مکھیاں بڑی مضبوط ہوتی ہیں اور ان کی آنکھیں بہت تیز ہوتی ہیں۔ جب یہ اپنے چھتے میں آنا چاہتی ہیں تو اوپر سیدھی اڑ جاتی ہیں۔ وہاں سے اپنے چھتے کو دیکھتی ہیں اور آجاتی ہیں۔ اور سیدھے خط پر آتی ہیں جو سب سے کم فاصلہ ہوتا ہے۔

نکھٹو کے ڈنک نہیں ہوتا۔ لیکن ملکہ اور کام کرنے والیوں کا ڈنک پیچھے ہوتا ہے۔ جب ملکہ ان نر نکھٹوؤں میں سے ایک سے جفتی کھاتی ہے تو پھر انڈے دینے چھتے کے ان خانوں میں چلی جاتی ہے جو اس غرض کے لئے بنائے جاتے ہیں دو اور تین ہزار انڈے صرف ایک دن میں دیدیتی ہے۔ خدا کی قدرت دیکھو۔ پہلے تو وہ ایسے انڈے دیتی ہے جس میں سے صرف کام کرنے والیاں نکلتی ہیں۔ ان کے لئے چھتے میں علیحدہ جگہ ہوتی ہے۔ پھر دوسری لائن کے خانوں میں وہ انڈے دیتی ہے جس میں نکھٹو نر نکلیں گے۔ اگر چھتہ بڑا ہے اور ملکہ کا خیال ہوتا ہے کہ دوسری ملکہ ہونی چاہئے تو وہ ملکہ والے انڈے تیسرے لائن میں دیتی ہے تین دن میں کیڑے، نما بچے نکل آتے ہیں۔ اور فوراً کام کرنے والیاں ان کو سنبھال لیتی ہیں

اور پرورش کرتی ہیں۔ اس کے پانچ اور چھ دن بعد یہ کیڑے اپنے اوپر ایک خول سا تنتے ہیں جس میں کام کرنے والیاں نکلتی ہیں اور بیس دن میں پوری مکھیاں ہو جاتی ہیں۔ نکھٹو ۲۴ دن میں مکمل ہو جاتے ہیں۔ اوران خولوں میں سے ملکہ ۱۶ دن میں نکل آتی ہیں۔ اگر چھتہ چھوٹا ہے تو پرانی ملکہ اُن نئی ملکاؤں کو خانوں کے اندر ہی مار ڈالتی ہے۔ لیکن اگر چھتہ بڑا ہے تو صرف ایک نئی ملکہ چھوڑ دی جاتی ہے اور وہ پرانی ملکہ اپنے ساتھ اس جماعت کا کچھ حصہ لے کر نکل جاتی ہے اور دوسری جگہ چھتہ بن جاتا ہے۔

مکھیوں کے دو معدے ہوتے ہیں۔ ایک میں تو شہد بنتا ہے جس کو ضرورت کے وقت نکال کر چھتے کے خانوں میں جمع کر دیتی ہیں۔ دوسرا معدہ اپنے کھانے کا ہوتا۔ موم فقط کام کرنے والی مکھیوں میں ہوتا ہے۔ اُن کے پیچھے ایک پوٹلی ہوتی ہے۔ یہ موم اُس میں سے نکلتا ہے۔ تو وہ ہی مکھی یا دوسری مکھیاں مل کر خانے بناتی ہیں۔ یہ خانے ہمیشہ مسدس بناتی ہیں۔ اور وہ مساوی الاضلاع ہوتے ہیں۔ اس طرح سارا چھتہ بھر جاتا ہے اور کوئی جگہ خالی نہیں رہتی۔ اس میں دو سطح ہوتے ہیں جنکی پشت آپس میں ملی ہوتی ہے۔ ہر ایک چھتہ میں دونوں حصوں کے درمیان تقریباً ایک انچ راستہ چھٹا ہوا ہوتا ہے جس میں سے یہ مکھیاں آتی جاتی ہیں۔ جب وہ بھر جاتا ہے تو پھر موم سے بند کر دیتی ہیں تاکہ جاڑے میں بیٹھ کر کھائیں۔

چیونٹیوں کی کہانی بھی سننے کے قابل ہے۔ ان کی بھی علیحدہ علیحدہ جماعتیں ہوتی ہیں۔ ایک جماعت میں کئی ہزار ہوتی ہیں۔ ان میں بھی تین قسمیں ہوتی ہیں مادہ جو سب سے بڑی ہوتی ہیں۔ نر جو اُن سے چھوٹے ہوتے ہیں اور کام کرنے والیاں جو سب سے چھوٹی ہوتی ہیں۔ مادہ اور نر کے پر ہوتے ہیں لیکن کام کرنے والیوں کے پر نہیں ہوتے۔ جب یہ نر مادہ سے جفتی کھا لیتے ہیں تو پھر جماعت میں سے نکل جاتے ہیں۔ اور پھر واپس نہیں آتے۔ دو چار دن میں یہ مر جاتے ہیں کیونکہ ان میں ڈنک نہیں ہوتا۔ اور خود غذا نہیں مہیا کر سکتے ہیں۔ مادہ چیونٹیاں چھوٹے چھوٹے انڈے دیتی ہیں۔ بغیر خوردبین کے نظر نہیں آتے۔ کام کرنے والیاں اُن کو

جمع کر لیتی ہیں۔ دن کو یے جا کر دھوپ میں رکھتی ہیں اور رات کو گرم جگہ لے آتی ہیں۔ چھوٹے چھوٹے کیڑے بغیر پیر کے پیدا ہوتے ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد یہ بھی اپنے اوپر خول تن لیتے ہیں۔ ان خولوں کو کام کرنے والیاں دن کو تو دھوپ میں اور رات کو سایہ میں لے جاتی ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد یہ کام کرنے والیاں ان خولوں کو کاٹ دیتی ہیں اور پوری چیونٹیاں برآمد ہو جاتی ہیں۔

ان کے گھر بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ کام کرنے والیاں ہی گھر بناتی ہیں اور علام جماعت کے لئے غذا بھی مہیا کر کے لاتی ہیں۔ ان گھروں میں یہ گلی کوچے بھی بناتی ہیں۔ گھروں میں کئی کمرے ہوتے ہیں اور گھر بھی کئی منزلوں کا ہوتا ہے جو ایک دوسرے سے گیلری سے ملا ہوا ہوتا ہے۔ کئی قسم کی چیونٹیاں ہوتی ہیں۔ ایک قسم (MINING) یعنی کانوں کی بنانے والی چیونٹیاں کہلاتی ہیں، یہ مٹی میں گھر بناتی ہیں ستون بھی بناتی ہیں جن پر گھاس سے لپائی کرتی ہیں۔ بڑھئی چیونٹیاں اپنا گھر درختوں میں بناتی ہیں اور اپنے لیئے بہت گہرے خانے اُن درختوں میں بنا لیتی ہیں اور درمیان میں دیواریں رکھتی ہیں۔

یہ چیونٹیاں آدمیوں کو مشقت اور صبر اور کوشش کا سبق پڑھاتی ہیں۔ اپنے سے دس بارہ گنا زیادہ وزن ایک چیونٹی اُٹھا لیتی ہے۔ تمام دن کام کرتی رہتی ہیں۔ اور ضرورت ہو تو رات کو بھی کام کرتی ہیں۔

ایک قسم کی جوں ہوتی ہے اس میں سے میٹھا سا عرق نکلتا ہے جس کو چیونٹیاں بہت پسند کرتی ہیں۔ جب کوئی جوں مل جاتی ہے تو چیونٹی اُس کی پیٹھ کو ٹھونکتی ہے۔ اُس سے عرق نکلتا ہے۔ وہ یہ پی جاتی ہے۔ اور بسا اوقات ان جوؤں کو لا کر اپنے گھروں میں رکھتی ہیں اور پالتی ہیں۔ پرورش کرتی ہیں جس طرح گائے کو رکھتے ہیں اور اس کا دودھ پیتے ہیں۔ یہ بھی اُن کا دودھ دوہتی ہیں۔

بعض چیونٹیاں ایسی ہیں جو دوسری قسم کی چیونٹیوں سے جنگ کرتی ہیں اور جنگ میں اُن کو قید کر کے لے آتی ہیں تاکہ اُن کو غلام بنائیں اور اُن سے کام لیں۔ چنانچہ وہ قیدی اُن کے نوکروں کا کام کرتے ہیں۔ یہ لڑنے والی چیونٹیاں اکثر وہ ہوتی ہیں جو خود عقل نہیں رکھتیں اور نہ کام کر سکیں۔ اس لئے دوسروں کو غلام بنا کر اُن سے

کام لیتی ہیں۔ یہ عام طور سے سرخ ہوتی ہیں۔ یہ اُن چیونٹیوں سے جنگ کرتی ہیں جو مکان بنا کر رہنے والی کام کرنے والی ہوتی ہیں۔ جب ان سرخ چیونٹیوں کو ایسی بستی مل جاتی ہے تو یہ جا کر اپنی آبادی کی چیونٹیوں سے کہدیتی ہیں کہ چلو ہمیں ایسی بستی مل گئی۔ پھر وہ سب مل کر آتی ہیں۔ جنگ کرتی ہیں اور قیدی بنا کر لے جاتی ہیں۔ ان چیونٹیوں کی آپس کی گفتگو کا ذکر ایک انگریزی مصنف اس طرح کرتا ہے۔ (۱۲۳)

ترجمہ:۔ جن چیونٹیوں پر چڑھائی کرتی ہیں وہ چھوٹی کالے رنگ کی محنتی اور پھرتیلی ہوتی ہیں جو لپے ہوئے بنے ہوئے گھروں میں رہتی ہیں اور جو نہایت محنتی اور مستعد ہوتی ہیں۔ جب کچھ سرخ چیونٹیاں ایسی کالی چیونٹیوں کی آبادی دیکھتی ہیں تو وہ اپنے مقام پر جا کر اپنے ساتھیوں سے کہتی ہیں کہ ہم نے یہ آبادیاں دیکھی ہیں پھر سرخ چیونٹیوں کی فوج اُن چیونٹیوں کے قلعہ پر چڑھائی کرتی ہیں۔ جب کالی چیونٹیوں کے سنتری ان سرخ چیونٹیوں کی فوج کو آتا دیکھتے ہیں تو فوراً اندر جا کر خبر کرتے ہیں اور پھر فوراً باہر آجاتے ہیں اور اُنکے پیچھے کالی چیونٹیوں کی فوج ہوتی ہے۔ وہ نہایت بہادری سے اپنے دشمنوں سے لڑتی ہیں۔ لیکن پسپا ہوتی ہیں کیونکہ سرخ چیونٹیاں اچھے سپاہی ہوتے ہیں۔ یہ سرخ چیونٹیاں کالی چیونٹیوں کو پسپا کر کے اُن کے قلعہ میں داخل ہو جاتی ہیں۔ کالی چیونٹیاں چاروں طرف بھاگ جاتی ہیں اور پھر جلدی سے لال چیونٹیاں منہ میں کالی چیونٹیوں کے انڈے اور فوراً پیدا ہوئے بچے لیکر نکل آتی ہیں۔ ان کو لیئے ہوئے وہ اپنے گھر کو واپس مارچ کر جاتی ہیں اور وہاں اپنے قیدیوں کی پرورش اسی طرح کرتی ہیں جیسی اپنے بچوں کی کرتی ہیں۔ یہ بڑی چیونٹیوں کو نہیں لے جاتے۔ جب کالی چیونٹیوں کے بچے بڑے ہو جاتے ہیں تو وہ سارا گھر کا کام کرتے ہیں اور اپنے آقاؤں کی بہت اچھی طرح خدمت کرتی ہیں۔ اُن کو چاٹتے ہیں۔ ان کی مٹی جھاڑتے ہیں اور ان کو اپنی پیٹھ پر لئے پھرتی ہیں۔ اُن کے آقا جو سوائے لڑنے کے اور کچھ نہیں جانتے اس طرح خدمت کرانے کے اتنے عادی ہو جاتے ہیں کہ اگر ان کے یہ نوکر جاتے رہیں تو یہ احمق باوجود ہر قسم کی آسائش کے مرجائیں۔ (ختم ہوا ترجمہ)

دیکھو اصل انگریزی کا ضمیمہ نمبر ۱۸

اصل کے لئے دیکھو ضمیمہ ۱۸

کیسا عمدہ نظام ہے کتنی سمجھ ہے۔ اب تو خداوند تعالے کی قدرت کا اندازہ ہوا۔ بے جان بے عقل مادہ یہ سب کچھ نہیں پیدا کر سکتا۔ اور اگر کہا جائے کہ ارتقاء کے ذریعہ سے یہ عادت پیدا ہو جاتی ہے تو عادت پیدا ہوتے اتنی دیر لگتی ہے کہ ابھی وہ منزل نہ پہنچی اور اس سے پہلے یہ نیست و نابود ہو جائیں۔ یہ منکرین خدا قرآن شریف کے الفاظ کو تو نہیں مانتے تھے کہ چیونٹیاں کیونکر بات چیت کر سکتی ہیں۔ اب اُن کے اُستادوں نے کہہ دیا اب تو ماننے بغیر چارہ ہی نہیں رہا۔

سُبۡحٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَلِيۡمُ الۡحَكِيۡمُ ۝

باب یازدہم

فلسفۂ اسلام اور اس کی خصوصیات

اب تک جو ہم نے بیان کیا ہے وہ فلسفۂ اسلام کا مقدمہ تھا کسی شے یا نظریہ کی ماہیت، حقیقت اور عظمت مقابلہ ہی سے اچھی طرح واضح ہو سکتی ہے۔ لہذا اُس ہی نوع کی دیگر اشیاء یا نظریات کی واقفیت ضروری ہے۔ تاکہ دونوں کے مقابلہ سے عقل سلیم فیصلہ کر سکے کہ ان میں سے کون سی شے یا کونسا نظریہ صحیح ہے۔ قرآن شریف میں بھی یہ ہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں ہم ایک بات جتاتے چلیں۔ قرآن شریف میں ہر فلسفہ اور ہر قسم کے کفر و شرک کی تردید کی گئی ہے۔ جوں جوں ہم اپنے بیان میں آگے چلیں گے یہ امر واضح ہوتا جائیگا۔ حضرت ابراہیم کے زمانہ میں جو نمرود کا زمانہ تھا اور حضرت ابراہیم کے ملک میں جو دجلہ و فرات کے درمیان اور اُن کے ارد گرد کی وادی تھی ستارہ پرستی، چاند پرستی اور سورج پرستی عام تھی۔ ایسی عام کہ دنیا میں رائج ہو گئی تھی چنانچہ مصر کی سورج پرستی کا ذکر ہم کر چکے ہیں اور کواکب و قمر و شمس پرستی ملک یونان و

ایشیائی کوچک میں بھی رائج تھی۔ یونان کے علم الاصنام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے خدا اکثر اپنے تئیں ستاروں میں تبدیل کرتے رہتے تھے اور پھر اُن ستاروں کی پرستش اُن کو خدا سمجھ کر ہوتی تھی۔ حضرت ابراہیم زیادہ تر اس مذہب کی تردید کرتے تھے تو چنانچہ سورۃ الانعام کی آیات ۷۷، ۷۸، ۷۹ میں حضرت ابراہیم کا طریقہ تعلیم درج ہے۔ اُن کے غروب ہونے کی طرف توجہ دلا کر کیسی عمدگی سے حضرت ابراہیم نے اپنی قوم پر واضح کر دیا کہ یہ خدا نہیں ہو سکتے۔ جو کہ اپنے بندوں سے چھپ جائیں وہ ان کے حالات سے واقف نہیں ہو سکتے اور جب حالات سے واقف نہیں ہو سکتے تو وہ خدائی کیا کریں گے۔ غروب ہونے کے معنی نیستی اور تغیر کے بھی ہیں۔ جو خدا نیست ہو جائے یا اُس میں تغیر آ جائے تو وہ خدا صاحبِ قدرت نہیں ہو سکتا۔ عالم الغیب والشہادۃ نہیں ہو سکتا سمیع و بصیر نہیں ہو سکتا۔ اور بغیر ان صفات کے خدا خدائی نہیں کر سکتا۔ اس ہی وجہ سے قرآن شریف میں خدا کی ان صفات پر بہت زور دیا گیا۔ اور بار بار دہرایا گیا ہے۔ ہاں تو ہم کہہ رہے تھے کہ حضرت ابراہیم کا طریقۂ بحث یہ تھا کہ پہلے تو ان مزعومہ خداؤں کی ماہیت اور صفات سے لوگوں کو آگاہ کیا اور پھر بتایا کہ ایسی خاصیتیں رکھنے والے اشیاء خدا نہیں ہو سکتے۔ کلمہ اسلام بھی جھوٹے خداؤں کی نفی سے شروع ہوتا ہے۔ ان جھوٹے خداؤں کی غیر خدایانہ خصائل کا ذکر بھی قرآن شریف میں کیا گیا ہے۔ انکار و اقرار، تبرا و تولا یہ وہ لازم و ملزوم امور ہیں کہ جن کے بغیر حق نہیں معلوم ہو سکتا۔ فلسفۂ اسلام کی برتری لوگوں کے ذہن نشین کرانے کے لئے یہ ہی طریقہ ہم نے اختیار کیا ہے۔ پہلے غلط مذاہب اور غلط فلسفوں کی حقیقت و ماہیت بتائی ہے، اور اُن کی مضحکہ خیز اصول و نظریات کی طرف توجہ دلا کر اب ہم فلسفۂ اسلام کی صداقت ظاہر کرتے ہیں۔

اس ضمن میں فلسفۂ اسلام کی وہ خصوصیات ہماری نظر کے سامنے آتی ہیں جو فلسفۂ اسلام کو دیگر مذاہب اور فلسفوں سے ممیز کرتی ہیں۔ لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ محض چند خصوصیات ہیں۔ دراصل سارا فلسفۂ اور شریعت اسلام ہی دیگر مذاہب اور نظریات فلسفہ سے ممیز ہیں۔ اور یہ ہی اسلام کی خوبی ہے کہ اُس نے مروجہ عقائد اور نظریات میں سے وہ ہی لئے ہیں جو انبیاء سابقین کی تعلیم

کی وجہ سے دنیا میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور چونکہ مرور ایام اور امتداد زمانہ کی وجہ سے وہ بت پرستی کے عقائد سے مخلوط ہو گئے تھے لہٰذا اسلام نے اس کا فرانہ اضافہ کو دور کر کے اصلی ابراہیمی عقائد کو لے لیا ہے اس باب کے تذکرہ خصوصیات کو تو محض آنے والے حصہ دوم کی تمہید تصور کرنا چاہیے۔

(۱) اسلام میں نجات کو ایمان و عمل دونوں پر مبنی کیا ہے۔ بغیر ایمان کے عمل خواہ کتنا ہی نیک ہو نجات کے لئے کافی نہیں۔ اسی طرح ایمان کیسا ہی ہو اگر اس کے مطابق عمل نہیں تو وہ نجات کے لئے کافی نہیں۔ اس کے علاوہ باقی جتنے فلسفے یا مذہب ہیں انھوں نے نجات کا انحصار ان دونوں میں سے فقط ایک پر رکھا ہے۔ دیکھو بدھ مذہب و جین مت میں کرم یا عمل پر کتنا زور دیا گیا ہے۔ لیکن اعتقاد و ایمان کی مطلقاً ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ یہودیت و مسیحیت نے عمل کی مطلقاً پرواہ نہ کی۔ یہاں تک کہ پاپائے اعظم کو اختیار دیدیا گیا کہ وہ روپیہ لے کر عمل کی خامیوں کو نظر انداز کر سکتا ہے۔

(۲) اسلام دین فطرت ہے۔ یعنی انسان کی صحیح فطرت کے مطابق ہے برعکس اس کے دیگر مذاہب فطرت انسان کے بالکل خلاف ہیں۔ اس کی بہت سی مثالیں دوران بحث میں گزرتی رہیں گی۔ اُن میں سے چند یہ ہیں۔

(ا) رہبانیت :۔ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔ کسی دین میں خدا نے رہبانیت کی اجازت نہ دی یہ ان لوگوں نے خود ہی ایجاد کر لی تھی اور اس کو بھی نہ نبھا سکے۔ سورۃ الحدید ۵۷ : ۲۷۔ اس کا مفصل ذکر آگے آتا ہے۔

(ب) اپنے جسم کو بیفائدہ تکلیف میں ڈالنا۔ مذہب ہندو، یہودیت و مسیحیت اور دیگر ادیان کفر میں یہ خیال رائج ہو گیا تھا کہ جتنا اپنے جسم کو تکلیف دو گے اتنی ہی تمھاری روح میں رفعت و صفائی پیدا ہو گی۔ اسلام نے محض نفس امارہ بالسوء کی مخالفت کا حکم دیا ہے۔ جو خواہشات تم کو بدی کی طرف لے جائیں اُن کی مخالفت کرو۔ علاوہ اس کے دنیا میں جو خدا نے تم کو نعمتیں دی ہیں اُن سے جائز طریقے سے متمتع ہوتے رہو۔

(ج) ترکِ دنیا اور لذاتِ دُنیا:- ان مذاہب نے یہ تعلیم دی کہ ترکِ دنیا و لذاتِ دنیا ضروری ہے۔ اسلام انہماک فی الدنیا کو معیوب قرار دیتا ہے۔ ترکِ دنیا کی اجازت نہیں دیتا۔ خداوندِ تعالےٰ نے دنیا اور لذاتِ دنیا کو انسان کے لئے پیدا کیا ہے کہ وہ جائز طریقے سے اور حدودِ عدل کے اندر اُن سے مستفید ہوتا رہے۔ نہ کہ اُن کو بالکل چھوڑ دے۔ اس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

(د) عدل:- کسی فلسفہ یا مذہب نے عدل پر اس طرح اور ان معانی میں زور نہیں دیا جس طرح اور جن معانی میں اسلام نے اس کی تعلیم کی ہے۔ انھوں نے اگر بہت ترقی کی تو یہ کہدیا کہ انسان کو چاہیئے کہ آپس میں اور اپنے تعلقات میں عدل کرے۔ اسلام نے ان امور کے علاوہ انسان کی گفتگو میں بھی اور اس کی خصائل میں بھی عدل کو بہت اہمیت دی ہے۔ اچھی خصائل بھی جب حدودِ معینہ و مقررہ سے آگے نکل جاتی ہیں تو وہ معیوب ہو جاتی ہے۔ شر کیا ہے۔ خدا نے شر کو پیدا نہیں کیا۔ خدا نے تو خیر ہی کو پیدا کیا ہے۔ لیکن جب خیر اپنی حدودِ معینہ سے نکل جاتی ہے تو وہ شر بن جاتی ہے۔ اس کی تفصیل اپنے مقام پر آگے آئے گی۔ یہاں صرف اتنا ہی کہدینا کافی ہے کہ جس تہدید و تنبیہ کے ساتھ اسلام نے عدل کی اہمیت کو ظاہر کیا ہے اور ظلم سے اجتناب کرنے کی ہدایت کی ہے اس طرح کسی اور مذہب و فلسفہ میں نہیں ہے عدل کی خواہش اور ظلم سے نفرت انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ یہ بڑا اہم مضمون ہے۔ اس پر مفصل بحث ہم آگے چل کر کریں گے۔ یہاں اتنا کہدینا ضروری ہے کہ اسلام کا ہر حکم، ہر ہدایت، ہر امر، ہر نہی عدل پر مبنی ہے۔ اگر نیکی کا بدلہ بدی سے دیا تو وہ بھی ظلم ہو گیا۔ ۲۳ : ۳-۱۲

اسی طرح اور بہت سی مثالیں ہیں۔ جن کا ذکر اپنے اپنے مقام پر ہوگا۔ تقیہ، قوانین قرض و سود، نکاح، متعہ، طلاق، حقوق و فرائض زوجین قانون وراثت وغیرہ وغیرہ۔ سب میں فطرتِ انسانی کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

ان سب قوانین کا اصل جزو عدل ہے۔ خداوند تعالےٰ اسلام کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے :- فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۭ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۭ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ڎ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔ الروم ۳۰ : ۳۰

فطرت اللہ کے کیا معنی ہیں۔ خدا کی پیدا کی ہوئی، مقرر کی ہوئی خلقت یہی معنی سب مفسرین نے لئے ہیں۔ علامہ یوسف علی نے اپنے انگریزی ترجمہ میں Handiwork of God; اس کا ترجمہ کیا ہے۔ مسٹر پکتھال نے Nature framed of Allah; کیا ہے۔ مسٹر سیل نے اس کا ترجمہ Institution of God کیا ہے۔ بہر صورت سب کے معنی ایک ہیں۔ خداوند تعالےٰ نے انسان کو اس خلقت پر پیدا کیا ہے۔ اس خلقت کا جزوِ خاص عدل ہے۔ خدا کی خلقت میں ظلم نہیں ہو سکتا۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ (۴ : ۴) اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (۱۰ : ۴۴) یہ کہہ کر کہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے۔

چونکہ دنیا میں ظلم عام ہے لہٰذا ہم لوگوں کی توجہ اس امر کی طرف خاص طور سے دلاتے ہیں کہ اسلام عدل پر مبنی ہے۔ امر واقعہ تو یہ ہے کہ خدا کی مقرر کی ہوئی خلقت میں کوئی بھی برائی نہیں ہے۔ خدا نے انسان کو نہایت اچھی خلقت پر پیدا کیا۔ نیکی ہی نیکی کو پیدا کیا۔ بدی کو خدا نے پیدا ہی نہیں کیا۔ نیک صفت کا برا استعمال اس کو بدی میں تبدیل کر دیتا ہے دوسرے الفاظ میں کہہ سکتے ہیں کہ جب انسان نیک صفت کو عدل کے اصول کے مطابق عمل میں نہیں لاتا وہ ہی بدی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ذرا سا اختیار جو انسان کو دیدیا گیا ہے۔ دنیا کا سارا ظلم اس کا نتیجہ ہے مسلمانوں نے بھی ضد کر کے حکومت کا اختیار اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ دیکھو خلافت یعنی نیابت رسول کی کیا شکلیں بنی ہیں۔ رسول کی نیابت تو نہ رہی۔ کسی اور ہی کی نیابت ہو گئی۔

(۳) دین اسلام میں تبدیلی ناممکن ہے :- اوپر کی آیت ملاحظہ ہو۔ اسلام کو دین القیم کہا گیا ہے۔ خلقتِ خدا پر مبنی ہے۔ خدا کا مقرر کیا ہوا ہے۔ لا تبدیل لخلق اللّٰہ۔ اپنے الفاروق میں جو مولوی شبلی مرحوم نے بعض جگہ صاف طور سے اور بعض جگہ صریح اشاروں سے کہا ہے کہ اسلام میں مختلف زمانوں کی ترقیات کے ساتھ ساتھ چلنے کی اہلیت نہ تھی حضرت حضرت عمر الفاروق نے اس میں ترمیم و تنسیخ کر کے اس میں ترقی کی اہلیت عطا کی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھو ہماری کتاب التفریق والتحریف فی الاسلام۔ اسلام کے علاوہ اور مذاہب جو ہیں اُن سب میں پروہتوں کی ایک جماعت ; Clergy ہوا کرتی ہے۔ جس کو اپنے دین میں موقعہ اور وقت کے مطابق ترمیم و تنسیخ کا حق ہوتا ہے اور وہ اکثر اس حق کو استعمال کرتی رہتی ہے۔ عیسائی پادریوں نے اس حق کو ایسا استعمال کیا کہ مذہب ہی کو مسخ کر دیا۔

(۴) الاعمال بالنیات۔ اسلام میں یہ بھی بہت بڑا اصول ہے۔ اور جو محض اسلام ہی کے ساتھ مختص ہے۔ دیگر مذاہب میں رسومات پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ یہانتک کہ اُن کو جزوِ مذہب بنا کر اعتقاد قائم کیا کہ مذہب محض ان رسومات پر مبنی ہے۔ جو یہ رسوم ادا نہ کرے گا وہ نجات نہ حاصل کر سکے گا۔ اور ان رسومات کو ایسا پیچیدہ اور ناقابل فہم بنا دیا کہ صرف پیشہ ور پروہت ہی ان کو عوام الناس کے لئے ادا کر سکیں۔ پروہتوں اور CLERGY نے عوام الناس پر فوقیت قائم رکھنے اور اُن سے ممیز ہونے کا یہ ذریعہ پیدا کر لیا۔ برعکس اس کے اسلام نے ثواب و نجات کا مدار محض نیت پر رکھا۔ جو کام کیا جائے وہ محض خدا کے لئے کیا جائے ورنہ بیکار ہے اور بسا اوقات جیسے نماز ریائی باعث عذاب ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے :-

مَنْ كَفَرَ بِاللّٰهِ مِنْ بَعْدِ اِيْمَانِهٖٓ اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّۢ بِالْاِيْمَانِ وَلٰكِنْ مَّنْ شَرَحَ بِالْكُفْرِ صَدْرًا فَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ مِّنَ اللّٰهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۱۶ : ۱۰۶)

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَاۗءُوْنَ ۙ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝ (۱۰۷: ۴، ۵، ۶)

بغیر نیت کے نماز نہیں، بغیر نیت کے روزہ نہیں، بغیر نیت کے قربانی نہیں۔ غرض کہ کوئی عمل کوئی فعل نتیجہ بہ ثواب نہیں ہوتا جب تک نیت نہ ہو اور اگر نیت خیر کی ہے۔ لیکن وہ کام پورا نہ ہوا تب بھی پورے کام کا ثواب ملے گا۔ مثلاً اگر حج یا زیارات آئمہ علیہم السلام کے لئے کوئی شخص روانہ ہوا لیکن راستہ میں مرگیا، یا قدرتی طور سے ایسی رکاوٹ حائل ہوگئی جس پر اُس کا اختیار نہیں تو اُس کو پورا ثواب اُس عمل کا ملے گا جس کا اُس نے ارادہ کیا تھا۔ کسی دیگر مذہب میں یہ بات نہیں۔ وہاں تو یہ ہے کہ اگر رسومات صحیح و مکمل طور سے نہ ہوئیں تو کوئی ثواب ہی نہیں۔ جیسا ہم پہلے ابواب میں بیان کر چکے ہیں۔ اسلام کے علاوہ سب MYSTERY CULTS. ہیں۔ مسیحیت نے خواہ مخواہ دین متھرا کی نقل میں اپنے تئیں MYSTERY CULT . بنالیا ہے۔ اسلام میں ثواب عمل کے لئے محض نیت درکار ہے۔ دیگر مذاہب میں محض رسوم درکار ہیں۔

اب چند احادیث و روایات ملاحظہ ہوں۔

جناب رسولخدا فرماتے ہیں:۔ لِيَكُنْ فِي كُلِّ شَيْءٍ نِيَّةٌ حَتَّى فِي الْأَكْلِ وَالنَّوْمِ تمھارے ہر کام میں نیت (رضائے خدا) ہونی چاہیئے یہانتک خواب و خورمیں بھی إِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبَلُ عَمَلًا فِيهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ رِيَاءٍ۔ یعنی خداوند تعالےٰ کوئی عمل قبول نہیں کرتا اگر اُس میں ایک ذرّہ کے برابر بھی ریاء ہے۔

۱۔ جناب علی ابن الحسین علیہما السلام فرماتے ہیں:۔ لا عمل الا بنیتہ۔ کوئی عمل بغیر نیت کے مقبول نہیں ہے۔

۲۔ جناب رسول خدا فرماتے ہیں:۔ نیۃ المومن خیر من عملہ ونیتہ الکافر شر من عملہ وکل عامل یعمل علی نیتہ۔ یعنی مومن کی نیت اُس کے عمل سے بہتر ہے۔ اور کافر کی نیت اُس کے فعل سے بھی زیادہ بدتر ہے اور ہر ایک عمل کرنے والا اپنی نیت کے مطابق عمل کرتا ہے۔

۳۔ جناب امام جعفر الصادق علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جب کوئی بندہ مومن جو

نادار ہے۔ یہ کہتا ہے کہ اگر خدا مجھے وسعت رزق دے تو میں یہ اور یہ نیک کام کروں گا، تو خداوند تعالےٰ اُس کی صدق نیت کو دیکھ کر اُن کاموں کا ایسا ہی اجر اُس کو دیتا ہے کہ جیسے اُس نے وہ کام کئے ہوں۔ کیونکہ خدا بہت کریم ہے۔

۴۔ ابو بصیرؒ سے روایت ہے کہ میں نے جناب امام جعفر الصادقؑ سے پوچھا کہ عبادت کے لئے کیا شرط ہے کہ کوئی شخص کرے اور اُس کو ثواب ملے۔ آپ نے فرمایا کہ حسن النیۃ بالطاعۃ۔

۵۔ لادینیت کے رہنمایان اکثر یہ اعتراض کیا کرتے ہیں کہ انسان کی زندگی کتنی تھوڑی سی ہوتی ہے۔ اُس میں اگر ساری عمر بھی کفر کیا یا بدی کی تو اس کا عذاب اتنا ہمیشگی والا کیوں ہو۔ اور اگر نیکی کی تو اُس کا اجر اتنا طویل کیوں ہو۔ جناب امام جعفر الصادقؑ اُس کے متعلق فرماتے ہیں:۔ انما خلد اهل النار فی النار لان نیاتهم کانت فی الدنیا ان لو خلدوا فیها ان یعصوا الله ابدا وانما خلد اهل الجنة فی الجنة لان نیاتهم کانت فی الدنیا ان لو بقوا فیها ان یطیعوا الله ابدا فبالنیات خلد هؤلاء وهؤلاء ثم تلا قوله قل کل یعمل علی شاکلته قال علی نیته۔ یعنی اہل نار جہنم میں اس وجہ سے ہمیشہ رہیں گے کہ اُن کی نیتیں یہ تھیں کہ اگر وہ دنیا میں ہمیشہ رہتے تو ہمیشہ نافرمانی خدا ہی کرتے رہتے۔ اور اہل جنت جنت میں اس وجہ سے ہمیشہ رہیں گے کہ اُنکی نیتیں دنیا میں یہ تھیں کہ اگر وہ دنیا میں ہمیشہ باقی رہیں تو ہمیشہ خدا کی اطاعت ہی کرتے رہیں گے۔ پس اپنی نیتوں کی وجہ سے یہ دونوں ہمیشہ ہمیشہ اپنی مقام پر رہیں گے پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی، قُلْ كُلٌّ يَعْمَلُ عَلَىٰ شَاكِلَتِهِ (۸۵:۱۷) شاکلتہ کے معنی یہاں نیتہ کے ہیں۔

قرآن شریف کی دیگر آیات سے بھی یہ ہی معنے نکلتے ہیں۔ قرآن شریف ہم کو خبر دیتا ہے کہ حشر و میزان کو دیکھ کر کفار کہیں گے کہ اگر ہم کو واپس دنیا میں بھیجدیا جائے تو ہم عمل نیک کریں گے اور کفر نہ کریں گے لیکن خداوند تعالےٰ فرماتا ہے کہ بَلْ بَدَا لَهُم مَّا كَانُوا يُخْفُونَ مِن قَبْلُ ۖ وَلَوْ رُدُّوا لَعَادُوا لِمَا نُهُوا عَنْهُ وَإِنَّهُمْ لَكَاذِبُونَ ۔ ۶:۲۸۔

اگر ان کو دنیا میں واپس بھیجا جائے تب بھی وہ ایسے ہی اعمال بد کریں گے۔ ممکن ہے کہ کوئی فلسفہ کا دلدادہ کہے کہ پہلے ہی سے کہدیا۔ بھیجکر دیکھا تو ہوتا۔ گویا ساری دنیا کو از سرِ نو واپس بھیج دینا چاہئے تھا۔ سب یہ ہی کہتے۔ جن کے درجات میں کمی تھی وہ بھی یہ کہتے کہ ہم کو بھیج کر دیکھو۔ ہم دوبارہ جاکر بہتر کام کریں گے۔ خدا کے عالم الغیب ہونے کا تو کچھ فائدہ نہ ہوا۔ خدا کیا ہوا جمہوری امریکہ کا پریذیڈنٹ ہوگیا۔

خیرات بھی ریاء کی وجہ سے بیکار رہے ۲:۲۶۴

کیا وجہ ہے کہ اسلام کے علاوہ اور کسی مذہب یا فلسفہ نے اس سختی کے ساتھ نیت پر زور نہیں دیا۔ وجہ یہ ہے کہ اسلام میں خدا کا تخئیل یہ ہے کہ وہ انسان کی نیت اور دل کے ارادوں سے واقف ہے۔ عالم الغیب ہے۔ ان اللہ یحول بین المرء و قلبہ۔ اور کسی مذہب میں یہ تخئیل نہیں ہے۔ یہودیت و مسیحیت میں بھی یہ ہی تخئیل تھا۔ لیکن جب وہ دونوں مذہب مسخ ہوئے تو یہودیوں میں احباروں نے اور عیسائیوں میں پوپ نے اس امر میں خدا کی جگہ لے لی۔ اور نذرانہ لے کر مغفرت اور جنت کے پروانے جاری کرنے لگے۔

(۵) حُبِّ خدا۔ قرآن شریف میں حُبِّ خدا پر بہت زور دیا گیا ہے۔ خدا سے محبت کرنے کے کیا معنی۔ خدا سے کس طرح محبت کریں۔ مسلمانوں کے ایک فرقہ نے اس کے معنی عجیب لئے ہیں۔ خدا کے تخئیل میں زلف و عارض، خالِ مشکیں، لب لعل، و انداز معشوقانہ کو شامل کرتے ہیں۔ پھر جامِ مے کے اندر عکسِ رُخِ یار دیکھتے ہیں، خراباتِ پیرِ مغاں میں نورِ عجیب دیکھتے ہیں۔ رازِ درونِ پردہ ان کو رندانِ مست سے ملتے ہیں۔ ذرا ان اشعار کو تو ملاحظہ فرمائیے:۔

برنیامد از تمنائے لبت کامم ہنوز
بر امید جام لعلت دردی آشامم ہنوز

روز اوّل رفت دینم در سرِ زلفینِ تو
تا چہ خواہد شد دریں سودا سر انجامم ہنوز

در ازل داد ست مارا ساقی لعلِ لبت
جرعۂ جامی کہ من سرگرم آنجامم ہنوز

غور تو کیجئے۔ یہ خدا کا کیا تخیل ہوا۔ کیا خدا سے محبت کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایک نہایت حسین نو عمر معشوق کا خیال معہ اُس کے زلف و عارض و خال کے کیا جائے کیا یہ محبت و عشق جام و مے و خرابات، رندانِ مست کے ہی خیالات میں ظاہر ہو سکتی ہے ان الفاظ سے تو ڈر لگتا ہے کہ معلوم نہیں یہ لوگ اپنے دل میں خدا کا کیا اور کس شکل میں تصور کرتے ہیں۔ اور پھر اس سے اظہار محبت کرتے ہیں۔ اور معلوم نہیں "وصل" سے کیا مراد لیتے ہیں۔ لیکن قرآن شریف بھی خدا سے محبت کرنے کا طریقہ بتاتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔ ۳ : ۳۱

کہہ دے اے رسول کہ اگر تم خدا سے محبت کرتے ہو تو میری اطاعت و پیروی کرو خدا بھی تم کو دوست رکھے گا اور تم کو تمہارے گناہ بخش دے گا اور خدا بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔ گویا خدا سے محبت کرنے کے یہ معنی ہیں کہ اُس کے رسول کی اطاعت کی جائے اور خدا کا محبت کرنا یہ ہے کہ وہ تمہارے گناہ بخشدے گا۔ کیسی سیدھی سی بات ہے جس کو محفلِ قوالی کے "قال و حال" میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ جو طریقہ قرآن شریف نے بتایا ہے وہ دنیا کے کسی اور مذہب میں نہیں پایا جاتا۔ حب خدا کا لفظ تو مسیحیت میں ملتا ہے۔ لیکن کس طرح محبت کی جائے، نہیں بتایا گیا۔

(۶) اطاعت رسول - چونکہ تصفیہ قلب و تزکیٔ نفس اطاعت رسول پر مبنی ہے لہذا قرآن شریف میں اس پر بہت زور دیا گیا ہے۔ قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۳ : ۳۲

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۴ : ۸۰

ایسی بہت سی آیات ہیں جن میں اطاعت رسول پر زور دیا گیا ہے۔

اطاعت رسول کے کیا معنی ہیں۔ اور اس سے کیا نتائج نکلتے ہیں یہ ہم آگے چل کر عنوان نبوت کے تحت میں بیان کریں گے۔

(۷) دین یسر - فقہ اسلام کی یہ بہت بڑی خصوصیت ہے کہ یہ مطابق فطرت انسانی ہے۔ لہذا سہل ہے: يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۲ : ۱۸۵

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر انسان اپنی سہولت و ضرورت کے مطابق نئے قیاس سے اوامر و نواہی خداوندی کی تاویل کرتا رہے۔ اور جو اُس کی خواہش کے مطابق ہو اُس کی پیروی کرے اور جو اُس کی خواہش کے خلاف ہو اُس کو نظر انداز کر دیا کرے۔ حدود و قیود تو ہر ایک نظام میں ہوتے ہیں اور اسی طرح اسلام میں ہیں۔ مثلاً کوئی شخص نمازوں اور روزوں کی تعداد میں اپنی سہولت کے مطابق کمی بیشی نہیں کر سکتا۔ دنیا میں کسی جاندار کی زندگی حیوانی ہو کہ انسانی بغیر حدود و قیود کے نہیں ہے۔ اُس انسان اور حیوان کو پاگل سمجھا جاتا ہے جو ان حدود و قیود کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ انسانی عقل اور حیوانی عقل دونوں میں حدود و قیود ہیں۔ اسلام کو دین یسر یعنی آسان دین کہتے ہیں دین بے قیود نہیں کہتے۔

(۸) **شفاعت**: اسلام کی شفاعت میں اور دیگر ادیان کے تخئیل شفاعت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ کفارِ عرب کا تو عقیدہ تھا کہ ہمارے لئے ہماری خواتین خدا یعنی لات و منات و عزیٰ کافی ہیں۔ خواہ ہمارے اعمال کیسے ہی خراب کیوں نہ ہوں وہ ہماری شفاعت خدائے اعظم سے کریں گی اور اُس خدائے اعظم کا فرض ہو گا کہ اُن کی شفاعت قبول کرے۔ یونانیوں کے علم الاصنام میں تو یہ شفاعت جبر کی حد تک پہنچ جاتی تھی۔ خدائے اعظم Zeus، کو باقی خدا اتنا مجبور کرتے تھے کہ وہ ان کی شفاعت کو جو دراصل حکم ہوا کرتی تھی، ماننے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ مسیحیت میں خدا کی اس مجبوری کا اظہار دوسری طرح کیا گیا ہے۔ جب خدا نے شیطان کی زیادتیاں دیکھیں اور دنیا میں گناہ کی کثرت کا ملاحظہ کیا تو اُسے بہت رنج ہوا۔ لہذا اُس نے اپنے بیٹے حضرت عیسیٰ کو بنی نوع انسان پر قربان کیا اور صلیب کے لئے پیش کیا۔ تمام بنی نوع انسان یا یوں کہو کہ دنیائے مسیحیت کے گناہوں کو اپنے اوپر لے کر حضرت عیسیٰ تو صلیب پر چڑھ گئے۔ اور اب بنی نوع انسان جو مسیحیت میں داخل ہو گئے اپنے گناہوں سے پاک ہو گئے اور بخشے جائیں گے اس کو (Atonement) کہتے ہیں۔ جب حضرت عیسیٰ کی خلافت پاپائے اعظم تک پہنچی تو انھوں نے بھی اس حق شفاعت میں سے کچھ حصہ لیا اور پروانہ نجات (Papal Dispeusations) گنہگاروں کو دیکر اور نذرانہ لیکر اُن کی نجات کے ضامن بن گئے۔

لیکن اسلام میں شفاعت کا تصور بالکل مختلف ہے کوئی شخص خدا سے سفارش

شفاعت ہی نہیں کرسکتا جب تک کہ خداوند تعالےٰ اُس کو شفاعت کرنے کی اجازت نہ دے۔ من ذاالذی یشفع عندہٗ الا باذنہ۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اگر اجازت بھی مل گئی تو وہ اُس شخص ہی کی شفاعت کرسکتا ہے جس کی شفاعت کرنے کی خدا اجازت دے۔ کیسے لوگ سفارش کرسکتے ہیں۔ یعنی کیسے لوگوں کو شفاعت کرنے کی اجازت ملے گی اس کو بھی خداوند تعالےٰ نے بتا دیا ہے: وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ۭ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ ۝ لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ ۝۲۷ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ۝۲۸ ۲۱: ۲۶، ۲۷، ۲۸۔

ترجمہ:۔ اور (اہل مکہ) کہتے ہیں کہ خدا نے (فرشتوں کو) اپنی اولاد (بیٹیاں) بنا رکھا ہے (حالانکہ) وہ اس سے پاک و پاکیزہ ہے بلکہ (وہ فرشتے) (خدا کے) معزز بندے ہیں۔ یہ لوگ اس کے سامنے بڑھ کر بول نہیں سکتے۔ اور یہ لوگ اسی کے حکم پر چلتے ہیں۔ وہ (خدا) جانتا ہے جو کچھ اُن کے سامنے ہے اور جو کچھ اُن کے پیچھے ہے۔ اور یہ لوگ اس شخص کے سوا جس سے خدا راضی ہو کسی کی سفارش بھی نہیں کرتے اور یہ لوگ خود اُس کے خوف سے (ہر وقت) ڈرتے رہتے ہیں۔

اگرچہ یہ آیات فرشتوں کے متعلق ہیں اہل مکہ کے اس قول کی تردید میں ہیں کہ فرشتے خدا کی بیٹیاں ہیں اور ہماری سفارش اور شفاعت کرتی ہیں لیکن دراصل ان میں "مکرموں" کے اوصاف بیان کئے گئے ہیں۔ خدا کے بندوں میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو مکرموں کی تعریف میں آتے ہیں۔ ان کی صفات میں سے ایک یہ صفت بھی ہے کہ وہ شفاعت کرسکتے ہیں۔ چونکہ وہ ہر وقت خدا کے حکم پر چلتے رہتے ہیں اور اُس کی رضا کے شناسا ہیں لہذا وہ سفارش اور شفاعت بھی اُن لوگوں کی کرتے ہیں جن سے خدا راضی ہے۔

صلحاء، شہداء و صدیقین کا طبقہ مکرموں کا ہے۔ یہ ہم کو اس آیت سے معلوم ہوا: قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ ۝۲۶ بِمَا غَفَرَ لِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ ۝۲۷ ۳۶: ۲۶، ۲۷ ←

جب حبیب نجار کو اُن کی قوم نے بوجہ اُن کے ایمان لاتے تھے قتل کر دیا

اور موت کے بعد جو عزت خدا نے اُن کو دی اُس کو دیکھ کر اُنھوں نے کہا۔

ترجمہ:- میرے پروردگار نے جو مجھکو بخشدیا اور مجھے معزز لوگوں کی جماعت میں شامل کردیا کاش میری قوم کے لوگ اس کو جانتے۔

ہمارا الیقین کامل ہے کہ جناب محمد مصطفےٰ اور اُن کے آئمہ اہلبیت علیہم السلام کو خداوند تعالیٰ نے شفاعت کی عام اجازت دے رکھی ہے۔ جس شخص کی وہ چاہیں سفارش و شفاعت کرسکتے ہیں لیکن ان کو خطاب کرکے ہمیں خبر دی گئی ہے کہ وَمَا تَشَاۤءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّشَاۤءَ اللّٰهُ - ۷۶ : ۳۰

(۹) **شکر** - ہر ایک نعمت جو انسان کو ملے اس کے لئے خدا کا شکر ادا کرنے کی بہت تاکید کی گئی ہے۔ وَاِذۡ تَاَذَّنَ رَبُّكُمۡ لَئِنۡ شَكَرۡتُمۡ لَاَزِيۡدَنَّكُمۡ وَلَئِنۡ كَفَرۡتُمۡ اِنَّ عَذَابِىۡ لَشَدِيۡدٌ - ۷،۱۴ - اگر شکر کیا تو نعمت زیادہ ہوگی اگر کفرانِ نعمت کیا تو خدا کا عذاب نازل ہوگا۔

نَّجَّيۡنٰهُمۡ بِسَحَرٍۙ ۝ نِّعۡمَةً مِّنۡ عِنۡدِنَا ؕ كَذٰلِكَ نَجۡزِىۡ مَنۡ شَكَرَ ۵۴ : ۳۴

۳۵ - ہم اسی طرح شکر کرنے والوں پر اپنا فضل و کرم کرتے ہیں۔

اِعۡمَلُوۡۤا اٰلَ دَاوٗدَ شُكۡرًا ؕ وَقَلِيۡلٌ مِّنۡ عِبَادِىَ الشَّكُوۡرُ ۳۴ : ۱۳

ترجمہ - اے آلِ داؤد تم شکر کرو۔ میرے بندوں میں سے بہت کم شکر کرنے والے ہیں۔

جناب امام جعفر صادق فرماتے ہیں: توراۃ میں لکھا ہے کہ تم شکر کرو اُس کا جو تم کو کوئی نعمت دے، اور نعمت دو اُس کو جو تمہارا شکر ادا کرے۔ کیونکہ اگر تم نے شکر ادا کر دیا تو پھر نعمتوں کے لئے زوال نہیں ہے اور اگر تم نے کفرانِ نعمت کیا تو پھر اُن کے لئے بقاء نہیں ہے۔

جناب امام جعفر صادق نے فرمایا کہ تین چیزیں ایسی ہیں کہ اُن کے ہوتے ہوئے کوئی امر نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ دعا مصیبت کے وقت، استغفار گناہ کے وقت اور شکر نعمت کے وقت۔

شکر کے ادا کرنے کا طریقہ آپ بتاتے ہیں: شکر النعمة اجتناب المحارم وتمام الشکر قول الرجل الحمد للہ رب العالمین یعنی شکر اس طرح ادا

ہوتا ہے کہ حرام امور سے پرہیز کیا جائے اور تمام شکر ہے کہ انسان سمجھے الحمد للہ رب العالمین۔

شکر قول وفعل و دل سے ادا ہوتا ہے۔ اما بنعمۃ ربک فحدث۔ اور ارشاد ہوتا ہے۔ اَحْسِنْ کَمَا اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَیْكَ ۲۸ : ۷۷

(۱۰) **صبر**۔ قرآن شریف میں صبر کی بہت تاکید ہے اور صابر کا بہت اعلیٰ درجہ ہے۔ تمام آیات کا یہاں نقل کرنا باعثِ طوالت ہوگا۔ آئمہ حق کی خاص شناخت صبر سے ہوتی ہے۔ اور کسی دین میں صبر کو یہ درجہ نہیں دیا۔ مصائبِ دنیا و آلام زندگی کی تشریح ہی بہت حد تک صبر اور امتحان کے تصورات سے ہوتی ہے۔ جناب امام جعفر علیہ السلام فرماتے ہیں۔ الصبر من الایمان بمنزلۃ الراس من الجسد فاذا ذھب الراس ذھب الجسد کذلک اذا ذھب الصبر ذھب الایمان۔

ترجمہ۔ صبر کو ایمان سے وہ ہی نسبت ہے کہ جو سر کو جسم سے ہے۔ جب سر چلا جاتا ہے تو جسد بھی مردہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب صبر چلا جاتا ہے تو ایمان بھی گم ہو جاتا ہے۔

جناب امیر علیہ السلام فرماتے ہیں۔

الصبر صبران صبر عند المصیبۃ حسن جمیل واحسن من ذالک الصبر عند ماحرم اللہ عزوجل علیک والذکر ذکران ذکر اللہ عزوجل عند المصیبۃ وافضل من ذلک ذکر اللہ عند ماحرم اللہ علیک فیکون حاجزا۔

ترجمہ:۔ صبر دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو صبر مصیبت کے وقت۔ یہ بھی بہت اچھا صبر ہے۔ لیکن اس سے بھی بہتر صبر وہ ہے جو اُن چیزوں سے کیا جائے جو خدا نے تم پر حرام کر دی ہیں۔ اسی طرح ذکر بھی دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک تو ذکر خدا مصیبت کے وقت۔ اور اس سے بھی افضل ذکر خدا وہ ہے جو محرمات سے بچنے کے وقت کیا جائے۔

جناب امام محمد باقر علیہ السلام فرماتے ہیں۔ الجنۃ محفوفۃ بالمکارہ

والصبر فمن صبر علی المکارہ فی الدنیا دخل الجنۃ وجھنم محفوفۃ باللذات والشھوات فمن اعطی نفسہ لذتھا وشھوتھا دخل النار۔

ترجمہ:۔ جنت مصائب دنیا اور صبر کے درمیان ہے۔ جس نے دنیا کے مصائب و آلام پر صبر کیا وہ جنت میں داخل ہوا۔ اور جہنم لذات و خواہشات کے درمیان ہے جس نے اپنے نفس کی لذات و خواہشات کو پورا کیا وہ دوزخ میں داخل ہوا۔

(۱۱) اتفاقات:۔ اسلام میں اتفاق (CHANCE) کوئی شے نہیں، جو کچھ ہوتا ہے یہاں تک کہ اگر آدمی کا پیر پھسل کر وہ گر جاتا ہے یا تیز موٹر کار کی زد میں آ جاتا ہے تو اُس کو بھی اتفاق نہیں کہا جائے گا۔ جس طرح نپولین کی رائے میں ناممکن کا لفظ لغت سے نکال دینا چاہئے اسی طرح اسلامی ڈکشنری سے اتفاق کا لفظ نکال دینا چاہئے۔ جو کچھ ہوتا ہے وہ خدا کے حکم و ارادہ و اجازت سے ہوتا ہے۔ یا اُس کے نہ روکنے کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جیسا قرآن شریف میں درج ہے۔ اگر خدا چاہے تو کوئی کفر ہی نہ کرے۔ اور اگر خدا روک دے تو شیطان بدی ہی نہ کر سکے۔

(۱۲) حقیقتِ دنیا اور مقصدِ حیاتِ انسان: صحیح فلسفہ کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ دنیا کی حقیقت کو معلوم کرے اور بتائے کہ اس دنیا میں انسان کا مقصدِ حیات کیا ہے۔ اور اُس کو وہ کس طرح پورا کر سکتا ہے تمام فلسفے اور سب غیر الہامی مذاہب اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ حیاتِ انسان کا مقصد اس دنیا ہی میں پورا ہو جاتا ہے۔ یا ہو جانا چاہئے۔ اگر انہوں نے اپنے طریقہ سے کسی مافوق الطبیعیات طاقت کو مانا تو فقط اس لئے کہ وہ انہیں اس دنیا کی لذات سے بہرہ اندوز کرے اولاد عطا کرے۔ مویشیوں میں کثرت ہو۔ فصلیں اچھی اور وافر ہوں۔ تجارت میں فائدہ ہو۔ اگر یہ ہو گیا تو بس اُن کا مقصدِ حیات پورا ہو گیا۔ اور اس ہی مقصد کے حصول کے لئے وہ اپنے خود ساختہ خداؤں سے التجا کرتے تھے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ کیا یہ صحیح مقصدِ حیاتِ انسان ہے۔ اگر اس دنیا میں انسان کو مکمل خوشی حاصل ہو جاتی ہے یا ہو سکتی ہے اور جو جسمانی اور روحانی قوائے عملیہ و عقلیہ اس کو دئیے

گئے ہیں اون کا پورا پورا ارتقاء اور نشو ونما اس دنیا کی زندگی میں ہو جاتا ہے اور جو طاقتیں یا ترقی کے امکانات انسان میں ودیعت کیے گئے ہیں وہ خاطر خواہ پورے ہو جاتے ہیں اور انسان کو پوری پوری تسکین اور خاطر جمعی حاصل ہو جاتی ہے تو ہم نتیجہ نکالیں گے کہ ان حکماء کا مقرر کردہ مقصدِ حیات صحیح ہے۔ اور ہماری ساری کوششیں اس دنیا کی زندگی کے لئے ہونی چاہئیں لیکن معاملہ برعکس ہے اور ہماری قوائے جسمانیہ اور روحانیہ کی پوری تکمیل کیلئے یہ زندگی کافی نہیں ہے۔ آخری عمر میں جب ہم موت کے نزدیک ہوتے ہیں اور گزری ہوئی زندگی کو مڑ کر دیکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے قوائے جسمانیہ اور روحانیہ کے ارتقاء کے لئے تو ابھی بہت وسیع میدان اور عظیم الشان امکان باقی ہے۔ یہ گزری ہوئی زندگی تو محض ایک خواب پریشان معلوم ہوتی ہے۔ جس کی ابھی تعبیر بھی نہیں نکلی۔ شوق وخواہشِ پرواز بہت لیکن فضائے پرواز کچھ بھی نہیں۔ ہم نے اس زندگی سے پایا کیا۔ کچھ نا امیدیاں، کچھ غم والم، کچھ حسرتیں، یہ ہیں وہ ساتھی جن کو اپنے ساتھ لے کر ہر ایک انسان قبر میں جاتا ہے، خواہ بادشاہ ہو خواہ فقیر۔ دنیا کی ساخت ہی ایسی ہے کہ انسان کے لئے اس میں خوشی ناپید ہے۔ جن راحتوں کو ہم نے بہت تکلیف اٹھا کر حاصل کیا تھا وہ راحتیں حاصل ہوتے ہی تکفیر میں مبدل ہو گئیں جس حسن پر ہم جان دیتے تھے وہ کہاں گیا۔ جس عشق پر ہم کو ناز تھا وہ تو محض حماقت ثابت ہوا۔ جوانی میں بہت اچھے اچھے خواب دیکھا کرتے تھے۔ وہ خوابوں کی رات بھی چشم زدن میں گزر گئی اصلی خوشی نہ بچپن میں ملی اور نہ جوانی میں۔ بڑھاپے میں تو خوشی کا لفظ بھی زبان پر آنا ایک مضحکہ خیز بات معلوم ہوتی ہے۔ دنیا کی راحت بھی کوئی راحت ہے۔

ابو العتاھیہ نے کیا اچھا کہا ہے۔ ؎

حَلَاوَتُهَا مَمْزُوْجَةٌ بِمَرَارَةٍ　　　　وَرَاحَتُهَا مَمْزُوْجَةٌ بِعَنَاءٍ

دنیا کی مٹھاس میں کڑواہٹ ملی ہوئی ہے اور اس کی راحتوں میں تکلیفیں شامل ہیں۔ غالب کہتے ہیں۔ ؎

قیدِ حیات وبندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں\
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

شیخ سعدی نے سچ کہا ہے کہ آنچہ پایندگی ندارد دلبستگی رانشاید دنیا کی کسی شے کو کسی حالت کو ثبات نہیں۔ دوام نہیں۔ ہماری زندگی ایک بہتا ہوا دریا ہے۔ جس کا ہر قطرہ گزرنے کی حالت میں متحرک ہے۔

چنانچہ کہنے والا کہتا ہے ؎

دگر گوں می شود احوال عالم ہر ساعت ہر لحظہ ہر دم

ایسی حالت میں خوشی و راحت کی تلاش بے سود ہے انسان کی زندگی محض ایک خیال ہے۔ انسان ماضی کی یاد میں اور مستقبل کی امید میں زندگی بسر کرتا ہے اور یہ دونوں خیالی حالتیں ہیں۔ حال تو ایسی تیزی سے گزر رہا ہے کہ گویا ہے ہی نہیں۔ جو لمحہ آیا وہ فوراً ماضی میں تبدیل ہوگیا اور جو نہیں آیا وہ مستقبل میں ہے۔ اس خیالی زندگی کی بھی کوئی حقیقت ہوئی۔ گزرے ہوئے عیش کی یاد۔ آنے والے عیش کی امید۔ اس ہی امید و بیم میں انسان کی زندگی گزرتی ہے۔ دنیا کی اگر کسی بات پر یقین ہو سکتا ہے تو وہ تین ہیں: ظلم، دنیا کی بے ثباتی اور موت۔

جب حالت یہ ہے تو مذہب کی ضرورت ظاہر ہے۔ دنیا میں بہت سے مذاہب ہوئے ہیں اور اب اس لادینی کی حالت میں بھی ہیں جن کو خدا سے انکار ہے انھوں نے بھی اپنا کوئی خدا مقرر کر لیا ہے۔ مذہب کا نام بدل کر ; Ideology رکھ لیا ہے۔ اور اس پر عمل پیرا ہونا اپنی زندگی کا مقصد سمجھتے اور اس کے لیے جان دیتے ہیں۔ صرف خدا والے مذہب کو بدنام کرتے ہیں اور غیر خدا کے مذہب پر جان دیتے ہیں۔ غرضکہ کسی نہ کسی مذہب کا اختیار کرنا ضروری ہوا۔ قدرتاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ کونسا مذہب اختیار کرنا چاہیے۔ ظاہر ہے کہ وہ مذہب اختیار کیا جائے جو حیات انسان کی ضروریات کو باحسن وجوہ پورا کرتا ہے۔ اور جو سوالات و مشکلات پیدا ہوتی ہیں اُن کا بہترین حل پیش کرتا ہے۔

وہ ضروریات و مسائل مشکلہ یہ ہیں:۔

مسائل برائے حل۔

۱۔ ہماری زندگی مخالف عناصر، مخالف ماحول اور مخالف آفات سے گھری ہوئی ہے۔ ان سب کو قابو میں رکھنے اور مغلوب کرنے کے لیے کوئی طاقت

ہے یا نہیں۔

۲۔ اتنا بڑا نظامِ کائنات ہے۔ لیکن باوجود اس کے اُس میں ضبط و نظم و نسق ایسا ہے کہ ہر ایک شے اپنے اپنے کام میں لگی ہوئی ہے۔ آیا ان سب کا کوئی خالق و منتظم و مدبّر ہے یا نہیں ہے۔ اگر ہے تو کون ہے۔ اُس کی صفات کیا ہیں۔

۳۔ حادثاتِ زمانہ کے سامنے ہم بے بس نظر آتے ہیں۔ ہمارے چاروں طرف بد اعمالی، عیاری، مکر و فریب و دغابازی ہے۔ دنیا کے گوشہ گوشہ میں ظلم اور زیادتی ہے۔ آیا ہمیں دیکھنے والا اور ہمارے حالات پر نظر رکھنے والا کوئی ہے یا نہیں۔ اس ظلم کی دادرسی کہیں ہو گی یا نہیں۔

۴۔ کیا ہماری زندگی یہیں ختم ہو جاتی ہے اور ہم کیڑے مکوڑوں کی طرح پیدا ہو کر مر جاتے ہیں۔ ہماری طاقتوں اور ہماری خواہشوں کے لئے وسعتِ زمان و مکان کچھ بھی نہیں۔ موت کیا ہے۔ ہماری اصل زندگی کیا ہے۔

۵۔ اس دنیا کے بنانے والے اور اس نظام کے ترتیب دینے والے نے دنیا کو ایسا کیوں نہ بنایا جس میں راحت و آرام، اور عدل و اطمینان اور امن و امان ہوتے۔ دنیا سے خوشی کیوں مفقود ہے۔

۶۔ اندریں صورت دنیا کے علائق سے وابستہ رہنا اچھا ہے۔ یا دنیا سے علٰحدہ ہو کر رہبانیت اختیار کرنی چاہیئے۔

۷۔ جب خوشی مفقود ہے، رنج و غم کے دائرہ میں ہم پھنسے ہوئے ہیں۔ موت ایک نہ ایک دن آنی ضرور ہے۔ تو آج ہی خودکشی کر کے کیوں نہ اس سارے جھگڑے ہی کو ختم کر دیں۔

یہ تو ہم نے دیکھ لیا کہ دیگر مذاہب اور فلسفے ان سوالات کو کس طرح حل کرتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اسلام ان کو کس طرح حل کرتا ہے۔ اسلام کا فلسفہ اور اُس کی تعلیم یہ ہے کہ خالق و مدبّرِ کون و مکاں صرف ایک ہے۔ اگر ایک سے زائد ہوتے تو عالم میں فساد پیدا ہو جاتا اور یہ اتحاد اور یکرنگی نہ ہوتی۔ اُس کے قبضۂ اقتدار میں تمام کون (BEING) اور مکان (SPACE) ہیں۔ اُس کے علم میں عالم کی چھوٹی سے چھوٹی شے ہے۔ اگر پتہ گرتا ہے تو اُس کو علم ہے۔ اگر ایک چڑیا

مرجاتی ہے تو اس کا علم اُس کو ہے۔ ہمارے افعال، ہمارے اعمال، ہمارے دل کے راز، ہماری زبان کے الفاظ سب سے اُس کو واقفیت ہے۔ ہمارے حالات کو جانتا ہے۔ جو رنج ہم کو پہنچتا ہے اُس سے واقف ہے، جو راحت ہم کو ملتی ہے اُس کو جانتا ہے۔ ہماری تمام مشکلات سے واقف ہے۔ ہماری کمزوریوں اور مجبوریوں سے آگاہ ہے۔ رحمان بھی ہے۔ رحیم بھی ہے۔ اور اگر کوئی گناہ میں جان بوجھ کر اُس کی عمداً نافرمانی کر کے اصرار کرتا ہے تو قہار و جبار بھی ہے۔ ہمارے دل کے اسرار اور ہماری نیت و ارادے سے وہ واقف ہے۔

دنیا میں جو واقعہ ہوا ہے، ہو رہا ہے اور آئندہ ہوگا اُس سب کا علم اس کو خلقت دنیا و مافیہا سے پہلے تھا۔ اور وہ سب اُس کی اجازت سے ہوتا ہے۔ دنیا میں خیر بھی ہے، شر بھی ہے، ظلم بھی ہے۔ طغیان بھی ہے۔ خدا سے بغاوت و نافرمانی بھی ہے۔ خدا کے نیک بندے بھی ہیں جو اُس کی عبادت و اطاعت میں مشغول رہتے ہیں۔ اور حتی المقدور اُس کے اوامر نواہی کی پابندی کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ خدا کی اجازت سے ہے۔ اگر خدا چاہتا تو قضا و قدر صادر کرتا اور پھر کوئی اُس کی نافرمانی نہ کر سکتا گناہ نہ کرتا۔ ہم نے اجازت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ انسان کی زبان محدود ہے۔ اور اس میں اجازت کے علاوہ کسی اور لفظ سے یہ مفہوم ادا نہیں ہو سکتا۔ خداوند تعالیٰ نے انسان کو ایک حد تک صاحب اختیار بنایا ہے۔ اور یہ ظلم و شر و بغاوت اس ہی اختیار کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ ورنہ دنیا کی خلقت اور اُس کا نظام اور انسان کی فطرت بری نہیں ہیں۔ انسان کو خیر و شر کا علم دے کر صاحب اختیار بنا دیا گیا ہے۔ اور ساری خرابیاں اُس کے اختیار و قیاس سے پیدا ہوئیں۔ اس اختیار نے انسان کو شیطان کے دھوکہ میں آنے کا امکان پیدا کر دیا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کو یہ اختیار کیوں دیا گیا اور شیطان کو اس کے بہکانے کے لئے مہلت کیوں دی گئی۔ جہاں تک ہم نے اس پر غور کیا دو وجوہات نظر آتی ہیں۔ انسان کو اختیار کیوں دیا گیا؟ اس وجہ سے کہ اُس نے خود ضد کر کے

خدا سے آسے حاصل کیا۔ خدا نے تو حکم دیدیا تھا کہ فلاں درخت کے نزدیک تک نہ جانا۔ لیکن انسان نے اُس درخت کا پھل کھا لیا۔ باوجود خدا کے صریح حکم کے اُس نے اپنے قیاس اور اختیار پر عمل کیا۔ خدا نے فرمایا کہ اس جگہ تم میرے حکم کے خلاف اپنا قیاس اور اختیار استعمال نہیں کر سکتے اس جگہ سے علاحدہ ہو جاؤ اور نیچے چلے جاؤ۔ میں نے تم کو ایک حد تک اختیار دیا جس کی تم کو خواہش تھی۔ تم کو خیر و شر کا علم دے دیا گیا ہے (فالھمھا فجورھا وتقواھا) باوجود ان سب باتوں کے میں تمہارے پاس تم ہی میں سے اپنے نبی و ہادی بھیجوں گا۔ اُن کے کہنے پر عمل کرو گے تو پھر تمہارے لیے رستگاری ہے اور اس جنت میں پھر آجاؤ گے۔ اور اگر نہیں تو اپنے ساتھی شیطان کے ساتھ دوزخ میں جلنا۔

شیطان کو اس وجہ سے مہلت دی گئی کہ وہ اپنے اس دعوی کو ثابت کر لے کہ میں انسان سے افضل ہوں۔ میں تیرے سارے بندوں کو ورغلاؤں گا۔ خدا نے فرمایا کہ تو جن کو ورغلائے گا اُن سب کو تیرے ساتھ دوزخ میں ڈالدوں گا لیکن تو میرے سچے اور مخلص بندوں کو نہیں بہکا سکیگا۔ لہذا ثابت ہو گیا کہ انسان اپنی فطرت کے لحاظ سے شیطان سے افضل ہے۔ اگر شیطان کو یہ مہلت نہ ملتی تو ثابت ہوتا کہ شیطان کا دعوٰی درست ہے۔ لہذا مہلت ملی اور اس لفظ کے ہر وسیع معنی میں مہلت ملی۔ اس وسعت کے یہ معنی ہوئے کہ خداوند تعالے جبراً نہیں بلکہ اُن قوانین قدرت کے مطابق جو حیات انسانی پر حاوی ہیں انسان کی ہدایت کرے گا اور شیطان کو بھی مہلت یعنی اجازت ملی کہ اُن ہی اسباب و قواعد کو انسان کی گمراہی کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔ شیطان کے چیلنج کے ساتھ خدا نے بھی شیطان کو ایک چیلنج دیا کہ تو میرے مخلص بندوں کو نہیں ورغلا سکے گا۔ وہ مخلص بندے جو اپنی اُس فطرت پر قائم ہیں جس کی وجہ سے میں نے تجھ پر آدم کو فوقیت دی۔ اب اگر شیطان خدا کے مخلص بندوں کو بھی گمراہ کر سکے تو خداوند تعالے کا چیلنج فیل ہو جاتا ہے۔ لیکن تاریخ عالم گواہ ہے کہ شیطان خدا کے مخلص بندوں کو بہکانے میں کامیاب نہیں ہوا۔ وہ لوگ نبوت کی حقیقت کو نہیں سمجھے جو کہتے ہیں کہ شیطان کے ورغلانے سے جناب رسولخدا نے عرب کی خدائیں تسلیم

کے لئے کہہ دیا کہ تلک غرانیق العلیٰ اور ان کی شفاعت قبول کی جائے گی۔ ان امور کی تفصیل آگے چل کر لے گی۔ اس بیان سے مسائل جبر و اختیار اور قضا و قدر حل ہو جاتے ہیں۔ ان کی بحث میں ہمیشہ اجازت یعنی مہلت اور حکم یعنی قضا کے فرق کو مدنظر رکھنا چاہیئے۔ قرآن شریف میں اکثر کہا گیا ہے کہ جس کو ہم چاہتے ہیں ہدایت کر دیتے ہیں۔ اور جس کو چاہتے ہیں گمراہی میں پڑا رہنے دیتے ہیں۔ اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ کن لوگوں کو توفیق ہدایت نہیں ملتی۔ وہ ایسے لوگ ہیں جو گناہ پر اصرار کرتے ہیں اور خداوند تعالےٰ کی نشانیوں پر توجہ نہیں دیتے۔

خداوند تعالےٰ کی وحدانیت کی دلائل میں سے یہ بھی ایک بہت بڑی دلیل ہے کہ تمام کون و مکان میں خداوند تعالیٰ کی وحدانیت کے اثر سے یکجہتی ہے اگرچہ مختلف اقسام کے اشیاء مختلف انواع کے جاندار دنیا میں نظر آتے ہیں لیکن اُن سب کا منبع ایک ہی ہے۔ اور ایک ہی قانون کے تابع ہیں۔ حرکت کن فیکون سے ایک لہر حیات پیدا ہوئی اُس کا نام بجلی کی لہر رکھو۔ یا حیات کی موج۔ اُس سے ایٹم پیدا ہوئے۔ ایٹم سے مخلوقات بنی۔ ایٹم کتنی چھوٹی سی شے ہے لیکن اُس کے اندر کا نظام ایسا ہی ہے جیسے سبع سیارگان کا۔ ایٹم کے اندر کے اجزاء کی مختلف تعداد و ترکیب سے اختلاف اشیاء و جانداران پیدا ہوا۔ سب کا منبع ایک ہی تھا۔ یہ ہی قانون وحدت غیر مرئی اشیاء اور صفات میں جاری ہے۔ دنیا میں کتنی قسم اور انواع کی بدیاں اور نیکیاں ہیں۔ خیر و شر کے کتنے اصناف ہیں۔ لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ان سب کا منبع ایک ہے۔ بروئے فقہ اسلام دنیا میں محض ایک گناہ یا بدی ہے اور ایک ہی نیکی یا احسان ہے۔ وہ گناہ ظلم ہے اور وہ نیکی اُس کے برعکس عدل ہے۔ دنیا میں جتنی خرابیاں یا برائیاں ہیں اگر اُن کا اختصار کیا جائے تو صرف ایک جزو رہ جائے گا اور وہ ظلم ہوگا۔ اُن کی ابتدا بھی ظلم سے ہوتی ہے اور انتہا بھی ظلم پر ختم ہوتی ہے۔ اس ہی ابتدا و انتہا کے اندر سب کچھ آ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ شرک کو بھی ظلم عظیم کہا گیا ہے۔ اور ہر بدی کرنے والے کو، ہر ایک منکر آیات خداوندی کو قرآن شریف میں ظالم کا خطاب دیا گیا ہے اور اسی طرح اگر حسنات پر غور کیا جائے تو وہ سب عدل

پر مبنی نظر آئیں گی. ظلم اور عدل کیا ہیں - اشیاء و صفات و اخلاقیات کی غلط قدرات کا نام ظلم ہے اور اُن کے صحیح اندازے کا نام عدل ہے. اس صحیح قدرات یعنی میزان کی عظمت اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ وَالسَّمَاءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ الْمِيزَانَ ۝ أَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ ۝ وَأَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ ۝ الرحمن ۵۵: ۷، ۸، ۹ -

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے. لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ وَأَنزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتَابَ وَالْمِيزَانَ لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ - (الحدید ۵۷ : ۲۵)

اس میزان کو اگر دال چاول کی تول پر حاوی کرنا چاہو تو کرلو لیکن قطعاً یہ اس میں منحصر نہیں ہوتا - وہاں ختم نہیں ہوتا - اس کی قدر و منزلت یہ ہے کہ انبیاء کے ساتھ اُن کی کتاب کے ہمراہ بھیجا جاتا ہے - اور جب زمین و آسمان بنائے گئے تب ہی یہ بھی بنایا گیا. صحیح آئمہ رہنمایان کی شناخت اور اُن کی پیروی اس ہی میزان کے ذریعہ سے ہوتی ہے - آئمہ ہدیٰ کو آئمہ تلبیس سے علٰحدہ کرنا یہ اُن کی شناخت ہے - اور شناخت کیا ہے - ہر ایک چیز، ہر ایک شخص کو اُس کی صحیح اور اصلی قدر دینا - اگر اس حکم خداوندی کو مانا جاتا تو پھر کوئی شخص نہ تو شیطان کی پیروی کرتا اور نہ آئمہ تلبیس کے پیچھے جاتا - اور دنیا میں عدلِ کامل کا رواج ہوتا. سقیفہ میں کیا ہوا - کربلا میں کیا ہوا، انبیاءؑ کی کیوں تکذیب کی گئی - آنحضرت شعب ابیطالب میں کیوں محصور کئے گئے - ہجرت پر کیوں مجبور ہوئے - ان سب اور دیگر ایسے ہی واقعات کی وجہ صرف ایک ہی تھی - لوگ صحیح قدرات سے تجاوز کر گئے. صدق و کذب کو غلط ملط کر دیا -

غرضکہ دنیا میں ایک ہی گناہ ہے - ایک ہی بدی ہے اور وہ ظلم ہے ایک ہی نیکی ہے - ایک ہی عمل صحیح ہے اور وہ عدل ہے - ہر ایک شخص کو وہ ہی دو، خواہ مال ہو، خواہ شہرت جس کا وہ اہل ہے - محفلوں میں بیٹھ کر اپنے دوستوں کی صفات نیک کو جتانا اور بڑھانا اور اپنے مخالفین کی صفات حسنیٰ کو چھپانا یا گھٹانا یا اُن کی غیبت کرنا - یہ بھی ظلم ہے - یہ ایسا ہی بُرا ہے جیسا

بے جا تقسیم مال۔ بلکہ اُس سے زیادہ بہت زیادہ تمام فساد اور فتنے کی بنا یہی ہے۔

یہاں ایک معترض دہریہ اعتراض کر سکتا ہے کہ خداوند تعالےٰ نے ظلم کو اتنا بُرا سمجھا اور اسلام میں اُس کو تمام بُرائیوں کی جڑ بتایا گیا۔ لیکن ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ ہمارے چاروں طرف ظلم ہی ظلم ہے۔ ممکن ہے کچھ تو یہ ظلم انسان کے آپس کے اعمال و افعال کا نتیجہ ہو۔ لیکن ایسے بھی مصائب ہیں جو انسان کی طاقت سے باہر ہیں، اور خدا ہی کی طرف سے معلوم ہوتے ہیں۔ موت کا بے محل اور بیجا اور بے وقت عمل اُن میں سے ایک ہے۔ انسان ایک کمزور ہستی ہے اور اُس کو ایسے ترغیبات و خواہشات کے طوفان میں ڈال دیا ہے کہ بقول شاعر ؎

اندرونِ قعرِ دریا تختہ بندم کردہ ای ۔۔۔ باز میگوئی کہ دامن تر مکن ہوشیار باش

القاہ فی الیم مکتوفاً وقال لہ ۔۔۔ ایاک ایاک ان تبتل بالماء

انسان اتنے مصائب میں گھرا ہوا ہے کہ ہر وقت بلکہ ہر لمحہ اور ہر لحظہ دنیا سے آسمان کی طرف صدائے فریاد و گریہ و زاری و آہ و نالہ جاتی رہتی ہے۔ اُن کے مقابلہ میں خوشی کی صدائیں جو خود غم آمیز ہوتی ہیں بہت کم ہوتی ہیں۔ موت اپنے بے محل اور بے وقت عمل سے رہی سہی راحت و آرام کو بھی مکدر کر دیتی ہے بڑوں کو تو جانے دو معصوم بچے کبھی یتیم و اسیر ہو کر روتے رہتے ہیں۔ کبھی موت کے بے وقت عمل سے ضائع ہوتے رہتے ہیں۔ کوئی نانِ شبینہ کو محتاج ہے۔ بچوں کی نگہداشت کیا ان کو پوری خوراک نہیں دے سکتا۔ اُس میں بھی تو محبت پدری ہوتی ہے۔ اپنے تئیں دیکھتا ہے، اپنے بچوں کو دیکھتا ہے، پھر آسمان کی طرف دیکھ کر غم کا گھونٹ پی لیتا ہے۔ باہر نکلتا ہے تو ایسے انسانوں کو دیکھتا ہے جس کے ایک ایک بچہ پر دو دو دائیاں ہیں۔ ہر نعمت سے ہر وقت متمتع ہوتے رہتے ہیں۔ ماں باپ کو اتنا گوارا نہیں کہ ذرا بچہ کی پیشانی پر شکن آئے رونا تو درکنار۔ پھر اپنے بچوں کی طرف نظر کرتا ہے رات کو بھوک کے مارے روتے روتے سو جاتے ہیں۔ اور ایک ٹکڑا روٹی کا نہیں ملتا۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ عالم الغیب والشہادت ہے۔ اُس کے علم میں ہے۔ اور یہ ظلم جاری ہے

یہ مصائب ختم نہیں ہوتے۔ اس پر وہ اپنے تئیں علیٰ کل شئی قدیر کہتا ہے۔ ارحم الراحمین کہتا ہے۔ ماں باپ سے زیادہ شفیق ہے۔ وہ دہریہ کہتا ہے کہ ہماری سمجھ میں تو یہ منطق آتی نہیں، مظلم کی اتنی فراوانی اور قادر مطلق کی موجودگی جس نے کتب علیٰ نفسہ الرحمت کا اعلان کیا ہوا ہے۔ یہ دونوں چیزیں متضاد ہیں۔

فلسفۂ اسلام میں یہ امور بہت اچھی طرح حل کر دئے گئے ہیں۔ ذرا غور شرط ہے۔ پہلے اس بات کا ثبوت ہونا چاہیے کہ دنیا میں ظلم خدا کی طرف سے ہے۔ کسی جوان یا بچے کی موت یا کسی شخص کی غربت کو دیکھ کر یہ کہہ دینا کہ ظلم ہے درست نہیں، جب تک کہ ہم کو اُس کے صحیح حالات نہ معلوم ہوں ہم فیصلہ نہیں کر سکتے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہر شخص اپنے حالات پر انصاف کے ساتھ غور کرے اور پھر نتیجہ نکالے کہ مجھ پر ظلم ہوا ہے یا جو گزر رہا ہے یا گزرا ہے عین انصاف ہے ہر ایک شخص اپنی جگہ اسی طرح غور کرے تو ہم کو یقین ہے کہ وہ سب اس ہی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ جو کچھ ہمارے ساتھ ہوا ہے یا ہو رہا ہے عین انصاف ہے۔ اور جب سب اس ہی نتیجہ پر پہنچے تو پھر ظلم تو نہ ہوا۔

دنیا میں مصائب ہیں، سختیاں ہیں۔ ان کا جواب قرآن شریف میں اچھی طرح دیا گیا ہے۔ مصائب و تکالیف مندرجہ ذیل صورتوں میں آسکتی ہیں اور آتی ہیں:۔

(۱) بسا اوقات وہ مصیبت ہمارے اپنے ہی فعل کا نتیجہ ہوتی ہے۔ چنانچہ قرآن شریف میں ارشاد ہے:۔ مَا اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَا اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ۔ النساء ۴ ۷۹ لیکن چونکہ خدا کی حکومت ہر شے پر ہے۔ ہر ایک شے اس کے تحت فرمان ہے۔ لہذا اگر ہمارے فعل سے بھی ہم کو مصیبت پہنچی ہے تو وہ بھی خدا کی اجازت سے ہوتی ہے۔ مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ التغابن ۶۴ ۱۱ یہاں تک کہ اگرچہ اجل کا ایک دن مقرر ہے اور وہ خدا وند تعالےٰ کے علم میں ہے لیکن وہ بھی جب آتی ہے تو ہماری غلطی ہی اُس کے آنے کا ذریعہ بن جاتی

ہے۔ علاج میں کمی رہ گئی۔ پرہیز میں غلطی ہوگئی ڈاکٹر کی نالائقی اور نااہلیت تھی، رہائش کی خرابیاں، عادتوں کی بے اعتدالیاں، غرض کچھ بھی ہو بچھنا وا ہمارے ہی لئے ہے۔

(۲) جتنی سیاسی تمدنی اور اقتصادی مصائب و تکالیف ہیں وہ سب اس ہی عنوان کے نیچے آتی ہیں۔ اور وہ بہت ہیں۔ مصائب و تکالیف کی اکثریت کا منبع یہ ہی ہیں۔ دولت کی نادرو اتقسیم، مزدوروں کے ظلم مالکان پر اور مالکان کے ظلم مزدوروں پر، روزگار کا نہ ملنا، بے روزگاری کا طوفان۔ افرا پروری۔ خود غرضی، ان کے مصائب بے شمار ہیں۔ تقریباً سارے ہی موجودہ مصائب اس میں آجاتے ہیں۔ اور وہ سب انسان کے اپنے ہاتھوں سے لائے ہوتے ہوتے ہیں۔ انسان نے خدا کی نافرمانی کرکے نارو آزادی چاہی، کسی حد تک اختیار مل گیا، اب اس کی شکایت خدا سے کیا۔ اور اس کا الزام خدا کو کیا دینا۔ خداوند تعالے نے اپنے انبیاء اور اپنی کتابوں کے ذریعہ سے بتادیا کہ کس طرح ان سے بچ سکتے ہو۔ ان پر عمل نہیں۔

(۳) جن اغراض اور جن وجوہات سے مصائب انسان پر پڑتے ہیں وہ بھی مختلف ہیں مثلاً۔

(ا) عذاب

(ب) امتحان

(ج) کفارۂ گناہان۔

(د) جذبۂ تضرع وزاری پیدا کرکے خدا کی طرف بلانا۔

(ہ) مصلحت

(و) مشیت ایزدی

(ز) رفع درجات۔

(ح) انبیاء و آئمہ کے لئے مصائب کا مخصوص ہونا۔

ان میں سے ہر ایک پر تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہے۔

(ل) عذاب - قرآن شریف میں اس کی مثالیں بہت سی ہیں. طوفانِ نوح - طوفان زلزلہ، قصہ فرعون، وغیرہ وغیرہ - تاریخ عالم میں بہت سی مثالیں مثلاً یزید کی موت، بنو اُمیّہ کی بربادی، مسلمانوں کی پریشانی، ہندوستان کے زمانۂ حال کا مسلمانوں کا قتل و غارت وغیرہ - اور اس کا یہ اصول ہے کہ جب کوئی قوم جس پر عذاب نازل ہوا ہے اُس عذاب کی پرواہ نہ کرے گی تو اُس پر عذاب سخت سے سخت تر ہوتا جائے گا جس طرح لوگوں نے تقسیم ہندوستان کے وقت بھی قتل و غارت سے سبق نہ لیا تو اب وہ اُس سے شدید تر عذاب میں مبتلا ہیں -

(ب) امتحان - اس کے لئے قرآن شریف کی یہ آیت ملاحظہ ہو -

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۝ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝ ۲ : ۱۵۵، ۱۵۶

أَمْ حَسِبْتُمْ أَن تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ - ۳ : ۱۴۲ -

(ج) کفارۂ گناہان - اکثر دیکھا گیا ہے کہ نیک آدمی پر بھی مصائب آتے ہیں - اُنھوں نے کچھ نہ کچھ گناہ تو ضرور کیے ہوں گے - یہ دنیا کی مصیبت اُن کے گناہان کا کفارہ ہو جاتی ہے -

(د) تضرع و زاری -

وَبَلَوْنَاهُم بِالْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ - الاعراف ۷ : ۱۶۸

(ہ) (و) (ز) (ح)

بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ بنی نوع انسان کی اصلاح و منفعت کے لئے انبیاء و آئمہ علیہم السلام مصائب و تکالیف میں مبتلا کئے جاتے ہیں تاکہ اُن کے صبر و استقلال و فعل و عمل سے لوگوں کو ہدایت ملے - خدا کی معرفت حاصل ہو - اور اپنے طرز عمل کو اُن کے مطابق کرنے کی کوشش کریں - اور یہ بھی معلوم ہو سکے کہ فطرت انسانی جب صراطِ مستقیم پر رہتی ہے تو کتنی ارفع و اعلیٰ ہوتی ہے - چونکہ محض مشیت خداوندی کی اطاعت میں وہ یہ صبر کرتے ہیں لہذا اُن کے درجات اُخروی بہت اعلیٰ ہو جاتے ہیں اور وہ

لوگ جو ان پر ظلم کرتے ہیں اُن کی قساوتِ قلبی اور ظلم کا بھی اچھی طرح اظہار ہو جاتا ہے۔ اور جب قیامت میں ان مظلوموں کے درجے بلند ہوں گے اور ان ظالموں کو اسفل السافلین کا عذاب ملے گا تو لوگوں پر ظاہر ہو گا کہ یہ بھی عین انصاف خداوندی ہے۔ مظلوموں نے اپنے صبر سے اپنے تئیں اس فضل وکرم و رحمت کا مستحق ثابت کر دیا اور ان ظالموں نے اپنے فعل سے ظاہر کر دیا کہ وہ اس ہی عذاب کے مستوجب تھے۔ انبیاء کرام و اولیاء پر جو مصائب پڑے وہ اس عنوان کے تحت آتے ہیں، یہ ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیئے کہ دنیا کے مصائب والام کتنے ہی سخت ہوں آخرت کے مقابلہ میں کچھ نہیں۔

کفار اور ظالم بھی بظاہر اس دنیا میں راحت و آرام میں معلوم ہوتے ہیں۔ اوّل تو ان کے دل کی حالت خدا ہی جانتا ہے کہ وہ راحت میں ہیں یا تکلیف میں۔ کیونکہ خوشی تو محض دل کی حالت کا نام ہے۔ بہت سے لوگ غربت میں مفلسی میں خوش و خرم رہتے ہیں۔ بہت سے لوگ پھولوں کی سیج پر بھی تڑپتے رہتے ہیں۔ لہذا ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ کفار اور ظالمین واقعی راحت میں ہیں یا نہیں۔ اور ظاہری ثروت اور دولت جو ان کو ملتی ہے اس کی تو یہ وجہ ہے کہ بُرے سے بُرا آدمی بھی کچھ نہ کچھ نیکیاں تو کرتا ہی ہے۔ اُس کو ان نیکیوں کا بدلہ اس ہی دنیا میں مل جاتا ہے۔ وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا ۝ لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ ۚ وَرِزْقُ رَبِّكَ خَيْرٌ وَأَبْقَىٰ ۝ كُلُوا وَتَمَتَّعُوا قَلِيلًا إِنَّكُم مُّجْرِمُونَ ۝

طٰہٰ ۲۰:۱۳۱

المرسلات ۷۷:۴۶

فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ۔

البقرہ ۲:۲۰۰

یہ بھی ہے کہ بسا اوقات ان تکالیف و مصائب کے نتائج اس دنیا ہی میں آگے چل کر اچھے نکل آتے ہیں۔ چونکہ ہم اُن سے واقف نہیں ہوتے اس لئے سمجھتے ہیں کہ یہ مصیبت ہے۔ حضرت موسیٰ کا قصہ اُس مردِ غیب کے ساتھ جس نے بظاہر بغیر کسی وجہ کے ایک بچے کو مار ڈالا، کشتی میں سوراخ کر دیا، گرتی ہوئی دیوار کو درست کر دیا اس ہی اصول کا سبق دیتا ہے۔ ان سب افعال کے نتائج آخر کار اچھے ہی نکلے۔ لیکن اُس وقت موسیٰ کو نہ معلوم تھے لہذا اعتراض کر بیٹھے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔

بچوں کی تکالیف و مصائب و موت کا مسئلہ بھی اکثر زیر بحث رہا ہے۔ یہ مصائب دو صورتوں کے ہو سکتے ہیں (۱) یتیمی (۲) موت۔ ان کے علاوہ جو مصائب ہوں گے وہ دراصل والدین کے اعمال کی پاداش میں ہوتے ہیں یتیمی بسا اوقات بچے کے لئے آخر کار فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔ دنیا کی سختیوں میں سے اوائل عمر میں گذر کر اُس کے قوائے عقلی و ذہنی اتنی ترقی کر جاتے ہیں کہ وہ آئندہ اپنے لئے بہت اچھی جگہ دنیا میں حاصل کر لیتا ہے۔ اپنے اوپر خود اعتماد کرنے کا ایسا جوہر اس میں پیدا ہو جاتا ہے جو اُس کو اعلیٰ درجہ پر لے جاتا ہے بچپن میں موت ہونے کی صورت یہ ہے کہ بسا اوقات تو وہ والدین کیلئے ان کے اعمال و افعال کے پاداش میں ہوتی ہے۔ یا اُس میں کچھ اور مصلحت ہوتی ہے۔ یہ ثابت نہیں کہ وہ بچہ کے لئے مصیبت ہے یا اُس پر ظلم ہے۔ اس کا فیصلہ تو قطعی طور پر ہم اُس وقت کر سکتے کہ جب ہم کو یقیناً معلوم ہوتا کہ مرنے کے بعد اُس پر کیا گزری۔ فقہ اسلام کہتا ہے کہ معصوم بچے مرنے کے بعد نہایت عمدہ حالت میں ہو جاتے ہیں۔

انسان کے مصائب و آلام میں ایک یہ بھی راز ہے کہ جس پر وہ واقع ہوئے ہیں۔ اُس کے لئے تو اُس کے اعمال کے نتائج ہیں لیکن دوسروں کے لئے باعث عبرت ہوتے ہیں شریعت کا حکم ہے کہ جب کسی کو گرفتار مصائب دیکھو جن سے تم آزاد ہو تو خداوند تعالےٰ کا شکر ادا کرو۔ دنیا میں کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے کہ جو ایک آدمی پر پڑی ہے اور دوسرے کو لاحق نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا ہم کو شکر ادا کرنا چاہیے کہ ہم اُس مصیبت سے بری ہیں۔ یہ شکر تین طرح ادا ہو سکتا ہے۔ (۱) زبان سے اُس کا ذکر کرنا چاہیئے (۲) دل سے ماننا چاہیئے (۳) عمل سے ظاہر کرنا چاہیئے۔ عمل کی صورت یہ ہے کہ ہم گرفتار مصائب و آلام کی مدد کریں۔

جہلاء کی ایک یہ بھی بحث ہوتی ہے جس کا ذکر قرآن شریف میں بھی ہے کہ ہم کیوں مساکین و غربا کو کھانا کھلائیں۔ اگر خدا چاہتا ہے تو اُن کو خود رزق دے فرمایا ہے اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗ۔ دوسرے الفاظ میں اُس کا مطلب ہوا کہ ہم دوسروں کی تکالیف میں، اُن کی پریشانی و افلاس میں کیوں اُن کی مدد کریں۔

خدا نے اُن پر یہ تکالیف ڈالی ہیں۔ اب خدا کا کام ہے کہ اُن کو تکالیف سے نکالے۔ لیکن یہ خیال کرنا چاہئے کہ دنیا اون اسباب و قواعد کے مطابق چل رہی ہے جو خدا نے مقرر کر دیئے ہیں۔ اُن سے کسی کو تکلیف پہنچتی ہے۔ کسی کو راحت۔ ایک شخص ان قوانین کے مطابق عمل نہیں کرتا وہ تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ دوسرا عمل کرتا ہے وہ راحت پاتا ہے۔ جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے اس رنج و راحت کے نتیجہ میں کافر و مسلمان کا فرق نہیں ہے۔ ہاں حشر کے دن اُن تکالیف و مصائب کا خیال رکھا جائے گا اور وہاں کفر و ایمان کا فرق عیاں ہوگا۔ جہاں تک دنیا کا تعلق ہے لن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔ ہاں یہ بھی ضرور ہے کہ قوانین و اسباب بنا کر خدا معطل بھی نہیں ہو گیا۔ معجزے بھی ہوتے ہیں، بہرے گونگے، اچھے ہوتے ہیں۔ مردہ تک زندہ ہو جاتے ہیں۔ کذالک ننجی المومنین کہہ سکتے ہیں کہ خداوند تعالےٰ اسباب کا اجتماع ایسا کر دیتا ہے کہ یہ امور ظہور پذیر ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی ہے کہ یَمۡحُوا اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَ یُثۡبِتُ وَ عِنۡدَہٗۤ اُمُّ الۡکِتٰبِ۔

خداوند تعالےٰ نے انسان کو اس دنیا میں اُس کی کمزور حالت میں بغیر مدد کے نہیں چھوڑا ایک تو اُس میں عقل کا جوہر عطا فرما دیا جو اُس کے لئے نہایت عمدہ سپر اور بہت اچھا ہتھیار ہے۔ دوسرے اپنے رحمت کاملہ سے اُس کی ہدایت کے لئے انبیاء و مرسلین بھیجے۔ جنھوں نے اُس کو اوائل ایام میں بہت سے ہنر سکھائے اور اشیاء کی خواص و ماہیت سے اُس کو آگاہ کیا اور ہدایت تو ہمیشہ کی اور صراط مستقیم پر چلنے کے طریقے بتائے۔ دنیا میں حکومت کا مسئلہ بہت مشکل رہا ہے۔ حکومت الٰہیہ کا نمونہ بھی خداوند تعالےٰ نے دکھا دیا۔ اور انبیاء و اوصیاء کے ذریعہ سے اُس کے طریقے بھی بتا دیئے۔ موت جسمانی کے بعد حشر و نشر و میزان و حساب کتاب یہ وہ امور ہیں جو فقۂ اسلام کو دیگر مذاہب سے ممیز و ممتاز کرتے ہیں۔ یہ وعدہ کہ انسان کو پھر جسم ملے گا اور ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی اُس پر ظلم نہ ہوگا وہ شے ہے جو انسان کو دنیا کی مصیبت و تکلیف کو صبر کے ساتھ سہنے کے لئے آمادہ کر دیتی ہے۔ اور مصیبت مصیبت نہیں معلوم ہوتی۔ یہ ہی تو وہ شے تھی جس نے امام حسینؑ اور اُن کے متعلقین کو کربلا کے میدان میں سے گزارا۔ اور یہ ہی وہ بات تھی جس نے اجتماع سقیفہ

اور اُس کے نتائج کو حضرت علی کے لیے اتنا سہل کر دیا۔ رضائے خداوندی کی امید نے مصائب دنیا کو ایک ایسی دلآویز صورت دیدی ہے کہ جس نے آتش دنیا کو صاحبان عزم و یقین کے لیے گلزار بنا دیا ہے۔ ورنہ درا صل دنیا کے مصائب ایسے ہیں کہ انسان اس زندگی پر موت کو ترجیح دیتا اور وہ حکماء خودکشی ہی کی تلقین کرتے رہے ہیں جن کا فلسفہ اس امید سے خالی تھا۔

رُہبانیہ فطرت کے خلاف
دُنیا کی زندگی کی حقیقت

اسلام دین فطرت ہے۔ قرآن شریف میں اسلام کو اس طرح بیان کیا گیا ہے: فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰـكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ (الروم ۳۰:۳۰)

خدا کی تلاش انسان کی فطرت کے موافقت میں نہ کہ اس کی مخالفت میں یہ ہے اسلام کا اصول۔ امتزاج دین و دنیا اسلام کا مایہ الامتیاز ہے۔ اب تک حکماء کا یہ خیال تھا کہ انسان کی بہتری دنیا سے کنارہ کشی میں ہے۔ ان کا یہ تصور یہودیت اور مسیحیت میں بھی لے لیا گیا۔ حکماء کے فلسفہ میں حیات بعد ممات، میزان، حساب کتاب، و عدل کا تو کوئی یقینی تصور ہی نہ تھا۔ لہٰذا دنیا کی بے ثباتی، ظلم کی فراوانی اور موت کی موجودگی کو دیکھ کر وہ اس ہی نتیجہ پر پہنچے کہ مصائب دنیا کا علاج محض خودکشی ہے۔ اس تصور کا آخری نمایندہ STOICISM تھا۔ اور ایک وہ زمانہ تھا کہ جب یہ فلسفہ تمام دنیا میں رائج تھا۔ یہاں تک کہ جب مسیحیت آئی تو اُس نے بھی اس سے بہت اثر لیا۔ اس فلسفہ کا بانی جیسا ہم پہلے بیان کر چکے ہیں زینو ZENO تھا۔ اُس نے دنیا کے مصائب کا حل خودکشی میں دیکھا۔ یہ شخص حضرت عیسیٰ سے ۳۴۲ سال پہلے ہوا تھا اور ۲۷۰ سال قبل ان کے مر گیا۔ اس کا فلسفہ تمام رومانوی دنیا پر چھا گیا تھا اور مثل مذہب کے سمجھا جاتا تھا۔ (۱۲۴) چونکہ عیسائی رہنماؤں کو اپنا مذہب پھیلانا مقصود تھا۔ اور وہ نہیں پھیل سکتا تھا جب تک رومانوی دنیا کے پسند خاطر نہ ہو لہٰذا اون کی نظروں میں مسیحیت کو خوشنما ظاہر کرنے کیلئے

(124) Robert Briffault: The Making of Humanity, P. 146.

ان مسیحی رہنماؤں نے اُس وقت کے مروجہ رومانوی مذاہب سے بہت کچھ رسوم و عقائد لے کر اپنے مذہب میں داخل کر لئے۔ اس کو تفصیل سے ہم نے اپنی کتاب **البلاغ المبین حصہ دوم طبع ثانی** میں بیان کیا ہے اور کچھ اس سے پہلے اس کتاب میں بیان کر چکے ہیں۔ دیکھو صفحہ ۲۳۶ تا ۲۵۷ کتاب ہذا۔ چنانچہ انھوں نے اس فلسفہ STOICISM (رواقی) کے بھی اصول اپنے مذہب میں شامل کر لئے۔ اور دو امور پہلے ہی سے ایسے تھے جنھوں نے اس امر میں مدد دی۔ ایک تو عورت کا ڈر جو مسیحیت کا جزو بن گیا تھا۔ اس زمانہ کے پادری عورت کو شیطان اور زہریلا سانپ سمجھتے تھے جس کے سایہ سے روحانی موت واقع ہو جاتی تھی۔ بیچاری عورت کی یہ گت اس وجہ سے بنی کہ ان کے خیال میں آدم کو ورغلانے میں یہ شیطان کی مددگار تھی اور در اصل اس نے ہی آدم کو جنت سے نکلوایا۔ دوسرے اُس زمانہ میں کنوارے بیراگیوں، راہبوں اور دیر و صومعہ کا رواج عام تھا۔ نکاح نہ کرنا عورت کے پاس نہ جانا، یہ مذہب کا خاص جزو تھا۔ جو عورت سے علیحدہ رہتا تھا وہ بہت اچھا سمجھا جاتا تھا۔ اس غلط نظریہ نے جو خرابیاں، بدمعاشیاں اور بدتمیزیاں آخر کار بن بیاہے مرد (MONKS) اور بن بیاہی عورتوں (NUNS) کی MONASTERIES میں پیدا کر دیں وہ ہم کیا بیان کریں خود ان کی ہی زبانی سن لینا بہتر ہوگا۔ دیکھو (۱۲۵)

یہ نظریہ محض اس فلسفۂ رواقی ہی کا نتیجہ نہ تھا۔ بلکہ بائبل کی غلط تحریر و تدوین بھی بڑی حد تک اس کی ذمہ دار ہے۔ موجودہ انجیل کے لکھنے والوں نے حضرت عیسیٰ کے منہ میں یہ الفاظ ڈالے تھے۔

ترجمہ:۔ اگر کوئی میرے پاس آتا ہے اور وہ اپنے باپ، ماں، بیوی، بچوں، بھائیوں اور بہنوں بلکہ اپنی جان سے بھی نفرت نہیں کرتا تو وہ میرا شاگرد نہیں ہو سکتا۔ اصل کے لئے دیکھو ضمیمہ ۱۹

ایک امیر دولتمند نوجوان سے حضرت عیسیٰ نے کہا:۔

(125) Myers: The Middle Ages, P. 58., Gibbon: The Decline and Fall of The Roman Empire, Vol. 1

ترجمہ:۔ اگر تو کامل ہونا چاہتا ہے تو جا اور جو کچھ تیرے پاس ہے وہ سب فروخت کردے اور غربا کو دیدے۔ (اصل کے لئے ضمیمہ ۲۰)

حضرت عیسیٰ کی زبان ارمی تھی۔ اس زبان کی انجیل اصلی تو انھیں ملی نہیں۔ کسی نے اس کا یونانی اور لاطینی ترجمہ کردیا تھا وہ رائج تھا کیونکہ یہ زبانیں رومیوں اور ایشیائی کوچک کے یونانیوں کی تھیں۔ اور ان میں مسیحیت کا رائج کرنا مدعا تھا اور وہ بھی اس طرح کہ اُن کے خیالات کے مطابق ہو لہذا ان ترجمہ کرنے والوں نے اپنی خواہش کے مطابق الفاظ کے دور از کار معانی لے کر یہ ترجمہ کردیا۔ کبھی کبھی ایک لفظ کے دو معانی ہوتے ہیں۔ اُنھوں نے وہ معنی لے لئے جن سے ان کا مقصد حل ہوتا تھا۔ بہرصورت موجودہ مذہب جو رائج ہوا وہ تو یہ ہی تھا۔ چنانچہ سینٹ پال نے اس تعلیم کی تتبع میں یہ کہا۔

ترجمہ:۔ جس نے شادی نہیں کی وہ تو خدا کی چیزوں کی پرواہ کرتا ہے اور جو شادی شدہ ہے وہ اُن چیزوں کی پرواہ کرتا ہے جو اس دنیا کی ہیں۔ اصل کیلئے ضمیمہ ۲۱

دنیا کی حالت کو دیکھ کر یونانی فلسفہ نے تو کہا کہ خودکشی کرلو اور مسیحیت نے کہا کہ ماں، باپ، بیوی، بچوں، بھائیوں اور بہنوں کو چھوڑ دو۔ بلکہ اپنے سے بھی نفرت کرو۔ جو کچھ تمھارے پاس ہے وہ غریبوں کو دے کر دنیا سے کنارہ کش ہو جاؤ۔ ہم نے یہاں ترجمہ میں "نفرت" لکھا ہے ورنہ اُردو بائیبل میں اس جگہ "دشمنی" کا لفظ ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ ہر غور و فکر کرنے والا شخص دنیا کی بے ثباتی، غم کی فراوانی اور موت کی زیادتی سے متاثر ضرور ہوگا۔ اور ہر ایک فلسفہ کے سامنے حل کے لئے یہ ہی سوال پیدا ہوتا ہے۔ یونانی فلسفہ نے آخر کار اس کا حل خودکشی سے کیا۔ اور مسیحیت نے اس کا حل تجرد و رہبانیت اور دیر و صومعہ کی زندگی سے کیا۔ یہ دونوں حل ایسے ہیں جو حل نہیں کیے جا سکتے: بلکہ کشمکش حیات کی تاب نہ لاکر اس سے فرار ہے۔ یہ بہادری نہیں ہے، بزدلی ہے۔ اسلام نے ان ہی امور کی منطق سے اور اُن کی بنا پر ایسے ایسے عالی نتائج نکالے ہیں جو انسان کی زندگی کو ایک قابل قدر شئے اور خود انسان کو اشرف المخلوقات کے درجہ تک پہنچاتے ہیں۔ اسلام نے ازدواجی زندگی کو ضروری قرار دیا۔ جناب رسولِ خدا نے فرمایا کہ نکاح میری سنت ہے

جس نے نکاح سے اعراض کیا وہ میرا پیرو نہیں ہے۔ اسلام نے بتایا کہ دنیا مزرعہ آخرت ہے۔ یہاں عمل نیک کرو تاکہ عاقبت میں دوامی زندگی حاصل ہو۔ دنیا کا ترک اسلام میں جائز نہیں، لیکن دنیا میں پھنس کر عاقبت کو بھول جانا یہ بھی بُرا ہے امام علیہ السلام فرماتے ہیں۔

لیس منا من ترک الدنیا للآخرۃ و من ترک الآخرۃ للدنیا یعنی وہ ہم میں سے نہیں ہے یعنی وہ ہمارا پیرو نہیں ہے جو آخرت کیلئے دُنیا کو اور دنیا کے لئے آخرت کو چھوڑ دے۔ یہ ہے مطابق فطرت النسانیت۔ عورت و دنیا کو بالکل ترک کرنا خلاف فطرت ہے۔

اسلام نے ان تمام مشکلات کا حل اور انسان کی نجات کا حصر اعتقاد و عمل میں رکھا ہے۔ قرآن میں جہاں کہیں اور جن سے نجات کا وعدہ کیا گیا ہے وہاں ہر جگہ یا ایھا الذین آمنوا وعملوا الصالحات کا فقرہ استعمال ہوا ہے۔ نہ تو صرف ایمان کافی ہے۔ اور نہ صرف عمل۔ بلکہ دونوں ہونے چاہئیں۔ اسلام کیا ہے؟ الاقرار باللسان، والتصدیق بالجنان والعمل بالارکان۔ یہ اگر ہوئے تو پھر ایمان مکمل ہے۔

وہ شخص فلسفۂ اسلام کو مطلق نہیں سمجھ سکتا جو ہمیشہ اس بات کو ذہن میں نہیں رکھتا کہ اسلام کے نزدیک اس دنیا کی زندگی بذات خود لھو ولعب امر بے حقیقت ہے۔ مادی ترقی بذات خود کوئی شے نہیں۔ دولت و ثروت بسا اوقات برائی کی طرف لے جاتی ہے۔ مال دنیا میں سے بقدر کفاف اپنے پاس رکھنا ضروری ہے تاکہ ذلت و خفارت سے بچو۔ لیکن دولت و ثروت کو اپنا مقصد زندگی اور معیار بزرگی نہ بناؤ۔ قرآن شریف میں اس کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:۔

وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُولَةً إِلَىٰ عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ فَتَقْعُدَ مَلُومًا مَّحْسُورًا - بنی اسرائیل ۱۷ : ۲۹

یعنی اپنے ہاتھ کو نہ تو گردن سے بندھا ہوا (بہت تنگ) کر لو (کہ کسی کو کچھ دو ہی نہیں) اور نہ بالکل کھول دو کہ سب کچھ دے ڈالو اور آخر تم کو ملامت زدہ حسرت ناک بیٹھنا پڑے۔

لیکن اسلام کی یہ نصیحت کہ دنیا کی دولت و جاہ کو اپنا مقصدِ حیات نہ بناؤ بہت کم مسلمانوں نے قبول کی۔ اور اس نصیحت پر نہ عمل کرنے کی وجہ سے صراطِ مستقیم پر سے ہٹ گئے۔ اس کو ہی نہ سمجھنے کی وجہ سے علامہ مشرقی اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ مادی ترقی ہی اصلی مقصدِ زندگی ہونا چاہئے۔ وہ تو یہاں تک غلطی کرتے ہیں کہ اس کو ہی اسلام کا مدعا بتاتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہے۔ دنیا کی دولت، حشمت اور ثروت ہی ہے جس کے پاس یہ ہے اُس کے پاس توحید ہے۔ جس کے پاس یہ نہیں وہ کافر ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان کافر ہیں۔ انگلستان، جرمنی، فرانس اور روس کے عیسائی توحید پرست ہیں، اصلی مسلمان ہیں کیونکہ اُن کے پاس ثروت اور طاقت ہے۔ جو اس دنیا میں مزے کر رہے ہیں وہ آخرت میں بھی مزے کریں گے۔ سجدے کرنا تو اوندھے منہ پڑ کر غوں غوں کرنا ہے۔ قارونی دولت ہی نعمت عظمےٰ ہے۔ دیکھو تذکرہ دیباچہ ص ۱۱۸ لغایت ۱۲۲۔ عنایت اللہ مشرقی ہی پر کیا منحصر ہے۔ جس نے مسلمانوں کی سلطنت کا رویہ اور حصولِ سلطنت و حکومت کا عشق ابتدائی خلافت سے اب تک غور سے مطالعہ کیا ہے وہ اُس ہی نتیجہ پر پہنچے گا۔ صحیح اسلام کی تعلیم کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بہت سے لوگوں کے قدم اس جگہ ڈگمگا جاتے ہیں۔

قرآن شریف صریحاً بتاتا ہے کہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے۔ عیسائیوں کی رہبانیتہ کا ذکر کرتے ہوئے خداوند تعالیٰ فرماتا ہے: مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ الحدید ۵۷:۲۷

دنیا کی زندگی کی ماہیت و ناپائداری پر اسلام میں بڑا زور دیا گیا ہے۔ قرآن شریف نے دنیا سے عبرت حاصل کرنے کی تاکید کی ہے۔ اور آئمہ اسلام نے بھی اس کو نہایت تصریح و تاکید سے بیان کیا ہے۔ کیونکہ دنیا کی ساری خرابیوں کی جڑ اُس کی ناپائیدار زینت میں ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے گردوپیش کے حالات سے عبرت حاصل کریں اور دنیا کے رنج و راحت کی حقیقت معلوم کریں تاکہ ہم اپنے دنیاوی نقصان و مصیبت پر رنج نہ کریں۔ لِكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ ط آل عمران ۳:۱۵۳

کہاں ہیں وہ لوگ جو اب سے چند سال پہلے دنیا پر حکومت کر رہے تھے۔ ہر ایک شخص پر اُن کا حکم رواں تھا اور ہر شخص اُن کی عنایت کا محتاج۔ بظاہر سارے عیش و راحت کے سامان موجود تھے۔ اب قبروں میں کیڑوں کی خوراک بنے ہوئے ہیں۔ اور اب سے

چند سال بعد ہماری بھی یہ ہی حالت ہوجائے گی۔ ممکن ہے دوسرے لمحہ ہی میں ہوجائے۔ ہمارے دوست، اقربا اور محبوب جن سے ہماری زندگی تھی اور جو ہم کو دیکھ کر زندہ رہتے تھے۔ وہ کہاں گئے۔ اُن کی محبت کیا ہوئی۔ ہماری آنکھیں اُنھیں ڈھونڈھتی ہیں۔ ہمارے وہ مہربان والدین جو ہمارے جسم پر مکھی کے بیٹھنے کے روادار نہ تھے اب وہ کہاں گئے۔ ہمارے جسم پر تلواریں لگ رہی ہیں اور کوئی پوچھنے والا نظر نہیں آتا۔ اگر ہمارا ایک آنسو گرتا تھا تو وہ بے قرار ہوجاتے تھے اور اشک کے دریا بہاتے تھے۔ اب ہماری آنکھوں سے خون کے دریا جاری ہیں اور کوئی چھوٹے مُنہ بھی نہیں پوچھتا کہ تمھیں کیا ہوا، یہ ہے دنیا اور دنیا کی حقیقت فاعتبروا یا اولی الابصار۔ دیکھیے اس کے متعلق کتاب اسلام اور آئمہ اسلام کیا کہتے ہیں۔

قرآن شریف۔

(۱) وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ط وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ (۶: ۳۲)

ترجمہ:۔ اور یہ دنیاوی زندگی تو کھیل تماشے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اور یقیناً آخرت کا گھر پرہیزگاروں کے لئے بہت اچھا ہے۔

(۲) وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ط وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ۔ ۲۹: ۶۴

ترجمہ۔ اور یہ دنیاوی زندگی تو کھیل تماشے کے سوا کچھ نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ حقیقی زندگی (کی جگہ) بس آخرۃ کا گھر ہے۔

(۳) اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ (۴۷: ۳۶)

ترجمہ۔ دنیاوی زندگی تو بس کھیل تماشا ہے۔

(۴) اِعْلَمُوْا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ط كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ط وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ط وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (۵۷: ۲۰)

ترجمہ :- جان لو کہ دنیاوی زندگی محض کھیل اور تماشا اور ظاہری زینت اور آپس میں ایک دوسرے پر فخر کرنا اور مال اولاد کی ایک دوسرے سے زیادہ خواہش ہے (دنیاوی زندگی کی مثال تو) بارش کی سی مثال ہے جس (کی وجہ) سے کسانوں کی کھیتی (لہلہاتی اور) اُن کو خوش کر دیتی ہے پھر سوکھ جاتی ہے تو تو اُس کو دیکھتا ہے کہ زرد ہو جاتی ہے پھر چُور چُور ہو جاتی ہے - اور آخرت میں (کفار کے لئے) سخت عذاب ہے اور (مومنوں کے لئے) خدا کی طرف سے بخشش اور خوشنودی ہے۔ اور دنیاوی زندگی تو بس فریب کا ساز و سامان ہے۔

حکماء اسلام یعنی آئمہ اہلبیت علیہم السلام

ان اماماں اُمت کے قول قرآن شریف کی آیات کی تشریح کرتے ہیں۔ اور اُن کا عمل مشعلِ راہ ہے۔

حضرت علی علیہ السلام

دُنیا کی نسبت آپ فرماتے ہیں۔

تَغُرُّ وَتَضُرُّ وَتَمُرُّ، اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی لَمْ یَرْضَهَا ثَوَابًا لِاَوْلِیَائِهٖ، وَلَا عِقَابًا لِاَعْدَائِهٖ ؛ وَاِنَّ اَهْلَ الدُّنْیَا کَرَکْبٍ بَیْنَا هُمْ حَلُّوا اِذْ صَاحَ بِهِمْ سَائِقُهُمْ فَارْتَحَلُوا۔

ترجمہ :- دنیا دھوکہ دیتی ہے نقصان پہنچاتی ہے اور تلخیاں چکھاتی ہے خداوند تعالےٰ نے اس دنیا کو اپنے دوستوں کے لئے بطور ثواب کے پسند نہیں کیا۔ اور نہ اپنے دشمنوں کو اس کے ذریعہ سے عذاب دینا پسند کیا۔ دنیا کے لوگ ان سواروں کے مانند ہیں جو ابھی ابھی منزل پر پہنچے تھے کہ ان کو کوچ کا حکم دینے والے نے پکارا اور وہ کوچ کر گئے۔

دنیا کے رنج و راحت کا کیا عمدہ بیان ہے۔ مومن کو جو یہاں عمدہ چیزیں ملتی ہیں۔ وہ اُس کی نیکیوں کا بدلہ نہیں ہوتا وہ تو آخرت میں دیا جائے گا۔ اور دشمنان خدا کو جو یہاں مصائب پہنچتے ہیں وہ اُن کے گناہوں کا عذاب نہیں ہوتا۔ کیونکہ اگر

اُن کے گناہوں کا عذاب ہو تو پھر آخرت میں دوبارہ عذاب نہ ہو۔ لیکن یہ عذاب دین کے لئے مخصوص ہے۔ اس دنیا کے رنج و راحت کے واقع ہونے کے اور اسباب اور قوانین ہیں۔ یہ نہ کہنا چاہئے کہ فلاں شخص نیک مومن تھا وہ کیوں مصائب میں مُبتلا ہوا۔ اور فلاں شخص بُرا تھا اُسے کیوں نعمتیں ملیں۔ اس مسئلہ کا کیسا عمدہ جواب ہے۔ اکثر لوگ یہ دیکھ کر ہی دہریئے ہو گئے ہیں کہ یہاں نیکوں کو کیوں مصائب ہیں اور بدلوگ کیوں عیش و عشرت و راحت میں ہیں۔

وَالدَّھْرُ یَوْمَانِ۔ یَوْمٌ لَکَ وَیَوْمٌ عَلَیْکَ فَاِذَا کَانَ لَکَ فَلَا تَبْطَرْ، وَاِذَا کَانَ عَلَیْکَ فَاصْبِرْ۔

ترجمہ:۔ زمانہ کے دو دن (دو حالتیں) ہیں۔ ایک تیری آسائش و راحت کے لئے اور دوسرا تیری سختی اور مصیبت کے لئے۔ پس جب تیری راحت کا دن ہو تو مغرور نہ ہو جا اور اترا تا نہ پھر۔ اور جب مصیبت کا دن آئے تو صبر کر۔

یہ دو حالتیں ہر انسان پر گزرتی ہیں۔ اُن کے لئے تیار رہنے کے لئے اور ان کے لئے طرز عمل مقرر کرنے کے لئے یہ نصائح ہیں۔

مَا خَیْرٌ بِخَیْرٍ بَعْدَہُ النَّارُ، وَمَا شَرٌّ بِشَرٍّ بَعْدَہُ الْجَنَّۃُ وَکُلُّ نَعِیْمٍ دُوْنَ الْجَنَّۃِ فَھُوَ مَحْقُوْرٌ، وَکُلُّ بَلَاءٍ دُوْنَ النَّارِ عَافِیَۃٌ۔

ترجمہ:۔ دنیا کی کوئی اچھی شئے اچھی نہیں ہے اگر اُس کا انجام جہنم ہو۔ اور کوئی بُری شے بُری نہیں ہے۔ جس کا انجام جنت ہو۔ نعمہائے بہشت کے علاوہ ہر ایک نعمت حقیر ہے۔ ہر ایک مصیبت جہنم کے علاوہ راحت ہے۔

اَلرُّکُوْنُ اِلَی الدُّنْیَا مَعَ مَا تُعَایِنُ مِنْھَا جَھْلٌ وَالتَّقْصِیْرُ فِیْ حُسْنِ الْعَمَلِ اِذَا وَثِقْتَ بِالثَّوَابِ عَلَیْہِ غَبْنٌ وَالطُّمَانِیْنَۃُ اِلٰی کُلِّ اَحَدٍ قَبْلَ الْاِخْتِبَارِ عَجْزٌ۔

ترجمہ:۔ دنیا کی طرف راغب ہو جانا باوجودیکہ اُس کے حالات تیرے مشاہدہ میں آرہے ہیں نادانی ہے حسنِ عمل میں کوتاہی کرنا حالانکہ تجھے اس پر ثواب ملنے کا یقین ہے۔ سخت زیاں کاری ہے۔ کسی شخص کو آزمانے سے پہلے اُس کی طرف سے مطمئن ہو جانا عجز و ناتوانی ہے۔

يَا اَيُّهَا النَّاسُ، مَتَاعُ الدُّنْيَا حُطَامٌ مُوبِئٌ فَتَجَنَّبُوا مَرْعَاهُ قُلْعَتُهَا أَحْظَى مِنْ طُمَأْنِينَتِهَا، وَبُلْغَتُهَا أَزْكَى مِنْ ثَرْوَتِهَا حُكِمَ عَلَى مُكْثِرِيهَا بِالْفَاقَةِ وَأُعِينَ مَنْ غَنِيَ عَنْهَا بِالرَّاحَةِ. وَمَنْ رَاقَهُ زِبْرِجُهَا أَعْقَبَتْ نَاظِرَيْهِ كَمَهاً، وَمَنِ اسْتَشْعَرَ الشَّغَفَ بِهَا مَلَأَتْ ضَمِيرَهُ أَشْجَاناً لَهُنَّ رَقْصٌ عَلَى سُوَيْدَاءِ قَلْبِهِ هَمٌّ يَشْغَلُهُ، وَهَمٌّ يَحْزُنُهُ، كَذَلِكَ حَتَّى يُؤْخَذَ بِكَظَمِهِ فَيُلْقَى بِالْفَضَاءِ مُنْقَطِعاً أَبْهَرَاهُ، هَيِّناً عَلَى اللّٰهِ فَنَاؤُهُ، وَعَلَى الْإِخْوَانِ إِلْقَاؤُهُ وَإِنَّمَا يَنْظُرُ الْمُؤْمِنُ إِلَى الدُّنْيَا بِعَيْنِ الْاِعْتِبَارِ، وَيَقْتَاتُ مِنْهَا بِبَطْنِ الْاِضْطِرَارِ، وَيَسْمَعُ فِيهَا بِأُذُنِ الْمَقْتِ وَالْإِبْغَاضِ، إِنْ قِيلَ أَثْرَى قِيلَ أَكْدَى وَإِنْ فُرِحَ لَهُ بِالْبَقَاءِ حُزِنَ لَهُ بِالْفَنَاءِ هَذَا وَلَمْ يَأْتِهِمْ يَوْمٌ فِيهِ يُبْلِسُونَ۔

ترجمہ:۔ ایہاالناس۔ دنیا کی دولت شکستہ کرنے والی ہے۔ اور (خرابیوں کی) وبا پیدا کرنے والی ہے۔ اس چراگاہ سے دور رہو۔ جس کا دور کرنا اُس میں آرام کرنے سے بہتر ہے۔ اُس میں سے صرف بقدر کفاف لینا پاک تر ہے۔ بہ نسبت اُس کی فراوانی مال و متاع کے۔ جس شخص کے پاس اُس کا بہت مال و متاع ہے دراصل وہ مفلس ہے۔ اصلی راحت اُس کو حاصل ہے جو اُس سے مستغنی ہے۔ جس شخص کو اُس کی آرائشیں خوشگوار معلوم ہوتی ہیں۔ اُس کو دُنیا آخر کار اندھا بنا دیتی ہے۔ جس شخص نے دنیا کی محبت کو اپنا شعار بنالیا۔ دنیا نے اُس کے دل کو اپنے رنج و آلام سے لبریز کر دیا۔ اُس کے سویداو دل پر وہ آرائشیں اپنا رقص کرتی ہیں۔ وہ کسی کام کا ارادہ کرتا ہے تاکہ وہ مشغول رہے لیکن وہ ہی کام اُس کو غمگین کرتے ہیں وہ برابر اس ہی حالت میں رہتا ہے تاآنکہ اُس کو اجل پکڑ لیتی ہے اور وہ فضائی قبر میں ڈال دیا جاتا ہے اور اُس کی رگیں کاٹ دی جاتی ہیں۔ خداوند تعالےٰ پر اُس کا فنا کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ اور اُس کے بھائیوں پر اُس کا قبر میں ڈالدینا۔ بہ تحقیق کہ مومن دنیا کو عبرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور اُس میں سے وہ اتنا ہی لیتا ہے کہ جس سے اس کا اضطرار و احتیاج دور ہو۔ دُنیا داروں کی باتیں سُن کر اُس کو غصہ آتا ہے۔ اگر کہا جائے کہ فلاں شخص دنیا کو دوست رکھنے والا بہت مالدار ہے تو درحقیقت یہ کہا گیا کہ وہ

محتاج و فقیر ہے۔ اگر اُسے بقائے دنیا کی خوشخبری دی جاتی ہے تو در حقیقت اُسے فنائے دنیا کی خبر دیکر محزون کیا جاتا ہے۔ یہ ہیں اہل دنیا کے حالات۔ حالانکہ ابھی وہ دن نہیں آیا ہے جس میں وہ رحمتِ خدا سے مایوس ہوں (وہ دن تو آگے آنے والا ہے)۔

مَعَاشِرَ النَّاسِ، اتَّقُوا اللّٰهَ فَكَمْ مِنْ مُؤَمِّلٍ مَالَا يَبْلُغُهُ، وَبَانٍ مَالَا يَسْكُنُهُ وَجَامِعٍ مَاسَوْفَ يَتْرُكُهُ، وَلَعَلَّهُ مِنْ بَاطِلٍ جَمَعَهُ، وَمِنْ حَقٍّ مَنَعَهُ: أَصَابَهُ حَرَامًا، وَاحْتَمَلَ بِهِ آثَامًا، فَبَاءَ بِوِزْرِهِ وَقَدِمَ عَلَى رَبِّهِ آسِفًا لَاهِفًا قَدْ خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ۔

ترجمہ:۔ اے لوگو خدا سے ڈرو۔ بہت سے آرزومند ہیں جو اپنی آرزوؤں تک نہیں پہنچتے۔ بہت سے عمارتیں بنانے والے ہیں جنھیں اُن میں رہنا نصیب نہیں ہوتا۔ بہت سے مال جمع کرنے والے ہیں جسے وہ عنقریب چھوڑ جائیں گے۔ شاید انھوں نے اس مال کو از راہِ باطل جمع کیا ہو۔ اس کے سبب سے اُنھوں نے گناہ کا بوجھ اُٹھایا اور اس وبال کو لئے ہوئے اپنی بازگشت کی طرف گئے۔ اور نہایت ہی اندوہناک اور حسرت ناک حالت میں اپنے پروردگار کے سامنے پیش ہوئے ہوں۔ ان لوگوں نے دنیا و آخرت کا خسارا اُٹھایا اور ظاہر لظاہر نقصان ہے۔

لَوْ رَأَى الْعَبْدُ الْأَجَلَ وَمَصِيرَهُ لَأَبْغَضَ الْأَمَلَ وَغُرُورَهُ۔

لِكُلِّ امْرِئٍ فِي مَالِهِ شَرِيكَانِ: الْوَارِثُ، وَالْحَوَادِثُ۔

ترجمہ:۔ اگر بندہ اپنی موت اور اپنے آخری مقام کو دیکھ لے تو وہ آرزوؤں اور اپنے غرور کو اپنا دشمن سمجھے۔

ہر ایک آدمی کے مال میں دو شریک ہیں۔ ایک تو وارث اور دوسرے حوادث۔

وَاللّٰهِ لَدُنْيَاكُمْ هٰذِهِ أَهْوَنُ فِي عَيْنِي مِنْ عِرَاقِ خِنْزِيرٍ فِي يَدِ مَجْذُومٍ۔

ترجمہ:۔ قسم بخدا تمھاری دنیا میری نگاہ میں اس خنزیر کی ہڈی سے بھی زیادہ ذلیل و خوار ہے جو جذامی کے ہاتھ میں ہو۔

ہر موقع پر نصیحت کرنا اور لوگوں کو صراط مستقیم پر چلانا حضرت علی کا مقصد تھا۔ چنانچہ آپ ایک جنازہ کے ساتھ جا رہے تھے تو آپ نے ایک شخص کو ہنستے

ہوئے دیکھا۔ آپ نے فرمایا۔

كَأَنَّ الْمَوْتَ فِيهَا عَلٰى غَيْرِنَا كُتِبَ، وَكَأَنَّ الْحَقَّ فِيهَا عَلٰى غَيْرِنَا وَجَبَ، وَكَأَنَّ الَّذِي نَرٰى مِنَ الْأَمْوَاتِ سَفْرٌ عَمَّا قَلِيلٍ إِلَيْنَا رَاجِعُونَ، نُبَوِّئُهُمْ أَجْدَاثَهُمْ، وَنَأْكُلُ تُرَاثَهُمْ كَأَنَّا مُخَلَّدُونَ بَعْدَهُمْ، ثُمَّ قَدْ نَسِينَا كُلَّ وَاعِظٍ وَوَاعِظَةٍ، وَرُمِينَا بِكُلِّ جَائِحَةٍ۔

ترجمہ۔ گویا اس دنیا میں موت ہمارے غیر کے واسطے ہی لکھی گئی ہے۔ اور گویا موت کا حق ہونا دوسروں ہی کے لئے واجب کر دیا گیا ہے۔ گویا یہ مسافر مردے جنھیں ہم دیکھ رہے ہیں عنقریب ہمارے پاس پلٹ آئیں گے۔ ہم اُن کو قبروں میں رکھتے ہیں۔ اور اُن کی میراث کھاتے ہیں گویا ہم اُن کے بعد ہمیشہ زندہ رہنے والے ہیں۔ ہم ہر نصیحت دینے والے (حوادثِ دنیا) کو بھول گئے اور اُن کی نصیحت کو بھلا دیا۔ حالانکہ ہم ہر ایک مصیبت اور آفت میں پھینکے گئے ہیں۔

مَثَلُ الدُّنْيَا كَمَثَلِ الْحَيَّةِ لَيِّنٌ مَسُّهَا وَالسَّمُّ النَّاقِعُ فِي جَوْفِهَا يَهْوِي إِلَيْهَا الْغِرُّ الْجَاهِلُ، وَيَحْذَرُهَا ذُو اللُّبِّ الْعَاقِلُ۔

ترجمہ۔ دنیا کی مثال اُس سانپ کی سی ہے (جس کا ظاہر) جو چھونے میں نرم و نازک ہوتا ہے لیکن اندر اُس کی کچلیوں میں زہر قاتل بھرا ہوتا ہے۔ فریب خوردہ جاہل تو اس کی خواہش کرتا ہے لیکن عقلمند اور دانا آدمی اس سے حذر ہی کرتا ہے۔

إِنَّ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةَ عَدُوَّانِ مُتَفَاوِتَانِ، وَسَبِيلَانِ مُخْتَلِفَانِ، فَمَنْ أَحَبَّ الدُّنْيَا وَتَوَلَّاهَا أَبْغَضَ الْآخِرَةَ وَعَادَاهَا وَهُمَا بِمَنْزِلَةِ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ، وَمَاشٍ بَيْنَهُمَا: كُلَّمَا قَرُبَ مِنْ وَاحِدٍ بَعُدَ مِنَ الْآخَرِ: وَهُمَا بَعْدُ ضَرَّتَانِ۔

ترجمہ۔ دنیا و آخرۃ دو دشمن ہیں جو ایک دوسرے سے بالکل علیحدہ ہیں دو راستے ہیں جو بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ جس نے دنیا سے محبت کی اور دوستی کی اُس نے آخرت کو دشمن سمجھا اور اُس سے عداوت کی یہ دونوں بمنزلہ مشرق و مغرب ہیں اور چلنے والا ان دونوں کے درمیان ہے۔ جب وہ ایک سے نزدیک ہوا تو دوسرے سے دور ہوتا گیا۔ یہ دونوں مثل دو سوکنوں کے ہیں۔

جناب امیر علیہ السلام کے بہت سے خطبے دنیا اور دنیا کی زوال پذیر حالات و نعمات کے متعلق ہیں۔ اُن میں سے ہر ایک ایسا ہے کہ بار بار پڑھا جائے۔ اگر اُن کی بدولت کی جائے تو مجھ کو یقین کامل ہے کہ دنیا کی اصلی حالت کا نقشہ ایسا دل پر بیٹھ جائے اور آخرت کی خوبیوں کا اتنا یقین ہو جائے کہ انسان دنیا کی نعمتوں کی خاطر عاقبت کے خیال کو کبھی نہ چھوڑے۔ اُن خطبات کی فہرست ہم نیچے درج کرتے ہیں۔ حوالے اُس نسخہ نہج البلاغہ کے صفحات کے ہیں جو شیخ محمد عبدہ کی شرح کے ساتھ مطبعۃ الاستقامت مصر میں چھپی ہے۔

نہج البلاغہ الجزء الاول

ص ۶۶	خطبہ	ع ۲۷	ص ۹۶	خطبہ	ع ۵۱
ص ۱۰۴	〃	ع ۶۰	ص ۱۰۵	〃	ع ۶۱
ص ۱۲۷	〃	ع ۷۹	ص ۱۲۸	〃	ع ۸۰
ص ۲۱۶	〃	ع ۱۰۷	ص ۲۲۰	〃	ع ۱۰۹

الجزء الثانی

ص ۱۵	〃	ع ۱۲۵	ص ۳۸	〃	ع ۱۴۱
ص ۷۸	〃	ع ۱۵۶			

ان میں سے ایک خطبہ ع ۱۰۷ ص ۲۱۶ الجزء الاول ہم یہاں نقل کرتے ہیں :-

أَمَّا بَعْدُ فَإِنِّي أُحَذِّرُكُمُ الدُّنْيَا فَإِنَّهَا حُلْوَةٌ خَضِرَةٌ، حُفَّتْ بِالشَّهَوَاتِ، وَتَحَبَّبَتْ بِالْعَاجِلَةِ، وَرَاقَتْ بِالْقَلِيلِ، وَتَحَلَّتْ بِالْآمَالِ، وَتَزَيَّنَتْ بِالْغُرُورِ۔ لَا تَدُومُ حَبْرَتُهَا وَلَا تُؤْمَنُ فَجْعَتُهَا، غَرَّارَةٌ ضَرَّارَةٌ، حَائِلَةٌ زَائِلَةٌ نَافِدَةٌ بَائِدَةٌ، أَكَّالَةٌ غَوَّالَةٌ لَا تَعْدُو إِذَا تَنَاهَتْ إِلَى أُمْنِيَّةِ أَهْلِ الرَّغْبَةِ فِيهَا وَالرِّضَاءِ بِهَا أَنْ تَكُونَ كَمَا قَالَ اللّٰهُ سُبْحَانَهُ وَتَعَالَى۔ كَمَاءٍ أَنْزَلْنَاهُ مِنَ السَّمَاءِ فَاخْتَلَطَ بِهِ نَبَاتُ الْأَرْضِ فَأَصْبَحَ هَشِيمًا تَذْرُوهُ الرِّيَاحُ

وكان الله على كل شيء مقتدرا) لم يكن امرؤ منها في حبرة إلا أعقبتها
عبرة ولم يلق في سرائها بطنا إلا منحته من ضرائها ظهرا ولم تطله فيها
ديمة رخاء إلا هتنت عليه مزنة بلاء وحري إذا أصبحت له منتصرة
أن تمسي له متنكرة وإن جانب منها اعذوذب واحلولى أمر منها
جانب فأوبى لا ينال امرؤ من غضارتها رغبا إلا أرهقته من
نوائبها تعبا، ولا يمسي منها في جناح أمن إلا أصبح على قوادم خوف
غرارة غرور ما فيها فانية فان من عليها لا خير في شيء من أزوادها
إلا التقوى، من أقل منها استكثر مما يؤمنه، ومن استكثر منها استكثر
مما يوبقه وزال عما قليل عنه، كم من واثق بها فجعته وذي طمأنينة
قد صرعته، وذي أبهة قد جعلته حقيرا وذي نخوة قد ردته
ذليلا؟ سلطانها دول وعيشها رنق وعذبها أجاج وحلوها صبر
وغذاؤها سمام وأسبابها رمام حيها بعرض موت وصحيحها بعرض سقم، ملكها مسلوب
وعزيزها مغلوب وموفورها منكوب وجارها محروب ألستم في مساكن
من كان قبلكم أطول أعمارا، وأبقى آثارا، وأبعد آمالا، وأعد
عديدا، وأكثف جنودا: تعبدوا للدنيا أي تعبد، وآثروها
أي إيثار؛ ثم ظعنوا عنها بغير زاد مبلغ، ولا ظهر قاطع، فهل
بلغكم أن الدنيا سخت لهم نفسا بفدية أو أعانتهم بمعونة،
أو أحسنت لهم صحبة؛ بل أرهقتهم بالفوادح وأوهنتهم بالقوارع
وضعضعتهم بالنوائب وعفرتهم للمناخر، ووطئتهم بالمناسم،
وأعانت عليهم ريب المنون فقد رأيتم تنكرها لمن دان لها، وآثرها
وأخلد لها حتى ظعنوا عنها لفراق الأبد، وهل زودتهم إلا السغب
أو أحلتهم إلا الضنك؟ أو نورت لهم إلا الظلمة أو أعقبتهم
إلا الندامة؛ أفهذه تؤثرون، أم إليها تطمئنون؛ أم عليها
تحرصون؟ فبئست الدار لمن لم يتهمها، ولم يكن فيها على وجل
منها فاعلموا وأنتم تعلمون بأنكم تاركوها، وظاعنون عنها،

وَاتَّعِظُوا فِيهَا بِالَّذِينَ قَالُوا مَنْ أَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً، حُمِلُوا إِلَى قُبُورِهِمْ فَلَا
يُدْعَوْنَ رُكْبَانًا، وَأُنْزِلُوا الْأَجْدَاثَ فَلَا يُدْعَوْنَ ضِيفَانًا، وَجُعِلَ لَهُمْ
مِنَ الصَّفِيحِ أَجْنَانٌ، وَمِنَ التُّرَابِ أَكْفَانٌ، وَمِنَ الرُّفَاتِ جِيرَانٌ، فَهُمْ
جِيرَةٌ لَا يُجِيبُونَ دَاعِيًا، وَلَا يَمْنَعُونَ ضَيْمًا، وَلَا يُبَالُونَ مَنْدَبَةً إِنْ
جِيدُوا لَمْ يَفْرَحُوا، وَإِنْ قُحِطُوا لَمْ يَقْنَطُوا. جَمِيعٌ وَهُمْ آحَادٌ، وَجِيرَةٌ
وَهُمْ أَبْعَادٌ، مُتَدَانُونَ لَا يَتَزَاوَرُونَ، وَقَرِيبُونَ لَا يَتَقَارَبُونَ، حُلَمَاءُ
قَدْ ذَهَبَتْ أَضْغَانُهُمْ، وَجُهَلَاءُ قَدْ مَاتَتْ أَحْقَادُهُمْ، لَا يُخْشَى فَجْعُهُمْ
وَلَا يُرْجَى دَفْعُهُمْ. اِسْتَبْدَلُوا بِظَهْرِ الْأَرْضِ بَطْنًا، وَبِالسَّعَةِ ضِيقًا،
وَبِالْأَهْلِ غُرْبَةً، وَبِالنُّورِ ظُلْمَةً، فَجَاءُوهَا كَمَا فَارَقُوهَا حُفَاةً عُرَاةً،
قَدْ ظَعَنُوا عَنْهَا بِأَعْمَالِهِمْ إِلَى الْحَيَاةِ الدَّائِمَةِ، وَالدَّارِ الْبَاقِيَةِ،
كَمَا قَالَ سُبْحَانَهُ. (كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ وَعْدًا عَلَيْنَا
إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ.)

ترجمہ:- بعد حمد خدا و نعت رسول کے اے لوگو! تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں تم کو دنیا کی حالت سے ڈراتا ہوں یہ نہایت خوش رنگ شیریں حلوہ نظر آتی ہے۔ شہوات کے باعث لوگ اس کے گرد منڈلا رہے ہیں۔ اس کی نعمتیں جلد زائل ہونے والی ہیں لیکن پھر یہ محبوب ہے۔ اس میں زندگی کتنی قلیل ہے لیکن پھر بھی یہ خوش آیندہ معلوم ہوتی ہے۔ اس کی آرائش یہ ہے کہ یہ آرزوؤں کے ساتھ وابستہ ہے۔ مکر و فریب اس کی زینت ہے۔ اس کی خوشیاں اور فرحتیں ہمیشہ نہیں رہیں گی۔ اور اس کے مصائب و آلام سے پناہ نہیں مل سکتی دنیا فریب دینے والی ہے ضرر پہنچانے والی ہے۔ آخرت کی خوبیوں سے روکتی ہے اور خود بہت جلد زائل ہونے والی ہے۔ یہ تو اب برباد ہوئی۔ اب ختم ہوئی یہ بہت تیزی سے کھلنے والی ہے۔ اور اپنے گرفتاروں کو ہلاک کرنے والی ہے۔ یہ دنیا اپنی طرف رغبت کرنے والوں کی آرزوؤں کی آخری حد تک پہنچ جانے پر بھی اس کی وہ ہی حالت ہوتی ہے۔ جیسا کہ خداوند تعالے قرآن شریف میں فرمایا ہے کہ دنیا کی مثال اُس پانی کی ہے جسے ہم نے آسمان سے اُتارا اور نباتات ارضیہ اُس کے ساتھ مخلوط ہوگئے یعنی چاروں طرف سبزہ نظر آنے لگا تو پھر سرسبز و شاداب گھاس سوکھ کر ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے اور ہوائیں اُس کو

چاروں طرف منتشر کر دیتی ہیں۔ بیشک خداوند تعالےٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ یہی حالت دنیا کی ہے۔ ابھی سرسبز تھی، ابھی خشک پڑی ہے اور خرمن ہستی کو فنا کی ہوائیں اڑائے لئے جاتی ہیں۔ کوئی شخص ایسا نہیں کہ جس نے دنیا میں کوئی ساعت خوشی سے گزاری ہو اور معاً فوراً ہی آنسوؤں کا تار نہ بندھ گیا ہو کوئی شخص ایسا نہیں جس کے ساتھ اس دنیا نے اپنی مسرتوں کے ساتھ ملاقات کی ہو اور پھر اُسے اپنی مضرتوں اور سختیوں کے مزے نہ چکھائے ہوں۔ کسی شخص پر وسعت کے دنیا کی بارشیں نہیں ہوتیں مگر یہ کہ فوراً اس پر بلاؤں کے بادل چھا جاتے ہیں۔ دنیا کا یہی وطیرہ ہے کہ جب کبھی کسی شخص کی صبح کو نصرت کرتی ہے تو شام کو اس سے دشمنی کرتی ہے۔ اگر ایک جانب سے وہ اس کے لئے شیریں وخوشگوار ہوتی ہے تو دوسری جانب سے اس کو اپنی تلخیاں پہنچاتی ہے۔ کوئی شخص اس دنیا میں اپنی خوشی وراحت کو نہیں پہنچتا۔ لیکن یہ کہ دنیا مصائب وحوادث کی مشقتوں کا بوجھ اُس پر لاد دیتی ہے اس دنیا میں کوئی شخص امن وراحت کے پردوں میں شام نہیں کرتا لیکن یہ کہ خوف وہراس کے سایہ میں صبح کرتا ہے یہ دنیا بڑی دھوکہ دینے والی ہے۔ یہ سراسر فریب ہے۔ جو اشیاء اس میں موجود ہیں وہ سب کی سب فانی ہیں۔ جو اس کے ساتھ لپٹا اُس ہی کو اس نے نیست و نابود کر دیا۔ اس دنیا میں اگر کوئی شے توشہ وزادراہ بنانے کے قابل ہے تو وہ تقویٰ ہے۔ زہد و تقویٰ کے سوا اور کسی چیز میں بھلائی نہیں۔ جس شخص نے دنیا کے مال ومتاع میں قلیل حصہ لیا اُس نے اُن اشیاء میں بہت بڑا حصہ لے لیا جو اُسے عقوبت وعذاب سے امن دینے والی ہیں۔ اور جس شخص نے اس دنیا کا بہت سا مال ومتاع جمع کیا اُس نے وہ چیزیں بہت زیادہ مقدار میں اکٹھا کر لیں جو اسے ہلاک کرنے والی ہیں۔ اور بہت جلد اُس کے پاس سے وہ زائل اور مفقود ہو جائیں گی۔ جس شخص نے دنیا پر بھروسہ کیا وہ ہی درد وغم میں مبتلا ہوا۔ جو شخص دنیا میں مطمئن ہوا اور عیش وراحت اُسے ملا اُس ہی کو یہ دنیا زمین پر پچھاڑ دیتی ہے۔ جو صاحب جاہ ومنزلت ہوا اُسی کو اس دنیا نے حقیر اور پست کر دیا۔ جس شخص نے یہاں نخوت کی اُسی کو اس دنیا نے ذلت وخواری میں گرفتار کر دیا۔ دنیا کی طاقتیں (حکومتیں) پلٹنے والی ہیں۔ اس کے عیش مکدر ہیں۔ اس کی شیرینیاں ناگوار ہیں۔ اس کی حلاوتیں تلخ ہیں۔ اس کی غذائیں زہر ہیں۔ اس کے اسباب وذرائع ہاتھ سے نکل جانے والے ہیں۔ اس کی زندگی ہمیشہ موت سے دوچار ہے اس کی تندرستی کے ساتھ

مرض لگا ہوا ہے۔ اس کی سلطنت سلب کر لی جاتی ہے۔ اس کے طاقتور لوگ ہی مغلوب ہیں۔ اس کے اموال معرض نکبت میں آئے ہوئے ہیں اور اس کے سایہ میں رہنے والے آوارہ و پریشان ہیں۔ کیا تم اُن پہلے لوگوں کے مکانوں میں نہیں ہو جن کی عمریں تم سے طویل اور جن کے آثار تم سے زیادہ باقی رہنے والے تھے۔ جن کی آرزوئیں حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھیں۔ جو تعداد میں تم سے بہت زیادہ تھے۔ جن کے لشکر بہت زیادہ فراہم اور کثیر تھے۔ اُنھوں نے کس کس طرح دنیا کی بندگی نہ کی۔ کن کن طریقوں سے دنیا کو اختیار نہ کیا مگر آخر کار دنیا سے چلے گئے۔ نہ تو زادِ راہ میسر ہوا جو منزل تک پہنچا دے۔ اور نہ کوئی سواری میسر ہوئی جو قطع مسافت میں کام آئے۔ کیا تمھیں کبھی خبر پہنچی ہے کہ دنیا نے ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی مکمل خوشی اُن کو دی ہو۔ یا اُن کی مدد کسی اور طریقہ سے کی۔ یا اُن کے ساتھ اچھائی اور خوبی سے رہی ہو۔ نہیں نہیں، بلکہ سخت مصائب کو اُن کے شاملِ حال کر دیا۔ اور اُنھیں طرح طرح کی کوفت پہنچا کر مضمحل کر دیا۔ حوادثِ زمانہ نے اُن کو مضطرب کر دیا۔ اور اُنھیں نتھنوں تک خاک میں آلودہ کر دیا۔ اُن کو اونٹ کے قدموں سے خوب ہی روندا اور حوادثاتِ زمانہ کو اُن پر مسلط کر دیا۔ بے شک تم نے اُس شخص کے ساتھ دُنیا کی بیوفائی کو دیکھ لیا جو اس کا تقرب تلاش کر رہا تھا اور اُس ہی کے اختیار کرنے پر اور اُس کی طرف مائل تھا یہاں تک کہ وہ اُس سے ہمیشہ کی جدائی کر کے چلا گیا۔ کیا سوائے گرسنگی کے اور بھی کچھ زادِ راہ دنیا نے ان لوگوں کو دیا۔ کیا سوائے تنگی اور ضیق کے کہیں اور جگہ بھی ان کو دی۔ سوائے ظلمت و تاریکی کے کیا کچھ اور بھی ان کے لئے ظاہر کیا۔ کیا سوائے پشیمانی کے اُنھیں کچھ اور بھی ملا؟ اب کیا تم اس دنیا کو اختیار کرتے ہو اور اس کی طمع رکھتے ہو۔ کیا ایسی دنیا کی طرف سے تم کو اطمینان حاصل ہے کہ تم اس کی حرص کرتے ہو۔ خوب سمجھ لو دنیا اُس شخص کے لئے نہایت ہی بُرا انعام ہے جو اُسے محلِ تہمت و اتہام نہ سمجھے اور اس میں رہ کر خوف و بیم میں زندگی نہ گزارے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ تم اس کو چھوڑنے والے ہو۔ اور یہاں سے کوچ کر جانے والے ہو۔ کیا تم ان لوگوں کے قدم بقدم چلنا چاہتے ہو جو کہا کرتے تھے کہ ہم سے زیادہ قوت میں کون ہے اور وہ اپنی قبروں کی طرف سوار کرا کر روانہ کر دئیے گئے اور کسی نے نہ کہا کہ کیسے شوکت والے سوار ہیں۔ اُنھیں قبروں میں داخل

کر دیا گیا اور کسی نے اُن کی مہمانی نہ کی۔ اب تو ان کی قبریں پتھروں کے ڈھیر ہیں مٹی اُن کا کفن ہے۔ بوسیدہ ہڈیاں اُن کی ہمسایہ ہیں اب وہ ایسے ہمسایہ ہیں کہ لاکھ اُن کو پکارو وہ جواب نہ دیں گے اُن پر کتنا ہی ظلم کیا جائے وہ اُس کے روکنے پر قادر نہیں ہیں۔ اور نہ رونے کے لئے اُن کی آنکھوں میں طراوت باقی ہے۔ اگر اُن کے ساتھ نیکی کی جائے تو اُنھیں کچھ خوشی حاصل نہ ہوگی اور اگر اُن کو کچھ نہ دیا جائے تو اُن پر مایوسی کے آثار ظاہر نہ ہوں گے۔ وہ ایک جگہ جمع ہیں۔ لیکن پھر اکیلے ہیں۔ آپس میں ساتھ ہیں۔ لیکن پھر ایک دوسرے سے بہت دور ہیں۔ وہ آپس میں نزدیک ہیں۔ لیکن ایک دوسرے کی زیارت نہیں کر سکتے۔ باوجود قریب ہونے کے قربت حاصل نہیں۔ وہ بردبار ہیں کینہ اُن کے دلوں سے نکل چکا ہے۔ وہ نادان ہیں۔ حسد اُن سے بالکل زائل ہو گیا ہے۔ ان کی تکالیف ان کو خوفناک نہیں بنا سکتیں۔ اور اب نہ اُن کے شاد ہونے کی امید کی جاسکتی ہے۔ اُنھوں نے زمین کی سطح کو اُس کی تہ سے بدل لیا ہے۔ اور وسعت کی بجائے تنگی اختیار کر لی ہے۔ اور اپنے اہل و عیال کو چھوڑ کر تاریکی میں چلے گئے ہیں۔ اب وہ پھر اسی طرح زمین کے اوپر آئیں گے۔ جس طرح اُس کو چھوڑ کر گئے تھے۔ تن و پا برہنہ۔ اور پھر اپنے اعمال کے ساتھ ہمیشہ کی زندگی اور دائمی مقام کی طرف چلے جائیں گے۔ جیسا کہ خداوند تعالےٰ فرماتا ہے۔ کما بدانا اوّل خلق نعیدہ وعد اعلینا انا کنا فاعلین۔ (ختم ہوا ترجمہ)

کیا اس سے بہتر کوئی دنیا کی حقیقت کو بیان کر سکتا ہے۔ اور اُس شخص سے زیادہ کوئی شقی نہیں جو باوجود ان حقائق کے سننے کے پھر دنیا سے لپٹا رہے۔ اسلام میں جن ارکان پر اعمال صالحہ کی عمارت قائم ہے اُن میں سے دُنیا کی حقیقت کا علم اور اُس سے بے رُخی بہت بڑا رکن ہے۔ اس کے بغیر کوئی نیک عمل مکمل نہیں ہو سکتا۔ اور اس کا نہ سمجھنا ہی آجکل دنیا کے لوگوں کو اُن کی بربادی کی طرف لے جا رہا ہے۔ لہذا فلسفہ اسلام کے بیان میں جتنا اس پر زور دیا جائے کم ہے۔ اندرین صورت اس حکیم الٰہی کا ایک اور خطبہ نقل کرتے ہیں۔ اس خطبہ کا نمبر ۱۰۹ ہے اور یہ نہج البلاغہ کے صفحہ ۲۲۰ سے شروع ہوتا ہے۔

وَاُحَذِّرُكُمُ الدُّنْيَا فَاِنَّهَا مَنْزِلُ قُلْعَةٍ، وَلَيْسَتْ بِدَارِ نُجْعَةٍ

قد تزینت بغرورها، وغرت بزینتها، هانت علی ربها، فخلط حلالها بحرامها، وخیرها بشرها وحیاتها بموتها، وحلوها بمرها: لم یصفها الله تعالی لاولیائه، ولم یضن بها علی اعدائه خیرها زهید، وشرها عتید، وجمعها ینفد، وملکها یسلب وعامرها یخرب فما خیر دار تنقض نقض وعمر یفنی فیها فناء الزاد، ومدة تنقطع انقطاع السیر۔ اجعلوا ما افترض الله علیکم من طلبکم، واسألوه من اداء حقه ما سألکم، واسمعوا دعوة الموت اذانکم، قبل ان یدعی بکم۔ ان الزاهدین فی الدنیا تبکی قلوبهم وان ضحکوا، ویشتد حزنهم وان فرحوا، ویکثر مقتهم انفسهم وان اغتبطوا بما رزقوا، قد غاب عن قلوبکم ذکر الآجال وحضرتکم کواذب الآمال، فصارت الدنیا املک بکم من الآخرة، والعاجلة اذهب بکم من الآجلة، وانما انتم اخوان علی دین الله، ما فرق بینکم الاخبث السرائر، وسوء الضمائر، فلا توازرون ولا تناصحون ولا تباذلون ولا توادون، ما بالکم تفرحون بالیسیر من الدنیا تملکونه ولا یحزنکم الکثیر من الآخرة تحرمونه، ویقلقکم الیسیر من الدنیا یفوتکم، حتی یتبین ذلک فی وجوهکم، وقلة صبرکم، عما زوی منها عنکم، کانها دار مقامکم، وکان متاعها باق علیکم، وما یمنع احدکم ان یستقبل اخاه بما یخاف من عیبه الا مخافة ان یستقبله بمثله۔ قد تصافیتم علی رفض الآجل، وحب العاجل، وصار دین احدکم لعقة علی لسانه، صنیع من قد فرغ من عمله، واحرز رضا سیده۔

ترجمہ:- میں تم کو دنیا سے ڈراتا ہوں۔ یہ وہ مکان ہے جس کی بنیادیں اکھڑنے والی ہیں۔ یہ آرام کرنے کا گھر نہیں ہے۔ یہ لوگوں کو فریفتہ کرنے کے لئے مزین ہوئی ہے اور لوگوں کو اپنی آرائش سے فریب دیتی ہے۔ اپنے رہنے والوں کے لئے یہ ذلت و

خواری کا مقام ہے۔ اس کے حلال حرام سے اور بھلائیاں برائیوں سے ملی ہوئی ہیں۔ اس کی حیات موت سے ملی ہوئی ہے۔ اور اس کی شیرینی میں کڑواہٹ ہے۔ اسے پروردگار عالم نے اپنے دوستوں کے لئے منتخب نہیں کیا۔ اور اپنے دشمنوں کو اس کی بخشش کرنے میں کمی نہیں کی۔ اس کی بہبودیاں نایاب ہیں۔ شرارتیں مہیا ہیں۔ اس کے اموال کا اجتماع نیست و نابود ہونے والا ہے۔ اس کا ملک سلب ہو جائے گا۔ اس کی عمارتیں بہت جلد برباد ہو جائیں گی۔ اس مکان میں کونسی خوبی ہے جس کی بنیادیں گرنے والی ہیں۔ اور اس عمر میں کیا خوبی ہے جو توشہ راہ کی طرح فنا ہو جانے والی ہے۔ اس مدت میں کیا بہتری ہے جو مسافر کے سفر کی طرح منقطع ہو رہی ہے، جو تمھارے مطالب و مقاصد میں سے خداوند تعالےٰ نے تم پر فرض کیا ہے اس کو بجالاؤ۔ تم خدا سے اسی شے کا سوال کرو جو تم سے ادائی حقوقِ واجبہ کی نسبت اُس نے تم سے سوال کیا ہے۔ موت کی آواز کو گوشِ دل سے سنو۔ قبل اس کے کہ موت تم کو بلائے۔ بالتحقیق کہ دنیا میں رہ کر اس کی طرف رغبت نہ کرنے والوں کے دل روتے رہتے ہیں۔ اگرچہ بظاہر وہ ہنستے ہوں (یعنی خوشی کے سامان مہیا ہوں) ان کا حزن و ملال بہت زیادہ سخت ہوتا ہے اگرچہ وہ بظاہر خوش ہوں (یعنی فرحت کے سامان مہیا ہوں) اور ان کا غصہ نفس امارہ پر زیادہ ہی ہوتا جاتا ہے اگرچہ سامان خوش حالی جوان کے لئے مقدر کر دئے گئے ہیں موجود ہوں۔ تمھارے دلوں سے موت کا تصور غائب ہو گیا ہے اور جھوٹی آرزوؤں کا غلبہ تم پر مسلط رہتا ہے۔ تمھیں کارہائے آخرت سے زیادہ دنیاوی امور متحرک کر رہے ہیں۔ اور اس دنیا کے خیال نے آخرت کا خیال تمھارے دلوں سے محو کر دیا ہے۔ خوب سمجھ لو۔ از روئے دین اسلام تم آپس میں بھائی بھائی ہو، تمھیں کوئی شے ایک دوسرے سے جدا نہیں کر سکتی۔ لیکن تمھارے اندر کی پوشیدہ خباثت اور تمھارے دلوں کی برائیاں تمھیں پراگندگی پر آمادہ کرتی ہیں۔ پس تم ایک دوسرے کا بوجھ نہیں بٹاتے ہو، ایک دوسرے کے حقوق ادا نہیں کرتے۔ آپس میں ایک دوسرے کو نصیحت نہیں کرتے۔ تمھارا کیا حال ہو گیا ہے۔ دنیا کا مال تمھیں تھوڑا سا مل جائے تو تم خوش ہو جاتے ہو اور وہ اجر کثیر آخرت جس سے تم محروم کر دئے جاتے ہو تمھیں ذرا بھی

اندوہناک نہیں کرتا۔ اگر دنیا کی ذرا سی چیز تم سے نکل جاتی ہے تو تم مضطرب اور پریشان ہو جاتے ہو۔ اس کا قلق اور اضطراب تمہارے چہروں سے ظاہر ہونے لگتا ہے۔ تمہارے چہروں پر انتہائی بے صبری برسنے لگتی ہے۔ اُس چیز کے سبب سے جو تم سے لے لی جاتی ہے۔ گویا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ دنیا تمہاری ہمیشہ کی سکونت کا مقام ہے۔ اور اس کا مال و متاع ہمیشہ تمہارے پاس باقی رہے گا۔ وہ کون سی چیز ہے جو تم میں کسی فردِ واحد کو اس بات سے روکتی ہے کہ اپنے بھائی کا صحیح عیب اُس کے منہ پر بیان کر دے۔ مگر بات یہ ہے کہ وہ بھی اس سے ڈرتا ہے کہ اُس کے عیب بھی اسی طرح بیان کر دیئے جائیں گے۔ اس صورت میں البتہ ترک آخرت اور محبت دنیا پر تم لوگوں میں خالص دوستی پیدا ہو گئی ہے۔ اور تم میں سے ہر ایک کا دین فقط اسی قدر رہ گیا ہے کہ اُسے زبان سے چاٹ لیا جائے (یعنی فقط زبان ہی پر دین کا نام ہے۔ اور دل اعتقاد سے خالی ہے) تمہاری یہ خصلت اُس غلام کی خصلت کے مانند ہے۔ جو اپنے آقا کے کاروبار سے فارغ ہو چکا ہو اور اس کی خوشنودی حاصل کر لی ہو۔

جناب امام حسن علیہ السلام

جنادہ ابن امیہ نے اپنے مرضِ موت میں امام حسنؑ سے استدعا کی کہ کچھ نصائح ارشاد فرمائیں۔ آپ نے فرمایا:۔

استعد لسفرك وحصل زادك قبل حلول اجلك واعلم انك تطلب الدنيا والموت يطلبك ولا تحمل هم يومك الذي لم يات على يومك الذي انت فيه واعلم انك لا تكسب من المال شيئا فوق قوتك الا كنت فيه خازنا لغيرك واعلم ان الدنيا في حلالها حساب وفي حرامها عقاب وفي الشبهات عتاب فانزل الدنيا بمنزلة الميتة خذ منها ما يكفيك فان حلالا كنت قد زهدت فيها وان كان حراما لم يكن فيه وزر فاخذت منه كما اخذت من الميتة وان كان العتاب فالعتاب يسير واعمل لدنياك

کانک تعیش ابداً واعمل لآخرتک کانک تموت غداً واذا اردت عزاً بلا عشیرۃ وھیبۃ بلا سلطان فاخرج من ذل معصیۃ اللّٰہ الی عز طاعۃ اللّٰہ عزوجل واذا نازعتک الی صحبۃ الرجال حاجۃ فاصحب من اذا صحبتہ زانک واذا خدمتہ صانک واذا اردت معونۃ اعانک وان قلت صدق قولک وان صلت شد صولک وان مددت یدک بفضل مدھا وان بدت منک ثلمۃ سدھا وان رای منک حسنۃ عدھا وان سألتہ اعطاک وان سکت عنہ ابتداک وان نزلت بک احدی الملمات واساک من لا تاتیک منہ البوائق ولا تختلف علیک منہ الطرائق ولا یخذلک عند الحقائق وان تنازعتما منقسما آثرک۔

ترجمہ:- اپنے سفر کے لئے تیاری کر اور زاد راہ حاصل کر لے قبل اس کے کہ اجل آئے۔ اور اچھی طرح سمجھ لے کہ تو دنیا کو طلب کرتا ہے اور موت تجھ کو طلب کرتی ہے اُس دن کا رنج نہ اُٹھا جو ابھی نہیں آیا۔ اور اس کل کے رنج کو آج کے رنج پر زیادہ نہ کر۔ یاد رکھ مالِ دنیا میں سے تو اپنی ضروریات سے زیادہ نہیں لے سکتا اور باقی مال کا تو دوسروں کے لئے چوکیدار ہے۔ یہ بھی سمجھ لے کہ دنیا کے حلال کا حساب ہے، حرام کا عذاب ہے اور تیرے شبہات کے لئے عتاب ہے۔ دنیا کو بمنزلہ مردار کے سمجھ (جو بموجب نص قرآنی خاص حالتوں میں جائز ہو جاتا ہے) اُس میں سے اُتنا ہی لے جتنا تیرے لئے محض کافی ہو۔ کیونکہ اگر وہ حلال ہے تو زیادہ نہ لینے کی وجہ سے تجھے زہد دنیا کا ثواب ملے گا۔ اور اگر اس پر حرام ہونے کا گمان ہے تو تیرے اوپر بوجھ نہ ہوگا کیونکہ تو نے اتنا ہی لیا ہے جتنا مردار سے خاص ضرورت کی حالت میں لیا جاتا ہے۔ اور اگر اس میں عتاب ہے تو وہ عتاب نرم ہوگا۔ جب تو دنیا کے امور کی طرف متوجہ ہو تو اس تن دہی کے ساتھ ہو کہ تو ہمیشہ زندہ رہے گا۔ اور جب تو آخرۃ کے لئے عمل کرے تو یہ خیال کر کہ گویا تو کل مر جائے گا اگر تو چاہتا ہے کہ تجھ کو بغیر اقربا کی مدد کے عزت ملے اور بغیر حکومت کے لوگوں کے دلوں میں تیری ہیبت ہو تو معصیت خدا کی ذلت سے

نکل کر خداوند عزوجل کی طاعت کی عزت میں آجا۔ اور اگر کوئی حاجت تجھ کو لوگوں سے ملنے پر مجبور کرے تو ایسے شخص سے مل کہ جب تو اُس سے ملے تو تجھے زینت و عزت دے، اور تو اُس کی خدمت کرے تو وہ تیری حفاظت کرے۔ اور اگر تجھ کو اُس کی اعانت کی ضرورت ہو تو وہ تیری مدد کرے۔ اگر تو کوئی بات کہے تو اُس کو وہ پورا کر دے۔ اگر تو کسی پر حملہ کرے تو وہ تیرے حملہ کو شدید کر دے۔ اگر تو اپنا ہاتھ نیکی کے ساتھ بڑھائے تو وہ بھی بڑھاوے اگر تجھ سے کچھ نقص یا رخنہ ظاہر ہو تو وہ اُس کو بند کر دے اور اگر وہ تجھ سے نیکی دیکھے تو وہ بھی نیکی کو زیادہ کر دے۔ اگر تو اُس سے کچھ سوال کرے تو وہ عطا کر دے، اور اگر تو اُس سے بات کرنی چھوڑ دے تو وہ تجھ سے بات کرنے میں ابتداء کرے۔ اگر تجھ پر کوئی مصیبت پڑے یا کسی طرف سے تجھے بُرائی ملے تو اُس شخص کی طرف سے تجھے سختیاں نہ پہنچیں اور تیری طرف سے اُس کی آنکھ نہ بدلے۔ اور نہ وہ تجھے مصیبت کے وقت چھوڑ دے۔

جناب امام حسن نے ایک خطبہ میں فرمایا۔

یا ابن آدم عف عن محارم اللّٰہ تکن عابداً وارض بما قسم اللّٰہ تکن غنیاً واحسن جوار من جاورک تکن مسلماً وصاحب الناس بمثل ما تحب ان یصاحبوک بہ تکن عدلاً انہ کان بین ایدیکم اقوام یجمعون کثیراً ویبنون مشیداً ویاملون بعیداً اصبح جمعھم بوراً وعملھم غروراً ومساکنھم قبوراً یا ابن آدم انک لم تزل فی ھدم عمرک منذ سقطت من بطن امک فخذ مما فی یدیک لما بین یدیک فان المومن یتزود والکافر یتمتع۔

ترجمہ: اے فرزند آدم۔ خداوند تعالےٰ کے محرمات سے بچ تاکہ تو اُس کی بندگی (اطاعت) کرنے والا شمار کیا جائے۔ جو خداوند تعالےٰ نے تقسیم رزق کر دیا ہے اُس پر راضی ہو جا تاکہ تو غنی (ہر ایک شے سے مستغنی) ہو جائے۔ اور اپنے ہمسایہ اور ساتھی کے ساتھ نیکی کر تاکہ تجھ کو سلامتی ملے۔ اور لوگوں کے ساتھ اس طرح مل کہ جس طرح تو چاہتا ہے کہ لوگ تجھ سے ملیں۔ تو انصاف کر۔ دیکھ تو سہی۔ تیرے سامنے تجھ سے پہلے جنھوں نے سب مال جمع کر لیا تھا۔ عالیشان محل بنوائے تھے اور بڑی لمبی چوڑی آرزوئیں رکھتے تھے۔ آخر کار اُن کا مجمع ہلاک ہو گیا۔ اور اُن کے سارے کام

برباد ہوگئے۔ اور اُن کے رہنے کی جگہ اُن کی قبر ہوگئی۔ اے فرزند آدم، جب سے تو اپنی ماں کے بطن سے پیدا ہوا ہے متواتر تیری عمر کم ہو رہی ہے۔ پس جو تیرے ہاتھ میں ہے اُس سے اپنی آخرت کا زاد بنا۔ کیونکہ مومن آخرت کے لئے جمع کرتا ہے اور کافر اُس سے یہیں فائدہ اٹھا لیتا ہے۔

جناب امام حسین علیہ السلام۔

کشف الغمہ میں جناب امام حسین علیہ السلام کا یہ خطبہ درج ہے۔

ایہا الناس نافسوا فی المکارم وسارعوا فی المغانم ولا تحتسبوا بمعروف لم تعجلوه واکسبوا الحمد بالنجح ولا تکسبوا بالمطل ذما فمهما یکن لاحد عند احد صنیعته رای انه لا یقوم بشکرها فالله له بمکافاته فانه اجزل عطاء واعظم اجرا واعلموا ان حوائج الناس الیکم من نعم الله علیکم فلا تملوا النعم فتحور نقما واعلموا ان المعروف مکسب حمدا و معقب اجرا فلو رایتم المعروف رجلا رایتموه حسنا جمیلا یسر الناظرین ولو رایتم اللؤم رایتموه سمجا مشوها تنفر منه القلوب وتغض دونه الابصار۔ ایها الناس من جاد ساد ومن بخل رذل وان اجود الناس من اعطی من لا یرجوه وان اعفی الناس من عفا عن قدرة وان اوصل الناس من وصل من قطعه والاصول علی مغارسها بفروعها تسمو فمن تعجل لاخیه خیرا وجده اذا قدم علیه غدا ومن اراد الله تبارک وتعالی بالصنیعة الی اخیه کافاه بها فی وقت حاجته وصرف عنه من بلاء الدنیا ما هو اکثر منه ومن نفس کربة مومن فرج الله عنه کرب الدنیا والآخرة ومن احسن احسن الله الیه والله یحب المحسنین

ترجمہ:۔ لوگو! عزت اور نیکنامی کے کاموں میں باہم مقابلہ کرو۔ اور منفعت حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جاؤ۔ جس نیکی میں تم نے تاخیر کی پھر اُسے نیکی نہ سمجھو۔ حاجت برآری کرکے تعریف کے قابل بنو۔ ٹال مٹول کرکے مذمت کے مستحق نہ بنو۔ اگر کوئی شخص کسی پر احسان کرے۔ اور یہ سمجھتا ہو کہ وہ شخص

ہمارے احسان کا شکر یہ نہ ادا کرے گا تو اللہ اُس کے احسان کا بدلہ دے گا اور خدا تو بہت گراں قدر عطیہ اور بڑا معاوضہ دینے والا ہے۔ یہ جان لو کہ لوگوں کا اپنی حاجتیں تمہارے پاس لانا تمہارے لئے بڑی نعمت ہے۔ لہذا اس نعمت سے برداشتہ خاطر نہ ہو۔ ورنہ وہ تمہارے لئے بجائے نعمت کے وبال بن جائے گی۔ یہ سمجھ لو کہ احسان کر کے انسان مدح وستائش حاصل کرتا ہے اور بعد میں ثواب بھی پاتا ہے۔ اگر احسان آدمی کی شکل اختیار کرتا تو تم اُس کو نہایت حسین وجمیل دیکھتے جسے دیکھ کر دیکھنے والوں کو خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اور اگر بخل انسان کی صورت اختیار کرتا تو وہ زشت رو اور کریہ المنظر ہوتا جس سے دل متنفر ہوتے ہیں اور آنکھیں اُسے دیکھنے سے گریز کرتی ہیں۔ لوگو! جس نے سخاوت کی وہ سردار ہوا۔ جس نے بخل کیا وہ رذیل ہوا۔ اور سب سے زیادہ فیاض وہ شخص ہے جو ایسے کو دے جو اُس سے امید نہیں رکھتا ہو۔ اور لوگوں میں سب سے زیادہ عفو کرنے والا وہ شخص ہے جو قابو پانے کے باوجود معاف کردے۔ اور لوگوں میں سب سے زیادہ صلہ رحم کرنے والا وہ شخص ہے جو اُس کے ساتھ صلہ رحم کرے جس نے اُس کے ساتھ قطع رحم کیا ہو۔ جڑیں اپنے جمنے کی جگہوں میں اپنی شاخوں ہی کے ساتھ بڑھتی ہیں۔ لہذا جو شخص اپنے بھائی کے ساتھ بھلائی کرنے میں جلدی کریگا تو وہ جب خود کسی ضرورت سے مجبور ہو کر اُس کے پاس آئے گا تو اپنی بھلائی موجود پائے گا۔ اور جو شخص اپنے بھائی پر احسان کر کے خدا سے اجر کا طالب ہو تو خدا بھی اُس کی ضرورت کے وقت اس کے احسان کا بدلہ دیگا۔ اور دنیا کی اتنی مصیبتیں دور کرے گا جتنی اُس نے اپنے بھائی کی دور نہ کی تھیں جو شخص کسی مومن کو رنج سے چھڑائے گا تو خدا اُسے دنیا اور آخرت کے رنج سے نجات دیگا۔ جو شخص دوسروں پر احسان کرے گا خدا اُس پر احسان کرے گا اور اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

دنیا کی زندگی کے یہ بہترین اصول ہیں۔ ناظرین غور کریں۔ دنیا سے الگ ہو کر رہبانیت اختیار کرنا اور ہمالیہ پہاڑوں پر رشی اور منی بنکر زندگی بسر کرنا یا بدھ کی طرح عورتوں اور بچوں کے علائق کی تکلیف سے گھبرا کر اُن سے علیحدہ ہو جانا اچھا ہے۔ یا اس طرح دنیا میں رہ کر لوگوں کی حاجت برآری کرنا۔

یا ابن آدم تفکر و قل این ملوک الدنیا و اربابھا الذین عمروا خرابھا، واحتفروا انھارھا، واغرسوا اشجارھا ومدنوا مدائنھا، فارقوھا وھم کارھون وورثھا قوم آخرون، ونحن بھم عما قلیل لاحقون۔ یا ابن آدم اذکر مصرعک وفی قبرک مضجعک وموقفک بین یدی اللہ، تشھد جوارحک علیک یوم نزل فیہ الاقدام و تبلغ القلوب الحناجر و تبیض وجوہ، وتسود وجوہ وتبدو السرائر ویوضع المیزان القسط، یا ابن آدم اذکر مصارع آبائک و ابنائک کیف کانوا وحیث حلوا وکانک عن قلیل، قد حللت محلھم وصوت عبرۃ المعتبر۔ وانشہ شعرا۔

این الملوک التی عن حفظھا غفلت
حتی سقاھا بکاس الموت ساقیھا
تلک المدائن فی الآفاق خالیۃ
عادت خرابا وذاق الموت بانیھا
اموالنا لذوی الوارث نجمعھا
ودورنا لخراب الدھر بانیھا

ترجمہ:۔ اے فرزند آدم! غور کر اور بتا کہ شاہان دنیا اور دنیا والے کہاں ہیں، کدھر گئے وہ لوگ جنھوں نے اس دنیا کے ویرانوں کو آباد کیا تھا۔ انھوں نے نہریں کھودیں، درخت لگائے، اس کے شہروں کو آباد کیا، آخرکار انھیں یہ دنیا چھوڑنی پڑی درآنحالیکہ وہ اس کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اور ان کی جگہ دوسرے لوگ مالک بن بیٹھے۔ ہم لوگ بھی عنقریب ان سے جا ملیں گے۔ اے فرزند آدم! اپنے بچھڑنے اور قبر میں لیٹنے اور پھر بروز قیامت خداوند عالم کے سامنے کھڑے ہونے کو یاد کر جہاں تیرے اعضا تیرے خلاف گواہی دیں گے اس دن جب کہ قدموں کو لغزش ہوگی اور دل حلق تک آجائیں گے۔ اور بعضوں کے چہرے سفید اور بعضوں کے سیاہ ہوں گے اور دل میں چھپائی ہوئی باتیں ظاہر ہوجائیں گی۔ اور انصاف کی ترازو نصب کی جائے گی۔ اے فرزند آدم! اپنے

باپ دادا اور اپنی اولاد کے مرنے کو یاد کر کہ پہلے وہ کہاں تھے اور اب کہاں ہیں۔ اور تو بھی عنقریب اون کے ساتھ جاملے گا۔ اور عبرت حاصل کرنے والے کے لئے نمونہ عبرت بن جائے گا۔

پھر آپ نے اشعار پڑھے جن کا ترجمہ یہ ہے۔

کہاں ہیں وہ بادشاہ جو اپنی جانوں کو نہ بچا سکے۔

یہاں تک کہ پلانے والے نے اُن کو موت کا جام پلادیا۔

دنیا میں اُن کے شہر خالی ہیں۔

اور ویران ہو رہے ہیں اور ان کے بنانے والے نے موت کا مزا چکھ لیا۔

ہم اپنے مال اپنے وارثوں کے لئے جمع کرتے ہیں۔

اور اپنے گھر زمانہ کے بگاڑنے کے لئے بناتے ہیں۔

یہ خطبہ تاریخ ابن عساکر سے لیا گیا ہے۔

قال بعد الحمد والثناء عباد الله اتقوا الله وكونوا من الدنيا على حذر، فان الدنيا لو بقيت لاحد وبقي عليها احد لكانت الانبياء احق بالبقاء واولى بالرضاء وارضى بالقضاء غير ان الله خلق الدنيا للبلاء وخلق اهلها للفناء فجديدها بال ونعيمها مضمحل وسرورها مكفهر والمنزل بلغة والدار قلعة فتزودوا فان خير الزاد التقوى

ترجمہ:- بندگانِ خدا! خدا سے ڈرو اور اس دنیا سے ہوشیار رہو اگر یہ دنیا کسی کے لئے ہمیشہ باقی رہتی اور دنیا میں کوئی ہمیشہ باقی رہ سکتا تو انبیاءؑ ہمیشہ باقی رہنے کے زیادہ حقدار تھے اور اس بات کے زیادہ مستحق تھے کہ ہر بات اُن کی مرضی کے مطابق ہو۔ اور وہ سب سے زیادہ تقدیر کے فیصلے اپنی پسند کے مطابق پاتے۔ مگر خدا نے اس دنیا کو بلا و مصیبت ہی کے لئے خلق کیا ہے۔ اور اس دنیا کے لوگوں کو فنا ہو جانے کے لئے۔ دنیا کی ہر نئی چیز کہنہ ہو جانے والی ہے اور اُس کی نعمتیں فرسودہ ہو جاتی ہیں۔ اس کی خوشی تو نمائشی خوشی ہے۔ یہ ایک دوسری منزل کا پیش خیمہ ہے اور ناقابل سکونت گھر ہے۔ لہٰذا اس دنیا سے زادراہ فراہم کر لو اور بہترین زادراہ تقویٰ ہے۔

ایک دفعہ آپ سے کہا گیا کہ اے فرزندِ رسول آپ نے کس طرح صبح کی۔ تو آپ نے فرمایا:۔

اصبحت وفی ربی فوقی والنار امامی والموت یطلبنی والحساب محدق بی، وانا مرتھن بعملی، لا اجد ما احب، ولا ادفع ما اکرہ والامور بید غیری فان شاء عذبنی وان شاء عفی عنی فای فقیر افقر منی۔

ترجمہ:۔ میں نے اس طرح صبح کی کہ میرا پروردگار میرے اوپر ہے، آتش جہنم میرے سامنے ہے، موت میری طلبگار ہے۔ اور حساب میرے اوپر نگاہ جمائے ہوئے ہے۔ میں اپنے اعمال کا اسیر ہوں۔ جو چاہتا ہوں وہ پاتا نہیں اور جس سے بیزار ہوں اُس کو اپنے سے دور نہیں کر سکتا میرے کل امور دوسرے کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ چاہے تو مجھ پر عذاب کرے اور چاہے تو معاف کر دے۔ لہٰذا مجھ سے زیادہ نادار و مجبور اور کون ہو سکتا ہے۔

آئمہؑ کا طرزِ بیان ایسا ہوتا تھا کہ جس سے دوسروں کو نصیحت ہو۔ اور ہدایت حاصل کریں۔ لہٰذا جو کچھ کہتے تھے اپنے اوپر رکھ کر کہتے تھے۔

مورخ مسعودی مروج الذہب میں لکھتا ہے کہ متوکل عباسی سے کسی نے حضرت امام علی نقی علیہ السلام کی چغلی کی اور کہا کہ ان کے پاس بہت اسلحہ و مال ہے اور آپ یہ تیرے خلاف خروج کرنے والے ہیں۔ اُس نے ترکوں کی ایک جماعت کو رات کے وقت آپ کے پاس بھیجا کہ گرفتار کر کے لائیں۔ وہ جماعت جب آپ کے مکان پر پہنچی تو دیکھا کہ آپ عبادت الٰہی میں مشغول ہیں اور قرآن شریف کی آیات کا ورد ہے۔ بالوں کا کمبل اوڑھے ہوئے تھے۔ اسی حالت میں وہ لوگ آپ کو متوکل کے پاس لے گئے اور کہا کہ کوئی مشتبہ شے آپ کے مکان میں نہیں ملی۔ اور آپ کی عبادت کا حال سنایا۔ اُس نے عزت سے آپ کو اپنے پاس بٹھایا۔ متوکل اُس وقت شرابخواری میں مشغول تھا اور جام شراب گردش کر رہا تھا۔ متوکل نے ایک جام شراب آپ کو پیش کیا۔ جناب امام علی نقی علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے معاف رکھا جائے۔ آج تک شراب نے میرے خون و گوشت کو مس نہیں کیا۔ اُس نے کاسہ شراب پر اصرار

نہ کیا۔ لیکن کہا کہ کچھ اشعار سنائیے۔ آپ نے کہا میں شعر تو نہیں کہا کرتا۔ متوکل نے کہا کہ نہیں، شعر تو ضرور کہتے ہوں گے۔ اس پر آپ نے مندرجہ ذیل اشعار اسی وقت انشاء کر کے سنائے۔ یہ اشعار بھی مسعودی نے نقل کئے ہیں۔

مروج الذہب مسعودی طبع مصر الجزء الرابع ص ۴۴۔

وہ اشعار یہ ہیں :-

(۱) باتوا علی قلل الاجبال تحرسهم — غلب الرجال فما اغنتهم القلل

(۲) واستنزلوا بعد عز عن معاقلهم — فاودعوا حفرا یا بئس ما نزلوا

(۳) ناداهم صارخ من بعد ما قبروا — این الاساور والتیجان والحلل

(۴) این الوجوه التی کانت منعمة — من دونها تضرب الاستار والکلل

(۵) فافصح القبر عنهم حین ساءلهم — تلک الوجوه علیها الدود یقتتل

(۶) قد طالما اکلوا دهرا وما شربوا — فاصبحوا بعد طول الاکل قد اکلوا

(۷) وطالما عمروا دورا لتحصنهم — ففارقوا الدور والاهلین وانتقلوا

(۸) وطالما کنزوا الاموال وادخروا — فخلفوها علی الاعداء وارتحلوا

(۹) اضحت منازلهم قفرا معطلة — وساکنوها الی الاجداث قد رحلوا

ترجمہ

۱۔ وہ لوگ بلند پہاڑوں کی چوٹیوں پر رہتے تھے جہاں لوگوں کی طاقتور جماعتیں ان کی حفاظت کرتی تھیں۔ لیکن ان کی بلند چوٹیوں نے بھی ان کو کچھ فائدہ نہ پہنچایا۔

(۲) اس شان و شوکت کے بعد وہ اپنی بلند پہاڑوں کی پناہ گاہوں سے نیچے اُتار لئے گئے اور ایک گڑھے میں ڈال دیئے گئے۔ کیا خراب جگہ ہے جہاں وہ آ گئے۔

(۳) ان کے دفن ہونے کے بعد ایک ندا دینے والے نے ندا دی کہ کہاں ہیں وہ سونے چاندی کے ڈھیر اور وہ تاج و قیمتی لباس۔

(۴) وہ چہرے جو ناز و نعم میں رہتے تھے اور جن کے سامنے ستار و طنبورے بجتے تھے اب کہاں ہیں۔

(۵) جب اُن کی قبر نے ذرا سا پردہ ہٹایا کہ یہ ہیں وہ چہرے جن کے کھانے کے لئے

کیڑے آپس میں لڑ رہے ہیں۔

(۶) ایک زمانہ تک عیش و عشرت میں کھاتے پیتے رہے لیکن آج وہ خود کھلائے جا رہے ہیں۔

(۷) ایک زمانہ تک اُنھوں نے محل آباد کیے تاکہ محلوں میں انھیں امن ملے لیکن پھر اُنھیں اپنے محل اور اہل و عیال چھوڑنے پڑے۔

(۸) ایک زمانہ تک اُنھوں نے مال جمع کیا اور اس کا ذخیرہ لگایا۔ لیکن پھر ان خزانوں کو اپنے دشمنوں پر تقسیم کر کے خود چلتے بنے۔

(۹) ان کے رہنے کے گھر غیر آباد اور ویران ہو گئے اور ان گھروں کے رہنے والے قبروں میں اُتار دیے گئے۔

وہ شخص کتنا شقی ہوگا جو ان معلمانِ اسلام کی اس تعلیم کے بعد بھی اس دنیائے فانی میں دل لگائے اور ناجائز طریقوں سے اُس کو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اور اپنی موت اور اپنے انجام سے غافل رہے اور اصلی اور حقیقی ابدی زندگی کو بھول جائے۔ ایک ایک لفظ دل پر اُس نشتر کا کام کرتا ہے جس سے زخم کی پیپ اور مواد نکالا جاتا ہے۔ بار بار ان کو پڑھنا چاہیے تاکہ صفائے قلب اور جلائے نظر ایسی روشن ہو جائے کہ پھر اُس پر نہ زنگ آئے اور نہ کوئی پردہ حائل ہو۔ لیکن انسان کی خلقت اُس کی زندگی اور یہ دنیا عبث نہیں ہیں۔ ان کو ترک کرنے کی اسلام میں ممانعت ہے۔ خودکشی اور رہبانیت کی اجازت اسلام نہیں دیتا امتزاج دین و دنیا ہی اسلام کا مابہ الامتیاز ہے۔ اس ہی دنیا میں رہ کر اور اس کے مکروہات پر صبر کر کے، آزمائش کی سیڑھیوں سے غیر فانی نعمتوں کے ملک میں انسان پہنچ سکتا ہے۔

اسلام ترکِ دنیا اور عشق دنیا دونوں کو ممنوع قرار دیتا ہے اور اپنے اٹل اصول یعنی عدل کی پابندی کراتا ہے۔ خیر الامور اوسطہا۔ اہل تصوف دردِ دل کی بہت تعریف کرتے ہیں لیکن وہ بھی حد اعتدال سے نہ بڑھے کہ حبس کو دکھا رو دے۔ رہبانیت کے تتبع میں مسلمان حکماء و شعراء اور "اہل دل" کہتے ہیں کہ دنیا کو چھوڑنا ہی بہت بڑا تقویٰ ہے۔ چنانچہ ایک شاعر نے نہایت اچھے الفاظ میں ترکِ دنیا کی تعریف اس طرح کی ہے:-[۵]

از جہاں مجنوں برید در روئے در ویرانہ کرد   کم کند عاقل چنیں کارے کہ ایں دیوانہ کرد

مذہب تو ہر فرد کے لیے ہوتا ہے۔ سب ہی دنیا کو چھوڑ کر ویرانہ میں چلے جائیں تو پھر ویرانہ آباد ہو کر وہ ہی دنیا ہو جائے۔ اور قطع تعلق کے سلسلہ میں شادی و معاملات بند ہوں تو دنیا ہی نیست و نابود ہو جائے۔ لیکن یہ مشیت ایزدی نہیں ہے۔ دنیا کے علائق سے گریز کرنا بزدلی ہے۔ اور پھر دنیا چھوڑ کر بھی تو خوشی نہیں ملتی۔ خداوند تعالےٰ نے دنیا کو اس حکیمانہ طریقہ سے بنایا ہے کہ اس کی تکالیف ہی میں ایسی دلچسپی کی آمیزش کر دی ہے کہ لوگ اُن تکالیف کی تلاش میں رہتے ہیں۔ اولاد سے جو تکالیف مرد و عورت دونوں کو ہوتی ہے ظاہر ہے لیکن اولاد نہ ہو تو لوگ اُس کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں۔ عورت و مرد کی صحبت ہی بہت سے غم و الم کا باعث ہوتی ہے لیکن لوگ جوانی کو روتے ہیں اور جب وہ جاتی ہوئی نظر آتی ہے تو ہر ایک جتن سے اُس کا دامن گھسیٹ کر اپنی طرف کھینچنا چاہتے ہیں اور جب شنگرف کے کشتے سے بدن پھوٹ نکلتا ہے تو خدا کو الزام دینے لگتے ہیں یہ معجزہ ہے اور قدرت و حکمت الٰہی کا نمونہ ہے کہ ان مصائب و تکالیفِ دنیا ہی میں دلآویزی موجود ہے ایسی دل آویزی کہ کوئی شخص اپنی خوشی سے مرنا نہیں چاہتا۔ ظاہر ہے کہ مشیت ایزدی یہ ہے کہ دنیا چلے۔ نہ یہ کہ سب لوگ ترکِ دنیا کر کے دنیا کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔ ترکِ دنیا کا یہ نتیجہ ہوا کہ نہ خدا کی رضا ملی اور نہ خوشی حاصل ہوئی حکیم اسلام حضرت علی علیہ السلام دنیا کی زندگی کے فوائد اس طرح بیان کرتے ہیں۔ ابو عثمان عمرو بن بحر الجاحظ البصری متوفی ۲۵۵ھ نے اپنی کتاب المحاسن والاضداد کے صفحہ ۳۲ پر جناب امیر علیہ السلام کا یہ خطبہ زیر عنوان محاسن فضل الدنیا نقل کیا ہے۔

الدنیا دار صدق لمن صدقها ودار عافیۃ لمن فھم فیھا ودار غنی لمن تزود منھا، مسجد انبیاء اللہ، ومھبط وحیہ، ومصلی ملائکتہ ومتجر اولیائہ یکسبون فیھا الرحمۃ، ویربحون فیھا الجنۃ فمن ذا یذمھا؟ وقد آذنت ببینھا ونادت بفراقھا ونعت نفسھا وشوقت بسرورھا الی السرور وببلائھا الی البلاء تخویفاً و تحذیراً و ترغیباً و ترھیباً، فیا ایھا الذام للدنیا والمفتتن بغرورھا متی غرتک ابمصارع آبائک من البلی ام بمضاجع امھاتک تحت الثری؟ کم علّلت بکفیک وکم مرضت بیدیک تبتغی لھم الشفاء و تستوصف لھم الاطباء و تلتمس لھم الدواء؟ لم تنفعھم بطلبتک ولم تشفعھم بشفاعتک ولم تستشفعھم باستشفائک بطبک مثلت بھم الدنیا مصرعک ومضجعک حیث لا ینفعک

بکاؤک لا یغنی عنک احباؤک ثم التفت الی قبور ھناک فقال:۔ یا اھل الثراء والعز، الازواج قد نکحت والاموال قد قسمت والدور قد سکنت ھذا خبر ما عندنا فما خبر ما عندکم، ثم قال لمن حضر واللہ لو اذن لھم لاجابوا بان خیر الزاد التقوی وانشہ: ؎

مَا اَحْسَنَ الدُّنْیَا وَ اِقْبَالَھَا ۔ اِذَا اَطَاعَ اللہَ مَنْ نَالَھَا

مَنْ لَمْ یُوَاسِ النَّاسَ مِنْ فَضْلِھَا ۔ عَرَّضَ لِلْاِدْبَارِ اِقْبَالَھَا

ترجمہ:۔ دنیا دار صداقت ہے اُس شخص کے لئے جس نے اس کی حقیقت کو پہچانا اور دار عافیت ہے اُس شخص کے لئے جس نے اُس میں غور و فکر کرکے اُس کو سمجھا۔ دارِ دولت ہے اُس شخص کیلئے جس نے اس میں سے عاقبت کیلئے زادِ عقبیٰ جمع کیا۔ یہ انبیاء اللہ کے سجدہ کرنے کی جگہ ہے۔ اور اُس کی وحی کے نزول کا مقام ہے۔ اُس کے ملائکہ کے نماز پڑھنے کی جگہ ہے اور اُس کے دوستوں کی تجارت کی جگہ ہے جہاں وہ خدا کی رحمت حاصل کرتے ہیں اور نفع میں جنت لیتے ہیں۔ پھر کیوں اس کی مذمت کی جائے۔ درآنحالیکہ دنیا نے اپنے فرزندوں کو (محبت کرنے والوں کو) اس صورت سے طلب کیا ہے کہ اپنی مفارقت کی بھی منادی کردی ہے۔ اور اپنے فنا ہونے کی سُنائی بھی سنادی ہے۔ اور اپنی راحتوں کی طرف شوق بھی دلایا ہے اور اپنی بے شمار آفات کی طرف بھی توجہ دلادی ہے۔ دنیا خوف دلانے والی بھی ہے۔ ڈرانے والی بھی ہے اور رغبت بھی دلاتی ہے۔ اور خوف زدہ بھی کرتی ہے۔ پس اے مذمت کرنے والے دنیا کے اور اس کے مکر سے فریفتہ ہونے والے۔ کیا تجھ کو دھوکہ میں ڈال دیا ہے تیرے آبا کی موت نے یا تیری ماؤں کے زیر خاک دفن ہوجانے نے (یعنی اے مذمت کرنے والے کیا تو اس وجہ سے دنیا کی مذمت کرتا ہے) اور (اے دنیا کی زینت کے مکر میں آنے والے) کیا تو نہیں دیکھتا کہ کتنی مرتبہ تو نے بیماروں کی تیمار داری کی ہے اور کتنے مریضوں کا اپنے ہاتھ سے علاج کیا ہے کہ اُن کو شفا ہوجائے۔ اور کتنی مرتبہ تو نے اُن کے لئے اطبا کو طلب کیا ہے اور اُن کے لئے دوا مہیا کی ہے۔ لیکن تیری کوششوں نے اُن کو کچھ فائدہ نہ پہونچایا۔ اور نہ تیری شفاعت نے ان پر کچھ اثر کیا۔ اور نہ تیری تیمار داری نے ان کو شفا بخشی۔

پھر آنجناب اُن قبروں کی طرف متوجہ ہوئے جو وہاں موجود تھیں۔ اور فرمایا:۔

اے اہل ثروت و عزت، تمہاری ازواج سے لوگوں نے نکاح کر لئے۔ تمہارے اموال تقسیم کر لئے گئے تمہارے گھروں میں اور لوگ ساکن ہو گئے۔ یہ تو خبر ہماری طرف سے ہے جو ہم تم کو دیتے ہیں۔ اب تمہاری طرف سے کیا خبر ہے؟ پھر ان لوگوں سے فرمایا جو وہاں موجود تھے کہ واللہ اگر ان کو اجازت مل جاتی تو البتہ یہ جواب دیں کہ بتحقیق کہ بہترین توشہ تقویٰ ہے اور یہ شعر پڑھا:۔

کس قدر اچھی ہے دنیا اور اُس کا آنا جبکہ خدا کی اطاعت کرے وہ شخص جس کو وہ حاصل ہو جائے۔ لیکن اگر وہ اُس کی نعمتوں سے لوگوں کی مدد نہ کرے تو اُس نے پلٹ دیا، دُنیا کے حصول کو اُس کی واپسی سے یعنی اُس کا نہ حاصل ہونا ہی اُس کیلئے بہتر تھا۔

دنیا کی اصلی حقیقت اور حالت اس سے بہتر الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی۔ دنیا میں انسان کی زندگی کے مقصد اور طریقۂ رہائش کو کیسے عمدہ الفاظ میں بیان فرمایا ہے اور اشعار میں اُس کا خلاصہ رکھ دیا ہے۔ دنیا بہترین جگہ ہے، حصول امن و دوام کا ذریعہ ہے اگر اس میں خوف خدا اور اُس کے اوامر و نواہی کی پابندگی میں زندگی گذاری جائے۔ دنیا بدترین جگہ ہے اگر اُس میں انہماک ہے اور اُس کی زینت سے عشق ہے تو اس کا نتیجہ غفلت اور عاقبت کا عذاب ہے۔

حصہ اوّل خداوند تعالےٰ کے فضل و کرم سے ختم ہوا۔ اس کے بعد حصہ دوم شروع ہوتا ہے۔ اُس میں انشاء اللہ اُن تمام ارکانِ حیات ابدی کا تذکرہ ہوگا جو اس کتاب کے صفحہ ۵۹ پر جدول کی صورت میں لکھے گئے ہیں۔

وما توفیقی اِلّا باللہ العلی العظیم

عبدہ المذنب
محمد سلطان مرزا

6 SEPT. 1956 : 9.50 A.M.

کشاف

لموضوعات الجزء الاول کتاب فلسفۂ اسلام

باب ہفتم

غیر اسلامی فلسفے

(مذہب یونان)

تصحیح اغلاط کتاب فلسفۂ اسلام حصہ اوّل

معذرت:- ناظرین سے معذرت کے ساتھ التماس ہے کہ کتاب کے مطالعہ سے پہلے مندرجہ ذیل اغلاط کی صحت فرمائیں :-

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳	۱۸	میرے بغیر	بغیر
۶	۹	کے ترقی	کے بغیر ترقی
۸	۱۵	اص	اس
۱۹	۹	کہ حاکم	کہ بنیا حاکم
۲۲	۱۷	معلم	علم
۳۹	۱۱	Discontent	Discontented
۵۰	۱۶	نہیں	ہیں
۵۸	۷	جانے	جائے
۶۳	۷	بین	بین
۷۵	۲۰	اخنام	اصنام
۷۹	۲۳	آغاز	عقاد
۸۱	۱۸	عقیلام	عیلام
۹۳	۴	اسمیریا	سمیریا
۹۴	۹	اشورنڈیرپال	اشورنذیرپال
۹۴	۱۴	اشوریہ	اشوریا
۱۱۶	۱۷	نہبت	بہت

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۲۳	۱۷	لے	کے
۱۲۴	۱۸	مزڑدا	مزدا
۱۲۶	۶	ہوتی ہے کیونکہ	کیونکہ
۱۳۰	۱۹	کہیا	کہبا
۱۳۲	۱۷	ہین۔	ہین
۱۳۳	۲۰	نکلوائی	نکلوائے
۱۳۶	۱۶	زمانہ	زمانے
۱۳۷	۵	دانشمندان	دانشمندانہ
۱۳۷	۷	جینی	چینی
۱۳۹	۱۵	لگے	لگا
۱۴۰	۵	محل ہونا	محل پر ہونا
۱۴۰	۱۵	تیراندازہ	تیرانداز
۱۴۲	۱۹	جملہ	یہ انگریزی کا جملہ
۱۴۳	۲	گویہ	گویا
۱۴۵	۴	ان کے	ان حکماء کے
۱۴۵	۴	کے اخلاقیات	کے ان کے فلسفے اخلاقیات
۱۴۶	۵	کے	کی
۱۴۷	۱۲	Amaximander	Anaximander
۱۴۸	۱۱	Amaximander	Anaximander

صحیح	غلط	سطر	صفحہ
سے	سے	۱۳	۱۴۸
فیڈرلشین	فیڈرِشنی	۶	۱۵۱
لیسج لِللہ	لیسج اللہ	۹	۱۵۲
کی	کے	۲۰	۱۵۳
مستقیم	مستصیم	۲۱	۱۵۶
ہوتی	ہوئی	۶	۱۵۸
تضُیع	تفیع	۱۶	۱۵۸
cannot	oannot	۱۹	۱۶۲
ایمپڈوکلیز	ایمپڈونکیز	۹	۱۶۴
دفاع	نزاع	۲۰	۱۶۸
الحاد	اتحاد	۴	۱۷۱
Pericles	Pe eles	۶	۱۷۱
لہذا	بہذ	۲۰	۱۷۵
خودرائے	خودرائی	۳	۱۷۷
زمانے	زمانہ	۲۳	۱۷۹
شدہ	شدد	۱۷	۱۸۰
×	concepts	۵	۱۸۶
کی بصیرت	کے بعد	۲۰	۱۸۷
بدکار	یہ کار	۱۰	۱۸۸

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۸۸	۱۲	من اش	منشس
۱۸۹	۷	تکبیر	تکبّر
۱۹۹	۱۰	راس	اس
۱۹۹	۲۲	کووہ	کو
۲۰۰	۱۹	ملکی	فلکی
۲۰۵	۸	بیاکل	ہیاکل
۲۱۱	۲۴	کذ	کو
۲۱۳	۶	کھلا	کھولا
۲۲۱	۱۵	دفع	دفعہ
۲۲۴	۱۱	اسی	اس
۲۲۶	۲۱	سنگیار	سنگھار
۲۲۷	۱۸	۱۷ اشوریا	اشوریا
۲۲۷	۱۸	مامل	بابل
۲۳۶	۱۲	عزیرعن ابن اللّٰہِ	عُزَیرمنِ ابنُ اللّٰہِ
۲۴۴	۱۱	Mysteris	Mysteries
۲۶۰	۲۳	جوزا	جوڑا
۲۶۰	۱۰-۱۱	میں - بہت	میں بہت
۳۰۱	۱۸	کہ حیات	کہ امکانِ حیات
۳۰۴	۲۳	عرضہم	عَرَضَہُم

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۰۶	۱۷	سایہ	سائے
۳۱۲	۱۷	بتاتے	پائے
۳۱۴	۱۸	Exiremes	Extremes
۳۱۷	۲۵	جائے	جائیں
۳۱۸	۹	کاور	اور
۳۱۸	۹	پیدا ہوتا ہے	ہوتا ہے
۳۲۱	۱۹	اماھکُمُ	اَمَامَکُمُ
۳۲۱	۲۵	جمہُم	جوتُم
۳۲۳	۱	اَلّذیِنَ	اَلَّذِیْنَ
۳۲۴	۵	اَلذَھَرَ	اَلدَّھَرَ
۳۲۴	۶	مِنّہ	مِنْہُ
۳۲۴		نُفُہُ	نَفَہُ
۳۲۴	۱۳	اَلقُصُوٰی	اَلْقُصْوٰی
۳۲۴	۱۴	باللہ	اَللہ
۳۲۴	۱۸	کُرَکُبِ	کَرَکُبِ
۳۲۵	۸	سَدَرَتْ	صَدَرَتْ
۳۳۰	۱۰	نسے	نے
۳۳۲	۳	کے	کی
۳۳۲	۱۷	اپنے	اپنی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۳۲	۱۷	کے	کی
۳۳۲	۲۴	اس	اس
۳۳۳	۴	بجہت	ہیئت
۳۳۳	۱۴	رہ	وہ
۳۳۴	۶	دوریین	دوربین
۳۳۶	۱۱	آحان	آسمان
۳۳۶	۱۹	(Orion)	Orion)
۳۳۶	۲۰	(Constellation)	(Constellation)
۳۴۶	۷	اوز	اور
۳۴۶	۸	تبیا	بتا
۳۴۶	۱۲	پلے	بے
۳۴۶	۱۵	تجود	بخود
۳۴۶	۲۰	دنیا	دیا
۳۴۷	۴	رذح	روح
۳۴۷	۱۹	ندگی	زندگی
۳۴۸	۱۰	ابٹھم	اٹیم
۳۵۰	۴	ٹتیان	ٹمٹیان
۳۵۲	۲۳	لئے	لیتے
۳۵۳	۲	ذاقعہ	واقعہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳۶۰	۵	پہنچي	پہنچے
۳۶۱	۴	نوچنانچہ	چنانچہ
۳۶۳	۲	دتیا	دینا
۳۶۶	۲۱	نیتیہ	نیة
۳۶۶	۲۲	تیتیتہ	نیتتہٖ
۳۶۸	۱۱	بین امرٔ	بین المرٔ
۳۶۸	۱۳	احبارلون	احبار
۳۶۹	۱۶	تزکی	تزکیہ
۳۷۰	۲	لو	و
۳۷۳	۴	الئک	الیک
۳۷۴	۹	زائے	رائے
۳۷۵	۲۴	بیند	بند
۳۷۶	۲۵	کرے	کرنے

فلسفۂ اسلام حصۂ اوّل کے ملنے کا پتہ

۱- مولف آغا محمد سلطان مرزا - سنی سائڈ بلڈنگ - فلیٹ نمبر ۱۰، اے-ایم ۳۳ کراچی ۱

۲- لاہور- اندرون موچی دروازہ - کتب خانہ حسینیہ حلقہ نمبر 52 شیخ غلام علی صاحب شہید

۳- لاہور- اندرون موچی دروازہ - منیجر صاحب کتب خانہ اثنا عشری -

۴- لاہور- اندرون موچی دروازہ - منیجر صاحب کتب خانہ امامیہ

۵- پاک کتب خانہ، اردو بازار - راولپنڈی شہر -

۶- کراچی نمبر ۱۸ ناظم آباد - نزد پہلی چورنگی - ظفر منزل - بلاک نمبر ۲
سب بلاک A - دفتر نور
ادیب اعظم حضرت مولانا سید ظفر حسن صاحب

۷- منیجر صاحب محفوظ بک ایجنسی - F ۱۴۹ جبیل روڈ - کراچی نمبر ۵

father, and mother, and his wife, children, and brothers, and sisters, and yea, and his own life also, he cannot be my disciple. Luke xiv: 26

XX If thou wilt be perfect, go and sell that thou hast, and give to the poor. Matt xix, 21.

XXI. He that is un-married careth for the things that belong to the Lord;.......... ... but he that is married careth for the things that are of the world. 1 Cor. vii, 32,33.

speech and writing are the only methods of communication of which we know for certain, whereby one person can communicate with another and so transmit his thoughts, yet we cannot be perfectly certain that some more subtle means may not be possible. This may only dimly and uncertainly be available to certain specially favoured individuals and it may work just as does wireless transmission, only being capable of transmitting messages between a specially tuned transmitter and an equally specially tuned receiver.

A. G. Gordon: The Philosophy of a Scientist, P. 18.

XVIII. The ants on which they make war are active little black ones, who live in well-built houses, and who are hard workers. When some of the red ants find one of these colonies, they go home to tell their friends of it, and then the red ant army sets out to attack the enemy's fort. As soon as the black ant sentinels see them coming, they rush into the fort, give the alarm, and then rush quickly out again followed by great numbers of other black ants, who fight the invaders bravely, but in vain. The red ants are the best soldiers, and they soon overcome the black ones and press into the fort. The blacks fly in all directions, and in a few minutes the reds are seen coming out again, each one carrying in its mouth an egg or larva of the black colony. With these they march home, where they bring up their prisoners to serve them, treating them as their own children. They never carry off the grown up ants.............. ....As soon as the black ant children grow up, they do all the work of the house-hold and take the best care of their masters. They lick them brush them, and carry them round on their backs. The masters, who do nothing but carry on war, become so used to being waited on, that if they lost their slaves the stupid creatures would die in the midst of plenty. The Little Cyclopedia of Common Things, by W. Cox, Art. "Ant".

XIX. If any man come to me and hate not his

which finally appears, we know not how, whence or why.

The Universe Around Us, Introduction, P. 10

XVI. All these different kinds of nebulae are called "Galactic" because they belong to our Galactic System of Stars, but now we come to the Great or Spiral Nebulae, which are in a class by themselves for more than one reason. These are "island Universes," galaxies like our own galaxy but outside it and at stupendous distances both from us and from each other. The nearest ones are *almost a million light-years away* from us, and their average distance from each other is nearly *two millions light-years.* Astronomy has long taught that there are other worlds than our little earth-world, but the great 100—inch telescope inaugurated a sensational new era only a quarter of a century ago by giving dramatic and definite news of *other universes than our great universe....* The "Globular Clusters" of stars sending out millions of times as much light as the sun are, as we have seen, awe-inspiring wonders of Creation. *But clusters of galaxies or universes are now known to exist, some probably containing thousands of such universes....* ... ...Now this stupendous Galactic System of ours *has been found to be one of a group or cluster*, possibly the cluster in Virgo Constellation, whose distance has already been given as 7,000,000 light years. *This would imply a cluster of Galaxies seven million light-years in extent. Can you imagine object a million and more light-years apart from each other and yet members of a group or cluster* ? That can perhaps give you an idea of the scale and size of the heavens which "declare the glory of God." *Not merely stars but whole stellar universes now stretch out one behind another till vision fails* The end is certainly not yet in sight. It may be that each spiral system fits into and forms part of a bigger spiral which in turn merely forms part of a still bigger spiral, and so on *Ad infinitum*, or to *infinity.* (106)

(106) J. Robinson: The Universe, PP. 44,46,48.

XVII............... for although various forms of signalling,

iences, in the statement that the universe appears to have been designed by a pure mathematician.

The Mysterious Universe, P. 115.

(3) The uniformity of nature proclaims the self-consistency of this mind (creator).

The Mysterious Universe, P. 129.

(4) In brief a mathematical formula can never tell us what a thing is, but only how it behaves; it can only specify an object through its properties. And these are un-likely to coincide in toto with the properties of any single microscopic object of our everyday life.

The Mysterious Universe, P. 130.

(5) We have already noticed that science cannot hope ever to discover the true nature of the ingredients of the material universe; from the nature of things, this lies forever beyond our ken.

The Universe Around Us, Chapt. II. P. 113.

XIV. Atheism means the disbelief in any sort of God, however God may be defined; a belief, if there is any belief at all, in mere chaos in which we should be the playthings of un-directed chance.

R. G. Gordon; The Philosophy of a Sciantist, P. 80.

XV. We have conjectured that the planets began life as condensations in a filament of tenuous gas; after this, they first gradually contracted, and then liquefied and solidified, until they assumed their present physical conditions

The Universe Around Us, P. 258.

Our home in space came into being as a globe of intensely hot gas on which no life of any kind could either gain or retain a foothold.

Gradually this globe of gas cools down, becoming first liquid, then plastic Finally the outer crust solidifies, rocks and mountains forming a permanent record of irregularities of its earlier plastic from........Gradually the earth assumes a condition suited to the advent of life,

strange but we must realise that it is not only but *is becoming more and more rare.*

Ouspensky : The Psychology of Man's Possible Evolution, PP. 10, 11.

XII. The mechanist theory which proclaimed life a by-product of non-living processes and mind an offshoot of the brain is proving increasingly unsatisfactory in biology. From a number of quarters evidence is accumulating to suggest that the mode of behaviour of a living organism is fundamentally different from that of a machine and can never be explained in terms of it. Life, it seems, is fundamental ; moreover, it is creative, and uses and moulds the forms of living organisms as instruments to further its purpose and serves its ends. Hence arise theories of creative evolution which interpret evolution as the expression of a purposive force or principle which manifesting itself in living organisms, seeks to achieve ever higher qualities of life in the effort to realise some objective at which we can at present only dimly guess.... Evolution, in other words, is coming to be regarded as a creative process, continually engaged in bringing to birth something new; there is literally more in the universe at any moment than there was in the moment before; the future is un-predictable and man is free within limits to make it as he pleases.

C.E.M. Joad: Guide to Modern Thought, PP. 21,22.

XIII.

(1) We know that the interpretation is conspicuously inadequate; it fails to explain the simplest phenomena, the propagation of a sun-beam, the composition of radiation, the fall of an apple, or the whirl of electrons in the atom.

The Mysterious Universe, PP. 112,113.

(2) In the same way, a scientific study of the action of the universe has suggested a conclusion which may be summed up, though very crudely and quite inadequately, because we have no language at our command except that derived from our terrestrial concepts and exper-

of ancient Monuments and Memorial which cannot be repeated or imitated by the present humanity.

As regards prehistoric man or creature similar in appearance to man and yet at the same time very different from him, whose bones are sometimes found in deposits of glacial or preglacial periods, we may accept the quite possible view that these bones belong to some being quite defferent from man, which died out long ago..........................

Our fundamental idea shall be that man as we know him is not completed being; that nature develops him only upto a certain point and then leaves him, either to develop further, by his own efforts and devices, or to live and die such as he was born, or to degenerate and lose capacity for development.

Evolution of man in this case will mean the development of certain *inner* qualities and features which usually remain undeveloped, *and cannot develop by themselves.*

Experience and observation show that this development is possible only in certain definite conditions, with efforts of a certain kind on the part of man himself, and with *sufficient help* from those who began similar work before and have already attained a certain degree of development, *or atleast* a certain knowledge of methods.

We must start with the idea that without efforts evolution is impossible; without help, it is also impossible.

After this we must understand that in the way of development, man must become a *different being*, and we must learn and understand in what sense and in which direction man must become a different being; that is, what a different being means.

Then we must understand that *all men* cannot develop and become different beings. Evolution is the question of personal efforts and in relation to the mass of humanity is the rare exception. It may sound

atom possesses these remarkable properties resides somewhere in the ultimate laws of nature, but mathematical physics has not yet fathomed it.

Sir James Jean : The Mysterious Universe, P.7

In other words, is a living cell merely a group of ordinary atoms arranged in some non-ordinary way? or is it something more? Is it merely atoms, or is it atoms plus life ? or to put it in another way, could a sufficiently skilful chemist create life out of the necessary atoms, as a boy can create a machine out of "Meccano", and then make it go. We donot know the answer.

Sir James Jeans : The Mysterious Universe P.6.

VIII. We can scarcely call it an accident that among the integers there should happen to be the number 6 ; but I dont know how otherwise to express the fact that organic life would not have begun if Nature's arithmetic had overlooked the number 6.

IX. The truth is that no one knows how life began in a lifeless world. It is one of the great, unsolved wonders of creation, how a world which was a desert could become a flowering garden. But if we cannot say how life began, we can know where it began. It began in the sea The Golden Book of Knowledge, Vol. I. PP. 22,23

X. The Divine word of truth shows up as foolish those teachers of "science falsely so called", who teach that man has been upon this planet and in a state of development toward perfection for milllon of years, the exact number of which these so called "scientists" cannot agree among themselves.

XI. As regards ordinary modern views on the origin of man and his previous evolution I must say atonce that they cannot be accepted. We must realise that we know nothing about the origin of man and we have no proof of man's physical or mental evolution.

On the contrary, if we take historical mankind, that is, humanity for ten or fifteen thousand years, we may find unmistakable signs of a higher type of man, whose presence can be established on the evidence

The new knowledge compels us to revise our hasty first impressions that we had stumbled into a universe which either did not concern itself with life or was actively hostile to life The old dualism of mind and matter, which was mainly responsible for the supposed hostility, seems likely to disappear, not through matter becoming in any way more shadowy or insubstantial than heretofore, or through mind becoming resolved into a function of the working of matter, but through substantial matter resolving itself into a creation and manisfestation of mind. We discover that the universe shows evidence of a designing or controlling power that has something in common with our own individual minds-not, so far as we have discovered, emotion morality, or aesthetic appreciation, but the tendency to think in the way which, for want of a better word, we describe as mathematical.... ....we may well conclude by adding, what might well have been interlined into every paragraph, that every thing that has been tentatively put forward, is quite frankly speculative and uncertain.

Sir James Jean: The Mysterious Universe, PP. 136-138.

(VII) If this is so, life exists in the universe only because the carbon atom possesses certain exceptional properties. Perhaps carbon is rather noteworthy chemically as forming a sort of transition betweeu the metals and non-metals, but so far nothing in the physical constitution of the carbon atom is known to account for its very special capacity for binding other atoms together. The carbon atom consists of six electrons revolving around the appropriate central nucleus, like six planets revolving around a central sun; it appears to differ from its two nearest neighbours in the table of chemical elements, the atoms of boron and nitrogen, only in having one electron more than the former and one electron fewer than the latter. Yet this slight difference must account in the last resort for all the difference between life and absence of life. No doubt the reason why the six electron

that it has become a mental concept............If all this is so, then the Universe can be best pictured, although still very imperfectly and inadequately, as consisting of pure thought, the thought of what, for want of a wider word, we must describe as a mathematical thinker. (Ibid. PP. 123, 124)

(d) Indeed the finiteness of time and space almost compel us, of themselves, to picture the creation as an act of thought. (Ibid P. 134)

(e) Thirty years ago, we thought, or assumed, that we were heading towards an ultimate reality of a mechanical kind It seemed to consist of a fortuitous jumble of atoms, which was destined to perform meaningless dances for a time under the action of blind purposeless forces, and then fall back to form a dead world. Into this wholly mechanical world, through the play of the same blind forces, life had stumbled by accident. One tiny corner atleast, and possibly several tiny corners, of this universe of atoms had chanced to become conscious for a time, but was destined in the end, still under the action of blind mechnical forces, to be frozen out and again leave a lifeless world.

To-day there is a wide measure of agreement which on the physical side of science approaches almost to unanimity, that the stream of knowledge is heading towards a nonmechanical reality; the universe begins to look more like a great thought than like a great machine. Mind no longer appears as an accidental intruder into the realm of matter; we are beginning to suspect that we ought rather to hail it as the creator and governor of the realm of matter-not of course, our individual minds, but the mind in which the atoms out of which our individual minds have grown exist as thoughts.

does not actually require, a religious interpretation of the universe.

C.E.M. Joad : Guide to Modern Thought P. 18.

(g) Hence, there is now no need for those who accept the results of the physical sciences to write off, as they had once to write off, as subjective illusions, the promptings of the moral and the aesthetic side of their natures, and the nineteenth-century gulf between science is in a fair way to being bridged.

Ibid. P. 20.

(h) To-day the foundation for this whole way of thinking, the hard, obvious, simple lumps of matter, has disappeared. Modern matter is.....................a 'mush' of electricity, a wave of probability undulating into nothingness.

Ibid. P. 19.

VI.

(a) The great Universe of Modern astronomy is first and foremost a Universe of Light rather than that of Matter or physical substance........ There is nowadays reason to believe that what we call mattermay be only a sort of congealed or bottled-up light. J. Robinson : The Universe P. 100.

(b) ....the tendency of modern physics is to resolve the whole material Universe into waves, nothing but waves. These waves are of two kinds : bottled-up waves, which we call matter, and unbottled waves, which we call radiation or light. The process of annihilation of matter is merely that of unbottling imrisoned wave energy and setting it free to travel through space. These concepts reduce the whole universe to a world of radiation, potential or existent.

Sir James Jeans : The Mysterious Universe, P. 69.

(c) The Universe cannot admit of material representation, and the reason, I think, is

opinions. You have no right to an opinion unless it is founded upon that which is universal in man, his reason. You cannot claim this right on behalf of your subjective impressions, and irrational whims. To do so is to make the mistake of the Sophists. (A critical History of Greek Philosophy, PP. 123—25.)

I. By Hellenizing Chritianity, these early writers adapted it for world expansion........................Christianity was Hellenized before it became palatable to the Greco-Romans.

Hitti's History of Syria, Chapt. XXV. P. 331.

II. The Christian Victory in the Roman Empire could hardly have been won if the Fathers of the Christian Church had not exerted themselves perseveringly during the first four or five centuries of the Christian era to translate the christian doctrine into terms of Hellenic Philosophy; to build up the Christian ecclesiastical hierarchy on the pattern of the Roman civil service; to portray the Christ in the lineament of an Orpheus; to descry the cross athward the disk of Sol Invictus; to mould the Christian rites on the model of the Mysteries; and even to convert pagan into Christian festivals and to replace pagan cults of heroes by Christian cults of saints.

A. J. Toynbee: Study of History, Vol. V. P. 366.

III. Mithraism, which was Christianity's contemporary and its most formidable rival in the competition for the spiritual conquest of the Roman Empire, was of a corresponding alloy. It was a Hellenized version, not of Judaism, but of Zoroastrianism.

Toynbee's History, Vol. II. P. 286n.

IV. I have already said that science is no longer disposed to identify reality with concreteness. Materialism is long since dead. Sir Arthur Eddington's Science and the Unseen World. P. 31.

V. (f) In particular it is thought that modern physics lends support to idealism, and suggests, if it

simply political protestantism, and democratic ideas are the direct offspring of the Protestant Reformation. The democratic principle is that no rational being can be asked to obey a law to which his own reason has not assented. But the law must be founded upon reason, upon the universal in man....... But if each individual's capricious self-will, his mere whims and fancies, are erected into a law, then democracy turns into anarchism and bolsh. evism.

It is a great mistake to suppose that the doctrines of the Sophists are merely antiquated ideas, dead and fossilized thoughts, of interest only to historians, but of no importance to us. On the contrary, modern popular thought positively reeks with the ideas and tendencies of the Sophists. It is often said that a man ought to have strong convictions, and some people go even so far as to say that it does not much matter what a man believes, so long as what he believes he believes strongly and firmly. Now certainly it is quite true that a man with strong convictions is more interesting than a man without any opinions.... But to put exclusive emphasis on the mere fact of having convictions is wrong. After all, the final test of worth must be whether the man's convictions are true or false. There must be an objective standard of truth, and to forget this, to talk of the mere fact of having strong opinions as in itself a merit, is to fall into the error of the Sophists.

Another common saying is that every one has a right to his own opinions. This is quite true, and it merely expresses the right of the subject to use his own reason. But it is sometimes interpreted in a different way. If a man holds a totally irrational opinion, and if every weapon is beaten out of his hands, if he is driven from every position he takes up– so that there is nothing left for him to do, except to admit that he is wrong, such a man will sometimes take refuge in the saying, that, after all, argue as you may, he has a right to his own opinion. But we cannot allow the claim. No one has a right to wrong opinions. There cannot be any right in wrong

SUPPLEMENT.

A. The early eighteenth century in England and France was likewise a period of enlightenment, and the era from which we are, perhaps, just emerging, bears many of the characteristics of aufklarung It is sceptical and destructive. All established institutions, marriage, the family, the state, the law, come in for much destructive criticism. It followed immediately upon the close of a great period of constructive thought, the scientific development of the nineteenth century. And lastly the age has produced its own Protagorean philosophy, which it calls pragmatism. If pragmatism is not egocentric, it is atleast anthropocentric. Truth is no longer thought of as an objective reality, to which mankind must conform. On the contrary, the truth must conform itself to mankind. Whatever it is *useful* to believe, whatever belief "works" in practice, is declared to be true. But since what "works" in one age and country does not "work" in another, since what it is useful to believe to day will be useless to-morrow, it follows that there is no objective truth independent of mankind at all. Truth is not now defined as dependant on the sensations of man, as it was with Protagoras, but as dependant on the volition of man. In either case it is not the universal in man, his reason, which is made the basis of truth and morals, but the subjective, individusl, particular element in him. A critical History of Greek Philosophy by W. T. Stace, P. 121.

B. Good examples of the right and wrong principles of the Sophists are to be found in modern Protestantism and modern democracy. Protestantism, it is often said, is founded upon the right of private judgment, and this is simply the right of the subject, the right of the individual to excercise his own reason. But if this is interpreted to mean that each individual is entitled to set up his mere whims and fancies as the law in religious matters, then we have the bad sort of Protestantism. Again, democracy is